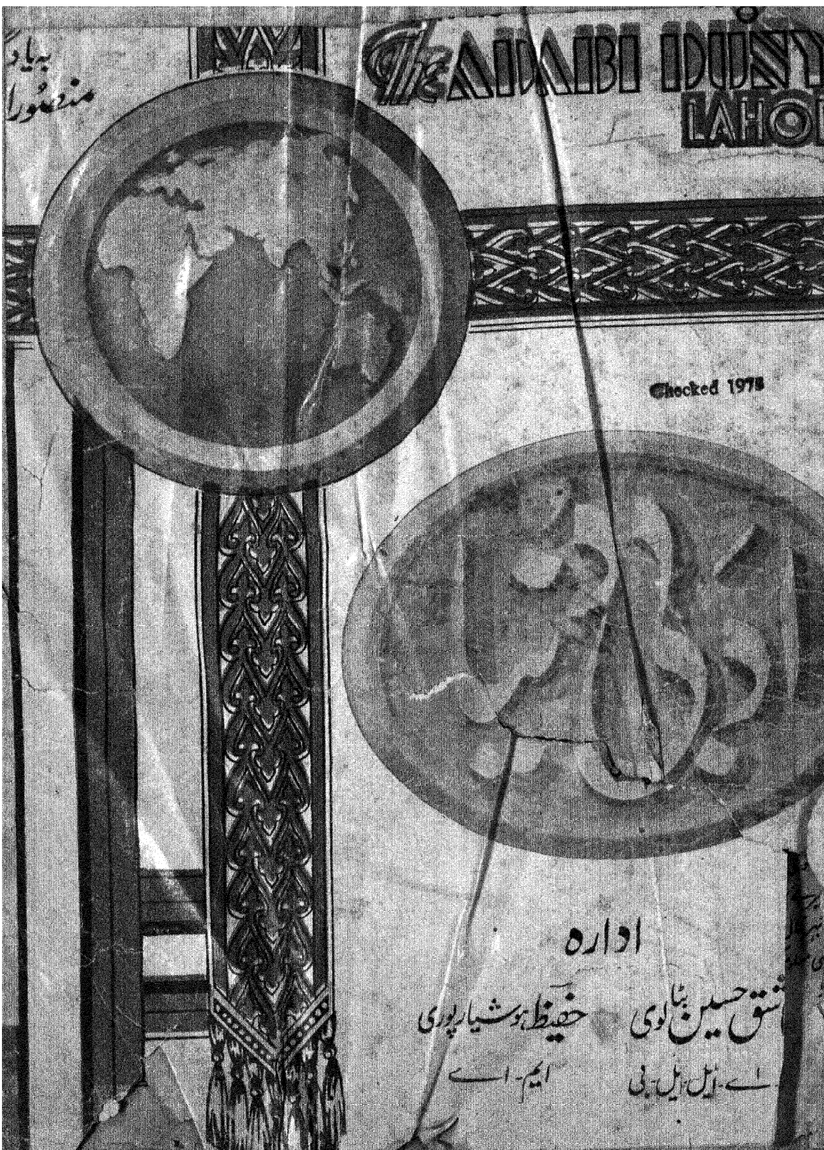

Adabi Duny
Lahor
Checked 1978
ادارہ
شتق حسین بٹالوی
حفیظ ہوشیارپوری
اے۔ ایل۔ ایل۔ بی
ایم۔ اے

عورت کے ہر عضو کو سڈول اور خوبصورت بنانے کے لئے بیسیوں خفیہ ترکیبیں اور ودر

اور نسخے اس کتاب میں درج کئے گئے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر بدصورت اور کریہ النظر عورت بھی چند

دنوں میں پری جوبن بنتی اور ادھیڑ عمر کی عورت چہرہ کی جھریاں دور کر کے حسن دوشیزہ کی مانند معلوم

ہونے لگتی ہے مشرق اور مغرب کی سینکڑوں نئی اور پرانی کتابوں کی مدد سے یہ کتاب لکھی گئی ہے

اسکا حجم ڈیڑھ صد پچاس صفحات نیز تین درجن سے زائد فوٹو بلاکس کی سادہ و رنگین تصویریں بھی مہیا

کی گئی ہیں مقبولیت کا یہ حال ہے امریکہ اور انگلستان میں اس کتاب کے انگریزی ایڈیشن کی دو کروڑ

سے زائد جلدیں فروخت ہو چکی ہیں قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے معہ محصولڈاک ناپسند ہونے پر پوری قیمت واپس

ڈیڑھ صد کے قریب سرخیوں میں سے صرف چند ایک ملاحظہ ہوں

۱ بدصورت چہرہ کو خوبصورت بنانے کا جدید سائنٹیفک طریقہ

۲ کالی کلوٹی اور بھونڈی عورت فرنگن کی مانند کیسے بن سکتی ہے اس کی ترکیب

۳ چہرے کے داغ سیاہیاں اور مہاسے دور کرنے کے طریقے

۴ دراز قد کس طرح حاصل ہو سکتا ہے

۵ موٹاپا دور کرنے کے طریقے

۶ آواز میں سریلا پن پیدا کرنے کی ترکیب

۷ زبان کی لکنت کیسے دور کی جا سکتی ہے

۸ عورت کی آنکھیں کشادہ بڑی بڑی

۹ ... کا طریقہ

۱۰ گیسوؤں کو ایڑیوں تک لمبا بنانے کی ترکیب

وغیرہ وغیرہ

قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنے معہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ

مینیجر کارخانہ مست قلندر بک ڈپو پوسٹ بکس ۱۵ لاہور

عورت کے حسن و شباب اور دوشیزگی

پریشگی کی مہر ثبت ہو گئی ہے کتاب

زیور حسن باتصویر کے مطالعہ

سے ممکن ہے کہ وہ کثیر الاولاد اور ادھیڑ

عمر ہونے کے باوجود بھی حسن دوشیزہ کی

مانند سرسبز و شاداب دکھائی دینے لگے

بالکل اس طرح جیسے کوئی بہشتی حور

1952

Publishers

The Steno House Agency,

AMRITSAR.

آئینہ عام

موت کے تاثرات

دو ماہ کا عرصہ ہوا کہ ایبرڈین (واشنگٹن) کے مسٹر تھیوڈور پرنز کو ڈاکٹروں نے مردہ قرار دیا۔ وہ موٹر کے ایک جانکاہ حادثے کا شکار ہوا تھا ... [illegible] ... گیا تھا کہ اس کا جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا، اس ... [illegible] ... ت بند ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے ... [illegible] ... ب ذیل بیان دیا:۔
... [illegible] ... تو میں نے اپنے آپ کو ایک اندھی ... [illegible] ... ن اور اطمینان میری ... [illegible] ... ی دیری کشتی کس سمت لے جا رہی ہے۔

"اس تاریکی میں ایک عجیب و غریب سکون اور چین کا احساس تھا اور روشنی کی کوئی کرن اس میں خلل نہ ڈالتی تھی ایک ہلکا سا دھندلکا تھا جو مدھم تاریک تر ہوتا جا رہا تھا لیکن اس سے مجھے خوف نہ آتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ میں اس حالت میں خوش تھا لیکن اس کیفیت کو میں روزمرہ کے الفاظ میں پوری طرح بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے ایک نئی دنیا میں موجود ہونے کا احساس ہو رہا تھا لیکن میری زبان اس دنیا کے ماحول کو بیان کرنے سے عاجز ہے۔

اس پر امن اور خوشگوار فضا میں اڑتے ہوئے مجھے کسی فکر اور اندیشے کا احساس نہ تھا۔ پھر یکایک میں نے اپنے آپ کو ہسپتال کی چارپائی پر موجود پایا۔ میری ٹوٹی ہوئی کمر درد کر رہی تھی، شکستہ پسلیوں میں ٹیس اٹھ رہی تھی اور میرے پہلو کا زخم سخت تکلیف دے رہا تھا۔

بہر حال میں خوش تھا اور میرا خیال ہے کہ میں نے لوگوں کے بتانے سے پہلے ہی معلوم کر لیا تھا کہ میں دوسری دنیا کی سرحد سے ہو کر واپس لوٹا ہوں۔"

قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان صحیح معنوں میں کب مرتا ہے؟ یہی وہ معمہ ہے جسے حل کرنے کے لئے موجودہ زمانے کے ماہرین طب و علمائے طبیعات کے دماغ مصروف عمل ہیں۔

ممکن ہے ہمیں اس تحقیق کے بعد اپنے بعض پرانے عقاید میں ترمیم و تنسیخ کرنی پڑے۔

مسٹر ڈبلیو وی فشر، کمشنر مالیات واشنگٹن اپنے اعداد میں سے ایک کا مستند واقعہ ذیل میں بیان کرتے ہیں:

... [illegible] ... رے اس بزرگ نے جو اس واقعہ کے وقت جوان تھا اپنے ایک دوست سے وعدہ کیا کہ ہم دونوں میں سے جو کوئی پہلے مرے وہ دوسرے کی آگاہی کے لئے اپنے دوست سے آ کر ملے۔

اس اقرار کے تھوڑے ہی عرصے بعد ان دونوں خاندانوں کے افراد پراگندہ کر دیا گیا تھا۔ ایک دوست شمالی کیرولینا میں گھوڑے کی سواری کرتے ہوئے گر پڑا۔ جب اس کی لاش دستیاب ہوئی تو معمول کے مطابق چوبیس گھنٹے کے بعد اسے دفن کر دیا گیا۔ ان دنوں گرمی کی شدت کی وجہ سے تجہیز و تکفین میں زیادہ تاخیر نہ کی جاتی تھی۔

آئندہ رات کو جب زندہ دوست سو گیا تو اسے اپنے مردہ دوست کی آواز یہ کہتی ہوئی سنائی دی "جان! تم نے مجھے زندہ کیوں دفن ہونے دیا؟"

جان نے اس خیال سے کہ اس کا وہم اسے دھوکا دے رہا ہے کسی سے کچھ ذکر نہ کیا لیکن اگلی رات کو اس نے پھر اپنے دوست کو وہی الفاظ دہراتے ہوئے سنا۔ اب بھی وہ اس خیال سے خاموش رہا کہ مبادا لوگ اس کا مذاق اڑائیں لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس سے اگلی رات کو اس کے دوست نے ...

...ولی اہمیت...

...پاس جاکر

سے احباب کی موجودگی میں قبر

...یران رہ گئے کہ تابوت کا ایک پہلو ٹوٹا ہوا ہے

...سے کھولا گیا تو لاش کا منہ نیچے کی طرف ہو رہا تھا۔ غالباً مرحوم نے

باہر نکلنے کی جدوجہد میں اپنا رُخ پھیر لیا تھا۔

اس واقعہ کی تفصیلات نہایت احتیاط سے محفوظ ہیں۔

اُن دنوں طب ابتدائی حالت میں تھی اور آج کل کی طرح ...نبض نہ نکالی جاتی تھی۔ آج کل زندہ دفن ہونے کے امکانات ایک لاکھ میں ایک سے بھی کم ہیں۔ ماہرین طبیعات کے لئے اس وقت سب سے بڑا معمہ یہ ہے کہ "حرکت قلب بند ہو جانے کے بعد انسان حقیقی معنوں میں کب مرتا ہے؟"

...ڈاکٹر برد خانسکیہ...

اس ...میں روس۔

کوششوں پر حکومت روسیہ پانی کی طرح روپیہ بہا رہی ہے۔

ڈاکٹر برد خانسکو کہتے ہیں کہ موت ایک ایسی طبعی حالت ہے جو کئی مختلف درجوں پر مشتمل ہے۔ ہم یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ موت کے کس درجے پر انسان دوبارہ زندہ کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر موصوف نے ایک کتے کو موت کے نصف گھنٹہ بعد زندہ کیا ہے اس کتے کے جسم سے خون کلیتہً خارج کر دیا گیا تھا اور تمام ڈاکٹروں نے اس کی موت کی تکمیل کا فتویٰ دے دیا تھا۔

اسی قسم کا ایک حیرت انگیز واقعہ ۲۷ر فروری کو سر آک لینڈ جیڈز نے ایڈنبرا کی رائل میڈیکل سوسائٹی کے اجلاس میں بیان کیا۔ یہ واقعہ جو نہایت احتیاط سے قلمبند کیا گیا ہے اور بالکل تازہ ہے ایک ایسے شخص کی روئداد پر مشتمل ہے جو زندگی کی حدود سے پرے پہنچ کر پھر واپس آ گیا تھا۔ تمام روئداد ایک ماہر مختصر نویس نے عین اُس وقت قلمبند کی تھی جبکہ طبی امداد کے زیر اثر مردہ جسم میں زندگی دوبارہ عود کر رہی تھی۔ مصنف کا نام بعض وجوہ مصلحتوں کی بنا پر پوشیدہ رکھا گیا ہے۔

"...ہفتہ کے روز نصف شب سے کچھ زیادہ وقت ہو چکا تھا کہ ...یک یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ میں

شدید حملہ کا شکار ہو گیا ہوں ...کے

...gastro-enteritis... کے ...

...تمام علامات اس بات پر دلالت ... رہی تھیں کہ زہر میرے جسم ... تمام

میں پھیل گیا ہے۔

...ہم گھنٹی بجا کر امداد طلب کروں لیکن میرے ...

اتنی خفیف حرکت کی طاقت بھی ...تھی چنانچہ میں نے یہ کوشش ...ہی ترک کر دی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ میں سخت بیمار ہوں چنانچہ جلدی ...میں نے اپنی مالی حالت کا جائزہ لینا شروع کیا۔ میرے ہوش و حواس بالکل قائم تھے لیکن اس کے فوراً ہی بعد مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرا شعور کسی دوسرے شعور سے الگ ہو رہا ہے اور وہ دوسرا شعور بھی میں خود ہی تھا۔

"رفتہ رفتہ مجھے اس بات کا احساس ہونا شروع ہوا کہ میں نہ صرف اپنے جسم اور اُس چارپائی کو دیکھ رہا ہوں جس پر وہ پڑا ہے بلکہ تمام گھر اور ... بھی مجھے نظر آ رہا ہے اور اب مجھے معلوم ہوا کہ میں نہ صرف ... سکتا تھا بلکہ لندن اور سکاٹلینڈ اور جہاں کہیں بھی میری ...

...مجھے نظر آ رہی تھی۔ اس کی توجیہہ یوں کی گئی کہ ...

...شبیہ جواب ...۔ وہ تین ابعاد ...

یہاں" کے مترادف ہے۔

"پھر آہستہ آہستہ میں لوگوں کی شکلیں پہچاننے لگا۔

"جوں ہی کہ میں یہ سب کچھ سمجھنے کے قابل ہوا میں نے دیکھا کہ "الف" میرے سونے کے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نظارے سے اسے سخت صدمہ ہوا ہے وہ ٹیلیفون کے آلے کی طرف دوڑی۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر اپنے تمام مریضوں کو چھوڑ چھاڑ کے دوڑا تھا۔ میں نے اُسے کہتے ہوئے سنا یا شاید سوچتے ہوئے دیکھا کہ یہ تو قریباً مر چکا ہے، میں نے اسے صاف آواز میں اپنے بستر کے جسم سے باتیں کرتے ہوئے سنا۔ میرا تعلق جسم سے قائم نہ تھا اس لئے میں اسے کوئی جواب نہ دے سکا۔

مجھے ڈاکٹر پر غصہ آیا جب میں نے اسے پچکاری سے کر کوئی دوا جسم میں داخل کرتے ہوئے دیکھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دوا کافور تھی۔ جوں ہی قلب کی حرکت شروع ہوئی میں واپس جسم کی طرف کھینچنے لگا مجھے انتہا رنج ہوا کیونکہ اس نئی کیفیت سے بدرجہ غایت دلچسپ معلوم ہو رہی تھی اور جو کچھ میں دیکھ رہا تھا، اس کا ادراک ابھی شروع ہی ہوا

اور میرے …
اس کے سا… میں واصل تو ہوگیا لیکن فرط رنج سے میرا برا حال تھا
ہوئی … داخل ہوتے ہی میری تمام بینائی بھی رخصت ہوگئی اور
…ھ ہی ہر شے پوشیدہ ہوگئی۔ حواس و شعور میں ذرا سی بیداری
لیکن درد کی شدت نے بے تاب کر دیا"

سر اَن لینڈ جانز نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس بات کا
یقین ہے کہ یہ بیان جھوٹا نہیں ہے۔ لیکن … خواب ہو یا رویا کے
…ی چیز ہے ہم اس کے ذریعے سے ایسی چیزوں کا تصور ضرور کر
سکتے ہیں جو عام حالت میں ہمارے ادراک سے بالاتر ہیں
موت آہستہ آہستہ زندگی پر غلبہ پاتی ہے۔ زندگی …
کچھ … ایسی بے وقعت شے نہیں ہے کہ اسے آسانی سے
… وہ لوگ جو مر چکے ہیں اور اپنے تاثرات ہمارے …

مرحوم سر الیگزنڈر اگسٹن کے، سی، او، بی، … اسکاٹ لینڈ کے
طبیب اپنی کتاب "یادداشت ہائے جنگ ثلاثہ" میں اس بیان کی تائید
…

سر الگزنڈر کو جنوبی افریقہ کی آخری جنگ میں میعادی بخار ہوگیا تھا
… ایک ایسی مستقل بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا جس میں امید
غشی کی حالت میں دن اور رات میں تفریق کرنا … لئے نا
… تک جاتا رہا تھا۔ ذہن اور جسم دو علیحدہ علیحدہ چیزیں معلوم
… معلوم ہوتا تھا کہ جسم معطل اور بے ترتیب ڈھیر کی صورت میں
… کے نزدیک پڑا ہے۔ یہ جسم … ہی تھا لیکن میں خود …

… محسوس ہوتا تھا کہ میری ذہنی ذات اکثر جسم سے علیحدہ
… ہمیشہ ایک نرم اور سیاہ رنگ کی چیز اس کے بائیں ہاتھ
… معلوم نہیں کہ وہ کیا چیز تھی لیکن اسے ساتھ لئے پھرنا
… سی فضا میں سورج، چاند اور ستاروں سے بہی
… پھرتا تھا ہمیشہ ایک ہی سمت میں اور آگے
… لیکن مسرت زا قندیل کی طرف … دور افق میں نظر
… چپکے سے میرے پاس سے گزر جاتے
… احساس ہوتا کہ گوشت اور پوست کے اس

…ے کے نزدیک
سرو ڈھیر کو کوئی چھیڑ رہا ہے جو میرا جسم ہے اور جو درواز…
…در نہایت
پڑا ہے۔ اس وقت میں بے اختیارانہ اس کی طرف کھنچ جاتا
…ہو جاتا
… دلی سے اس کے ساتھ واصل ہوجاتا۔ چنانچہ وہ جسم پھر میں "بر"
جس سے لوگ بولتے چالتے تھے اور جب پھر جسم کو چھوڑتا تو پہلے کی طرح پھر
دور چلا جاتا۔ نرم پر سکون اور دھندلی فضا میں سدا بہار پھولوں کے
خاموش تختوں پر سے ہوتے ہوئے۔ روشنی اور تاریکی کے امتیاز سے
بیگانہ … جانتا تھا کہ میرے سر پر موت منڈلا رہی ہے لیکن
… کا کوئی خیال یا موت کا کوئی خوف مجھ پر طاری نہ تھا۔ میں اسی طرح
پھرتا تھا یہاں تک …
… اس وقت تک کے تجربات ان کی …

… سے چلے جاتے ہیں۔ جب سے …
انہوں نے کسی کو کہتے سنا "اب یہ بچ جائے گا" … دوبارہ جسم سے پیوست ہوگئی اور
اس کے فوراً ہی بعد دو الگ الگ ذاتوں کا احساس ان سے
جاتا رہا۔ اس کے بعد آپ لکھتے ہیں:-

"اس حالت میں ایک عجیب و غریب احساس یہ بھی ہوتا تھا کہ میں مکان
کی دیواروں کے آر پار دیکھ سکتا ہوں حالانکہ میں اس بات کو اچھی طرح
جانتا تھا کہ نگاہوں کے درمیان دیواریں حائل ہیں۔ مثلاً میں نے صاف
طور پر دیکھا کہ ایک ڈاکٹر جو ہسپتال کے ایک دور کے حصے میں تھا
یکایک بیمار ہو کر مر گیا۔ ہسپتال والوں نے لاش کو کپڑے سے ڈھانپ
دیا اور پھر چند آدمی برہنہ پا ہو کر اسے چپکے سے اٹھا کر باہر لے گئے تاکہ دوسرے
بیماروں کو اس کی موت سے صدمہ نہ ہو اور پھر میرا خیال ہے کہ اگلی رات
اُسے دفن کر دیا گیا۔

"اس واقعے کے کچھ عرصہ بعد جب میں نے یہ تمام واقعہ نرسوں کو
سنایا تو انہوں نے میرے بیان کی حرف بحرف تائید کی"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موت ہماری زندگی کے تمام تجربات
میں سے عجیب ترین اور دلچسپ ترین تجربہ ثابت ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ
ہم … اسے خوف زدہ نہ ہوں۔
ان تمام … کے تاثرات کو …

آئینۂ عالم

اچھی طرح استعمال
اس ریڈیو کے
باندھ دیتا ہوں
ہے

سے لئے واپس آتے
کیا جا سکتا۔ ہر شخص
کو شیشے ...
پائے

...ب۔ احساسات کی اتفاقی یکسانیت پر محمول نہیں
...س اطمینان اور سکون کا احساس کرتا ہے ہر شخص اشیاء
...ن طرح شفاف بیان کرتا ہے اور ہر شخص جسم سے ایک دفعہ مخلصی
...ے بعد واپس آنا نہیں چاہتا۔ چنانچہ اس شہادت کے مطابق موت
...وئی غیر خوش آیند چیز نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف جب ہماری باری
آئے تو ہمیں موت کو سب سے بڑا اور دلچسپ ترین تجربہ سمجھ کر اس سے
ہمکنار ہونا چاہئے۔

میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ اس لئے ... مستقبل کو ...
... سکتا۔ اس کے بجائے میں ایک پٹی جس کا تعلق
... سوئی کو سینے پر اس کے دل کے مقابل
اس کے دل کی حرکت ... اس پٹی میں سے گزر کر آواز صوت کے ذریعہ
مجھ تک پہنچتی رہتی ہیں ... کے ساتھ گفتگو میں مشغول رہتا ہوں۔
جب حرکات ... زیادہ بڑھ جاتی ہیں تو مجھے معلوم ہو جاتا ہے
... گفتگو کس پہلو پر جاری رکھنا چاہئے۔ اس طرح اس مشین کی مدد سے میں
...س کرتا رہتا ہوں اور معلوم کر لیتا ہوں کہ ...
...ا کہاں سے ہوئی۔

انکشاف

... کے بلند کر ... جو حرکت قلب کی آواز کو جذب ...
... کی پوشیدہ پریشانیوں ...

...ذہنی استعداد کے مطابق اسے بہترین مشورہ دیتا ہوں۔
...ی مذہبی پیشوا اسے خدا پر بھروسہ کرنے کا مشورہ
...کرنے اور ...
...ے مرض کی جڑ تک پہنچ جاتا ہوں۔ جو شاید اس کی ... کے دنوں
خاص واقعہ ... ختم ہوتی ہے اور ہم دونوں اسے کاٹنے میں مش...
ہو جاتے ہیں۔
میرے مریض اپنے پوشیدہ ترین راز مجھ سے بلا کم و کاست بیان
کر دیتے ہیں۔ وہ مجھ سے خوف نہیں کھاتے۔
میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ میں لندن میں ایک
مرکز قائم کروں جس میں تین قسم کے "حکیم" ہوں طبی۔ ذہنی اور روحانی۔
میرے خیال میں صرف یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے نوع
انسانی ... بدنی اور روحانی نقطہ نظر سے تندرست رہ سکتی ہے۔
پادری کا فرض صرف انجیل کے ابواب سنانا ہے۔ بلکہ
ذہنی پریشانیوں کو دور کرنا بھی اس کے فرائض میں ہے۔

...ن رسمی بہانے سے مسرت لوگوں سے کنارہ کش ہو جاتی
ہے۔ وہ اپنی اپنی مشکلات کو لے کر میرے پاس آتے ہیں عموماً یہ مشکلات
محبت۔ روپے۔ یا کاروبار کے متعلق ہوتی ہیں۔
اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان کے اور اطمینان قلب کے درمیان
کوئی نہ کوئی خود ساختہ الجھن ایک پردہ سا حائل کر دیتی ہے۔ انہیں خود
اس بات کا علم تک نہیں ہوتا کہ یہ الجھن کیسے پڑ گئی ہے۔ میں ان سے کہتا
ہوں کہ وہ اپنی مشکلات من و عن بغیر کچھ چھپائے میرے روبرو بیان
کر دیں۔ یکایک میرے سوئی کی حرکت قلب تیز ہو جاتی ہے پس مجھے معلوم
ہو جاتا ہے کہ اس الجھن کی جڑ کہاں ہے

9/5/80

رباعی

... ہر بات کی رات
... جب آج ہو رات کی رات
... چلے جاؤ ... پہلو سے تم
... ہم ... قیامت کی رات

سعادت احمد

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ جولائی ۱۹۳۷ء

جلد ۱۵ — تصویر: جانِ نغمہ — نمبر ۹

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا ... لاہور سے شائع ہوا۔

دی نیو بنک لمیٹڈ، ۱۴۔ دی مال لاہور

ہندوستان کی بنکنگ کی دنیا میں اس بنک کے آغاز کا سہرا پنجاب کے مشہور ماہر اقتصادیات و بنکنگ جناب ایم۔ آر کوہلی صاحب ایم۔ اے (نیاد انسٹی ٹیوٹ آف بنکرز لندن) کے سر ہے۔ آپ مدت دراز تک پنجاب نیشنل بنک کے سکرٹری کے عہدے پر فائز رہے ہیں۔ دی نیو بنک لمیٹڈ کا منظور شدہ سرمایہ دس لاکھ ہے اور قابل تعریف یہ بات ہے کہ سارے کا سارا جاری شدہ سرمایہ تین لاکھ پچاس ہزار چند ہی دنوں میں فروخت ہو گیا سیونگ بنک اکاؤنٹس پر دیگر سہولتوں کے ساتھ شرح سود تین فی صدی سالانہ ہے اور سال بھر کے لئے فکسڈ ڈیپازٹ پر چار فیصدی سود دیا جاتا ہے۔

آغاز ہی میں بنک کا لین دین۔ اس کی ساکھ۔ قرضہ جات اور ڈرافٹ کے متعلق آسانیاں اور دیگر سہولتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم کوہلی صاحب کے اس کارنامے کو پنجاب کی اقتصادی بہتری کے لئے قابل تعریف اقدام سمجھتے ہوئے تمام ناظرین "ادبی دنیا" سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ بنکنگ کے کاروبار کے متعلق دی نیو بنک لمیٹڈ۔ ۱۴۔ دی مال لاہور سے ضرور تعلقات پیدا کریں۔

دو نوحے

عزیز منصور احمد مرحوم میری اہلیہ ح۔ب مدیرۂ نسوانی دنیا کے ماموں زاد بھائی تھے۔ ح۔ب نے انہیں اپنی گود میں کھلایا تھا اور انہیں وہ اپنے بچوں کی طرح عزیز تھے۔

عنایت اللہ خاں

(۱)

میں دردِ دل سنانے کے قابل نہیں رہا — جس دل میں صبر و ضبط تھا وہ دل نہیں رہا

جس کی ضیائے رخ سے تھی شب روکشِ سحر — واحسرتا کہ وہ مہِ کامل نہیں رہا

بزمِ ادب پہ چھائی ہے افسردگی کہ آج — وہ بے بدل ادیب وہ فاضل نہیں رہا

تاریک سر بسر ہیں اعزّہ کی محفلیں — وہ نورِ عین رونقِ محفل نہیں رہا

برباد والدین کو رونے دے اے ندیم — ان بے کسوں کی عمر کا حاصل نہیں رہا

"وہ قطرہ آہ قلزمِ پنہاں میں جا چھپا" — پردہ جو درمیاں تھا وہ حائل نہیں رہا

وہ پھول باغِ دہر میں دم بھر کھلا تو کیا — اک لمحہ گلستاں میں جو خنداں رہا تو کیا

اُس کی تجلیوں نے بسانِ چراغِ صبح — اک لحظہ کائنات کو روشن کیا تو کیا

جانے پہ اس کے روئیں گے تا زیست اشکِ خوں — آنے پہ اُس کے شورِ مسرّت ہوا تو کیا

اُس کی مفارقت سے ہے تاریک اپنا گھر — داغِ جگر نے اس کو منوّر کیا تو کیا

اہلِ چمن سے روٹھ کے بلبل چلا گیا — اب کوئی تازہ پھول چمن میں کھلا تو کیا

کچھ چل بسے تھا خاطرِ احباب کا خیال تھی ناپسند دہر کی آب و ہوا تو کیا

عنایت اللہ خاں

(۲)

سینہ ہے چاک دل میں ہیں ناسور ہائے ہائے
خاموش آج ہو گیا منصور ہائے ہائے

شانِ چمن تھے بلبلِ بستاں سرا تھے تم
جاتے ہو صحنِ باغ سے کیوں دور ہائے ہائے

بزمِ ادب خموش سی آتی ہے کیوں نظر
کیا بس ہے اخوش بیانیٔ منصور ہائے ہائے

کس مہرِ نیم روز نے چہرہ چھپا لیا
مہتاب اور نجوم ہیں بے نور ہائے ہائے

میں آؤں اور بات بھی پوچھو نہ تم مری
کب تم کو تھا پسند یہ دستور ہائے ہائے

ہم چیختے ہیں روتے ہیں کھوتے ہیں جان کو
اور تم خموشیوں پہ ہو مجبور ہائے ہائے

لب پر کوئی پیام نہ منہ سے کلام ہے
کچھ خیریت کا ذکر نہ مذکور ہائے ہائے

ماں باپ پر قیامت کبریٰ بپا ہے آج
یادِ غم و الم سے ہیں دل چور ہائے ہائے

منصور خوش خرام تھا جس سیرگاہ میں
اُس سے چلا ہے لاشۂ منصور ہائے ہائے

انسان ہے نصیب سے مجبور ورنہ یاں
کب تاب تھی وہ ہم سے ہو مستور ہائے ہائے

ماموں کے گھر میں آج یہ کیسی ہیں ظلمتیں
پنہاں ہے شمعِ چہرۂ منصور ہائے ہائے

"ح۔ب"

منصور مرحوم سے

تو پھر زندہ ہو اے منصور ایسا ہو نہیں سکتا
کسی سے ہائے یہ کارِ مسیحا ہو نہیں سکتا

تجھے اے مرنے والے اس لئے روتا ہوں رہ رہ کر
کہ اخلاص و وفا میں کوئی تجھ سا ہو نہیں سکتا

دلِ بے تاب کی تسکیں نہیں ہوتی نہیں ہوتی
ترے دیدار کا ارمان پورا ہو نہیں سکتا

بہر صورت، بہر حالت، بہر شیوہ تو میرا تھا
غلط ہے کوئی دنیا میں کسی کا ہو نہیں سکتا

مجھے اب کون سمجھائے، مجھے کس طرح صبر آئے
کہ ہو سکتا ہے ایسا اور ایسا ہو نہیں سکتا

مرے گھر میں کبھی نورِ مسرت آئے ناممکن
مرے گھر میں کبھی اب تیرا آنا ہو نہیں سکتا

غمِ ہجر اور ہجرِ دائمی، پھر ہجر بھی تیرا
میں صابر ہی سہی پر صبر اتنا ہو نہیں سکتا

مجھے کیوں ہے ترے دیدار سے امروز محرومی
کہ پر آشوب تر اس سے تو فردا ہو نہیں سکتا

الٰہی کل جو آنی ہے قیامت آج آ جائے
قیامت تک کروں میں صبر اتنا ہو نہیں سکتا

قیامت تک ترے دیدار کا امکاں نہیں کوئی
قیامت تک دلِ اکبر شکیبا ہو نہیں سکتا

جلال الدین اکبر

یادِ منصور

(۱)

اب ضبطِ غم کی خاک ہو تدبیر ہائے ہائے
زک دے رہی ہے عقل کو تقدیر ہائے ہائے

آنکھوں میں کھنچ کے آ گیا خونِ جگر تمام
کھنچنے لگی ہے درد کی تصویر ہائے ہائے

منصورِ بے مثال کی رحلت کا ذکر ہے
عاجز ہے جس کے وصف سے تقریر ہائے ہائے

احباب کا خیال تھا اُس کو بہت ، مگر
منظور تھی قضا کو نہ تاخیر ہائے ہائے

مٹی میں آہ مل گیا منصور کا شباب
یہ تُو نے کیا کیا فلکِ پیر ہائے ہائے

گنجینۂ متاعِ محبت جو سینہ تھا
اُس سینے میں اجل کا لگا تیر ہائے ہائے

(۲)

اک چاند تھا کہ چھپ گیا ابرِ سیاہ میں
دنیا سیاہ ہو گئی اپنی نگاہ میں

اے اہلِ دل مآلِ محبت کا دیکھنا
ہم قیدِ رنج و غم میں ہیں وہ خوابگاہ میں

ہمت تھی اس کی رفعتِ گردوں پہ خندہ زن
گو تھا اسیر رشتۂ شام و پگاہ میں

منصورِ بے مثال کو کس سے مثال دیں
دنیا میں اک ملک تھا کہ یوسف تھا چاہ میں

وہ تھا جہاں میں آنکھ میں ہو جس طرح نگاہ
یا جیسے کوئی حسن کا پیکر نگاہ میں

وہ تھا تو ذکرِ عشق و محبت میں تھا مزا
اب وہ نہیں تو لطف نہیں ہے نباہ میں

عطاء اللہ کلیم

کیا جنگ نوعِ انسان کے لئے لعنت ہے؟

(ایڈیٹر کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں)

انسان بھی عجیب واعظ ہے۔ کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے جو بات اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ وہ دوسروں کو کرتے نہیں دیکھ سکتا۔ مسئلہ جنگ کو ہی لیجئے اس کے خلاف کس قدر پروپیگنڈا کیا جاتا ہے مگر جانتے بوجھتے ہوئے بھی ہر آدمی مصروفِ پیکار ہے اور اپنی ہستی کی بقا کے لئے دوسروں کو مٹانے سے دریغ نہیں کرتا۔ تاجر منڈی کا مالک بننے، سپاہی اپنی جرأت کا اظہار کرنے، عالم اپنی فضیلت کا لوہا منوانے، سیاست دان جمہور پر اپنا سکہ بٹھلانے اور زاہد اپنے زہد و ورع کی نمائش کرنے کے لئے عرصہ کارزار میں جد و جہد کر رہے ہیں۔ یہی حالت اقوامِ عالم کی ہے۔ دولِ عظمیٰ کے دندان آز چھوٹی ریاستوں کے نگلنے کے لئے تیز ہیں اور دولِ صغیرہ قبائل کی ہستی اپنے اندر جذب کرنے میں مصروف ہیں حتیٰ کہ قبائل بھی چھوٹے خاندانوں کے وجود کو فنا کرنے پر مستعد رہتے ہیں۔ غرضکہ انسان بحیثیت فرد یا قوم جنگ میں مصروف ہے اور اسی کا نام اس نے جہد للبقا رکھ چھوڑا ہے۔ باوجود اس کے "جنگ نوعِ انسان کے لئے ایک لعنت ہے" "جنگ دردِ وحشت کی یادگار ہے" "جنگ کو ختم کر دینا چاہیئے" کا وعظ شد و مد سے کیا جاتا ہے سچ ہے ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آن کارِ دیگر می کنند

حقیقت یہ ہے کہ انسان جنگ و جدل پر مجبور رہے اور جس طرح فرد کے لئے ناممکن ہے کہ دوسروں کی ہستی مٹائے بغیر اپنی ہستی قائم رکھ سکے۔ اسی طرح اقوام بھی اپنی شوکت کے قیام کے لئے دوسروں کی آزادی سلب کرنے پر مجبور رہیں۔ جنگِ عظیم انہی مجبوریوں کا نتیجہ تھی۔ جرمنی کو اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے مزید نوآبادیوں کی ضرورت تھی اس لئے جنگ کے آتشیں کھیل میں شریک ہوا۔ فرانس برطانیہ اور روس اس کے حلیف جرمنی کی استعمارانہ ہوس کو اپنے لئے موت سمجھتے تھے پس وہ مقابلہ میں تن گئے۔ اب اس میں جرمنی اور اس کے مددگاروں یا فریقِ مخالف کا کیا قصور تھا؟ کہا جائے گا کہ اس شغل سے جرمنی کو کیا حاصل ہوا۔ بلاشبہ جرمنی سخت خسارے میں رہا۔ وہ مٹ گیا۔ مگر وہ تو بنایا مٹنا ہی چاہتا تھا۔ اگر کامیاب ہو جاتا تو اس کی چاندی تھی اور ناکامی کی صورت میں اس کی زاید آبادی جنگ کی نذر ہو کر باقی آبادی کی بسر اوقات کے لئے گنجائش چھوڑ گئی اور بس یہی جرمنی چاہتا تھا۔ مسئلہ حبش کو لیجئے اٹلی نے مجبوراً حبشہ پر حملہ کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے بچے فاقہ کشی کر کے کتوں کی موت مریں۔ اس نے ایک کمزور ریاست پر حملہ کر دیا۔ اگرچہ واعظانِ خود بیں اس کے خلاف تعزیرات کے نفاذ کی دھمکی دیتے رہے اس کا خیال تھا کہ اگر کامیابی کی دیوی نے قدم چومے تو اٹلی پھر طاقتور روم بن جائے گا اور شکست کی صورت میں اٹلی کے فرزند نہنگِ اجل کا شکار ہو کر اپنے بھائیوں کے لئے خود اٹلی میں ہی کافی جگہ چھوڑ جائیں گے یہی کچھ جاپان کر رہا ہے اس لئے جرمنی جاپان اور اٹلی کو مطعون کرنا صحیح نہیں ہے۔ خود برطانیہ یہی کچھ کر رہا ہے بلکہ ہر حکومت اسی حکمتِ عملی پر عمل پیرا ہے۔ کوئی توسیعِ سلطنت چاہتی ہے تو کوئی موجودہ حدودِ سلطنت کو قائم رکھنا چاہتی ہے اور یہ صرف آج کل ہی نہیں ہو رہا بلکہ جب سے دنیا بنی ہے یہی نظریہ محورِ عمل سمجھا جاتا ہے۔ ہابیل قابیل سے لے کر دورِ جدید تک ہزاروں لڑائیاں ہوئی ہیں۔ لاکھوں سلطنتیں بنی اور مٹی ہیں اور کروڑ در کروڑ نفوس لقمۂ جنگ ہوئے ہیں۔ اگر اُن مقتولینِ جنگ کا خون ایک جگہ جمع ہو جائے اور دریا کی شکل میں بہے تو غالباً خون کی گنگا برسوں تک بہہ سکتی ہے۔ الغرض جنگ کا سلسلہ انسانی تاریخِ ارتقا کے ساتھ ساتھ ہی شروع ہوتا ہے۔ خدا کے بندے اور شیطنت کے پرستار شروع ہی سے نبرد آزما رہے ہیں۔ جنگ کا مقصد ہوا و ہوس ہو یا اشاعتِ حق اس امر کے تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ جب تک دنیا میں انسان اشرفِ خلائق ہے اس وقت تک جنگ ناگزیر ہے۔

اگرچہ جنگ کے نتائج و عواقب بہت تلخ ہیں۔ قصرِ جنگ کے لئے انسانی نعشیں بمنزلہ سنگ و خشت ہیں اس میں انسانی لہو کی ارزانی ہوتی ہے حق و انصاف کا بسا اوقات خون ہوتا ہے گناہ گاروں کے ساتھ بے گناہ

لوگوں کے کام و دہن کو تلخی موت سے لذت آشنا ہونا پڑتا ہے لاکھوں
نوجوان عورتوں کے محبوب ان سے ہمیشہ کے لئے چھن جاتے ہیں کروڑوں
بچے یتیم بن جاتے ہیں۔ اربوں روپے اس شغل خونی میں صرف ہوتے ہیں
ملکوں کی آزادی خواب موہوم بن کے رہ جاتی ہے ہسپتال زخمیوں سے بھر
جاتے ہیں کساد بازاری کا دور دورہ ہو جاتا ہے بستیاں اجڑ جاتی ہیں گلستان
بیابانوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور عالی شان محلوں کی جگہ کھنڈر نظر آتے
ہیں۔ مگر تصویر کے اس تاریک رخ کا ایک روشن پہلو بھی ہے اور وہ یہ
کہ جنگ اپنے ساتھ ہزاروں برکات بھی لاتی ہے۔ انسانی فطرت صرف
خسارے کے سودے پر راضی نہیں رہتی وہ اپنا نفع پہلے دیکھتی ہے
جنگ کے فوائد سے متمتع ہونے کے لئے ہی انسان جنگ کے شعلوں میں
کودتا ہے۔ آئیے آج کی صحبت میں جنگ کے چند فوائد پر بھی نظر
ڈال لیں۔

(الف) طاعون قحط اور دیگر وباؤں سے سسک سسک کر اور ایڑیاں رگڑ
رگڑ کر مرنا مردانہ موت نہیں ہے اس لئے بڑھتی ہوئی آبادی کو بھوک
کی موت یا زلزلوں اور دیگر ارضی و سماوی آفات سے بچانے کے
لئے انسان نے اپنے نخل حیات کو قطع کرنے کا یہ سہل طریقہ اختیار
کر رکھا ہے اور اس میں وہ حق بجانب ہے۔ کیونکہ قدرت نے
لاتعداد بیماریاں پیدا کر کے انسان کو صد درجہ مجبور بنا رکھا تھا۔

(ب) زندگی وقار کا نام ہے۔ اس لئے دنیا کی ہر قوم کو یہ حق حاصل ہے
کہ وہ باوقار زندگی بسر کرنے کے لئے اپنے راستے سے کانٹے ہٹا
دے اور دنیا کی تمام اقوام اسی نظریے کی پرستار ہیں۔ برطانیہ اٹلی کو
حبشہ پر حملہ کرنے کی وجہ سے برا کہتا ہے مگر حق یہ ہے کہ اس نے
خود حبشہ جیسے کئی ممالک زیر نگیں کر رکھے ہیں۔ فرانس جرمنی کے
رائن لینڈ میں اقدام کو ناانصافی سمجھتا ہے مگر وہ اس بات کو کیوں
بھول جاتا ہے کہ اس نے خود کتنے ممالک پر قبضہ جما رکھا ہے۔
ہندوستان، فلسطین اور حبشہ کے مصائب پر آٹھ آٹھ آنسو روتا
ہے مگر خود اس نے اپنی آبادی کے تیرہ کروڑ نفوس کو "نا[illegible]"
کے حربے سے اپاہج بنا رکھا ہے جب جمہوریت نواز امریکہ اپنے
دیسی باشندوں پر انسانیت سوز مظالم کرتے ہوئے نہیں شرماتا تو
اس کا دوسروں کو رشد و ہدایت کا شربت تلخ پلانا کہاں تک
جائز ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر قوم صرف اپنا اقتدار چاہتی ہے

خواہ دوسروں کی ہستی کو فنا کیوں نہ کرنا پڑے اس لئے ہمیں حق حاصل
نہیں کہ جن امور کو خود جائز سمجھتے ہیں۔ ان کے لئے دوسروں کو گشتنی
و گردن زدنی قرار دیں۔

(ج) جنگ صرف تخریب کا نام نہیں ہے بلکہ جنگ نے ہزاروں افراد کو
بنایا بھی ہے۔ جنگ عظیم سے پہلے جو لوگ عسرت کی زندگی بسر
کرتے تھے اور جن کو ایک وقت کا کھانا نہیں ملتا تھا آج وہ عالیشان
بنگلوں میں رہتے اور شاندار موٹروں کی سواری کا لطف اٹھاتے
ہیں۔ پنجاب کے ہر گاؤں میں ایسے پنشنر فوجی افسر موجود ہیں۔
جن کے والدین بھیک مانگتے تھے یا مزدوری کر کے اپنا اور اپنے
بال بچوں کا پیٹ پالتے تھے اور اس منظر سے موجودہ نسل اس قدر
متاثر ہے کہ وہ آیندہ جنگ کی بے تابی سے انتظار کر رہی ہے اور
فوج میں بھرتی ہونے پر مستعد ہے یہ سب کچھ صرف اس امید پہ کہ
شاید ہم بھی ان لوگوں کی طرح دولت و عزت حاصل کر سکیں۔

(د) جنگ صرف فاتح قوم کے لئے مفید ثابت نہیں ہوتی بلکہ مفتوح اقوام
کی بیداری کا ذریعہ بھی ہے۔ جنگ عظیم سے پہلے ہندوستان پر
خواب مرگ طاری تھا۔ مگر اس جنگ نے ہندوستانیوں کی آنکھیں
کھول دی ہیں۔ اب وہ آزادی کے لئے ہر ممکن سعی کر رہے ہیں ترکی
کے جسد بے جان کو شکست نے نئی زندگی بخشی ہے حبش کی جنگ
مصر کے لئے آزادی کا دیباچہ ثابت ہوئی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ
کو جنگ نے آزادی دلائی تھی۔ الغرض جنگ نے بیشتر اقوام کو آزادی
کی نعمت سے فیض یاب کیا ہے۔

اس لئے جنگ کو صرف نوع انسانی کا قاتل قرار دینا حقایق سے چشم پوشی
کرنا ہے۔ البتہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر جنگ بنی نوع انسان کے لئے مفید ہے
تو پھر امن کے پیامبر امن امن کی رٹ کیوں لگا رہے ہیں۔ اس کا جواب روز روشن
کی طرح عیاں ہے۔ جنگ سے پہلو تہی کرنے والی وہی اقوام ہیں جو سونا اگلنے
والے خطوں کی مالک ہیں جن کو جنگ میں اب صرف خسارہ ہی خسارہ ہے۔
برطانیہ دنیا کے ایک تہائی حصے کا مالک ہے۔ فرانس تقریباً نصف افریقہ پر
قابض ہے اب بتائیے کہ فرانس اور برطانیہ جنگ کے خلاف پروپیگنڈا کیوں نہ
کریں جبکہ ان کے بچوں کے عیش و تنعم کے لئے دولت کے خزانے ان کے
گھروں میں موجود ہیں۔ چنانچہ بزدل اقوام کو بھی ان بزرگوں نے اپنی حکمت عملی
سے فریب دے رکھا ہے اور یہ فریب خوردہ قومیں ان کی ہمنوا بن گئی ہیں

مگر وہ بساطِ سیاست کے جادہ مہرے ہیں جو رازِ حیات سے آشنا نہیں۔ جنگ کے خلاف مظاہرہ کرنا خود کو موت کے منہ میں دینے کے مترادف ہے مشرق کا سب سے بڑا فلسفی شاعر کہتا ہے۔

میارا آ بزم بر ساحل کہ آنجا نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و باموجش درآویز حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

یعنی ساحل پر بزم آراستہ نہ کر کہ وہاں زندگی کی لے دھیمی ہے دریا میں کود اور اس کی موجوں سے اُلجھ کیونکہ دائمی زندگی جنگ و جدال میں ہے۔ وہ ہم میں سے ہر ایک کو شاہین صفت دیکھنا چاہتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اقوام و ملل کی زندگی کے لئے جنگ ناگزیر ہے۔ جنگ سے قوم کے فرسودہ اعضا و جوارح قطع ہو جاتے ہیں اس کو اپنے نقائص معلوم ہو جاتے ہیں اور وہ اُن کے استیصال کے لئے ہر ممکن کوشش کرتی ہے ایک قدیم مشرقی کہانی میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک شیر کے بچے نے مدتوں تک بھیڑوں میں پرورش پائی۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو بھیڑ سمجھتا رہا۔ وہ کتوں اور بھیڑیوں کو دیکھ کر بھاگ جایا کرتا تھا۔ آخر ایک دن شیر کی گرج سن کر اس کی نیم مردہ روح بیدار ہو گئی اور وہ از سرِ نو شیر بن گیا۔ اب وہ کتوں اور بھیڑیوں سے پناہ چاہنے والی بھیڑ نہ تھی بلکہ کتوں اور بھیڑیوں کی پشت پناہی کرنے والا شیر تھا۔ یہی کیفیت غلام قوم کی ہوتی ہے جو غلامی میں رہ کر اپنے فطری عادات و خصائل کو فراموش کر دیتی ہے۔ اپنے اندر سوتے ہوئے شیر کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتی۔ اپنے آپ کو غلامی کا سزاوار سمجھتی ہے اور اسے قدرت کا منشا قرار دیتی ہے۔ کیونکہ اس کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ بزدلی اس کا طرہ امتیاز بن جاتی ہے اور میدان جنگ اس کو پیامِ مرگ نظر آتا ہے۔ اس کے افراد تساہل پسند اور آرام طلب ہو جاتے ہیں وہ آسانی سے روزی کمانا ہی مقصدِ حیات سمجھتے ہیں۔ کسی کی سرپرستی کے اس حد تک خوگر ہو جاتے ہیں کہ ذمہ داری کے فرائض سے کتراتے ہیں آخر ایسی روباہ خصلت قوم کا وجود مٹ جاتا ہے یعنی دنیا میں اس کی موجودگی عدم موجودگی برابر ہوتی ہے کیونکہ ان کی جمعیت سے کسی کو ڈر نہیں لگتا۔ ہندوستان کے اچھوت کئی کروڑ ہیں مگر وہ چند ہزار کے قبیلہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی فطرت بھی مسخ ہو چکی ہے وہ اپنی پیدائش کی غرض ہی اونچی جاتی کے ہندوؤں کی خدمت کرنا سمجھتے ہیں برہمنوں نے اپنے علم و دانش سے اپنے اور اُن کے درمیان ایسی کڑی مذہبی دیوار حائل کر رکھی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بندی کے خواب" کا سزاوار ہی نہیں سمجھتے۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر امبیدکار جیسے مردِ میدان ان میں پیدا ہو گئے ہیں جن کی ایک ہی دعوتِ مبارزت نے اونچی جاتیوں میں کھلبلی مچا دی ہے۔ یہی حال آرام وہ کام کرنے والی اقوام کا ہے۔ یہودی دنیا کی متمول ترین قوم ہے۔ مگر دائمی غلامی کی مہر اس کی جبیں پر لگ چکی ہے۔

پس اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فرد ہو یا قوم اُس کو عزت و اقبال کی زندگی بسر کرنے کے لئے نسخہ جنگ کا استعمال کرنا ضروری ہے۔ اس سے میرا یہ مدعا نہیں کہ انسان اپنی بہیمیت کو بالکل بے نقاب کر کے دنیا کو میدانِ جنگ بنا لے۔ ہر وقت جنگ و جدل میں مصروف رہے اور انسانی خون کی اشتہا اُسے ہمیشہ بے قرار رکھے کیونکہ جنگ کا یہ پہلو بہت مہلک ہے مگر امن کے حصول کے لئے بڑی اقوام کو بھی اپنی فطرت میں تبدیلی کرنی چاہیئے۔ جب تک ابنِ آدم کا یہ امتیاز کہ ایک کی غلامی کا جوا دوسری قوم کے گلے کا ہار ہو دور نہ ہو گا امن کے ثمرات سے ہم لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ دوسروں کو غلام بنانے والی اقوام کا فرض ہے کہ اب وہ عالی حوصلگی سے کام لیں۔ غلام اقوام سے رواداری برتیں۔ نسل اور وطن کے بُت کو توڑ کر اخوت کی دیوی کے پجاری بنیں۔ پس ماندہ اقوام کی کمزوریوں کو رفع کرنے کے صحیح طریقے اختیار کریں۔ ان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دیں۔ صرف یہی ایک صورت ہے جس سے جنگ کا انسداد ہو سکتا ہے۔ مگر شاید یہ ایسا خواب ہے جو ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا اس لئے جنگ کے خلاف ہمارا شور و غوغا یا جنگ کو مہلک قرار دینا بالکل بے معنی ہے۔

میر زمان خاں فائق

مہیب اندھیرے میں ارد گرد بغور دیکھنے سے اُسے ایک پرانی جھونپڑی کا ہیولا سا نظر آیا۔ اس میں کسی قسم کی روشنی نہ تھی اور نہ آگ ہی روشن تھی۔ بند دروازہ ہوا میں جھول رہا تھا۔ کہنہ دیواریں بمشکل تمام متزلزل چھت کے بوجھ کو سنبھالے کھڑی تھیں۔

"اوہ!" اس نے کہا "میں اس غریب اور بیمار بیوہ کو بھول ہی گئی تھی۔ کل ہی میں نے اسے نہایت خستہ حالت میں دیکھا۔ نہ جانے اس وقت وہ کیسی ہے۔"

جھونپڑی کے دروازے پر پہنچ کر اس نے دستک دی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ ساحلِ سمندر کی سرد ہوا میں وہ کانپ رہی تھی۔

وہ بیمار ہے۔ اُف، اس کے بچے! حالانکہ وہ صرف دو ہیں پھر بھی ان کی پرورش بیوہ اور غریب ماں کے لئے کس قدر مشکل ہے!

اس نے دوبارہ دستک دی اور پکار کر کہا "ہمسائی! سنتی ہو؟ دروازہ کھولو ہمسائی!" مگر جواب میں وہی ہیبت ناک خموشی تھی اور بس!

اس نے ایک بار اور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جو اس مرتبہ خود بخود کھل گیا اور وہ اندر داخل ہو گئی۔ اس کی لالٹین نے تاریک اور خاموش جھونپڑی کو روشن کر دیا۔ اس کی چھت متعدد مقامات سے بُری طرح ٹپک رہی تھی۔ جھونپڑی کے دوسرے سرے پر ایک عورت کا غیر متحرک جسد پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں اور سر دبازو گھاس کے بستر پہ پھیلے ہوئے تھے۔ وہ مر چکی تھی۔ کبھی وہ قوی اور خوشحال عورت ہوگی لیکن اس وقت وہ صرف ایک بے جان جسم تھی جو انسان کی دنیا کے ساتھ طویل جنگ کے بعد باقی رہ جاتا ہے۔

گھاس کے بستر کے قریب دو چھوٹے چھوٹے بچے پالنے میں پڑے خوابوں کی دنیا میں مسکرا رہے تھے۔ ان کی ماں نے شاید جب یہ محسوس کیا کہ اب اس کا دمِ واپسیں قریب ہے تو ان پر اپنی چادر ڈال دی تاکہ وہ گرم رہیں اور خود ہمیشہ کے لئے سرد ہو گئی۔

وہ اپنے بوسیدہ پالنے میں کیسی میٹھی نیند سو رہے تھے! ان کے ہلکے سانس اور ننھے ننھے چہروں سے ایک عجیب سکون اور اطمینان مترشح تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان معصوم یتیموں کو اس خوابِ خرگوش سے کوئی بیدار نہیں کر سکتا۔ باہر بارش انتہائی شدت سے ہو رہی تھی اور سمندر خطرے کے گھنٹے کی طرح فضا میں آوازیں بلند کر رہا تھا بوسیدہ چھت کے ایک سوراخ سے پانی کا ایک قطرہ لاش کے چہرے پر ٹپکا اور آنسو کی صورت میں رخسار پر بہہ گیا۔

(۳)

مردہ بیوہ کی جھونپڑی میں ماہی گیر کی بیوی کیا کرتی رہی؟ وہ اپنے دامن میں چھپا کر کیا چیز اٹھائے لئے جا رہی تھی؟ اس کا دل کیوں دھڑکنے لگا؟ وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے بہ سرعت تمام، حتیٰ کہ مڑ کر دیکھے بغیر اپنی جھونپڑی کی طرف کیوں لپکی؟ اس نے اپنی مسہری پر پردے کے پیچھے کیا چھپا دیا؟ آخر وہ کیا چیز چرا لائی؟

جب وہ اپنی جھونپڑی میں پہنچی تو سمندر کے اوپر جھکی ہوئی چٹانوں پر سفیدی آ چلی تھی۔ وہ مسہری کے قریب ایک آرام کرسی پر دراز ہو گئی۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ گویا وہ کسی جرم کے ارتکاب پر منفعل ہے۔ تکیئے پر سر رکھے وہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتی۔ جھونپڑی کے باہر وحشی سمندر سرد آہیں بھر رہا تھا۔

"میرے غریب شوہر! ــــ او خدا! ــــ نہ جانے وہ کیا کہیں گے۔ وہ خود اپنی مشکلات میں گرفتار ہیں۔ اب میں نے بیٹھے بٹھائے یہ کیا کر لیا؟ پانچ بچے ہمارے آپ ہی ہیں ان کے ابا دن رات ان کے لئے افکار میں مبتلا رہتے ہیں۔ گویا اُن کی تکالیف کم تھیں جو میں نے یہ نئی مصیبت مول لے لی۔ وہ یقیناً بہت خفا ہوں گے ــــ کیا وہ آ گئے؟ نہیں ذرا سی آہٹ سے مجھے اُن کا گمان ہوتا ہے۔ ان کی آمد سے مجھے خوف سا محسوس ہوتا ہے۔"

وہ خیالات میں کھوئی سردی سے کانپتی رہی۔ ماہی خور پرندوں کی روح فرسا چیخوں اور طوفانی ہوا کی ہیبت ناک سرسراہٹ نے اس پر کوئی اثر نہ کیا۔

یک بارگی دروازہ کھل گیا۔ صبح کی سفید روشنی کے ساتھ ماہی گیر اپنا جال گھسیٹتا اور مترنم آواز سے گنگناتا ہوا ہشاش بشاش اندر داخل ہوا۔ بے شمار مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح اس کی آواز جھونپڑی میں گونج گئی۔ ؏

آہٹ پا کر کوئی ذرا سی کہتے ہیں لو، وہ آتے ہیں!

"تم آ گئے!" ماہی گیر کی بیوی بچھڑے ہوئے دوست کی طرح اس سے لپٹ گئی اور اپنا سر اس کے سینے کے قریب بھیگی ہوئی قمیص پر رکھ دیا۔

"میں آ گیا ہوں جانِ من!" اس نے مسکرا کر کہا۔ آگ کی روشنی میں اس کے مطمئن چہرے سے نجابت ٹپکتی نظر آتی تھی۔ وہ چہرہ جسے اس کی بیوی

کتاب کے ورق کی طرح پڑھ سکتی ہے۔

"آج کا دن بہت نحس ثابت ہوا" اس نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"موسم کیسا تھا؟"

"نہایت خطرناک"

"اور شکار؟"

"بہت برا، خیر کوئی بات نہیں میں صحیح و سالم تمہارے پاس ہوں یہی میرے لئے بہت ہے۔ شکار بالکل نہ ہو سکا۔ بلکہ جال بھی پھٹ گیا معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں شیطان رقص کر رہا ہے اور موجوں پر موت کروٹ لے رہی ہے۔ ایک بار تو مجھے یقین ہو چلا تھا کہ کشتی اب ڈوب کر رہے گی لیکن میں بچ گیا کیونکہ تم جانتی ہو کہ میری جان ان بچوں میں اٹکی ہوئی ہے۔ مجھے ان کی پرورش کرنی ہے۔ بہر حال یہ تو بتاؤ کہ اس وقت تک تم کیا کرتی رہیں؟"

اس کی بیوی نے اپنے جسم میں کپکپی سی محسوس کی۔

"میں!" اس نے بمشکل کہا "نہیں کچھ نہیں۔ یوں ہی معمول کے مطابق کپڑے سیتی رہی اور طوفان زدہ سمندر کا شور سنتی رہی۔ بلکہ میں تو ڈر گئی تھی"

"ہاں، بارش کے دن بہت ہی تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو!"

ماہی گیر کی بیوی نے جھرجھری لے کر گویا وہ کسی جرم کے اقدام پہ آمادہ ہے، کہا "بیوہ ہمسائی کا انتقال ہو گیا۔ غالباً رات کے پہلے حصے میں تمہارے جانے کے بعد ہی۔ غریب دو بچے چھوڑ گئی ہے کچھ اچھے ہی نام ہیں اُن کے لڑکا گھٹنیوں چلتا ہے اور لڑکی ابھی بہت چھوٹی ہے غریب بیوہ! بے چاری نے بہت مصیبتیں جھیلیں!!"

ماہی گیر ہراساں نظر آنے لگا۔ اس نے اپنی بھیگی ہوئی ٹوپی کو ایک کونے میں پھینک کر سر کھجاتے ہوئے کہا "ہمارے آپ ہی پانچ بچے ہیں۔ اب یہ دو مل کر سات ہو جائیں گے۔ گھر کا یہ حال ہے کہ اس ناقابل برداشت موسم میں ہمیں بھوکا سونا پڑتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا نتیجہ آخر کیا ہوگا۔ اونہہ! اس میں میرا کیا قصور؟ یہ سب خدا کے کام ہیں۔ اس نے ان بیچاروں سے ان کی ماں کو کیوں چھین لیا۔ خدا کی مصلحتوں کو سمجھنا میرے لئے دشوار ہے شاید پڑھے لکھے فلسفی سمجھ سکتے ہوں۔ ننھے ننھے غریب اور لاوارث بچے!! بی بی دیکھو۔ اسی وقت جاؤ اور انہیں اٹھا لاؤ۔ جلدی کرو۔ وہ جاگ اٹھیں گے تو اپنی ماں کی لاش دیکھ کر سہم جائیں گے۔ ہم انہیں اپنے بچوں کے ساتھ پال لیں گے اور وہ بھی ان میں بھائی بہنوں کی طرح رہیں گے۔ جب خدا ہمارے بچوں کے ساتھ ان دو ننھی ننھی جانوں کا اضافہ دیکھے گا تو یقیناً ہمارے شکار میں بھی دست غیب سے اضافہ کر دے گا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں فاقوں میں بسر کر لوں گا ان کے لئے میں آئندہ دگنی محنت سے کام کروں گا۔ بس بس جلدی کرو۔ انہیں فوراً اٹھا لاؤ! تم جاتیں کیوں نہیں؟ سوچ کیا رہی ہو؟ تم تو عموماً جلد بازی سے کام کرنے کی عادی ہو، پھر یہ پس و پیش کیسا؟ جاؤ!!"

ماہی گیر کی بیوی نے مسہری پر سے پردہ سرکا دیا!

"دیکھئے!!" اس نے کہا۔

(وکٹر ہیوگو)

غلام عباس مولوی

بشر اور خدا

تری قدرت امکاں سے لا مکاں تک ہے!
مری نگاہ بھی تو آشنائے نفس ان تک ہے!
نصیب سب ہیں مرے موج نفس بھی!
مرے قفس میں ہے باد رواں تک ہے!

ابرار احمد فاروقی

ترانۂ شوق

مندرجۂ ذیل اشعار شفق محترم خان بہادر نواب احمد یار خاں صاحب دولتانہ کی ذات گرامی سے معنون کرتا ہوں کہ انہیں کا نام اس "قافیہ پیمائی" کا محرک ہوا۔

مجھے کس طرح یقیں ہو کہ بدل گیا زمانہ
وہی آہ صبحگاہی، وہی گریۂ شبانہ

تب و تاب یک نفس تھا غم مستعار ہستی
غم عشق نے عطا کی مجھے عمر جاودانہ

کوئی بات ہے ستمگر کہ میں جی رہا ہوں اب تک
تری یاد بن گئی ہے مری زیست کا بہانہ

میں ہوں اور زندگی سے گلۂ گریز پائی
کہ ابھی دراز تر ہے مرے شوق کا ترانہ

جو اسیر رنگ و بو ہوں تو مرا قصور یا رب!
مجھے تو نے کیوں دیا تھا یہ فریب آب و دانہ

تو جو قہر پر ہو مائل تو ڈبو دے موج ساحل
ترا لطف ہو جو شامل تو بھنور بھی آشیانہ

مرے نالوں سے غرض کیا تری نغمہ خوانیوں کو
یہ صلائے بے نوائی، وہ نوائے دولتانہ

حفیظ ہوشیارپوری

کاشانۂ محبوب کو دیکھ کر

میں کل دیر تک اس مکان کے سامنے کھڑا رہا جہاں گزشتہ سال تمہارا قیام تھا۔ تمہارے جانے کے بعد یہ مکان کئی مہینے خالی پڑا رہا۔ اب سنتا ہوں کہ اس میں کوئی بنگالی بابو آ گئے ہیں۔ شاید ان کے بچے بھی ہوں۔ میں نے تو صدر دروازے پر صرف اُن کے نام کی تختی آویزاں دیکھی ہے جب سے تم یہاں سے گئی ہو میں کبھی کبھی مجبور و بے اختیار ہو کر اس طرف آ نکلتا ہوں۔ تمہارے لئے اس مکان کی یاد ممکن ہے خوشگوار نہ ہو مگر مجھے اس عمارت سے محبت ہو گئی ہے۔ تمہیں یاد ہو گا سامنے کے رخ ایک برآمدہ ہے۔ اس کے دروں پر اب چقیں ڈال دی گئی ہیں۔ تم نے ان دروازوں کو کھلا رکھا تھا۔ برآمدے کے دائیں بائیں دونوں کمروں کی کھڑکیوں پر نیلگوں باریک پردے لٹک رہے ہیں۔ تم نے بھی یہاں پردے ڈال رکھے تھے لیکن ان کا رنگ سپید تھا۔ بیرونی روشوں پر کٹی ہوئی سرخ بجری پڑی ہے اور احاطے میں پھولوں کے بہت سے گملے اِدھر اُدھر بے ترتیبی سے رکھے ہیں۔ تمہیں پھول بہت پیارے تھے اور تم نے تھوڑی سی مدت میں جس کاوش سے رنگ رنگ کے پھول جمع کر لئے تھے اُس نے برآمدے کے سامنے گھاس کے چھوٹے سے میدان کو تختۂ گلزار بنا دیا تھا۔ صبح و شام تم ان ننھے ننھے پیارے پیارے پھولوں کی دیکھ بھال میں مصروف نظر آیا کرتی تھیں۔ مکان کی رونق ہمیشہ مکین سے ہوتی ہے۔ اب یہ چار دیواری میرے لئے صرف اُس مختصر سے عہدِ انبساط کی یادگار ہے۔ جب قدرت اتفاق سے تمہیں چند روز کے لئے اس جگہ لے آئی تھی۔ ہم پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے اور تمہیں شاید اُن جذبات کا خفیف سا علم بھی تھا جو مدت سے میرے دل میں پرورش پا رہے تھے اور جن کا تعلق تنہا تمہاری ذات سے تھا۔ چنانچہ جب مجھے تمہاری آمد کی اطلاع ملی تو میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا ہو گا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں بعد تمنا زندگی مستعار کے چند دن ایک ہی شہر میں بسر کرنے پر مجبور تھے اور میں جانتا تھا کہ قدرت اتنی فیاض نہیں کہ ایسے موقعے بار بار میسر آئیں

میں نے ارادہ کیا کہ کہیں باہر چلا جاؤں۔ میرا یہاں رہنا نہ صرف میرے صبر و شکیب کی شدید آزمائش تھی بلکہ میں ڈرتا تھا کہ میری وجہ سے کہیں ایسے واقعات نہ رونما ہونے لگیں کہ تم پر حرف آنے کا احتمال ہو۔ اُدھر دل مچل مچل کر کہہ رہا تھا کہ جس جانِ آرزو کی خاطر عمرِ عزیز کو تباہ کیا ہے، جس برقِ جمال کی ایک جھلک نے متاعِ دین و دانش کو جلا کر راکھ کر ڈالا ہے اور جس نرگس خواب آلود کی یاد میں آنسو بہا بہا کر راتیں کاٹی ہیں وہ یہاں ہو اور آنکھیں اس کی زیارت سے محروم رہیں۔ آہ یہ حرماں نصیبی! یہ سیاہ بختی میری برداشت سے باہر تھی۔ اچانک ایک روز مجھے . . . م مل گیا۔ مجھے اس شخص سے کبھی رغبت نہیں ہوئی۔ اس کی حرکات سے آشفتگی اور اس کی باتوں سے چھچھورپن ٹپکتا ہے۔ وہ سنجیدگی سے کسی موضوع پر گفتگو کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا اور نہ وہ اخلاق و عادات کی اُس پاکیزگی کا مالک ہے جو انسان کو دوسرے کی نگاہ میں محبوب بنا دیتی ہے۔ لیکن قدرت کی بے نیازی کو کیا کہئے کہ اسی . . . م کو تمہاری خدمت میں باریابی حاصل ہے۔ میں نے بڑی احتیاط سے سنبھل سنبھل کر، سرسری طور پر اُس سے تمہارے متعلق پوچھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری گفتگو سے یہ ظاہر ہو کہ میں کس شیفتگی و دلبستگی کے ساتھ تمہاری باتوں میں دلچسپی لیتا ہوں۔ اس نے مجھے بتایا کہ تم چند ضروری امور کی خاطر صرف دو، ایک ماہ یہاں ٹھہرو گی۔ میں جب واپس گھر آیا تو میرے دل و دماغ میں خطرناک کشمکش جاری تھی۔ دماغ کہتا تھا کہ اپنے کو آزمائش میں ڈالنا اور زندگی کا سکون برباد کر لینا حماقت ہے۔ دل کا مشورہ تھا کہ اگر زندگی کی ساری راحت اور عمر کا سارا آرام دے کر تیری ایک غلط انداز نظر، ایک تغافل پیشہ نگاہ میسر آ جائے تو سودا مہنگا نہیں۔

دو عالم نقدِ جاں بر دست دارند
بہا زارے کہ سودائے تو باشد

میں جب پہلی مرتبہ تمہارے مکان کے دروازے پر پہنچا تو میرے دل میں رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ شاید تم آج اس مغائرت کو دور کر دو اس حجاب کو اٹھا دو جس نے برسوں سے ہمارے درمیان ایک مصنوعی بیگانگی کی خلیج حائل کر رکھی تھی۔ تمہارے ذوقِ ادب کے طفیل میرے اکثر مضامین تمہارے مطالعہ سے گذر چکے تھے اور تم نے بارہا اپنی ملنے والیوں سے فخریہ انداز میں کہا تھا کہ "اس تحریر کے پسِ پردہ جو کرب و اضطراب جھلک رہا ہے۔ میں اس کے راز سے واقف ہوں"! اور پھر ایک مرتبہ تم نے یہاں تک بھی تو کہہ دیا کہ "ان مضامین کا مصنف اپنے خونچکاں دل کے جن گوشوں کو بے نقاب کرنا چاہتا ہے میں مدت ہوئی اُن سے آگاہ ہوں"۔ یہ باتیں مجھ تک پہنچیں تو میں ایک مجنونانہ مسرت کے ساتھ اچھل پڑا کہ شاید تم ازراہِ ہمدردی یا اعترافِ حقیقت کے خیال سے اُن زخموں کے لئے کوئی مرہم بھیجو جن کی ٹیسیں الفاظ کا جامہ اوڑھ کر تمہیں میرے درد والم کا احساس کرا چکی ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ تم نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے صرف اس لئے بے رُخی اختیار کی کہ تمہیں میرے رنج و غم کی پروا نہ تھی یا یہ کہ تمہیں طعنِ اغیار کا خوف دامن گیر تھا۔ میں نے تمہیں ایک ایسے جذبہ بے پناہ کے ساتھ چاہا کہ میرے غم نصیب دل کو دنیا میں کہیں اماں نہ ملتی تھی۔ لیکن اس آگ کو جس کی ایک رمق بہ مشکل تم تک پہنچ سکی میں نے ہمیشہ اپنے سینے میں دفن کئے رکھا۔ تم ہی بتاؤ اگر میں ان شعلوں کو دبا دبا کر نہ رکھتا، اگر یہ چنگاریاں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح ایک لمحہ کے لئے منظرِ عام پر آجاتیں تو میں اور تم کہاں ہوتے۔

میں نے اپنے آپ پر شدت سے جبر کیا، میں نے ہمیشہ اپنی آرزوؤں کا سر کچلا لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ پیہم صبر و ضبط سے میرا کلیجہ چھلنی ہو کر رہ گیا۔ میرا سینہ اندر ہی اندر سلگنے والی آگ سے تنور کی طرح جل اٹھا۔ میں نے اپنے آپ کو ہلاکت کے منہ میں ڈالنا گوارا کیا لیکن وہ راز جس سے تمہاری حُرمت و تقدیس وابستہ تھی میری زبان پر نہ آسکا۔ میں برسوں اس انتظار میں رہا کہ تم محبت کا ایک لفظ مجھ کو بھیجو، عنایت کی ایک نظر مجھ پر ڈالو۔ میری سینکڑوں راتیں اس امید میں کٹ گئیں کہ شاید تمہیں رحم آئے اور میری دنوں کی بے قراری اور راتوں کی بیداری کو چین کی نیند میسر ہو۔ تم نے خرمن میں آگ لگا دی اور جی بھر کے تماشا دیکھا۔ تم نے طوفان کا منہ کھول دیا اور میری زندگی کی ناؤ ڈانواں ڈول ہو گئی۔ کاش تمہیں آگ بجھانے کی توفیق ملتی، کاش تم اس طوفان کو فرو کرنے کی تدبیر سے آگاہ ہوتیں، کاش تم اتنا سوچتیں کہ جس دل کو تمہاری آنکھوں کے جادو اور تمہارے تبسم کی بجلیوں نے مجروح کیا ہے اُس پر مرہمِ الفت کا ایک پھاہا رکھنا آئینِ مروت کے خلاف نہیں۔

میں صبر کر چکا تھا۔ ایک یاس آشنا سکون جسے فریبِ امید پراگندہ نہ کر سکے مجھ پر حاوی ہو چکا تھا۔ قدرت کے اس فیصلے پر کہ میرا دل تمہاری محبت کے داغوں سے ہمیشہ لالہ زار رہے اور مجھے تمہاری بارگاہِ ناز میں کبھی شرفِ نیاز حاصل نہ ہو میں سرِ تسلیم خم کر چکا تھا کہ حالات نے یکایک کروٹ لی اور زمانے کی ستم ظریفی نے ہمیں چند روز کے لئے ایک ہی فضا میں سانس لینے پر مجبور کر دیا۔

میں جب پہلے پہل تمہارے مکان میں داخل ہوا تو میں اپنے آپ کو بالکل اجنبی سمجھ رہا تھا۔ مجھے تم سے کسی پذیرائی کی توقع نہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ تم اس بے اعتنائی کا اظہار کرو گی جو ابتدا سے تمہارا شیوہ رہا ہے۔ تمہاری مجبوریوں سے میں بے خبر نہ تھا لیکن غضب خدا کا ان مجبوریوں کے باوجود تمہاری دلپذیر گفتگو، تمہارا حسنِ سلوک، تمہاری عنایات و مدارات اور دل پر ابرِ رحمت کی طرح برسنے میں دریغ نہ کرتی تھیں۔ میں نے تمہارے مکان کے برآمدے سے گذر کر جب بڑے کمرے میں قدم رکھا تو تم، شاید پاؤں کی آہٹ سن کر، اس خیال سے کہ کون آرہا ہے، منتظر نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ تمہارا آنچل جو تمہارے سر کے معطر، لمبے لمبے، سرکش بالوں سے ہمیشہ دب جاتا ہے تمہارے شانے پر لٹک رہا تھا اور تم دیوار کے ساتھ لگی ہوئی یوں چپ چاپ کھڑی تھیں کہ گویا مصور کا حسین ترین شاہکار ہو۔ مجھے دیکھ کر بھی تم نے جنبش نہ کی۔ صرف ایک خفیف، نامعلوم، ہلکا سا تبسم تمہارے چہرے پر دوڑ گیا اور تمہاری آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی گویا تم مجھ سے صاف کہہ رہی تھیں "یہاں بھی آگئے ہو۔ یہ جرأت! آخر تم کب تک اس طرح حیران و سرگرداں پھرتے رہو گے؟ ان باتوں سے کیا حاصل؟ اپنی زندگی کو کیوں خراب کر رہے ہو؟ مجھے بھول کیوں نہیں جاتے؟ تمہارے حوصلے کی تعریف کرنی چاہئے۔ بے شک تم نے حیرت انگیز صبر و ضبط سے کام لیا ہے لیکن اگر تم اسی روش پر قائم ہی رہنا چاہتے ہو، اگر تمہیں یہ منظور نہیں کہ ہم اس آگ سے زیادہ گرم، زہر سے زیادہ مہلک اور پہاڑ سے زیادہ بوجھل راز کو اپنے اپنے دل میں چھپا کر ہمیشہ کے لئے علیٰحدہ ہو جائیں تو پھر آؤ،

میٹھو، پچھلی باتیں جانے دو۔ جو ہوا سو ہوا۔ مجھے اپنے دکھ درد کی کہانی خود اپنی زبان سے سناؤ۔"

تم بمشکل دو مہینے یہاں ٹھہریں۔ ہمارے درمیان بہت کم باتیں ہوئیں لیکن وہ نصاحت جو صرف آنکھوں کے حصے میں آئی ہے ہمیشہ محوِ تکلم رہی۔ تم نے سب کچھ کہہ دیا جو تمہیں کہنا تھا میں سمجھ گیا کہ گہرے پانی کی سطح ہمیشہ ساکن ہوتی ہے۔ اب تم مجھ سے ہزاروں کوس دور ہو، دور زمانے کی رفتار کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ہم شاید کبھی یکجا نہ ہوسکیں گے۔ خانۂ دل جو تمہارے ہاتھوں بن بن کر بگڑا اب صرف اُن آرزوؤں سے آباد ہے جو حسرتوں میں تبدیل ہوگئیں۔ کیا یہ کبھی نہ ہوگا کہ تمہارے دیارِ حسن سے آنے والی ہوائیں تمہاری آواز کا ترنم، تمہاری باتوں کا رس، تمہاری دلبری کی ادائیں، تمہاری آنکھوں کی شوخیاں، تمہارے ہونٹوں کی رنگینیاں، تمہارے لباس کی خوشبوئیں اور تمہارے بالوں کا عنبر اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر اس طرف لے آئیں اور یہ جانِ حزیں گھڑی بھر کے لئے تم سے ہم کنار ہو جائے؟

"ع"

رباعی

رہ جاؤ مری جان مرے گھر رات کی رات
ہر روز کہاں آتی ہے برسات کی رات
ہے ابرِ بہاراں کا برسنا رم جھم
یہ رات یہ پیماں ہائے یہ برسات کی رات

سعید احمد اعجاز

سوزِ ناتمام

نہ کہہ کہ اب وہ محبت میں سوز و ساز نہیں
ترے ہی سینے میں اے بے خبر گداز نہیں

ابھی وہی ہے نمودِ سحر وہی راتیں
ترے ہی دل کو مگر خوئے امتیاز نہیں

نگاہِ حسن میں اب تک وہی ہے کیف و خمار
مگر تو ذوقِ نظر سے ہی سرفراز نہیں

ہے ذرّے ذرّے کے لب پر پیامِ شوق مگر
تری نظر ہے کہ جو آشنائے راز نہیں

ترے وصال کے لمحے نہیں ہیں برق خرام
ترے فراق کی راتیں ابھی دراز نہیں

کمالِ شوق سے عاری ابھی ہے روح تری
تری جبیں میں کوئی سجدۂ نیاز نہیں

مرے ندیم! ابھی سوزِ ناتمام ہے تو
ہنوز میکدۂ غم میں تشنہ کام ہے تو

تابش صدیقی

نیرنگِ تصوّر

سحر کا وقت ہے، بیٹھا ہوں میں پھولوں کی محفل میں
تلاطم خیز ہے موجِ ترنّم قلزمِ دل میں

جھلکتا ہے کسی کا حسن فردوسِ نظر بن کر
کسی کے اشک سبزے پر مچلتے ہیں گہر بن کر

کوئی آواز دیتا ہے مجھے بلبل کے نغموں میں
اڑاتا ہے کوئی میری ہنسی چھپ چھپ کے پھولوں میں

کسی کی آہِ سوزاں کا دھواں گردوں پہ رقصاں ہے
کسی کا خونِ دل رنگِ شفق میں جلوہ افشاں ہے

خموشی بن کے سرتاپا کوئی بیٹھا ہے سوسن میں
سویدا بن کے پنہاں ہے کوئی لالے کے دامن میں

کوئی شاخوں میں چھپ کر میرے آگے سر جھکاتا ہے
مجھے اپنی طرف شاید اشاروں سے بلاتا ہے

کوئی میری طرف نرگس کی مست آنکھوں سے تکتا ہے
میں کیا جانوں وہ ان پردوں میں کیا کچھ دیکھ سکتا ہے

کوئی زیرِ شجر سایوں کی پریوں کو نچاتا ہے
ہوا ہے یا کوئی دھیمے سروں میں گیت گاتا ہے

کوئی کوئل کی کو کو میں یہ آہستہ سے کہتا ہے
تجھے جس کی تمنا ہے وہ تیرے دل میں رہتا ہے

غرض ہر چیز میں ہے اس کے جلووں کی فراوانی
عیاں ہے ذرے ذرے سے اُسی کے رُخ کی تابانی

تخت سنگھ

ادیب کے آخری الفاظ

(۱)

جلال کو بالآخر فرصت مل ہی گئی کہ وہ اپنی محفلِ عیش و نشاط کو چھوڑ کر، اور دخترِ رز سے رخصت لے کر، اپنے مرتے ہوئے چچا کو اس کی درخواست پر ایک دفعہ دیکھ لے۔

ابھی ابھی تھوڑا سا مینہ پڑا تھا۔ جلال کے چچا، حبیب احمد ادیب کے مکان کے سامنے نالی نشیب میں کھڑا ہو گیا۔ صرف گزرنے کے لئے ایک چوڑی سی پگ ڈنڈی رہ گئی تھی۔ جلال نے اپنی پتلون کے پائنچے کو احتیاط سے سنبھالتے، ایڑیاں اٹھا اٹھا کر قدم رکھتے اور خاموشی کی زبان میں اس اہم طلب کی وقعت کو غیر ضروری گردانتے ہوئے اپنے چچا کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

سکینہ، جلال کی چچازاد بہن نے دروازہ کھولا اور پھیلتی ہوئی آنکھوں سے جلال کی طرف دیکھا اور آنسو کا وہ قطرہ جو کہ پہلے سے آنکھ میں اٹکا ہوا تھا، اس کے چہرے پر ٹپک پڑا۔ کچھ حیرانی سے اُس نے کہا۔

"جلال تم آ گئے —— ابا جان کی امیدوں کے خلاف وہ تمہیں ابھی ابھی یاد کر رہے تھے"

جلال نے بہن کی بات کو عجب بے توجہی سے سنا، برآمدے کے اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے نیم بوسیدہ ٹاٹ سے اپنے بوٹوں کو نہایت اطمینان سے رگڑ رگڑ کر کیچڑ سے صاف کیا ایک عام دنیا دار کی مانند جلال نے ظاہری اضطراب کا کوئی نشان چہرے پر ہویدا نہ ہونے دیا۔ نہ اس کی آنکھیں اپنے حلقوں میں گھبراہٹ سے پھیلیں، نہ اُس کی رفتار میں خلافِ معمول سرعت آئی۔ بیسٹر کو اتار کر کندھے پر ڈالتے ہوئے وہ برآمدے کے دائیں کونے کے دریچے میں جو گلی میں کھلتا تھا کھڑا ہو گیا، پھر اس نے ختم ہوتے ہوئے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا اور اُسے گلی میں پھینک دیا سکینہ جو اپنی والدہ کو جلال کی آمد کی اطلاع دے کر واپس آئی تھی بولی۔

"جلال تم ابھی یہیں ہو بھائی؟"

"چچا کس کمرے میں ہیں! یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں سکینہ!"

"اس کمرے میں جس کے سامنے تم کھڑے ہو۔ جلال، جلدی پہنچو! تمہارے پہنچنے سے شاید ان کی طبیعت سنبھل جائے"۔

جلال نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر ڈاکٹر پر پڑی۔ ڈاکٹر کے ایک ہاتھ میں پرانی سی سٹیتھوسکوپ تھی۔ دوسرے ہاتھ کی انگلی کو لبوں تک لے جاتے ہوئے اُس نے مطلق خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ جلال ایڑیوں کے بل چلتا ہوا کمرے کے دائیں طرف ہو لیا۔

وہاں سے اُسے اپنے چچا حبیب احمد ادیب کا زرد چہرہ صاف طور پر نظر آ رہا تھا اس پر تھکاوٹ کے آثار اچھی طرح سے نمایاں تھے۔ اس کا ہر ایک خط —— جو کسی نتیجہ خیز تجربے کی نشانی تھا۔ زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ نقاہت کی وجہ سے اس کی آنکھیں مکمل طور پر بند نہ تھیں۔ نیم وا آنکھوں کے وصندلے پن کو دیکھ کر دل میں ایک وحشت سی محسوس ہوتی تھی۔

"یہ ہے زرد رو جھریوں والا کل انچاس برس کا منحنی بوڑھا، جس کی بابت ملک الشعرا نے کہا تھا کہ وہ مکمل آدمی ہے"، جلال نے دل میں کہا کتنا بڑا خطاب دیا ہے اُس نے، مکمل آدمی ہونا کتنا بڑا امتیاز ہے۔ آج کون آدمی صحیح طور پر مکمل کہا جا سکتا ہے۔

معاً ادیب نے آنکھیں کھولیں اور اپنا منہ دائیں طرف موڑا، سامنے جلال کھڑا تھا۔ اُس نے سلام کیا، مگر ادیب نے صبر و سکون اور بے چینی کے مابین کشمکش کو محسوس کرتے ہوئے ماتھے پر تیوری لا کر آنکھیں بند کر لیں، بالکل اُس بچے کی مانند جسے ماہ جون کی مختصر سی رات کے گزر جانے کے بعد اُس کی ماں اُسے سکول جانے کے لئے جگاتی ہے۔ مگر وہ خواب کے پرستان میں پہنچ کر حظ اٹھانے کے لئے آنکھیں بند کر کے بستر میں چھپ جاتا ہے۔

جلال نے اپنے بائیں طرف ادیب کی تصنیف کردہ کتابوں کی الماری پر ایک نظر ڈالی۔ الماری کے پاس اخروٹ کی لکڑی کا ایک ہشت پہلو میز دھرا تھا اس میں کہیں کہیں سفید سی گلکاری کی ہوئی تھی۔ میز کے اوپر قلم دوات اور ایک دُہرا کیا ہوا کاغذ پڑا تھا جلال نے کاغذ کو ہاتھ میں لے لیا۔ لکھا تھا۔

بوڑھے کے آنسو چار سو بکھرے پڑے تھے۔
اُس نے ساری عمر کوئی ڈھنگ کا کام نہ کیا تھا۔

بوڑھے نے سر اٹھایا اور کہا۔

زندگی کے اسباق بکھرے پڑے ہیں ——
دریا دل معشوق کی مسکراہٹوں کے مانند
کسی غریب کے دل کی محبت کے مانند
صرف ایک سبق رہ گیا ہے —— پشیمانی کا۔
آ موت! او وہ بھی سکھا دے

حبیب احمد

جلال کی طبیعت پریشان سی ہو گئی۔ وہ بے پرواہ ضرور تھا مگر ایک حساس دل کا مالک تھا۔ اس کے مزاج کی مستقل دیوار متزلزل ہو گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کئی زرد، نیلے، سرخ حلقے آپس میں ملے جلے اس کی آنکھوں کے پاس کن پٹی سے چھو کر ہوا میں دور دور تک پھیل رہے ہیں۔ محفل عیش و انبساط سے نکل کر اس نوری درد و کرب کی فضا میں جہاں قہقہوں کی بجائے آنسو، جوانی کی بجائے بڑھاپا، ناکردہ گناہوں کی پشیمانی، موت اگھوم رہے ہوں۔ اس کا دل نہ لگا۔

جلال نے ایک عجیب انداز سے شانے ہلائے اور روکھی سی مسکراہٹ لبوں تک لاتے ہوئے کہا "بھلا ایک مکمل آدمی محض ایک معمولی سبق —— پشیمانی —— کی خاطر موت کو دعوت دیتا ہے۔ ناگاہ اسے یاد آیا، اسی قسم کا ایک اور خیال بھی چچا نے اپنی ایک کتاب میں ظاہر کیا تھا کہ انسان اس قدر خود سر اور خود بیں ہے کہ اس پر آسمان کی گردش سے جتنی بھی بلائیں نازل ہو سکتی ہیں۔ یکسر نازل ہو جائیں تو بھی انسان خود کردہ فعل کو غلطی یا گناہ کہنے اور صحیح طور پر پشیمان ہونے کی بجائے پھر باتوں سے دل کی تسلی کے سامان بہم پہنچائے گا۔ وہ ہر وقت بچپن کے گناہوں کو طفلانہ پن جوانی کے گناہوں کو جوانی نادانی پر اور بڑھاپے کے گناہوں کو انسانی ناتوانی اور کمزوری کے سر تھوپے گا۔ حتیٰ کہ حد سے زیادہ دیر ہو جائے گی اور موت اپنے تلخ جام کے ساتھ اس کے ہر رگ و ریشہ میں پشیمانی کا سبق سرایت کر دے گی۔ ایک عمیق اور تنقیدی نظر اپنی مختصر سی حیات پر ڈالتے ہوئے جلال نے کہا۔ کس قدر درست بات ہے —— "برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن جوانی کی راتیں مرادوں کے دن"

"قیامت کس کسی نے دیکھی ہے —— یہی دن تو ہیں"۔ اس قسم کے ہزاروں کلمات ایتھر میں اب تک لہروں کی صورت میں گھوم رہے ہوں گے"۔

"میں جلال سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"۔ دفعتہً جلال کے چچا نے کہا اور نہایت آرام و سکون سے اپنی آنکھیں اس طرف پھیر لیں۔ جلال تیزی سے چچا کی چارپائی کے نزدیک دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔

"سکینہ —— سامنا دروازہ تو کھول دو —— مجھ تک ہوا آنے دو" ادیب نے پھر کہا۔

ایک لمحہ کے لئے چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ سب نے ادیب کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"باہر ابھی بارش ہوئی ہے"

"جی چچا جان"

"دنیا کس قدر وسیع ہے۔ رنگین اور بے رنگ بھی ——"

"جی ہاں ——" جلال نے چچا کے تخیل کی رو کو سرعت سے بدلتے ہوئے دیکھ کر حیرت سے کہا۔ اس کے بعد ادیب نے اپنی تمام کوشش سے ان دھندلی آنکھوں سے باہر کی طرف دیکھنا شروع کیا۔

سب لوگ بھی باہر کی طرف دیکھنے لگے۔ باہر کچھ بھی نہ تھا۔ صرف سخت سردی میں ایک اندھا لاٹھی ٹیکتا ہوا جا رہا تھا۔ جلال نے چچا کی طرف دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ چچا کچھ کہنے کو تھے۔ مگر قوت ارادی کی ناتوانی کی وجہ سے کہہ نہ سکے۔ جلال نے دیکھا۔ دوبارہ چچا نے حد سے زیادہ زور لگاتے ہوئے کہا۔

"باہر ایک اندھا جا رہا ہے۔ اس کے سامنے راستہ پر نشیب و فراز دونوں ہیں جنہیں وہ دیکھ نہیں سکتا۔ تاہم اسے چنداں فکر لازم نہیں۔ اس کے پاس لاٹھی ہے"۔

ایسے معلوم ہوا جیسے یہ بات کہنے میں ادیب نے اپنی تمام قوت صرف کر دی ہے۔ ان کو دو ہچکیاں سی آئیں اور اس سے پہلے کہ فضا میں ہاؤ ہو کی آوازیں لرزش پیدا کریں۔ ان کا جسم ساکت ہو گیا اور برف کی مانند ٹھنڈا۔

(۳)

چچا حبیب احمد کو دفنا کر واپس لوٹتے ہوئے جلال ایک ارتعاش سو ناں محسوس کرتا ہوا بازار کی رونق میں سے گزر رہا تھا۔ سینتیس برس کی عمر میں خود کو اپنے چچا کے مقابلہ پر لاتے ہوئے وہ اپنے آپ کو زیادہ معمر محسوس کرنے لگا۔ اس کے خیال میں تلافی مافات کے لئے بہت دیر ہو چکی تھی اور وہ مفردات جو کہ انسان کی بہتری کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ اپنی تخریب سے بدن میں کپکپی پیدا کر رہے تھے۔ یکایک اس کے رونگٹے

کھڑے ہونے شروع ہو گئے اور اُس کے کانوں میں سائیں سائیں کی آواز کے درمیان چچا کے آخری الفاظ اُسے سنائی دئے ـــــ آہستہ آہستہ آواز میں ایک گونج سی پیدا ہوئی ـــــ "باہر ایک اندھا جا رہا ہے اُس کے سامنے راستے پر نشیب و فراز دونوں ہیں جنہیں وہ دیکھ نہیں سکتا تاہم اُسے چنداں فکر لازم نہیں۔ اُس کے پاس لاٹھی ہے۔"

"کیا یہ الفاظ کسی تشبیہہ مجازی کے حامل تھے یا ایک گزرتے ہوئے اندھے کو دیکھ کر ایک مریض کی بامونقہ اور اتفاقیہ بات" جلال نے اپنے آپ سے سوال کرتے ہوئے کہا ـــــ "نہیں نہیں" یہ نہیں ہو سکتا چچا استاد استعارہ مانے جاتے تھے اور یہ کبھی ممکن نہیں کہ اپنے حواس کی موجودگی میں وہ الفاظ انہوں نے بے معنی طور پر اور اتفاقاً کہے ہوں پھر اس نے اپنی تمام ترعلمیت کو جو اب ایک گزرے ہوئے زمانے کی یادگار تھی۔ طلب کیا اور دل ہی دل میں اُن الفاظ کی تفسیر و تشریح کرنی شروع کی۔

خوانچے والوں کی آوازیں اخبار بیچنے والوں کا شور و غوغا سینما والوں کے اعلان۔ ریڈیو بھکنگ کی دکان کے اندر ایمپلی فائر کی مدد سے بلند ہوتا ہوا گانا، خوبصورت نیو ماڈل کاروں کے ہارن اس کے کانوں میں جگہ پانے سے قاصر تھے۔ اُس کے پاس سے ایک مونگے رنگ کی موٹر کار گزری جس کو ایک مونگے رنگ کی وردی والا شوفر چلا رہا تھا۔ کار کے اندر ایک نازنین مونگے رنگ کی کریپ کی ایک نہایت خوشنما ساڑھی پہنے بیٹھی تھی۔ تمام گزرتے ہوئے لوگ رنگ کی مشابہت و مطابقت دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرا رہے تھے۔ جلال جو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کار کی آخری سیٹوں کو دیکھا کرتا تھا۔ آج نظریں زمین پر گاڑے ہوئے جا رہا تھا۔

ریز ریسٹورنٹ کے خانساماں نے اپنے گاہک جلال کو اپنے کیبنے کے نزدیک رکتے ہوئے دیکھ کر کہا

"حضور پیرس سے پہنے کے دو رنگے موسے آئے ہیں۔ شاہین سے اُن کا خاص . . . "

جلال نے ایک نہایت سخت نگاہ سے خانساماں کی طرف دیکھا اور کہا "پیچھے ہٹ جاؤ نامعقول" اور خود آگے بڑھ گیا۔

چچا آخر کتنا سادہ آدمی تھا نفس کُش صحیح معنوں میں کفایت شعار خرچ کرنے کی جگہ خرچ کرنے والا، خاموش اور سنجیدہ مزاج گرج بولنے کی جگہ چپ شیلا سپیکر یا حقیقت اور اصلاح کے لئے قدرت کی اچھی بُری طاقتوں کا استعمال کرنے والا (یعنی افسانہ نویس) . . . آخر وہ مکمل آدمی تھا!

ایک دفعہ پھر اُس کے کانوں میں ادیب کے آخری الفاظ گونجے جس طرح تمام روئے زمین پر پھیل چکنے کے بعد ایتھر میں ایک معین و نغمہ کے بعد پھر لہرا آتی ہے ـــــ "باہر ایک اندھا جا رہا ہے۔ اُس کے سامنے راستے پر نشیب و فراز دونوں ہیں جنہیں وہ دیکھ نہیں سکتا۔ تاہم اُسے چنداں فکر لازم نہیں۔ اس کے پاس لاٹھی ہے"۔

تمام پریشانیوں سے اپنی توجہ کو یک سو راغب کرتے ہوئے اب جلال نے مرحوم ادیب کے آخری الفاظ کی تفسیر کرنی شروع کی یکایک اُس کے گالوں پر ایک سرخی سی نمودار ہونے لگی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جو رنج و غم سے تہی نہ تھی مسکراتے ہوئے اُس نے کہا۔

کتنا عمیق تھا چچا کا مطالعہ۔ انسان کی زندگی کے غیر ضروری نا قابل توجہ واقعات سے وہ روزانہ سبق لیتے تھے۔ زندگی کی ہر لطیف جنبش سے انہوں نے کچھ اخذ کیا۔ حتیٰ کہ موت سے پشیمانی۔ اس کی تفسیر اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسان اپنے مستقبل یعنی زندگی کے نشیب و فراز پانی اور کیچڑ، اونچے اور نیچے راستے پر ایک بے خبری کے عالم میں جا رہا ہے۔ کیونکہ وہ ہونے والے واقعات سے آگاہ نہیں۔ وہ اونچی نیچی جگہہ کو دیکھ نہیں سکتا جس طرح اندھا آدمی اپنی لاٹھی کی مدد سے اپنا راستہ نشیب و فراز پانی اور کیچڑ اور گڑھوں میں سے نکال لیتا ہے۔ اسی طرح آدمی اپنی دور اندیشی کی لاٹھی سے اپنی زندگی کو بے خطرہ و استوار بنا سکتا ہے جس اندھے کے پاس لاٹھی اور جس انسان کے پاس دور اندیشی نہیں۔ وہ دنیا کے میدان نشیب و فراز، پانی اور کیچڑ اور اونچ نیچ میں منہ کے بل گرے گا۔

جلال نے کلائی پر سے کوٹ کی آستین ہٹاتے ہوئے وقت دیکھا ساڑھے سات بجے تھے اور سردیوں میں ساڑھے سات بجے اچھا خاصا اندھیرا ہو جاتا ہے۔ دھند سورج کے غروب ہوتے ہی آسمان سے نیچے اتر کر روئے زمین پر پھیل گئی تھی اور بلیرڈ کلب میں جانے کا وقت تھا۔

بلیرڈ کلب ہو کنگ کلب برج کلب یہ سب ایک ہی بات تھی۔ یہ سب مہذب مرد عورتوں کی تفریح گاہیں تھیں۔ جلال نے اپنی جیب ٹٹولی۔ پیسوں کی سویپ اور برج میں اس نے تھنر روپے جیتے تھے۔ جلال کو وہ کھلی سی محسوس ہونے لگی جو ایک جیتنے ہوئے کھلاڑی کو اور داؤ لگا کر تمام کچھ کھو دینے کے لئے اکساتی ہے۔ جلال ایک قدم رُک گیا چسٹر کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس نے فیصلہ کن انداز و دعوے سے کہا کہ . .

یقیناً ان روپوں کو کسی بہتر کام میں صرف کرے گا۔ وہ بیوی کے لئے گرم ساڑھی لائے گا یا اپنے بڑے بیٹے کے لئے جو کہ ایک مقامی کالج میں ایف اے کا متعلم تھا۔ ایک چھوٹی سی لائبریری خریدے گا۔ وہ نظارہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا جبکہ اس کے بیٹے نے نہایت اشتیاق سے کتابیں خرید کر لادینے کی التجا میں انگلستان کے تمام بڑے بڑے پبلشر اگلیوں پر گن ڈالے تھے۔

آج پھر جلال نے اپنی گذشتہ زندگی پر ایک نظر ڈالی۔ اُس نے دیکھا کہ تمام گذشتہ وقت اجوانی کا بیش قیمت ترین زمانہ اُس نے عیش ونشاط کی محفلوں، مہذب بدمعاشوں کی صحبتوں، طوطا چشم ایکٹرسوں کو طویل چٹھیاں لکھ کر گرویدہ بنانے کی کوششوں میں گنوایا تھا اور خود کو اس اندھے کی مانند کر دیا تھا جس کے پاس لاٹھی نہ ہو اور جسے ہر طرح کی ٹھوکر لازم ہو۔ اور اب بھی وہ زندگی کے نشیب وفراز میں دور اندیشی کی لاٹھی کے بغیر بھاگا جا رہا تھا اور وہ بھی بے تحاشا!

اُس نے بازار میں گذرتے ہوئے عام آدمیوں کو دیکھ کر انسانی عادت کے مطابق اپنے دل کو تسلی دینی شروع کی۔

اِن میں سے کسی کے پاس لاٹھی نہیں ہے۔ اگر ان میں کوئی سنبھلا ہوا ہے بھی تو وہ شخص ہے جو کہ لاٹھی کے نہ ہوتے ہوئے بے تحاشا نہیں بھاگتا بلکہ استقلال سے قدم قدم چل رہا ہے۔"

"مجھے کم از کم بے تحاشا نہیں بھاگنا چاہئے۔" جلال نے دل ہی دل میں خود کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ خوب صورت استعاسے کے زیر اثر جسمانی طور پر بھی سست پڑ گیا ہے۔ اُس کی رفتار کاروباری آدمی کی رفتار سے بہت کم ہوگئی تھی۔ جلال نے اپنی چال تیز کر دی اور تیز چلتے ہوئے اُس نے قدرے اونچی آواز سے کہا۔

اپنی وہ لاٹھی جو میں نے گھر کے ایک کونے میں پھینک رکھی ہے اور جس کی ہستی کو بھی بھول چکا ہوں محنت اور کاوش سے ڈھونڈھ نکالوں گا اور اُسے استعمال کیا کروں گا۔"

(۳)

شہر کے قمار خانے کی شکل جاپانی پگوڈا سے مشابہت رکھتی تھی بنکوک کے ایک اعلیٰ کاریگر نے اُسے بنایا تھا۔ اُس کے چاروں طرف پینتالیس سیڑھیاں تھیں اور صبح وشام شہر کے لوگ سمندر سے آنے والی ہوا کا لطف اٹھانے کے لئے وہاں جمع ہو جاتے۔ شراب کے متعلق ملک کے اس حصے کا قانون سخت گیر ہونے کی وجہ سے کئی شخص ایک سیڑھی پر بازو رکھ کر اُسے تکئے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے باقی کا جسم نچلی سیڑھی پر رکھ کر پڑے رہتے جس طرح کسی بڑے دریا کے ریتلے کناروں پر گھڑیال اور مگرمچھ دھوپ تاپنے کے لئے پاؤں پھیلا کر دنیا ومافیہا سے بے خبر پڑے رہتے ہیں۔ جلال حسب معمول ان انسان نما گھڑیالوں یا گھڑیال نما انسانوں سے بچتا بچاتا قمار خانے کے اندر داخل ہوا۔ اُس کے ساتھی جو دو دن سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ نہایت خلوص سے اُسے ملے۔ مگر جلال سر درد کا بہانہ کر کے اُن سے معذرت کا خواہاں ہوا اور آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔

جلال صبح سے بھوکا تھا اور حالت گرسنگی میں آدمی لطیف سے لطیف خیالات تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ جلال جس کا پیٹ طرح طرح کے کھانوں کے علاوہ حرص وہوا سے تنا رہتا تھا۔ آج اس قابل تھا کہ اُسے دور کی سوجھے اور وہ گذشتہ زندگی اور روزمرہ کے واقعات کا تصور کر کے پریشان وپشیمان ہو۔ ظاہرا اُس کی آنکھیں قمار بازوں کے سر پر لٹکی ہوئی قندیل پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر در اصل وہ نیم خفتہ ونیم بیدار حالت میں تھا۔ اُسے شہزاد رقاصہ کا گھر دکھائی دیا۔ جہاں اُس کے یار غار شراب کے نشہ سے مخمور تکیوں کا سہارا لئے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک کی پگڑی کھل کر اس کی گردن میں پڑی تھی۔ دوسرا بغیر فریم کی عینک کے پیچھے سے عقاب کی مانند آنکھیں جھپکائے بغیر ایک ریاستی دیوان کی طرح جس کی کہ ہر محکمہ پر گہری نظر رہتی ہے۔ بڑے غور سے شہزاد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تاکہ کوئی ناز وانداز، کوئی حرکت کوئی رنگیں، کوئی جاں نواز لمحہ مکمل حظ دئے بغیر نہ گزر جائے ایک اور صاحب جو مولویانہ وضع کے تھے اُن کے سکڑتے ہوئے لبوں سے منہ کے دونوں طرف دو گہری سلوٹیں سی پیدا ہوگئی تھیں جن میں پان کی سُرخی نمایاں تھی۔ انہوں نے اپنا سر عمداً اوارادتاً ننگا کر رکھا تھا۔ کیونکہ اُن کے سر کے گھنے بال گھنگریالے بھی تھے۔

تصور میں ہی جلال نے اپنے آپ کو شہزاد کے دروازے پر کھڑا پایا۔ اُسے دیکھتے ہی شہزاد نے اپنا گانا بند کر دیا اور دوڑی دوڑی اُسے لینے کے لئے دروازے تک آئی۔ کیونکہ جلال شہزاد کا مستقل مالدار اور قدردان گاہک تھا۔ شہزاد نے اس انداز سے جو شکایت سے خالی نہ تھا۔ پوچھا۔

تم گزشتہ دو شب کہاں رہے ——— جلال ——— شہزاد

کی طبیعت مضمحل نظر آتی ہے کچھ"۔

ایک اور سرو قد بت تھا جو کہ شہزاد کے مقابل آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بُت قدرے دھندلا سا دکھائی دیتا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اُس بُت کے منہ میں زبان نہیں ہے مگر پھر بھی کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یکایک اُس بت نے بھی وہی الفاظ دہرا دئیے۔ وہ بُت جلال کی بھولی بسری بیوی تھی۔ جلال نے اپنی بیوی اور شہزاد کے استفسار کا مقابلہ کیا۔ بیوی اُسے اُسی کے لئے چاہتی تھی اور محبت سے باہیں گلے میں حائل کر کے شکایت کے آنسو گراتے ہوئے پوچھتی "آپ کیوں نہیں آئے ——— میں تمام رات تڑپتی رہی ہوں" اور وہ آواز مطلق تصنع اور ناز و انداز کی حامل نہ تھی بلکہ دل ہی سے، دماغ سے مشورہ لئے بغیر اس کے خیالات لبوں تک آجاتے اور شہزاد جلال کو جلال کے لئے نہیں، اُس کی جیب کے لئے چاہتی تھی۔ جو عموماً نہیں بلکہ ہمیشہ معمور ہوتی۔

میرے عزیز چچا حبیب احمد کل فوت ہو گئے ہیں ———" جلال نے رحم طلب آنکھوں سے حاضرین کی استفساری نگاہوں کی طرف دیکھتے ہوئے شہزاد کی بات کا جواب دیا۔ تمام نے افسوس اور ہمدردی کا اظہار کیا اُن میں سے ایک نے یہ بھی محسوس کیا کہ جلال نے اس عیش و نشاط کے موقع پر یہاں آ کر اپنی افسردہ دلی سے تمام انجمن کو افسردہ کر کے اپنی کم فہمی کا ثبوت دیا ہے۔

شہزاد نے کئی ایک باتوں سے جلال کو تسلی دینی شروع کی اور یہ بھی کہا کہ اُس کے نہ آنے سے کتنی بجلیاں تھیں جو اُس پر کوندیں اور کتنے وسوسے تھے جو اس کے دل میں آئے . . .

جوں جوں شہزاد خوشامد کرتی توں توں جلال کا دل اس سے متنفر ہوتا جاتا۔ اس نے ایک ہاتھ اپنی جیب پر رکھ لیا جس کو بچانے کا صرف آج کے لئے ہی نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے اُس نے تہیہ کر لیا تھا۔ شہزاد کے پیش کردہ جام کو پرے دھکیلتے ہوئے ایک روکھی پھیکی مسکراہٹ سے جلال نے کہا۔ "تمہیں ایک خبر سناؤں شہزاد . . . چچا اپنی جائداد کا ایک بڑا حصہ میرے نام چھوڑ گئے ہیں"۔

"سچ مچ" ——— شہزاد نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔ یہ بات صحیح معنوں میں اس کے لئے خوش کن اور دل نواز تھی۔ وہ اپنی خوشی کو فریب نظر کے دامن میں مستور نہ کر سکی۔ اگرچہ یہ اُس کے پیشے کی خصوصیت ہوتی ہے اور وہ چھپاتی بھی کیسے۔ جب کہ جلال کی نظر نہایت باریک

بیں ہو گئی تھی اور اس وقت وہ فولاد کے پار بھی دیکھ سکتی تھی۔

علاوہ اور چیزوں کے چچا مجھے ایک لاٹھی دے گئے ہیں ———
تاکہ میں ٹٹول ٹٹول کر اپنا راستہ بنا لوں اور نشیب و فراز میں نہ گروں"۔
جلال نے اپنے آپ کو کہتے ہوئے پایا۔

"کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہوئے جلال ——— لو یہ پی کر بے نیاز ہو جاؤ" ——— اور شہزاد نے سمجھا کہ یہ صرف چچا کی موت کا گہرا اثر ہے۔ جلال نے شہزاد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا شباب زوروں پر ہے ———" شہزاد نے اپنے جسم کی طرف ایک پھسلتی ہوئی نگاہ سے دیکھا اور مسکرائی۔

"کل ڈھل جائے گا" ——— شہزاد نے دوسری دفعہ اپنے جسم کی طرف دیکھا اور خون اُس کے رخساروں اور کانوں کی طرف دوڑنے لگا

"تم بوڑھی ہو جاؤ گی اور پھر تمہیں کوئی نہ پوچھے گا ——— یہ جتنے بھی یہاں بیٹھے ہیں اور میں خود بھی ———" اس نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ تمہارے شباب کے خریدار ہیں۔ جوانی کی دوپہر ڈھلنے پر یہ سب کے سب اپنے گھونسلوں میں چلے جائیں گے . . . تم کو کوئی نہ پوچھے گا ——— پھر تم کیا کرو گی شہزاد؟" یہ سوال تو میں عنقریب ہی تم سے کرتی ——— کیا جلال جس نے مجھے بارہا کہا ہے کہ تم میری عزیز ترین چیز ہو۔ میری خبر گیری نہ کرے گا!"

"ایسا نہیں ہوا کرتا شہزاد، شباب کی رعنائیوں کے خریدار، عمر کے ساتھ بوڑھی ہونے والی رعنائیوں کی کھوٹے داموں بھی قیمت ادا نہیں کرتے۔ اگر تم اپنا دامن عصمت سنبھال کر کوئی دوسرا شوہر کر لیتیں تو گو زندگی ظاہری طور پر عیش سے نہ گذرتی۔ تب بھی تمہارا انجام خراب نہ ہوتا۔ عورت سے وابستہ وہ آدمی جسے شوہر کہتے ہیں۔ اپنے بڑھاپے میں بوڑھی بیوی کی بوڑھی اور بھونڈی رعنائیوں کی بھی وہی قیمت ادا کرتا ہے جو اُس نے جوانی میں ادا کی ہو گی ——— بلکہ اس سے بھی زیادہ ——— میں نے تمہارے شباب کو عزیز کہا ہے اور اس کے لطف کو خریدا ہے مگر بیوی نے بغیر دام لئے اپنے شباب کے جام خلوص اور ایثار سے مجھے پلا دئیے۔ اس لئے وہی ایک ہستی ہے جو میرے جذبۂ ایثار پر تسلط جانے کا حق رکھتی ہے . . .

"شہزاد! تم اندھے کی مانند ہو جو کہ بے تحاشا بھاگا جا رہا ہو حالانکہ اُس کے پاس لاٹھی نہیں ہے۔ تم نے اپنی لاٹھی یہیں کہیں گم

کے کسی کونے میں بھول کر ڈال دی ہے۔ اٹھو اُسے ڈھونڈھ نکالو۔ اور اپنے مستقبل میں اپنی راہ نشیب و فراز پانی اور کیچڑ سے بچ کر نکال لو —— ورنہ رنج و آلام کی گہرائیوں میں جا گرو گے ——"

جلال کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے آخری الفاظ نہایت زور سے کہے تھے قمار خانے کے تمام آدمی جلال کی طرف گھور رہے تھے۔ جلال کچھ گھبرا سا گیا۔ اُس نے ویسی ہی اونچی آواز میں کہا "یہ میرے ادیب چچا کے آخری الفاظ ہیں —— . . . اور تم سب لاٹھی کے بغیر ہو جو بالضرور مصائب کی خندق میں گرو گے —— الوداع ——"

دوسرے لمحہ میں جلال پگوڈا نما قمار خانے کی پینتالیس سیڑھیوں کو بے تحاشا پھلانگتا ہوا بھاگا جا رہا تھا اور اُسے اپنے پیچھے بے تحاشا قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

راجندر سنگھ بیدی

رباعی

ہے آپ کی تسبیح و مناجات کی رات
اور میری معاصی و خرابات کی رات
یہ رات سوئے میکدہ ہے شیخ رواں
اچھی ہوئی قبلۂ حاجات کی رات!

سعید احمد اعجاز

غزل

کوئی ظالم جو چھپ کر گا رہا ہے
دلِ بے تاب کو برما رہا ہے
مجھے کیا چاہئے اس سے زیادہ
میں روتا ہوں کوئی شرما رہا ہے
فرشتے ڈھونڈتے پھرتے ہیں شعلے
کوئی عاشق بنایا جا رہا ہے
خمیر اک پیکرِ زہرہ جبیں کا
ستاروں سے اٹھایا جا رہا ہے
یہ آنسو؟ —— کون جانے ان کا مطلب!
پرانا واقعہ یاد آ رہا ہے
مجھے یاد آ رہا ہے اک حسیں خواب
دلِ مجبور بیٹھا جا رہا ہے
کسی نے لطف کی نظروں سے دیکھا
گیا وقت آج واپس آ رہا ہے
مرے مقصد کو بھی کوئی سمجھتا!
مجھے سارا جہاں سمجھا رہا ہے

احمد ندیم قاسمی

Baij

پروازِ عرشی

اک گوشۂ زنداں ہے، کونین کی پہنائی
دیکھو تو خرد مندو! اندیشۂ سودائی

اُس چہرۂ خنداں میں، اُس جبۂ رخشاں میں
کشمیر کی شادابی، شیراز کی زیبائی

اے تیرے تصور سے، مخمور تصور سے
جذبات میں رنگینی، احساس میں رعنائی

میں بھول نہیں سکتا، کیا بھول سکے کوئی
اظہارِ تمنّا پر احسان پذیرائی

پیکارِ محبت میں دل باختۂ خامی
کیا تجربۂ پیری، کیا جراَتِ برنائی

دنیا کے حسینوں پر کیا تم کو تفوق تھا؟
کیوں میں نے تمہیں چاہا، کیا چیز پسند آئی؟

سالک کی نگاہوں میں گردِرہِ عرفاں ہے
اورنگ سلیمانی، اعجازِ مسیحائی

یاں عجز کی تہ میں ہے طوفانِ تکبّر کا
اوڑھے ہوئے نادانی ہے چادرِ دانائی

دہلیزِ محبت پر دیکھے ہیں جبیں فرسا
کیا فرّۂ کاؤسی، کیا شوکتِ دارائی

تکمیلِ وفا یہ ہے ہم لوگ ہوئے آخر
خوگردۂ محرومی، جاں دادۂ رسوائی

عمریست دریں سودا کز تو نشود سیری
در دیدہ نمی گنجی، در سینہ نمی آئی

عرشی امرتسری

کتابِ زندگی کا ایک ورق

آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ فضا میں ہلکی ہلکی تیرگی پھیل رہی تھی۔ ہالینڈ پارک کے صدر دروازے پر ایک ضعیف بھکارن اپنے لاغر و ناتواں جسم کو دیوار کا سہارا دئے کھڑی تھی ——— صرف ایک پیسے کی خاطر!

لیکن یہ دن ہمیشہ سے اُس کے مقدر میں نہ تھے۔ زندگی کی واحد امید۔ گلزارِ تمنا کی بہار ——— اکلوتے بیٹے کی بے وقت موت نے آج اُسے شارعِ عام میں ایک قابلِ رحم حالت میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ اس ناگہاں صدمہ سے نیم جاں، سیلِ حوادث کے بے پناہ تھپیڑوں سے لاچار، ضرورت کے لئے در بدر بھیک مانگنے کے سوا زندگی بسر کرنے کا دوسرا راستہ ہی کونسا تھا؟ زندہ رہنے کے لئے یہی ایک طریق اُس کے سامنے موجود تھا اور اسی کے طفیل اس کا نحیف و زار جسم اب تک موت سے ہم آغوش ہونے سے بچا ہوا تھا۔

لیکن اس میں قصور کس کا تھا؟ نہ ہمارا نہ تمہارا سب کچھ پردۂ غیب سے ظاہر ہو رہا تھا۔ روزمرہ کی طرح وہ آج بھی آٹھ بجے تک یہاں ایک پیسہ کی امید سے وابستہ ہو کر بے چارگی کی حالت میں کھڑی رہی لیکن اُسے پیسہ کون دیتا؟ اس کے چہرے پر اب حسن کی دلآویزی نہ تھی رعنائی نہ تھی اور نہ ہی شباب کی رنگینیوں کا جاذبِ نظر جلوہ! ——— صرف ایک رنج و الم کی تیرگی کا کریہہ منظر موجود تھا۔

اس کی شامِ زندگی۔ سراپا خستگی کا عالم۔ پھٹے پرانے کپڑے۔ آہ! کس قدر دلگداز اور قابلِ رحم حالت تھی۔ شوہر اور پیارے بیٹے کی موت کے جاں گداز صدمے اور پیٹ کی آگ بجھانے کی چنتا سے چہرے پر انتہائی بے بسی اور بے کسی کی نہ چھٹنے والی گھٹا چھائی رہتی تھی۔ اُس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں سے درد و غم کی لہر پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی۔ دن بھر اُسے ایک پیسہ بھی نہ ملا تھا۔

اس کی صورت زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ اُس کے پیٹ میں دو چلو پانی سے زیادہ کچھ نہیں گیا تاہم اس کے دل کی گہرائیوں میں ایک امید لحظہ بہ لحظہ کروٹ لے رہی تھی ——— پارک سے لوٹ کر آتا ہوا کوئی بابو شاید اس کی درد بھری صدا سے متاثر ہو کر اُسے ایک آدھ پیسہ دے جائے وہ ہاتھ پھیلا کر نہایت دلگداز لہجے میں التجا کر رہی تھی ——— ایک پیسہ دو بابا! اناتھ پر دیا کرو۔ لیکن اس کی درد انگیز پکار کا جواب کہیں سے نہ ملتا تھا۔

بے نیل و مرام مایوس و دل شکستہ ہو کر جب وہ اپنی میلی کچیلی گدڑی اٹھا کر چلنے لگی تو اُسے قریب سے ٹن ٹن کی آواز آئی۔ اُٹھے ہوئے پاؤں وہیں کے وہیں جم گئے۔ اُس نے دیکھا کہ ایک رکشا پارک کے صدر دروازے پر آ کر رُک گئی ہے۔

رکشا والے کی شکل و صورت سے اس کی ذات پات کی تمیز نہ ہوتی تھی۔ لیکن اس کا بڑھا ہوا پیٹ اس بات کا ضرور پتہ دے رہا تھا کہ وہ ہندوستان سے بنگال میں روپیہ کمانے کی خاطر آیا ہے۔ اس کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ صحت نہایت اعلیٰ اور جسم مضبوط تھا۔ اس کا سانس چڑھا ہوا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دُور سے سیر و تفریح کرتا ہوا یہاں آ کر رُکا ہے سر سے ایک ملگجی صافہ کھول کر اس نے چہرے سے پسینہ صاف کیا اور پھر اُس کے دامن کو سرعت کے ساتھ ہلاتے ہوئے جسم کو ہوا دینے لگا۔

بھکارن نے اپنی عادت کے مطابق رکشا والے کے سامنے ہاتھ پھیلا کر عاجزی سے کہنا شروع کیا "ایک ہی پیسہ دے دو بابا! دن بھر پیٹ میں کچھ نہیں گیا"۔

رکشا والا دامن کی ہوا بند کر کے کچھ دیر اس کی طرف نظر اٹھا کر غور سے دیکھتا رہا۔ وہ کتنی درد انگیز اور جذبات ریز نگاہیں تھیں! دیکھتے دیکھتے یک دم ——— بے اختیار اُن سے رحم و اخلاص کے آنسوؤں کا دریا بہ نکلا۔ اس کے سامنے ایک ایسی ہستی تھی جو رزم گاہ دنیا کی صعوبتوں سے پس چکی تھی لیکن اس پر بھی وہ اپنی خستگی و درماندگی کو چھپائے ہوئے تھی۔ درد و الم کی اس زندہ تصویر نے اُسے حیران و پریشان کر دیا۔ اُس نے اپنے ملگجی دوپٹے

سے آنسو پونچھے اور کمر سے بندھی ہوئی تھیلی میں سے اپنی دن بھر کی کمائی نکال کر بھکارن کی طرف ہاتھ بڑھا دیا —— "یہ لیجئے مائی جی!"

اس کے اس شیریں طرز خطاب "مائی جی" سے بھکارن کے جسم میں مسرت و راحت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کتنی مدت کے بعد اس کے کانوں میں یہ محبت بھرے الفاظ پڑے تھے "ماں" کہہ کر پکارنے کے اس لہجے نے اس کے چھپے ہوئے دبے ہوئے بے پایاں درد کو از سر نو تازہ کر دیا۔ آہ! وہ جو صرف راہ گیروں کا لعن طعن سننے کی عادی تھی۔ آج ان شیریں الفاظ سے کس قدر سرور و شادمانی محسوس کر رہی تھی؟ دو سال ہوئے جب اُس کا بیٹا زکھن گھر سے چلا گیا تھا —— جانے کہاں! دکھیا کی دلخراش پکار آسمان کو چیر کر اس پار نکل گئی تھی اُسے آہستہ آہستہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس کے دل کے کھوئے ہوئے قرار کو بحال کرنے کے لئے واپس نہیں آئے گا —— اُس کی پیاری آواز اور شیریں تکلم بھی اس کے ساتھ ہی چلا گیا تھا . . .

لیکن رکشا والے کے ان روح افزا الفاظ نے بڑھیا کے دل کے کواڑ کھول دیئے۔ تھے اور اس کی مرجھائی ہوئی زندگی گھڑی بھر کے لئے پھر تر و تازہ ہو گئی تھی۔ آہ! کتنی راحت، کتنا سکون اور کتنا اطمینان اُسے حاصل ہوا تھا! اُس پہ ایک بے خودی سی طاری ہو گئی اور وہ زبان جو بھیک مانگنے کی عادی ہو چکی تھی۔ اب خاموش ہو گئی۔

فرط محبت سے کانپتی ہوئی آواز میں بھکارن نے کہا ——

روپے تم اپنے پاس ہی رہنے دو بابا! ایک عرصے کے بعد آج جو کچھ تم نے مجھے دے دیا وہ کتنا انمول ہے؟ تمہاری روپوں کی خیرات اب مجھے نہیں چاہیئے لیکن . . تم صرف ایک بار مجھے مائی کہہ کر اور بلا لو۔ ہائے میرا زکھن مر گیا نہیں —— تمہیں میرے زکھن ہو! ——

یہ کہہ کر ضعیفہ اس سے لپٹ گئی اور ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگی رکشا والا خاموش تھا۔ مگر چہرے سے حیرت آمیز دردمندی ٹپک رہی تھی۔ راہگیر وہاں سے گزرتے ہوئے اس نظارے کو دیکھ کر کھڑے ہوتے جاتے تھے۔ آہستہ آہستہ وہاں ایک بھیڑ سی لگ گئی۔ لیکن بھکارن کی آہ و زاری تھمنے میں نہ آتی تھی۔ رکشا والے کے ساتھ وہ اور بھی زور سے لپٹی جاتی تھی گویا اُسے لوگوں کی نگاہوں سے بچا کر وہ اپنے نہاں خانہ دل میں چھپا لینا چاہتی تھی۔

راہ گیر اُسے پاگل سمجھتے تھے۔ کوئی کہتا کہ یہ بھی مانگنے کا نیا طریقہ ہے غرضکہ جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ مگر تعجب یہ ہے کہ جسے بولنا چاہئے تھا وہ خاموش سب کچھ دیکھ رہا تھا . . .

لوگوں نے دیکھا اور دم بخود رہ گئے کہ وہ شخص جو رکشا میں بیٹھا ہوا تھا ایک باوقار خاموشی سے کھڑا ہوا اور اُس نے نہایت محبت و احترام سے ضعیف بھکارن کو اپنے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر رکشا میں بٹھا دیا اور اپنے ہمراہ لے گیا —— کہاں! اور کیوں!! —— وہ کم فہم لوگ نہ سمجھ سکے ——

بیٹے کی یاد میں تڑپنے والی ماں کو اس کا لخت جگر مل گیا تھا اور یہ دردانگیز نظارہ دیکھ کر فرشتوں کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک پڑے۔

(بنگالی سے)

جگن ناتھ شرما

خودی

سپاہ و تیغ و کلاہ و سریر شاہی ہے
نہیں ہے تیغ سے مرغ و ماہی ہے
بتاؤں راز تجھے ہمنشیں امیری کا
خودی نہ چھوڑ فقیری میں پادشاہی ہے

ابرار احمد فاروقی

نوائے فراق

امید و یاس کے اب وہ پیام بھی تو نہیں
حیاتِ عشق کی وہ صبح و شام بھی تو نہیں

بس اک فریبِ نظر تھا جمالِ گیسو و رُخ
وہ صبح بھی تو نہیں اب وہ شام بھی تو نہیں

وفورِ سوزِ نہاں کا علاج کیوں کر ہو
جو لے سکے کوئی وہ تیرا نام بھی تو نہیں

انہیں محال ہے تمیزِ قید و آزادی
کہ تیرے صیدِ بلا زیرِ دام بھی تو نہیں

دلِ حزیں میں ترے شوق مضطرب کے نثار
اس انجمن میں تجھے کوئی کام بھی تو نہیں

بیاں ہو کیسے وہ دیرینہ ارتباطِ نہاں
کہ تجھ سے اگلے پیام و سلام بھی تو نہیں

وہ کیا کہیں کہ کبھی اہلِ شوق سے کھل کر
ہوئی نگاہ تری ہم کلام بھی تو نہیں

کبھی انہیں بھی زمانے میں تھی خوشی کی تلاش
اب اہلِ غم کو یہ سودائے خام بھی تو نہیں

نہ پوچھ ہجر کی حسرت کہ دورِ گردوں میں
سحر نہ ہو سکے جس کی وہ شام بھی تو نہیں

فراق جلوۂ ساقی کے سب کرشمے تھے
کہ اب وہ رنگِ مئے لالہ فام بھی تو نہیں

فراق گورکھپوری

سینما

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

مقام

رومیش کا ڈرائنگ روم۔ سامان زیادہ نہیں مگر مشرقی طریقے سے سجا ہوا ہے
رومیش کی بیوی بملا دروازے سے اندر داخل ہوتی ہے۔ رومیش اخبار
پڑھتے پڑھتے چونک اٹھتا ہے۔

رومیش۔ تم آگئیں۔

بملا۔ ہاں میں آگئی۔

رومیش۔ پاروتی!

بملا۔ دیوداس!

رومیش۔ مجھے دیوداس نہ کہو۔ میں اپنی زندگی کو درد بھری داستان نہیں بنانا چاہتا۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ تمہارے پاس ہمیشہ۔

بملا۔ میں بھی پاربتی کی طرح زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ تم جانتے ہو پاربتی نے اپنے سسرال میں اپنے دل کی راگنیوں کو کیسے خاموش کیا۔ مجھے اس کے تصور سے بھی خوف محسوس ہوتا ہے۔ بیشک اُس کی زندگی دیوداس کی موت سے کہیں زیادہ المناک تھی۔ مجھے پاربتی مت کہو۔

(دونوں ایک دوسرے کو بھول کر خیال کی دنیا میں چلے جاتے ہیں)

رومیش۔ (مہر سکوت کو توڑتے ہوئے) تم خاموش کیوں ہوگئیں۔

بملا۔ تم بھی تو خاموش رہے۔

رومیش۔ میں سوچ رہا تھا . . . تم تو جانتی ہو پیاری میں کیا سوچ رہا تھا تم سب کچھ جانتی ہو۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہماری زندگی اُس خواب سے کہیں شیریں ہے جس نے مصیبت کی گھڑیوں میں پاربتی یا دیوداس کو اُن کے تباہ شدہ احساسات کی یاد دلا کر کچھ عرصہ کے لئے زندہ رکھا۔ تم تو جانتی ہو کہ میں تمہیں کتنا پیار کرتا ہوں۔

بملا۔ تم مجھے کتنا پیار کرتے ہو یہ تو میں جانتی ہوں۔ مگر میں . . . مگر رومیش ایک دور روز سے مجھے . . . مجھے تم پہ کامل یقین نہیں رہا مجھے خود اپنے آپ پہ اعتماد نہیں رہا۔ میں ڈرتی ہوں۔ رومیش تم مجھے بےحد چاہتے ہو میں جانتی ہوں مگر . . . میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ الفاظ ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ رومیش میرے احساسات کی دنیا میرے لئے معمہ ہے۔

رومیش۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ میں . . .

بملا۔ (بات کاٹ کر) نہیں نہیں مجھے تم پر شک نہیں ہو سکتا۔ تم مجھے دل و جان سے چاہتے ہو۔ سب جانتے ہیں کہ ہم دونوں . . . نہیں نہیں تم مجھے کس قدر پیار کرتے ہو۔

رومیش۔ تمہاری باتیں میرے لئے معمہ ہیں۔

بملا۔ میں خود نہیں جانتی کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں اور کیا کہہ رہی ہوں

رومیش۔ تو پھر تم کہنا کیا چاہتی ہو۔ تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ تمہاری یہ حالت . . . . .

بملا۔ رومیش میں ڈرتی ہوں اور کچھ نہیں۔

رومیش۔ ڈر کس کا۔ میں تمہارے پاس ہوں۔ تمہارا چہرہ زرد کیوں ہو رہا ہے۔

بملا۔ کچھ نہیں۔ تکان محسوس کر رہی ہوں اور کچھ نہیں۔

رومیش۔ ہوش میں آؤ . . . گھبراؤ نہیں . . . میں تم سے . . .

(رومیش کا دوست حمید داخل ہوتا ہے بملا کے چہرے سے تمام گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے گر حمید کی آنکھیں دھوکا نہیں کھاتیں۔ وہ ایک نظر سے بملا کی کیفیت بھانپ لیتا ہے)

حمید۔ دیوداس آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ مسز رومیش میں نے کہا نہ تھا کہ چار بجے پہنچ جاؤں گا۔

بملا۔ آئیے تشریف رکھئے ہم آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے۔

حمید۔ آج کونسی فلم دیکھنے گا۔
رومیش۔ بملا تم چائے کا انتظام کرو۔
حمید۔ ہاں بھابی صاحبہ اٹھئے۔ چائے کے بعد پھر سینما بھی جانا ہے،
بملا۔ مسٹر حمید آپ مجھے بھابی نہ کہا کریں۔
حمید۔ سچ کہہ رہی ہیں آپ؟ (ہنستا ہے)
(بملا چلی جاتی ہے)
رومیش۔ ہاں حمید مجھ کو تمہیں ایک ضروری بات سنانی ہے اب موقعہ اچھا ہے۔
حمید۔ چھوڑو پھر کبھی سہی۔ پہلے بتاؤ آج کونسی فلم دیکھو گے؟
رومیش۔ میرا دل جل رہا ہے اور تمہیں سینما کی سوجھی ہے۔ میں بملا کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔
حمید۔ فرمائیے، بملا کے متعلق میں سب کچھ سننے کو تیار ہوں۔ ایک ایسے شخص کے لئے جس کی ابھی شادی نہ ہوئی ہو اس سے زیادہ لطف انگیز چیز کوئی نہیں کہ وہ شادی شدہ لوگوں کی گھریلو زندگی کے متعلق کچھ سنے۔ میں خود پوچھنے والا تھا۔ آج بملا میں نمایاں تبدیلی نظر آرہی ہے۔
رومیش۔ تو یہ تم نے بھی محسوس کیا۔ مگر تم نے اخذ کیا کیا۔
حمید۔ یہی کہ وہ معمول سے زیادہ خوبصورت نظر آرہی ہے۔
رومیش۔ خدا کے لئے دھیان سے سنو۔ آج بملا کی عجیب حالت ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کبھی کہتی ہے کہ میں ڈرتی ہوں کبھی کہتی ہے کہ تم مجھ سے پریم نہیں کرتے کبھی تکان محسوس کرتی ہے۔ کوئی بات اس کے دل کے اندر مزور چٹکیاں لے رہی ہے مگر زبان پر لانے سے گریز کرتی ہے۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ حمید تم تو جانتے ہی ہو کہ میں اسے کس قدر چاہتا ہوں۔
حمید۔ میرا خیال ہے کہ میں بملا کی پریشانی کو رفع کر سکتا ہوں۔
رومیش۔ کیا اس کے دماغ کا توازن بگڑ گیا ہے۔
حمید۔ نہیں!
رومیش۔ تو پھر اُسے کیا ہو گیا ہے؟
حمید۔ تم ذرا سی دیر کے لئے باہر چلے جاؤ۔ پہلے مجھے یہ دیکھنا ہے کہ بملا کے متعلق جو میرا خیال ہے درست بھی ہے یا نہیں۔
رومیش۔ یہ خیال نہ کرنا کہ میں خدانخواستہ تم پر اعتبار نہیں کرتا مگر کیا ہی اچھا ہو کہ میں بھی یہیں رہوں۔
حمید۔ نہیں بھئی۔ تمہارا جانا ضروری ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔
رومیش۔ (جاتے ہوئے) حمید بھول نا مت۔ بملا ہی میری زندگی کا سہارا ہے۔
(رومیش چلا جاتا ہے۔ حمید پیانو بجانا شروع کر دیتا ہے۔ بملا داخل ہوتی ہے)
حمید۔ معاف فرمائیے میں نے آپ سے اجازت طلب نہیں کی۔
بملا۔ نہیں اس تکلیف کی ضرورت ہی کیا ہے آپ تو بہت اچھا پیانو بجاتے ہیں۔
(ملازم چائے لے کر داخل ہوتا ہے)
بملا۔ میز پر چُن دو۔
(ملازم چائے کے برتن رکھ کر چلا جاتا ہے)
بملا۔ آئیے۔
(دونوں میز کے قریب کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں)
بملا۔ (چائے بناتے ہوئے) رومیش کہاں ہیں میں تو بھول ہی گئی۔
حمید۔ ابھی شانتا دیوی کا ٹیلیفون آیا تھا۔ وہ یہ کہہ کر چلے گئے ہیں کہ میں ابھی آتا ہوں۔
بملا۔ آپ شانتا دیوی کو جانتے ہیں نا! پھر رومیش وہاں کیوں گئے کیا وہ اُسے اچھی طرح نہیں پہچانتے؟
حمید۔ کوئی کام ہو گا لیکن یہ تو معمولی بات ہے۔ زیادہ سوچنا نہیں چاہیئے رومیش ابھی آجائیں گے۔
بملا۔ اگر وہ جلدی نہ آئے تو۔
حمید۔ آپ رومیش سے یہ توقع نہ کریں کہ وہ . . .
بملا۔ نہیں نہیں میں جانتی ہوں کہ وہ مجھے دل و جان سے چاہتے ہیں۔
حمید۔ بھابی صاحبہ آپ رومیش کا بہت خیال رکھتی ہیں۔
بملا۔ میں جو کہہ چکی ہوں آپ مجھے بھابی نہ کہا کریں۔
حمید۔ تو کیا آپ کو مسز رومیش کہہ کر پکارا کروں۔
بملا۔ مجھے بملا کہا کیجئے۔
حمید۔ بملا؟ کیا پیارا نام ہے۔
بملا۔ سچ؟
(خاموشی)

حمید۔ آپ خاموش ہوگئیں۔ کیا سوچ رہی تھیں؟

بملا۔ آپ بھی تو خاموش رہے۔

حمید۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ آپ آج معمول سے زیادہ خوب صورت کیوں نظر آ رہی ہیں۔

بملا۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ آج آپ کے آنے سے میرے دل کی اُداسی بالکل دور ہوگئی۔

حمید۔ تو کیا میرے آنے سے پہلے آپ اُداس تھیں؟

بملا۔ میں بیان نہیں کرسکتی۔ میرے دل کی گہرائیوں سے ایک پریشان کر دینے والی صدا اٹھتی ہے جو میری رگ رگ کو تڑپا دیتی ہے۔ میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ آئیے چلئے باغ کی سیر کریں۔

حمید۔ آپ کے محسوسات کی دنیا ایک میدانِ کارزار بن چکی ہے۔ آپ کی روح کو ایک ایسے واقعہ کی ضرورت ہے جو آپ کو عام طبعی حالت میں لاسکے۔

بملا۔ تو مجھے کیا کرنا چاہئے۔

حمید۔ مجھے؟ بملا وہ صرف آپ ہی کرسکتی ہیں۔

بملا۔ کیا؟

حمید۔ پیاری بملا! روبیش کی دنیا آپ کا پریم ہے۔ اور آپ بھی اُسے پیار کرتی ہیں۔ اگر آپ کو میرا وجود کچھ خوشی دے رہا ہے تو وہ اس لئے کہ آپ کی روح میں تلاطم پیدا ہو چکا ہے اور اب آپ ایسے واقعہ کی تلاش میں ہیں جو آپ کی زندگی کو تبدیل کر دے۔

بملا۔ پیارے حمید۔ آپ سچ کہہ رہے ہیں۔ واقعی آپ کا یہاں آنا میری زندگی کا سب سے بڑا واقعہ ہوگا۔

حمید۔ بملا اگر یہ سب فلموں کا اثر ہے۔ آپ ذکی الحس واقع ہوئی ہیں۔ سینما نے آپ کی پُرسکون دنیا میں اضطراب پیدا کر دیا ہے۔ آپ جانتی ہیں۔ روبیش آپ کو کس قدر پیار کرتا ہے اور آپ کو یہ بھی جاننا چاہئے کہ آپ کی گھریلو زندگی ایسی ہے جو کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔

بملا۔ آپ بتاتے میں کیا کروں۔

حمید۔ بملا، تم اس راز سے اچھی طرح واقف ہو۔

بملا۔ لیکن یہ میرا اور آپکا راز ہو (روبیش داخل ہوتا ہے۔)

روبیش۔ حمید معاف رکھنا میں زیادہ دیر انتظار نہ کرسکا۔

بملا۔ روبیش مجھے گلے لگا لو میں بہت اُداس ہوں۔

روبیش۔ پیاری بملا!

بملا۔ ہاں پیاری بملا تمہاری بملا۔ اب مجھے کوئی ڈر نہیں۔

حمید۔ دیکھئے دیکھئے آپ مجھے تو بھول ہی گئے ہیں۔

بملا۔ روبیش! میرے ساتھ وعدہ کرو کہ ہم کبھی سینما نہ جائیں گے۔

روبیش۔ جیسے تم کہو پیاری۔

بملا۔ دیکھا مسٹر حمید میرا وجود اس اوروں کی طرح نہیں ہے۔

حمید۔ بہروپی! بھابی!

(پردہ)

عزیز الحق مسعود

رباعی

لاتی ہے تمہیں کھینچ کے برسات کی رات
مہمان ہو تم میرے یہی رات کی رات
کھل جاؤ مری جان خدارا مجھ سے
ہر روز کہاں آتی ہے برسات کی رات

سعید احمد اعجاز

احسن الکلام

دل میں سوزِ غم ہیں آنکھوں سے لہو جاری ہے
چمنستانِ محبت کی یہ گُل کاری ہے

ہر نفس آتے ہی جانے کے لئے جاری ہے
زندگی کی تگ و دو موت کی تیاری ہے

دردِ دل کا نہیں کرتا کوئی دنیا میں علاج
چارہ سازی سے مجھے یاس بناچاری ہے

جانِ محزوں سے یہ کہہ کر دلِ وارفتہ چلا
میرا قصہ تو ہوا ختم، تری باری ہے

آتے رہتے ہیں وہی، اُن کی جگہ صورتِ خواب
بے وفاؤں کے خیالوں میں وفاداری ہے

دل میں سب کچھ ہے زباں پر نہیں آتا کچھ بھی
یہ عجب طرح کی مجبوری و مختاری ہے

ہیں طلسماتِ محبت کے مناظر جتنے
فتنہ انگیز نگاہوں کی فسوں کاری ہے

نہ گھٹے سوزشِ دل، لاکھ بڑھے ضبطِ سرشک
آگ پانی میں لگادے یہ وہ چنگاری ہے

ڈھونڈتے کیا ہو خطاکاریٔ احسن کا ثبوت
وہ خطاکار تو خود مجرمِ اقراری ہے

احسن مارہروی

عجائبات کی دُکان

پیٹیرووڈ کی وصیت صاف تھی۔ اس نے اپنے تمام معاملات خود ہی ٹھکانے لگا دئیے تھے۔ لیکن اس کی نفیس لکھنے کی میز پر ایک سربمہر لفافہ دیکھ کر لوگوں کو تعجب ہوا۔ لفافے پر لکھا تھا: "اس خیال سے کہ محققین کی انجمنیں مجھے خواہ مخواہ دق کریں گی۔ میں نے ملفوف مسودہ کسی کو نہیں دکھایا لیکن میرے مرنے کے بعد ہر شخص اس کو پڑھ سکتا ہے۔ جو میرے بہترین علم و یقین کے مطابق ایک سچی کہانی ہے۔"

مسودہ پر پیٹیر کی موت سے تین سال قبل کی تاریخ درج تھی۔ اور نفس مضمون حسب ذیل تھا:۔

مجھے مدت سے اس بات کی تمنا تھی کہ میں اپنی جوانی کے دنوں کا یہ واقعہ سپرد قلم کر سکوں۔ میں اس کی نوعیت کی تشخیص نہ کروں گا اور نہ کسی رائے کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ میں صرف چند واقعات قلمبند کر دوں گا۔ یا یہ سمجھئے کہ واقعات کو اس صورت میں پیش کروں گا جیسا کہ میرے حواس نے انھیں محسوس کیا۔

ایک شام کا ذکر ہے کہ عدالت سے فراغت پا کر میں نہایت آزردگی کے عالم میں اپنے مکان کو لوٹ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کاش اس وقت مجھ میں تھیئیٹر کا ٹکٹ خریدنے کی استطاعت ہوتی۔ ناگاہ میری نظر ایک دکان کی جگمگ کرتی ہوئی کھڑکی پر جا پڑی۔ میں کوئی ماہر عجائبات نہیں لیکن مجھے ان چیزوں سے کسی قدر شغف ضرور ہے۔ میرے حلقۂ احباب میں ایک شادی ہونے والی تھی اور اس موقع پر میرا کوئی نہ کوئی تحفہ پیش کرنا ناگزیر تھا چنانچہ اس خیال کے آتے ہی میں نے دروازے کا دستہ گھمایا اور گھنٹی کی ایک سریلی آواز کے ساتھ اس وسیع اور عجوبہ روزگار اشیاء سے جگمگاتی ہوئی دکان میں داخل ہو گیا۔ چمکتی ہوئی فولادی زرہیں جستی برتن، تاریک اور چہرا بگاڑنے والے آئینے۔ کرسیاں، میزیں۔ الماریاں۔ بلوریں جھاڑ سبھی کچھ تھا لیکن باوجود ان انمل بے جوڑ اشیاء کے اجتماع کے اس دکان میں وہ میلاپن اور گرد آلود تاریکی نہ تھی جو ایسی دکانوں کا خاصہ ہے۔ کمرہ بجلی کی روشنی سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا اور انگیٹھی میں سے تابناک شعلے نکل رہے تھے کمرے کی فضا گرم اور مسرت افزا تھی۔ باہر کے کڑکڑاتے جاڑے اور دھند سے نکل کر یہاں آنے میں مجھے بڑا ہی لطف آیا۔

میرے داخل ہوتے ہی دو نوجوان لڑکیاں جو شکل و شباہت سے ایک دوسری کی بہنیں معلوم ہوتی تھیں اپنی آرام کرسیوں سے اٹھ کھڑی ہوئیں ان کے چمکتے ہوئے مسرور اور شگفتہ چہرے اُن لوگوں سے کس قدر مختلف تھے جن سے دوچار ہونے کی توقع ایسی دکانوں میں ہوتی ہے۔ ان چہروں کی صحیح جگہ تو پھولوں کی دکان ہو سکتی تھی۔

میں نے سوچا "کتنی سلیقہ شعار ہیں یہ لڑکیاں جنھوں نے دکان کو اتنی پاکیزہ اور صاف کر رکھا ہے۔"

ان کے مسکراتے ہوئے چہروں نے مجھ پر نہایت خوش آئند اثر کیا ایک راحت و آسائش کا اثر، اور اگرچہ بڑی لڑکی نہایت ادب و سلیقے کے ساتھ مجھے بیش قیمت اشیا، دکھا دکھا کر ان کے متعلق معلومات بیان کر رہی تھی لیکن مجھے رہ رہ کر اس کے انداز سے ایک شان استغنا کا احساس ہو رہا تھا۔

یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کو میرے کسی چیز کے خریدنے یا نہ خریدنے کی پروا نہیں ہے اور وہ بجائے دکان دار کے ان چیزوں کی محافظ ہے۔

معمولی سی قیمت کا ایک خوبصورت تحفہ میں نے اپنے دوست کے لئے منتخب کر لیا۔ چھوٹی لڑکی نے نہایت چابک دستی سے اسے ایک بادامی کاغذ میں لپیٹ کر باندھ دیا۔ میں نے اس کی بڑی بہن سے کہا کہ میرے پاس پوری نقدی نہیں ہے اور کیا وہ اس کے عوض چیک قبول کرے گی؟

"یقیناً" اس نے جواب میں کہا اور جلدی سے قلم دوات میرے آگے رکھ دی۔

"چک" کا رزکیوریو شاپ" کے نام پر بنا دیجئے"

میں بادلِ ناخواستہ پھر زرد، زرد دھند میں آ گیا۔

"خدا حافظ مجھے آپ کی آمد سے ہمیشہ مسرت ہو گی" لڑکی نے اپنی سُریلی آواز میں کہا۔ اس کی آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ مجھے اپنے مخلص دوستوں میں ایک اور اضافے کا احساس ہو رہا تھا۔

میرا خیال ہے کہ اس واقعے کے تقریباً ایک ہفتے بعد ایک نہایت ہی ٹھنڈی شام کو میں گھر کی طرف جا رہا تھا۔ برف کا باریک سفوف میرے چہرے پر پڑ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا جلد کو چیرتی ہوئی مغز استخواں تک کو منجمد کر رہی تھی کہ یکایک مجھے عجائبات کی دکان کی خوش گوار گرمی یاد آ گئی۔ اور میں نے وہاں جانے کا ارادہ کر لیا۔ حسن اتفاق سے میں اس وقت اسی بازار میں تھا اور بالکل سامنے وہ کونا نظر آ رہا تھا۔ اپنی تمام توقعات کے خلاف میں نے دیکھا کہ دکان پر ایسی بے رونقی چھا رہی ہے جیسے کسی لاش کی بے نور آنکھیں ہوں۔ دروازے کے دستے پر گتے کا ایک ٹکڑا آویزاں تھا جس پر "دکان بند ہے" کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

ہوا کا ایک تند جھونکا کونے پر سے چیختا ہوا نکل گیا اور میری پتلون کے گیلے پائنچے میرے ٹخنوں پر پھٹپھٹانے لگے۔ میں دکان کی گرمی اور روشنی کا کس شدت سے آرزو مند تھا لیکن اس کے خلاف مجھے سخت ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ سیانا سا ہو کر میں نے یونہی دستے کو پکڑ کر جھنجھوڑا۔ حالانکہ مجھے یقین تھا کہ دروازہ مقفل ہو گا لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب دستہ بغیر کسی کوشش کے میرے ہاتھ میں گھوم گیا۔ دروازہ اندر کی طرف کھینچ کر کسی نے کھول دیا۔ اور میں نے اپنے آپ کو دھندلی سی روشنی میں ایک پست قد منحنی سے بڈھے کی طرف گھورتے پایا۔

"براہ کرم اندر تشریف لے آئیے" نرم اور کانپتی ہوئی آواز میں اس نے کہا اور اس کے واپس ہونے کی ہلکی ہلکی قدموں کی چاپ مجھے سنائی دی۔

دکان کے بگڑے ہوئے نقشے کو بیان کرنا میرے امکان میں نہیں۔

میں نے سوچا کہ شاید بجلی کا تار جل گیا ہے کیونکہ اس وسیع کمرے میں صرف دو موم بتیاں اندھیرے کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں اور اس مدھم روشنی میں سامان کا ڈھیر جو پہلے بجلی کی روشنی سے چمک رہا تھا۔ اب عجیب پُراسرار سے سائے چاروں طرف بکھیر رہا تھا۔ آگ بجھ چکی تھی صرف ایک کوئلہ کبھی کبھی وقت چمک کر اس کی گزشتہ زندگی کا ثبوت دے رہا تھا۔ کمرے کی فضا اس قدر ٹھنڈی تھی کہ مجھے آج تک اس سے زیادہ سردی کا تجربہ نہ ہوا تھا۔ "کرۂ زمہریر" کے الفاظ بھی میرا مطلب پوری طرح واضح نہیں کر سکتے اس کے مقابلے میں باہر کی فضا زیادہ خوش گوار تھی۔ کیونکہ اس کڑاکڑاتی سردی میں کچھ فرحت افزا احساس تو تھا۔ اندر کی فضا اس وقت اتنی ہی اداس تھی جتنی اس سے پہلے مسرت افروز تھی۔ بے اختیار میرا دل چاہا کہ یہاں سے بھاگ جاؤں لیکن آہستہ آہستہ تاریکی دور ہونی شروع ہوئی کیونکہ بڈھا جا بجا شمعیں روشن کر رہا تھا۔

"آپ کیا ملاحظہ فرمائیں گے؟" وہ ایک جلتی ہوئی شمع اٹھائے کانپتی ہوئی آواز میں مجھ سے پھر پوچھنے لگا۔ اب میں نے اسے پہلے سے اچھی طرح دیکھا اور اس کی شکل و شباہت نے ایک ناقابل بیان اثر مجھ پر کیا۔ اس کے فرسودہ چہرے پر عجیب سے سائے نظر آ رہے تھے۔

"مجسم خستگی" کے الفاظ ہم نہایت معمولی موقعوں پر استعمال کر دیتے ہیں لیکن جب تک میں نے اس بڈھے کو نہ دیکھا تھا اس کے معانی کا تصور تک میرے دماغ میں نہ آیا تھا۔ اس کے مرجھائے ہوئے چہرے کا ناقابل بیان اضمحلال۔ اس کی آنکھیں جو اس کمرے کی بجھی ہوئی آگ کی طرح بے نور تھیں سوائے ایک مدھم سی چمک کے جو کسی خاص مقصد سے پیدا ہو گئی تھی اور اس کے جسم کا کھوکھلا پن جیسے کسی ڈھانچے پر کھال چڑھا دی گئی ہو۔

معلوم نہیں کیوں "خاک اور راکھ، خاک اور راکھ" کے الفاظ میرے دماغ میں گھومنے لگ پڑے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ اپنی پہلی آمد پر اس جگہ کی صفائی سے جسے ایسی اشیا کی دکانوں سے دور کی مناسبت بھی نہیں ہوتی میں بہت ہی متاثر ہوا تھا۔ اب میرے دل میں یہ عجیب سا خیال پیدا ہوا کہ یہ بڈھا اصل میں اس تمام گرد و غبار کا مجموعہ ہے جسے اس ماحول میں بکھرا ہوا ہونا چاہئے تھا اور حقیقت میں وہ اسی گرد کا مجموعہ معلوم ہوتا تھا اور مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک ہلکی سی پھونک یا انگلی سے چھو لینے سے بکھر جائے گا۔

حُسن و مسرّت کی ان پتلیوں نے کیسا عجیب بڈھا ملازمت میں لے رکھا ہے۔ میں نے سوچا یہ ضرور کوئی پرانا خادم ہو گا۔ جسے انھوں نے از راہ ترحم اپنے دامن سے وابستہ کر رکھا ہے۔

"آپ کون سی چیز ملاحظہ فرمائیں گے؟" بڈھے نے پھر دہرایا۔ اس کی آواز میں لکڑی کے جالے کے ٹوٹنے کی آواز سے کچھ ہی زیادہ قوت ہو گی۔

لیکن اس کے باوجود اس میں ایک ملتجیانہ اصرار محسوس ہوتا تھا اور اس کی آنکھیں اگرچہ پتھرائی ہوئی سی تھیں لیکن اس کے باوجود میں اس کی نگاہوں کی تاب نہ لاسکتا تھا۔ میں وہاں سے نکل آنا چاہتا تھا اور واپسی کا پختہ ارادہ کرچکا تھا۔ اس قابل رحم ہستی کے قرب سے میرا دل بیٹھا جاتا تھا۔ میری روح پر اضمحلال چھا گیا تھا لیکن بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا "مہربانی میں خود اپنے لئے کوئی چیز تلاش کروں گا" عجیب بے اختیاری کے عالم میں میں اس کے پیچھے پیچھے جارہا تھا اور ان مختلف اشیا کا معائنہ کررہا تھا جن پر اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں لرزاں شمع سے روشنی پڑ رہی تھی۔

کمرے کے خوفناک سکوت میں صرف اس کے سلیپروں کی آواز آرہی تھی جو میرے لئے سوہان روح سے کم نہ تھی "آج رات کتنی سردی ہے۔ ہے ناں؟ میں نے اس سکوت سے تنگ آکر کہا۔

"کیا سردی؟ سردی! ہاں ہے تو سہی" اس نے نہایت بے پروائی اور بے تعلقی سے جواب دیا۔

"شاید تم مدت سے اس کام پر متعین ہو؟" میں نے ایک فرسودہ مسہری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بہت، بہت طویل عرصے سے" اس کا جواب ایک ہلکی آہ کی طرح مجھ تک پہنچا۔ اور اس کے الفاظ سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ وقت دنوں ہفتوں مہینوں۔ برسوں پر مشتمل نہیں بلکہ ایک غیر محدود اور بے حد وسیع احساس ہے۔ بڈھے کی ناتوانی اور آزردہ دلی پر معلوم نہیں کیوں مجھے غصہ آرہا تھا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کی فرسودگی ایک بھوت بن کر میری روح پر سوار ہوگئی ہے۔

"کتنے عرصے سے، خدایا! اس کی کوئی حد بھی ہے؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور مزاحًا پوچھا: "بڑھاپے کی پنشن تو اب ملنے والی ہوگی، کیوں؟" لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

خاموشی سے ہم کمرے کی دوسری طرف پہنچ گئے۔

"عجیب چیز ہے یہ" میرے دوست نے ایک بے ہنگم سا مینڈک اٹھاتے ہوئے کہا جو الماری کے ایک خانے میں بہت سی دوسری چیزوں کے درمیان پڑا تھا۔ یہ فیروزے کی قسم کی کسی چیز کا بنا ہوا تھا۔ اور اپنی بدوضعی کی وجہ سے جاذب توجہ تھا۔ میں نے مینڈک بڈھے کے ہاتھ سے لے لیا۔ برف کی طرح سرد تھا۔

میں نے کہا "کسی نے مزاحًا اس صورت میں گھڑا ہے۔ کیا لوگے اس کا؟"

"نصف کراؤن" بڈھے نے مدھم سی آواز میں میرے چہرے کی طرف نظریں اٹھاتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز ایسے سنائی دی جیسے خاک کسی تودے سے ٹوٹ کر پھسل رہی ہو لیکن اس کی سہمی نگاہوں کی چمک ناقابل انکار تھی۔

"بس؟ میں اسے خرید لوں گا۔ کاغذ میں لپیٹنے کی ضرورت نہیں میں یوں ہی اسے جیب میں ڈال لوں گا۔ نصف کراؤن ہی کہا تھا نا تم نے؟ یہ لو!"

بڈھے کے ہاتھ میں سکہ دیتے ہوئے میں نے غیر ارادی طور پر اس کی ہتھیلی کو چھو لیا۔ میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں نے مینڈک کو سرد کہا ہے لیکن اس کا پتھر اس بڈھے کی ہتھیلی کے مقابلے میں دہکتے کوئلے کی طرح گرم کہا جاسکتا ہے۔ میں سردی کے اس درجے کو الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں جو میں نے صرف ایک لمحے کے چھونے سے محسوس کیا

"بیچارا غریب بڈھا" میں نے سوچا "یہ اس سنسان جگہ میں اور اس شدت کی سردی میں کام کرنے کے بالکل قابل نہیں ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ ان جمدل لڑکیوں نے کیوں اس ضعیف بڈھے کو ایسے وقت میں مشقت دے رکھی ہے" "خدا حافظ!" میں نے کہا۔

"خدا حافظ" بڈھے نے جواب دیا "آپ کا بہت بہت شکریہ" اور دروازہ بند کرلیا۔

پھر اسی برف بار فضا سے مقابلہ کرتے ہوئے میں نے ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بڈھے کا جسم قندیل کی روشنی میں ایک سائے کی طرح نظر آرہا تھا۔ وہ چہرے کو دروازے کے شیشے کے ساتھ لگائے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنے گاہک کو رخصت ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

عجیب بات ہے کہ اس بڈھے کا خیال دیر تک میں اپنے دل سے محو نہ کرسکا۔ رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی اور میں اپنے بستر پر لیٹا سونے کی کوشش کررہا تھا لیکن اس کا جھریوں سے بھرا ہوا ویران سا چہرہ اور اس کی سوتی سوتی سی بے نور آنکھیں استفہامیہ انداز سے میری طرف مسلسل گھورتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اس کی شخصیت نے میری طبیعت کو پراگندہ کردیا تھا اور جب آخر کار مجھے نیند آگئی تو میرے خواب بھی اپنے اس نئے دوست سے چھٹکارا حاصل نہ کرسکے۔

اس کی خستگی کا خیال مجھ پر اتنا مسلط تھا کہ میں خواب میں بھی اسے پکڑ پکڑ کر مسہری دار پلنگ پر لٹانے کی کوشش کررہا تھا جو میں نے دکان میں دیکھا

تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ آرام کرے لیکن جوں ہی میں اسے اٹھاتا۔ وہ پلنگ مجھے قبر معلوم ہونے لگتا اور اس کی جالی گھاس کی صورت اختیار کر لیتی جو اس قبر پہ اگا ہوا ہو اور بڈھا میری گرفت سے پھسل کر نیچے آرہتا۔ اور پھر دکان میں گھومنا شروع کر دیتا۔ میں اسے پکڑنے کے لئے اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ دکان وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی تھی لیکن جب میں اس کے قریب پہنچتا، وہ بچ کر دوسری طرف نکل جاتا۔ دکان اور پھیل جاتی دیوں ہی پھیلتی گئی پھیلتی گئی۔ یہاں تک کہ افق کی حدود بھی نظروں سے غائب ہو گئیں اور ایک تاریک وہولناک فضا میں مکان سے چوہا کر میں اس سیاہی نما قبر میں گر پڑا۔

اگلی صبح کو مجھے اپنی والدہ کی طویل علالت کی خبر ملی اور میں ایک ہفتے کے لئے اپنے مکان سے رخصت ہو گیا۔ مریضہ کی تیمارداری میں میں اتنا منہمک رہا کہ عجائبات کی دکان کا واقعہ میرے حافظے سے یکسر محو ہو گیا لیکن جوں ہی مریضہ کی حالت کچھ بہتر ہوئی۔ میں اپنے کلبۂ احزاں کو لوٹ آیا۔

نہایت ہی افسردہ دلی کے ساتھ میں اپنے اخراجات کا جائزہ لے رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آیندہ سہ ماہی کا کرایہ کہاں سے لاؤں گا کہ یکایک میرا ایک ہم مکتب دوست آدھمکا۔ مجھے اس کی آمد سے حقیقی مسرت ہوئی کہ لندن میں یہی ایک میرا اچھا دوست تھا۔ وہ فنون لطیفہ کی اشیاء کی ایک بہت بڑی دکان پر ملازم تھا جو نیلام کا کام بھی کرتی تھی۔

چند منٹ کی گفتگو کے بعد وہ دیا سلائی کی تلاش میں اٹھ کر میری پشت کی طرف آ گیا۔ میں نے دیا سلائی جلانے کی آواز سنی اور اس کے بعد پائپ پر کش لگانے کا احساس ہوا۔ یکایک وہ حیرت زدہ ہو کر چلا اٹھا۔

"خداوندا! ارے یہ تم نے کہاں سے لیا؟"

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کے ہاتھ میں میری اگلے دن کی خرید یعنی وہی عجیب و غریب مینڈک تھا جو اس نے انگیٹھی پر سے اٹھا لیا تھا۔ مجھے اس کا خیال بھی نہ رہا تھا گیس کی لو کے سامنے وہ اسے ایک خوردبین شیشے کے ذریعے سے نہایت غور سے دیکھ رہا تھا اور اس کے ہاتھ فرط جوش سے کانپ رہے تھے۔ "یہ تم نے کہاں سے لیا؟ کیا تمھیں معلوم ہے یہ کیا چیز ہے؟!"

میں نے مختصراً اسے بتایا کہ دوکان سے خالی ہاتھ آنے کے بجائے میں نے اسے نصف کراؤن میں خریدا ہے۔

"نصف کراؤن؟" وہ حیران ہو کر بولا "میرے یار میں حتمی طور پر تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ خوش بختی کا ویسا ہی ایک واقعہ ہے جیسا عام طور پر لوگ قصے کہانیوں میں پڑھتے ہیں۔ اگر میں بالکل ہی بیوقوف نہیں تو میرا یہ اندازہ صحیح ہونا چاہئے کہ یہ مینڈک چین کے خاندان حسیا کے وقت کا ہے اور سچے فیروزے کا بنا ہوا ہے۔"

مجھے کیا معلوم تھا کہ خاندان حسیا کیا بلا ہے اور فیروزہ کس قدر قیمت کی چیز ہے۔ میں نے کہا "کیا تمھارے خیال میں یہ قیمتی چیز ہے؟"

"قیمتی؟ بیوقوف سنو۔ کیا تم یہ سودا میرے سپرد کر سکتے ہو؟ مینڈک مجھے دے دو۔ میں اپنے مالکوں کے ذریعے سے اسے فروخت کر دونگا آج سوموار ہے۔ میں جمعرات کے نیلام میں اسے رکھوا دوں گا۔"

مجھے اپنے دوست پر پورا بھروسہ تھا اس لئے میں نے اس کی تجویز فوراً منظور کر لی۔ اس نے مینڈک کو نہایت احتیاط کے ساتھ روئی میں لپیٹ کر جیب میں ڈال لیا اور رخصت ہو گیا۔

جمعہ کی صبح کو مجھے اپنی زندگی میں سب سے بڑا دماغی صدمہ پہنچا ایسے صدمے ہمیشہ بری خبروں سے نہیں پہنچتے۔ کیونکہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ لفافہ جو اس وقت میری میز پر پڑا تھا کھولتے ہی چند لمحوں کے لئے کمرہ میری نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اس لفافے میں مسرز سپنک کی طرف سے ایک چیک ملفوف تھا جس پر یہ عبارت درج تھی:۔

۲۰۰۰۔۔۔۔ پونڈ حسیا فیروزے کی فروخت سے وصول ہوئے

۲۰۰۔۔۔۔ ۱۰ فی صدی کمیشن وضع کی گئی۔

۱۸۰۰ پونڈ باقی

اور اس کے ساتھ نہایت صفائی سے تہ کیا ہوا ۱۸ سو پونڈ کا چیک میرے اپنے نام کا یعنی "پیٹر وڈ صاحب" کے نام کا ملفوف تھا چند منٹ کے لئے میرا دماغ کلیتہً مختل ہو گیا۔

میرے دوست کے الفاظ نے اتنی امید ضرور بندھا رکھی تھی کہ اس کی فروخت سے ممکن ہے کہ میں آیندہ سہ ماہی کا کرایہ ادا کرنے کے قابل ہو جاؤں بعض اوقات یہ بھی خیال ہوتا تھا کہ شاید میں سال بھر کے کرایے سے سبکدوش ہو جاؤں لیکن اتنی بڑی رقم کا خواب بھی مجھے نہ آسکتا تھا۔ کیا یہ حقیقت تھی۔ یا میرے دوست نے میرے ساتھ ایک نامرغوب مزاح کیا تھا۔ اس خواب کی سی کیفیت کو حقیقت ماننے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ کیا سچ مچ ایسے واقعات کا امکان ہو سکتا ہے؟

میرے ہوش و حواس ابھی بحال نہ ہوئے تھے کہ میں نے اپنے دوست کو ٹیلیفون پر بلایا۔ اس کے متین لہجے اور اس کی دلی مبارکباد نے مجھے اپنی خوش بختی کا یقین دلا دیا۔ چنانچہ یہ نہ مزاح تھا اور نہ خواب۔ میں پیٹر ووڈ جو اس وقت تک بنک سے بیس پونڈ قرضہ لے چکا تھا اور اس کی ضمانت کے طور پر ۱۵۰ پونڈ کی ہنڈیاں گرو رکھ چکا تھا۔ اس وقت سونے کی ۱۸۰۰ اشرفیوں کا مالک تھا۔ میں اپنے قلبی ہیجانات کو دبانے کے لئے بیٹھ گیا اور حالات و واقعات کا جائزہ لینے کی کوشش کرنے لگا۔ تمام تجاویز۔ خیالات اور احساسات میں ایک بات سب سے عیاں تھی اور وہ یہ تھی کہ دکان کی مالکہ کے بھولے پن اور اس کے ملازم کی جہالت سے مجھے ناجائز فائدہ نہ اٹھانا چاہئے۔ میں صرف یاوری بخت کے عذر سے ان کی دولت ہضم نہیں کرسکتا۔ صرف اس لئے کہ میں نے اسے نصف کراؤن میں خریدا ہے۔

آخر میں نے فیصلہ کیا کہ کم از کم نصف رقم مجھے اپنے محسنوں کو واپس کر دینی چاہئے ورنہ میرا ضمیر مجھے ہمیشہ ملامت کرتا رہے گا۔ بالکل اس طرح جیسے میں نے رات کے وقت چوروں کی طرح سینہ لگا کر ان کو لوٹا ہو۔ میرا تصور ان کے حیرت سے کھلے ہوئے منہ ابھی سے دیکھ رہا تھا۔ اس خوشخبری کے سنانے سے کیسا لطف آئے گا۔ میں چاہتا تھا کہ اسی وقت اڑتا ہوا ان کی دکان پر پہنچ جاؤں لیکن آج خوش قسمتی سے مجھے ایک مقدمے میں بھی پیش ہونا تھا۔ اس لئے عدالت جانے پر مجبور تھا۔ مسز زسینک کا چیک میں نے اپنے بنک کو بھیج دیا اور پھر اپنی چیک بک اٹھا کر ایک چیک ۹۰۰ پونڈ کا سونے کی عجائبات کی دکان کے نام لکھا۔ یہ میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا تاکہ عدالت سے لوٹتے ہوئے ان کی دکان پر دیتا آؤں

عدالت سے مجھے کافی دیر سے فراغت ملی اور جب میں دکان پر پہنچا تو دروازے کے ساتھ "دکان بند ہے" والا مایوس کن بورڈ دیکھ کر مجھے زیادہ حیرت نہ ہوئی۔ ممکن ہے بڈھا ملازم اب بھی اندر ہو لیکن اس وقت مجھے اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ مجھے تو دکان کی مالکہ سے ملنا تھا۔ چنانچہ میں ملاقات کو دوسرے دن پر ملتوی کر کے آگے قدم اٹھانے ہی والا تھا کہ یکایک جیسے کوئی میرا منتظر ہو دروازہ کھلا اور میرے عین سامنے ہی بڈھا کھڑا تاریکی میں گھور رہا تھا۔

میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمائیے جناب؟"

اس کی آواز پہلے سے بھی زیادہ عجیب تھی مجھے محسوس ہوا کہ میں اس بڈھے کی ملاقات سے دیدہ و دانستہ کترا تا ہوں لیکن بے اختیارانہ میں پھر دکان میں داخل ہو گیا۔ اندر کی فضا اب بھی ویسی ہی ناخوش گوار اور سرد تھی جیسی کہ میری سابقہ آمد کے وقت تھی۔ میں سچ مچ کانپ رہا تھا بہت سی شمعیں جو بظاہر ابھی روشن کی گئی تھیں آہستہ آہستہ جل رہی تھیں ان کی مدھم روشنی میں بڈھے کی ہیبتناک آنکھیں استفہامیہ انداز میں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کا چہرہ ؟ خدا بچائے میں نے اس کے ساحرانہ نقوش کے بیان میں مبالغہ نہ کیا تھا۔ میں نے اپنی تمام عمر میں ایسا یکتا اور عجیب چہرہ نہ دیکھا تھا اور اگر میں تمام رات اسے خواب میں دیکھتا رہا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ کاش کہ وہ اس وقت دروازہ نہ کھولتا۔

"کوئی چیز جسے میں ملاحظے کیلئے پیش کرسکوں؟" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"شکریہ میں کچھ نہیں دیکھوں گا۔ میں اس چیز کے ضمن میں آیا ہوں جو تم نے اگلے روز میرے ہاتھ فروخت کی تھی۔ وہ بہت قیمتی شے ثابت ہوئی ہے اپنی مالکہ سے کہہ دینا کہ میں کل آکر اس کی مناسب قیمت ادا کر دوں گا۔"

جوں ہی میں نے یہ الفاظ کہے بڈھے کے چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ کھیل گئی۔ "مسکراہٹ" کا لفظ میں صرف اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ اس سے بہتر کوئی لفظ نہیں ملتا۔ میں حسن کی اس بے مثال کیفیت کو کن لفظوں میں بیان کروں جو اس کے بوسیدہ خط و خال میں نمایاں ہو رہی تھی۔ مسرت و اطمینان، بے پایاں مسرت جیسے قدرتی برف دھوپ میں پگھل رہی ہو اور اس کی مسرت و کامرانی کے چشمے پھوٹ رہے ہوں۔ اس سے پہلے میں نے غموم و ہموم کی یخ بستہ تہوں کو پگھلتے نہیں دیکھا تھا۔ فتح و کامرانی کے آفتاب کی شعاعوں تلے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وقت ٹھہر گیا ہے اور تمام اشیاء بے پایاں ہو گئی ہیں یکایک ایک گھڑی کی گر ر ر ر ر کی آواز جو گھنٹہ بجانے سے پہلے آتی ہے میرے کان میں آئی اور میں اسے دیکھنے کے لئے پیچھے کی طرف مڑا۔ ایک نہایت ہی خوب صورت دیوار گیر گھڑی نے جو پرانے زمانے کی فن کاری کا بہترین نمونہ تھی میری توجہ کو مرکوز کر لیا۔ اس کے ڈائل کے کسی پوشیدہ خانے سے عجیب و غریب پتلیاں نمودار ہوئیں۔ ان میں سے ایک تو گھنٹہ بجاتی تھی اور باقی ناچتی ہوئی گزر جاتی تھیں۔ میری نظریں اس حسین نظارے پر اس وقت تک جمی رہیں جب تک آخری گھنٹہ نہ بج لیا۔ اب میں نے اپنا رخ پھیرا۔ میں اکیلا تھا۔

بڈھا غائب ہو چکا تھا۔ میں نے دکان کے چاروں کونوں میں نگاہیں دوڑائیں لیکن اسے موجود نہ پایا۔ عجیب بات ہے کہ آگ جسے میں اب تک بجھا ہوا سمجھ رہا تھا پھر چمک اٹھی تھی اور مسرت افزا شعاعیں چاروں طرف بکھیر رہی تھی۔ آگ اور شمعوں کی مجموعی روشنی میں بھی بڈھے کا کہیں سراغ نہ ملتا تھا۔ وہ سچ مچ غائب ہو گیا تھا۔

"بابا! او بابا!" میں نے دو دفعہ پکارا

صدائے برنخواست گھڑیوں کی ٹک ٹک یا آگ کے پٹاخوں کی

آواز کے علاوہ اس سکوت کو توڑنے والی اور کوئی چیز نہ تھی۔ میں نے تمام کمرے میں گھومنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ مسہری میں جھانک کر بھی دیکھ لیا جس کا کابوس خواب میں بھی مجھ پر سوار رہا تھا۔ دکان کے ساتھ ہی ایک اور چھوٹا سا کمرا ملحق تھا۔ میں نے شمع اٹھائی اور اس طرف چل دیا۔ وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ دکان کے آخری سرے پر ایک سیڑھی تھی جو شاید اس گیلری کو جاتی تھی جو کمرے کے چاروں طرف بنی ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ بڈھا ضرور کہیں اوپر کی منزل میں چلا گیا ہے۔ چنانچہ میں نے اس کا پیچھا کرنے کا تہیہ کر لیا۔ میں ٹٹولتا ہوا سیڑھی کے پاس پہنچ گیا اور آہستہ آہستہ اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ سیڑھی کے زینے میرے بوجھ سے کراہتے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور مجھے بوسیدہ لکڑی کے ٹوٹنے کا احساس ہو رہا تھا۔ میری شمع بجھ گئی اور مکڑی کے جالے میرے چہرے پر لپٹ گئے۔ میں نامرغوب جدوجہد کو ترک کر کے نیچے اتر آیا۔

آخر مجھے ضرورت ہی کیا ہے۔ بڈھے کو جھینپنے دو۔ میں نے اپنا پیغام دے دیا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اب رخصت ہو جاؤں۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ دکان اب خوب گرم اور خوش گوار ہو گئی ہے۔ مجھے یہی فضا پہلے ناگوار کیوں گزری تھی۔ دکان سے نکلنے کو اب میرا دل نہ چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ایک دفعہ پھر وہی مسرور چہرہ دیکھوں اس عجیب بڈھے سے پھر ملوں جس سے اب مجھے ایک طرح کا انس ہو گیا تھا میرا یہ خیال کیوں تھا کہ وہ کریہہ المنظر اور خوفناک ہے؟

آئندہ ہفتے کے روز مجھے کوئی مصروفیت نہ تھی اور میں براہ راست دکان پر جا سکتا تھا۔ راستہ بھر میں یہی سوچتا رہا کہ دونوں بہنیں کس مسرت سے میرا استقبال کریں گی۔ جوں ہی دروازہ کھولنے سے گھنٹی بجی۔ دونوں لڑکیاں جو اپنی اشیاء کو جھاڑ پونچھ رہی تھیں سر اٹھا کر دیکھنے لگیں کہ ایسے بے وقت کون آ گیا ہے۔ مجھے پہچان کر دونوں نے سر جھکا کر آداب عرض کہا لیکن اسی طریقے سے جیسے کوئی کسی معمولی شناسا سے کہتا ہے۔

اس افسانہ نما حقیقت کے بعد مجھے ان کے موجودہ سرد مہرانہ طرز عمل کی ہرگز توقع نہ تھی۔ چنانچہ مجھے یقین ہو گیا کہ ابھی تک وہ پیغام انھیں نہیں ملا۔ اور جب میں نے کہا "یہ رہا آپ کا چیک" تو میرے خیال کی تصدیق ہو گئی وہ میرے چہرے کی طرف یوں دیکھنے لگیں جیسے میرا مطلب ہی نہیں سمجھیں۔

"چیک؟" بڑی لڑکی نے حیرت سے پوچھا "کونسا چیک؟"

"اس مینڈک کی قیمت میں جو میں نے اگلے روز یہاں سے خریدا تھا"

"مینڈک کیسا؟ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ نے چاندی کی ایک طشتری خریدی تھی۔"

اب مجھے معلوم ہوا کہ انھیں کسی بات کا علم ہی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ میرے دوبارہ آنے تک کو نہیں جانتیں۔ چنانچہ آہستہ آہستہ میں نے انھیں تمام کہانی سنا دی۔ وہ حیرت و استعجاب میں غرق ہو گئیں۔

"لیکن میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا بالکل کچھ نہیں آتا" بڑی لڑکی نے حیرانی سے کہا۔

"ہومز کو تو ہماری غیر حاضری میں کسی کو اندر بلانے تک کی اجازت نہیں۔ خرید و فروخت تو الگ رہی۔ وہ تو چوکیدار کی حیثیت سے صرف ان ایام میں آتا ہے جب ہم دکان ذرا پہلے بند کر دیں اور پھر جب پولیس کا پہرہ شروع ہو جائے تو اس کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ اس نے آپ کو اندر بلا لیا ہو اور اس نے کوئی چیز بیچنے کے متعلق بھی ہم سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ تو بالکل ہی عجیب بات ہے۔ اس وقت کیا بجا ہو گا؟"

"میرا خیال ہے کوئی سات بجے کا وقت ہو گا" میں نے جواب دیا

"عام طور پر وہ ساڑھے چھ بجے رخصت ہو جاتا ہے لیکن شاید اس روز پہرہ دار دیر سے پہنچے ہوں۔"

"لیکن کل تو میں اس سے بھی زیادہ دیر سے آیا تھا۔"

"کیا آپ کل بھی آئے تھے؟"

میں نے مختصراً اسے کل کا واقعہ کہہ سنایا اور یہ بھی بتا دیا کہ میں ان کے نام پیغام چھوڑ گیا تھا۔

"عجیب ناقابل قبول بات ہے مجھے اس کی سمجھ ہی نہیں آتی۔ بہرحال میں ابھی اس سے جواب طلب کرتی ہوں۔ اب وہ آیا ہی چاہتا ہے۔ ہر صبح وہ فرش صاف کرنے کے لئے آتا ہے۔"

اس بڈھے کو دوبارہ دن کی روشنی میں دیکھنے کی امید سے میری طبیعت میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ کیا وہ پھر مسکرائے گا؟

"وہ بہت ہی معمر ہے، ہے ناں؟" میں نے پوچھا۔

"معمر؟ وہ جوان تو واقعی نہیں ہے لیکن اس کا کام بھی تو معمولی ہے۔ وہ نہایت ایماندار اور شریف انسان ہے۔ مجھے اس کی اس حرکت کی سمجھ ہی نہیں آئی۔ میرا خیال ہے کہ ہم کچھ عرصے سے اشیاء کی فہرستیں بنانے میں سستی سے کام لے رہے ہیں۔ میں حیران ہوں کہیں وہ اس طرح چھوٹی موٹی چیزیں بیچتا تو نہیں رہتا۔ میرا دل نہیں مانتا۔ کیا آپ کو کچھ یاد ہے کہ یہ مینڈک کس جگہ

پڑا تھا۔"

میں نے الماری کے اس خانے کی طرف اشارہ کیا جس میں سے چوکیدار نے فیروزے کا مینڈک اٹھایا تھا۔

"اوہ اُن اشیا میں سے۔ میں نے اگلے ہی روز یہ تمام چیزیں برائے نام قیمت پر خریدی تھیں۔ ابھی میں نے ان کو چھانٹا بھی نہیں لیکن مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ان میں کوئی فیروزے کا مینڈک میں نے دیکھا ہو۔ وہ کہاں سے آ گیا؟"

یکایک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اس نے آلے کو کان سے لگالیا اور بولی،

"ہیلو ہیلو! ہاں میں ہی مس ولٹن ہوں مسز ہومز کیا بات ہے؟"

چند لمحوں تک وہ سنتی رہی اور پھر تعجب سے بولی "مر گیا۔ مر گیا؟ لیکن کیسے؟ کیوں؟ اوہ مجھے نہایت ہی رنج ہوا ہے۔"

چند ایک اور باتیں ہوئیں اور پھر اس نے آلہ رکھ دیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

"سنا آپ نے؟ بیچارا ہومز۔ ہمارا چوکیدار مر گیا ہے کل شام جب وہ یہاں سے لوٹا تو درد کا شدید دورہ اٹھا اور نصف رات کے قریب گیا حرکت قلب بند ہو گئی کسی کو خیال تک نہ تھا کہ وہ مریض ہے۔ آہ بیچاری بیوہ اب وہ کیا کرے گی۔ ہمیں فوراً تعزیت کے لئے جانا چاہئے۔"

دونوں لڑکیاں ملول سی ہو گئیں۔ چنانچہ میں دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔ بڈھے کی ہستی شخصیت نے مجھ پر اتنا گہرا اثر کیا تھا کہ میں اس کی صورت کو اپنے دل سے کسی طرح محو نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ مجھے اس کی موت کا بھی بے انتہا صدمہ ہوا۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ اس کی بیوی کے علاوہ میں ہی تنہا ایسا شخص تھا جس نے آخری مرتبہ اس سے گفتگو کی تھی میرا خیال ہے کہ اس مہلک درد کے دورے نے اسے میری موجودگی ہی میں آن لیا تھا۔ اسی لئے وہ یکایک مجھے اکیلا چھوڑ کر چل دیا تھا۔ کیا اسی وقت موت کے بے رحم ہاتھوں نے اسے اپنی گرفت میں دبوچ لیا تھا اور اسے اپنے انجام کا علم ہو گیا تھا۔ آہ، اس کی وہ بے مثال نورانی مسکراہٹ! کیا وہ اسی امن و سکون کی نشانی تھی جو اس پر وارد ہونے والا تھا۔

دوسرے دن میں پھر وہاں موجود تھا۔ میں نے اس مینڈک کی فروخت کی تمام تفصیلات انھیں بتا دیں اور پھر اپنا چیک پیش کر دیا لیکن انھوں نے غیر متوقع طور پر بہت ہی اصرار کے ساتھ واپس کر دیا۔ وہ کسی طرح بھی اسے قبول کرنے پر رضامند نہ ہوئیں اور کہنے لگیں یہ تمام رقم تمھاری ہے۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔

"بات یہ ہے کہ میرے والد اپنے کاروبار میں استاد مانے جاتے تھے مس ولٹن نے کہا۔" اور انھوں نے اس تجارت میں لاکھوں کمائے تھے جب وہ بڑھاپے کی وجہ سے بہت نحیف ہو گئے۔ تو ہم نے اس محبت کی وجہ سے جو انھیں اپنے کاروبار سے تھی دکان کو بند نہ کیا اور صرف ایک شغل کے طور پر اسے جاری رکھا۔ ہم اس کاروبار سے منافع حاصل کرنا نہیں چاہتے"

بہرحال میں یہ روپیہ انھیں دینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس بہانے سے کہ اگر وہ خود اس رقم کو رکھنا مناسب نہیں سمجھتیں تو کسی خیراتی ادارے میں حصول ثواب کے خیال سے دے دیں اور اس طرح اس جھگڑے کو ختم کر کے میرے دل کو کسی قدر اطمینان حاصل ہوا۔

اس مینڈک کے عجیب و غریب اور اتفاقیہ واقعے نے ہمارے تعلقات کو استوار کر دیا اور ہم بالکل دوستوں کی طرح ہو گئے۔ اب میں اکثر اس راہ سے گزرتا ہوا گھڑی دو گھڑی کے لئے ان کی مزاج پرسی کے لئے دکان میں جا بیٹھتا۔ درحقیقت یہ ہے کہ ان دو لڑکیوں کے خلوص و محبت پر مجھے ایک قسم کا بھروسہ ہو گیا اور بے تکلفی کے سے تعلقات قائم ہو گئے۔ ابھی تک اس بڈھے کے تاثرات میرے دل میں موجود تھے اور میں اکثر لڑکیوں سے اس کی بابت کوئی نہ کوئی بات پوچھ ہی بیٹھتا تھا لیکن کوئی غیر معمولی دلچسپی کی بات مجھے کبھی معلوم نہ ہوئی۔ وہ ہمیشہ اسے نیکی سے یاد کرتیں کیونکہ جب سے انھوں نے ہوش سنبھالا تھا تب ہی سے وہ ان کے باپ کے پاس ملازم تھا۔ اس کے مینڈک بیچنے کے معاملے پر کوئی مزید روشنی نہ پڑی اور یہ قدرتی بات تھی کہ وہ اس معاملے میں اس کی بیوہ سے باز پرس نہ کرنا چاہتی تھیں۔

ایک شام کا ذکر ہے کہ میں بڑی لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوا اندرونی کمرے میں چائے پی رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ تصویروں کا ایک مرقع دیکھتا جاتا تھا۔ اوراق پلٹتے ہوئے مجھے ایک ایسی تصویر نظر آئی جو حیرت انگیز طور پر اس بڈھے سے مشابہت رکھتی تھی۔ تمام خط و خال بدرجہ غایت مرحوم سے مماثلت رکھتے تھے لیکن ظاہر تھا کہ یہ تصویر کئی سال قبل کی ہے چہرہ بھرا بھرا تھا اور ابھی اس میں وہ بوسیدگی ضعف اور نقاہت نہ آئی تھی جس نے مجھ پر اتنا اثر کیا تھا لیکن کس قدر خوبصورت تھیں اس کی آنکھیں یقیناً اس شخص میں کوئی نہ کوئی غیر معمولی بات تھی۔ میں اس مدھم سی تصویر کی طرف گھور رہا تھا۔

"بڈھے ہومز کی یہ کیسی اچھی تصویر ہے" میں نے کہا۔

"ہومز کی تصویر؟ میں نے تو کبھی نہیں دیکھی۔ دکھائیے نا" لڑکی نے کہا جوں ہی میں مرقع لے کر اٹھا چھوٹی لڑکی نے پچھلے دروازے سے اندر

کو جھانکا اور بولی :۔

"میں سینما جا رہی ہوں ۔ والد نے ابھی ٹیلیفون پر کہا ہے کہ وہ پاؤ گھنٹے تک یہاں پہنچیں گے اور الماری ملاحظہ کریں گے ۔"

"اچھا میں یہیں ہوں اور اس کے متعلق ان کی رائے معلوم کر کے مجھے بے انتہا مسرت ہو گی ۔" یہ کہتے ہوئے مس ولٹن نے میرے ہاتھ سے تصاویر کا مرقع لے لیا۔ اس صفحے پر اور بھی بہت سی تصویریں چھپی ہوئی تھیں ،

"ہومز کی تصویر کہاں ہے ؟"

میں نے اس تصویر کی طرف اشارہ کیا ۔

"یہ ؟" اس نے حیرت سے کہا ۔ "یہ تو میرے والد کی تصویر ہے ۔"

"آپ کے والد کی ؟"

"میرے والد اور ہومز کی شکل و شباہت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ شاید دکان میں اس وقت بہت ہی تاریکی ہو گی جب آپ نے اسے دیکھا"

"ہاں ۔ ہاں تاریکی تو کافی تھی" سوچنے کا موقع حاصل کرنے کے لئے میں نے جلدی سے کہا ۔ کیونکہ میں خود سخت متعجب ہو رہا تھا۔ تاریکی خواہ کتنی زیادہ ہو لیکن میں ایسی غلطی تو نہ کر سکتا تھا ۔ مجھے اب بھی اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ تھا کہ جس شخص کو میں نے بطور چوکیدار دکان میں دیکھا تھا یہ اُسی کی تصویر ہے لیکن اس حیرت انگیز معاملے کی توضیح کیسے ہو ۔

اس کا باپ ؟ اگر واقعی اس کا باپ تھا تو وہ اپنی لڑکیوں کی لاعلمی میں دکان میں اکیلا کیوں آتا اور پھر سینڈک والے سودے کو ان سے پوشیدہ کیوں رکھتا ؟ اور جب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ سینڈک غیر معمولی قدر و قیمت کی چیز ہے تو اس نے اپنی لڑکیوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کیوں رہنے دیا کہ یہ مرحوم ہومز کی کارستانی تھی ؟

کیا وہ اپنی جہالت پر پردہ ڈالنا چاہتا تھا اور ندامت کے مارے اپنی غلطی کا اقبال نہ کرنا چاہتا تھا ؟ یا ممکن ہے ۔ لڑکیوں نے ہی اسے نہ بتایا ہو اور اس روپے کو اس سے پوشیدہ رکھا ہو کیتنی پُر اسرار خاندانی سازش ہے جس میں اتفاقیہ طور پر مجھے بھی دخل حاصل ہو گیا ہے ۔ اگر باپ نے جان بوجھ کر یہ بات پوشیدہ رکھی ہے تو مجھے بھی اس معاملے میں اپنی زبان روک لینی چاہئے چھوٹی لڑکی نے ابھی اس کے آنے کی اطلاع دی تھی ۔ کیا وہ مجھے پہچان لے گا ؟

"چہرے کے خط و خال کتنے خوش نما ہیں" میں نے متانت اختیار کرتے ہوئے کہا ۔

"واقعی ؟" اس نے مشتاقانہ انداز سے خوش ہوتے ہوئے کہا ۔ "والد کے چہرے سے دانائی اور عزم کا اظہار ہوتا ہے ۔ مجھے وہ وقت یاد ہے جب یہ تصویر اتاری گئی تھی ۔ اس سے کچھ ہی روز بعد ان کا رجحان مذہب کی طرف ہو گیا تھا" لڑکی مذہب کا نام اس طرح لیتی تھی جیسے اس نامرغوب حالت کا وارد ہونا باعث ہتک ہے ۔

"کیا وہ یکا یک مذہب کی طرف بہت زیادہ راغب ہو گئے تھے ؟"

"ہاں" اس نے متاملانہ انداز میں کہا ۔ "بیچارے والد ایک پادری کے دوست بن گئے اور اس قدر بدل گئے کہ پھر کبھی ان میں وہ پرانی باتیں واپس نہ آئیں ۔"

لڑکی کی رکتی ہوئی گفتگو سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ شاید اس کے باپ کا دماغی توازن درست نہیں رہا ۔ میرے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اس کی تاویل بھی اب ہوتی جا رہی تھی ۔ اُن دو موقعوں پر جب کہ میں نے اسے دیکھا ہے ۔ غالباً اس کے ہوش و حواس قائم نہ تھے ۔

"کیا مذہبیت نے ان کی طبیعت کو افسردہ اور مغموم کر دیا تھا ؟" میں نے جرأت سے کام لیتے ہوئے پوچھا ۔ میری خواہش تھی کہ اس شخص سے ملنے سے پہلے میں اس کی طبیعت سے کسی قدر واقفیت حاصل کر لوں ۔

"ہاں ، ان پر بے انتہا افسردگی چھا گئی تھی" لڑکی کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو ڈبڈبا آئے ،

"معاملہ یہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اصل میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" وہ کسی قدر متامل ہوئی لیکن پھر ایک نظر میری طرف دیکھ کر بولی "کوئی وجہ نہیں کہ میں آپ سے اس بات کو چھپا دُں ۔ اب ہم آپ کو اپنا حقیقی دوست تصور کرتے ہیں ، والد کو ایک وہم سا ہو گیا کہ ان سے ایک بہت بڑا گناہ سرزد ہوا ہے ۔ وہ اپنے ضمیر کو کسی طرح مطمئن نہ کر سکتے تھے ۔ میں آپ کو ان کی غیر معمولی کاروباری قابلیت کے متعلق بتا چکی ہوں ؟ ہاں تو ان کی تمام دولت خوش قسمتی کے تین اتفاقی واقعات کے باعث بنی جو کاروباری سودوں کے ضمن میں پیش آئے خوش قسمتی کے بالکل ایسے ہی اتفاقات جیسا کہ آپ کو پیش آیا ہے ۔ اور اسی لئے میں آپکو یہ سب کچھ بتا رہی ہوں ۔ کیا دونوں واقعات کا یہ تطابق حیرت انگیز نہیں ؟" وہ رک گئی ۔

"میں ہمہ تن گوش ہوں" میں نے کہا ۔

"ہاں تو تین مختلف موقعوں پر والد نے چند شلنگ کے عوض میں بے انتہا قیمتی اور انمول چیزیں خرید یں ۔ آپ کے واقعے کے مقابلے میں

فرق صرف یہ تھا کہ انھیں خریدتے وقت ان اشیار کی قدر و قیمت خوب معلوم تھی اور جو روپیہ انھیں ان کی قیمت میں وصول ہوا وہ غیر متوقع نہ تھا لیکن بخلاف آپ کے انھوں نے اس دولت میں سے ان لوگوں کو کچھ نہ دیا جنھوں نے اپنا خزانہ کوڑیوں کے مول لٹا دیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ دکان داروں میں یہ خبط یہی مفقود ہوتا ہے۔ آپ مجھ سے متفق ہیں ناں؟" اس نے کسی قدر درشت لہجے میں کہا۔

"خیر اس کے بعد والد امیر سے امیر تر ہوتے گئے۔ اس واقعہ کے کئی سال بعد ان کی ملاقات اس پادری سے ہوئی اور ان کی طبیعت میں اضمحلال آنا شروع ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ ہماری دولت چوری کے مال پر مشتمل ہے انھیں اس بات کا نہایت غم تھا کہ کیوں انھوں نے ان لوگوں کی ناواقفیت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کی قیمتی اشیار کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ جب والد نے تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ اُن کے تینوں "شکار" مفلسی اور ناداری میں فاقوں سے مرے ہیں۔ اس انکشاف نے والد کو اور زیادہ پژمردہ کر دیا۔ ان میں سے دو شخص بے اولاد مرے تھے۔ اور ان کے کسی رشتہ دار کا پتہ نہ مل سکا۔

تیسرے شخص کے بیٹے کا پتہ امریکہ میں ملا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بھی کوئی وارث چھوڑے بغیر مر گیا ہے۔ چنانچہ بے چارے والد کے پاس اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا۔

یہ غم کابوس کی طرح ان پر سوار ہو گیا۔ یہاں تک کہ بے چارے کا دماغ صحیح نہ رہا۔ جوں جوں مذہب کی گرفت مضبوط ہوتی جاتی ان کے دماغ میں یہ خیال راسخ ہوتا جاتا اور آخر ایک مستقل جنون بن گیا۔ "عمل صالح کا کمتر درجہ یہ ہے۔" والد کہتے "کہ کسی دوسرے شخص کو عمل صالح کرنے کا موقع بہم پہنچایا جائے" "ہمارے لئے گناہوں کے لئے ہر مرتبہ مسیح کو صلیب پر چڑھنا پڑتا ہے۔" "مجھے کم از کم تین ایسے اچھے کام کرنے چاہئیں جو میرے برے کاموں کی نوعیت کے ہوں۔ اس کے علاوہ کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے کہ میں مسیح کے حضور میں سرخروئی حاصل کر سکوں۔"

ہم بہتیرا سمجھاتے کہ جن حالات میں انھوں نے یہ کام کئے دنیا کا ہر فرد بشر ایسا ہی کرتا۔ وہ جواب دیتے "دوسرے لوگ اپنے اعمال کے لئے خود ذمہ دار ہیں اور میں نے جو کام کیا ہے اس کے متعلق مجھے یقین ہے کہ گناہ تھا۔" ان کے خیالات اور زیادہ پختہ ہوتے گئے۔ اور آخر کار انھوں نے مذہبی جنون کی صورت اختیار کر لی۔

والد نے اس بات کا تہیہ کر لیا کہ دنیا میں سے تین ایسے شخص ڈھونڈ نکالیں گے جو اپنے نیک اعمال کی وجہ سے ان تین گناہوں کو دھو ڈالیں جو ان سے سرزد ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ ایسی قیمتی اشیار تلاش کرنے میں مشغول ہو گئے جو بظاہر بے حقیقت معلوم دیں اور جنھیں وہ چند ٹکوں کے عوض فروخت کر سکیں۔ مجھے ان کی وہ مسرت آج تک نہیں بھولتی جب ایک دن ایک شخص پانچ شلنگ میں خریدا ہوا برتن لے کر واپس آیا اور بولا "یہ پانچ سو پونڈ کا ہے میرا خیال ہے کہ آپ نے غلطی سے مجھے پانچ شلنگ میں دے دیا۔" بالکل اسی طرح جس طرح تم چیک لے کر آئے تھے۔ خدا تمھیں خوش رکھے۔

اس واقعے کے پانچ سال بعد پھر ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ اور والد کی مسرت کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ انھیں محسوس ہوا کہ ان کے دو گناہ دُھل گئے۔ اس کے بعد سالہا سال یاس اور ناامیدی میں گزر گئے۔ وہ کہا کرتے تھے "اس وقت تک مجھے چین نہ آئے گا جب تک میں تیسرا آدمی تلاش نہ کر لوں گا۔"

لڑکی نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ "آہ۔ اب وقت گزر چکا تھا۔ اب کیا ہوتا تھا۔"

اتنے میں دروازے کی گھنٹی بجی۔

"آپ کے والد کو کتنا صبر آزما انتظار کرنا پڑا! میں خوش ہوں کہ خوش قسمتی سے تیسرا آدمی میں نکلا۔"

اس نے اپنے دونوں ہاتھ چہرے سے ہٹا لئے اور میری طرف غور سے دیکھنے لگی۔

"اور میں خوش ہوں کہ میں ان سے پھر مل رہا ہوں۔" میں نے قدموں کی چاپ سن کر کہا۔

"والد سے؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں، ہاں، اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی اُن سے مل لوں آپ کی ہمشیرہ نے ابھی کہا تھا نا کہ وہ تشریف لا رہے ہیں؟"

"اوہو! آپ غلط فہمی میں مبتلا رہے۔ یہ اُس کے والد ہیں۔ ہم سوتیلی بہنیں ہیں۔ میرے والد کو مرے سات سال ہوئے ہیں +

سینتھیا اسکوئتھ

مظفر احمد

غزل

پھر آ گئے میکدے میں ساقی گئے تھے جو دل پہ داغ لے کر
وہ تشنۂ التفات بیٹھے ہوئے ہیں خالی ایاغ لے کر

کچھ ایسی منظور ہے زمانے کو منزلت تیرے قیدیوں کی
قفس میں اُن کی خوشی کی خاطر بہار آتی ہے باغ لے کر

وُہ حُسن جن کا تھا شمعِ محفل، وہ بے نشاں زیرِ خاک ہیں اب
تلاش میں اُن کی حسرت آتی ہے جگنوؤں کے چراغ لے کر

نہ دل میں وہ جوشِ آرزو ہے نہ سر میں سودائے ہاؤ ہو ہے
اُداس بیٹھا ہے ساقیٔ منتظر شکستہ ایاغ لے کر

چمن میں ہے چاک سینۂ گل، غم آفریں ہے نوائے بلبل
فلک پہ آوارہ ہے قمر بھی جگر پہ فرقت کا داغ لے کر

بیگم مسعود شاہد

خدا ہو جانا

جوشِ الفت میں وہ قطرے کا فنا ہو جانا
اُس پہ دریا کا، وہ لب تشنہ سوار ہو جانا

کوئی انداز ہے! رہ رہ کے خفا ہو جانا
اپنے بندوں سے۔ یہ کہنا کہ خدا ہو جانا

ضبطِ غم سے مری آہوں کے شرارے کجلائے
بے ہوا۔ کام ہے شعلے کا فنا ہو جانا

اپنے نیرنگیٔ انداز کا اعجاز تو دیکھ
ابھی شوخی بھی ابھی اس کا حیا ہو جانا

اس زمانے میں نہیں کوئی کسی کا ہمدرد
دل کے دو حرف ہیں۔ اُن کو بھی جدا ہو جانا

ضعف سے اٹھ نہیں سکتا تیرا بیمار فراق!
اے اجل! تو ہی کرم کرکے ذرا۔ ہو جانا!

شاعرِ زار نہیں کوئی بھی معیار مرا
پھر بھی مشہور ہے کھوٹے کا کھرا ہو جانا

آغا شاعر قزلباش دہلوی

غزل

بیٹھا ہوں میں جو وادیٔ غربت میں گھر سے دور
دل سے قریں ہیں اہلِ وطن اور نظر سے دور

اے کیف اُن کی مست نگاہوں میں چھپ کے آ
اے دردِ دم زدن میں ہو میرے جگر سے دور

اک دن اُلٹنے والی ہے زاہد بساطِ زُہد
کب تک رہے گا دل نگہِ فتنہ گر سے دور

جب تک ہے دل رہینِ مآل و اسیرِ عقل
رہنا ہے تجھ سے اور تری رہگذر سے دور

کیا آئی تیرے جی میں کہ تقدیر! یوں مجھے
پھینکا ہے لا کے وادیٔ غربت میں گھر سے دور

الطاف ناز اپنی گدائی پہ ہے مجھے
دامن ہے اس کا سایۂ لعل و گہر سے دور

الطاف مشہدی

ایک راہبہ کے محبت نامے !!!

چوتھا اور آخری خط

تمہارے لفٹنٹ کی زبانی مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ ایک بحری طوفان کی وجہ سے تمہیں مجبوراً ایگارد کی حکومت میں ٹھہرنا پڑا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تمہیں اس ناگہانی حادثہ سے بہت سی چوٹیں آئی ہوں گی۔ جب سے میں نے یہ ہولناک خبر سنی ہے سخت سراسیمہ ہوں۔ یہاں تک کہ مجھے اپنی تکالیف کا احساس بھی نہیں رہا کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہارا لفٹنٹ تمہاری ہر بات میں مجھ سے زیادہ دلچسپی لیتا ہے؟ اُسے تو تمہارے متعلق ذرا ذرا سی بات کا پتہ لگ جاتا ہے اور میں ہوں جس پر تم اتنا بھی رحم نہیں کھا سکتے کہ خط کے ذریعے سے ہی اپنا حال کبھی لکھ بھیجو۔ میں یقیناً بدقسمت ہوں کہ تمہیں مجھ سے رخصت ہونے کے روز سے اب تک کوئی موقعہ اپنی خیر و عافیت سے مطلع کرنے کا مل ہی نہ سکا اور اب اگر ملا بھی تو تم نے خاموشی اختیار کر لی۔ آہ۔ کتنے سنگ دل ہو تم۔ تمہاری بے انصافی اور بے وفائی کی انتہا ہو چکی ہے !! کیا میں نے بھی کبھی چاہا کہ تمہاری غفلت شعاریوں سے تنگ آ کر تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچاؤں؟ مجھے میرے دل کے جذبۂ انتقام نے کبھی اس بات پر مجبور نہ کیا کہ تمہیں قصور وار تصور کر کے تمہیں سزا کا مستحق قرار دوں۔ میری سادہ دلی دیکھو۔ میں اپنے دل میں کبھی ایسے شکوک اور بدگمانیاں پیدا ہی نہیں کرتی جن سے یہ ظاہر ہو کہ تم کو مجھ سے محبت نہیں۔ میں تو اپنے جذبۂ دل کے پیچھے پیچھے ہوں۔ اور دیوانہ وار آنکھیں بند کر کے اسی کا اتباع کر رہی ہوں۔ تمہارا یہ دل آزار رویہ مجھ پر کیا کیا مظالم توڑتا۔ اگر یہ آغازِ محبت میں بھی ایسا ہی ہوتا جیسا کہ میں اب اسے محسوس کر رہی ہوں۔ مگر تمہاری اُس بظاہر سادہ لیکن درحقیقت فریب کار محبت کے دھوکے میں کون نہ پھنس جاتا؟ اور اُس کی صداقت کا کسے نہ اعتبار آ جاتا !!

آہ! کیسی روح فرسا بات ہے کہ انسان جسے پیار کرے۔ پھر اُس کی صداقت پر بھی کسی قسم کا شک کرے۔ میں جانتی ہوں کہ ان تمام باتوں کی سچائی کو جھٹلانے کے لئے تم کوئی نہ کوئی بہانہ ضرور تلاش کر لو گے۔ مگر اس سے پہلے کہ تم ایسا کرو اور ناحق اپنے آپ کو تکلیف دو۔ میں تم پر اچھی طرح پر واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ مجھے اب تمہاری تاویلوں اور بہانوں کی ضرورت نہیں رہی۔ میرا دل اپنے تمام خلوص و صداقت کے ساتھ تمہاری پرستش کر رہا ہے۔ مجھے جب کبھی تمہاری کوتاہیوں کا خیال گذرتا ہے تو میں خود ہی تمہیں مجرم بنا لیتی ہوں۔ اور تمہارے قصوروں کو سامنے رکھ کر اپنے آپ فیصلہ کر لیتی ہوں۔ جس سے یقیناً مجھے بہت راحت حاصل ہوتی ہے !!

ذرا سوچو تو۔ کس طرح تم نے پہلے پہل اپنی توجہ اور شوق سے مجھے اپنا گرویدہ بنایا۔ تم نے اپنی آرزوؤں سے میرے سینے کے سکون کو بے چینی سے بدلا۔ اپنے التفات اور کشش سے مجھے لبھایا۔ قسمیں کھا کھا کر میری غلط فہمیوں کو دور کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا چشمۂ الفت اُبل پڑا میں سب کچھ بھلا کر دنیا کی ہر اک شے سے بے نیاز ہو کر اپنے دل کی بے اختیاریوں اور بے تابیوں سے تمہیں چاہنے لگی !

آہ! محبت کے اُن خوشگوار پرکیف لمحوں کا انجام بھی دیکھا کیا ہے گرم گرم آنسو۔ پُردرد آہیں اور ایک جانکاہ موت کا تصور! جن کا میرے پاس کوئی درماں نہیں! آہ کوئی علاج نہیں !!

اس میں کوئی شک نہیں یہ بالکل صحیح ہے کہ مجھے تمہارے محبت کرنے میں ایک مسرت بے پایاں اک کیف روحانی حاصل ہوتا ہے۔ مگر اب اُن کے عوض میں دنیا بھر کے مصائب اور تلخیاں بھی تو مجھے جھیلنی

پکار رہی ہیں ـــ جنہیں خدا جانے کب تک اسی طرح جھیلتی رہوں گی!!

اگر میں ضدی بن کر تمہاری محبت کی مخالفت کرتی اور تمہارے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے تمہیں کسی قسم کی ناراضگی اور حسد کا موقع دیتی۔ اگر تم میرے رویئے میں بناوٹ اور تصنع کے آثار پاتے اور سب سے آخر میں اگر میں تمہاری بے رخی سے تنگ آ کر (جس کا احساس تم نے خود ہی میری کوششوں کے باوجود مجھے کرا دیا) اپنی محبت کے اس نظری لگاؤ کو کسی حالت میں کم کرتی تو پھر تمہیں ہر طرح سے حق تھا پورا پورا حق تھا کہ تم مجھے گردن زدنی تصور کرتے اور مجھے سنگین سے سنگین سزا دیتے!!

مگر تم نے تو اس سے پہلے کہ تم اپنی محبت کا مجھے ثبوت دیتے مجھے اپنے دام فریب میں پھنسا لیا۔ تم نے میرے دل میں ایک ایسا بے پناہ جذبہ پیدا کر دیا جس کے نہ رکنے والے بہاؤ کے ساتھ ساتھ میں بہتی گئی یہاں تک کہ میری روح کی گہرائیوں میں تمہاری محبت جاگزیں ہو گئی۔

لیکن تم پر مجھ جیسا اثر نہ ہوا۔ تمہارا دل میری طرح نہ پسیجا۔ آہ پھر تم نے صرف مجھے ہی کیوں ناکامیوں کے سیلاب میں ڈبویا جس میں اب تک ڈانواں ڈول ہوں!!

میری روح کی تمام پرستاریاں۔ میری محبت کی ساری سجدہ ریزیاں تمہاری نظروں میں کیا تھیں؟ فقط بیکار نمائشیں تمہارے تنگ آ جانے کے لئے!!!؟

تمہیں جب یہ بخوبی علم تھا کہ تم پرتگال میں رہ کر ہمیشہ کے لئے میرا ساتھ نہ دے سکو گے۔ پھر تم نے مجھے برباد کرنے کی خاطر اپنی محبت کے لئے انتخاب کیوں کیا؟

تمہیں یقیناً اس ملک میں آسانی سے مجھ سے زیادہ خوبصورت اور حسین عورت مل سکتی تھی جس سے تمہیں تمہاری آرزو کے مطابق عیش و عشرت (کیونکہ تمہیں اُس وقت اس کی جستجو اور ضرورت تھی) کا سامان مہیا ہو سکتا تھا جو تم سے باوفا بن کر محبت کرتی رہتی۔ اُس وقت تک کہ تم اُس کے پاس رہتے اور اگر تم اُس سے جدا بھی ہو جاتے تو شاید وقت اس کی تسلی آسانی سے کر دیتا اور اُس کے ساتھ تم میری طرح ظلم و جور سے پیش نہ آتے

اس قسم کا رویہ تو ایک سفاک اور جابر شخص کا ہوتا ہے جو صرف قتل و غارت سے امن وامان کا خون کرتا ہے۔ ایک عاشق کو جس کا مذہب دلداری و جاں نوازی ہوتا ہے یقیناً ایسی سنگ دلی زیب نہیں دیتی؟

افسوس تم اس معصوم دل کو اپنی بے رحمی کا نشانہ بناتے رہے جو ہر حالت میں تمہارا تھا۔ صرف تمہارا!! میں تم سے جس قدر ہمدردانہ سلوک کرتی رہی ہوں۔ اتنا ہی تم میرے درپے آزار رہے ہو اور مجھے جی بھر کے ستاتے رہے ہو!

تمہاری طرف سے محبت کا جواب طلب کئے بغیر تمہیں چاہتی رہی ہوں۔ میرے دل میں یہ کبھی خیال تک نہیں آیا کہ میں نے تمہاری خاطر کیا کیا کچھ کیا!

کیا میں تمہارے نقش قدم پر نہیں چل سکتی تھی؟ اور جہاں تم نے مجھ سے منہ موڑ لیا تھا کیا میں بھی ایسا نہ کر سکتی تھی؟ میری ثابت قدمی بدستور رہی۔ میری مستقل مزاجی میں کبھی فرق نہ آیا اور میرے برعکس تم نے کیا کیا۔ یہی کہ تم جتنا بھی جھوٹ بول سکتے تھے تم نے بولا جو بھی تم بہانے کر سکتے تھے۔ تم نے کئے اور آخر کار مجھ سے پیچھا چھڑا کر فرانس چلے ہی گئے۔

فرانس جانے کے لئے جہاز تیار تھا۔ کیا وہ تمہارے بغیر فرانس نہ جا سکتا تھا؟ تمہارے رشتہ داروں نے تمہیں بلایا تھا یہی سبب تھا۔ صرف یہی وجہ تھی جس نے تمہیں مجھے چھوڑنے پر مجبور کیا؟ آہ۔ کیا تم یہ بھول گئے کہ میں نے اپنے رشتہ داروں کی طرف سے فقط تمہاری خاطر کیا کیا صعوبتیں برداشت کیں؟ تمہاری عزت تمہارے نام نے تمہیں مجبور کیا تھا کہ تم واپس چلے جاؤ۔

آہ! کیا کبھی میں نے بھی تمہاری خوشنودی۔ تمہاری بہبودی پر اپنی عزت اور اپنے نام کو ترجیح دی تھی؟ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ تم اپنے ملک کی خدمات کے لئے واپس بلائے گئے۔ کیا تمہارے ملک کو صرف تمہاری ہی خدمات درکار تھیں؟ اگر تم جانے سے انکار کر دیتے اور پرتگال میں رہنے کی خواہش ظاہر کرتے تو شاہ فرانس ناراض ہو جاتا وہ یقیناً تمہیں پرتگال میں رہنے کی اجازت دے دیتا۔!!

آہ میں کس قدر خوش ہوتی۔ اگر ہم تم دونوں مل کر زندگی کا لطف اٹھاتے اس حالت میں بھی (جبکہ ہم ایک دوسرے سے جدا رہے)، میں کوئی کم خوش نہیں رہی ہوں۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ میں نے بڑی وفاداری سے تمہارا ساتھ دیا ہے اور کبھی مجھ سے کوئی ایسی نازیبا حرکت سرزد نہیں ہوئی جس نے تمہیں رنجیدہ و ملول کیا ہو!!

تم نے میری آہ و زاری نہ سنی۔ میرے دل شکستہ ہونے پر غور نہ کیا

اور مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑنے پر تیار ہو گئے اور رفتہ رفتہ مجھے یہ محسوس کرا کے ہی دم لیا کہ میں بھی تمہارے نقشِ قدم پر چلوں تمہیں بھول جاؤں اور کسی دوسرے خیال کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کر لوں۔

مجھے اس کا احساس ہے کہ میں تم سے بے حد محبت کرتی ہوں میں اپنی آرزوؤں کی بربادی کا تم سے گلہ نہیں کرتی۔ کیونکہ میں ان کی ناکامیوں کی اب عادی بن چکی ہوں۔

میرا زندہ رہنا مشکل تھا۔ اگر میں ان بے شمار آلام و مصائب کی تلخیوں میں گھری رہتی اور اپنے دل میں ایک پر اسرار مسرت محسوس نہ کرتی جو مجھے تمہاری محبت سے ہی نصیب ہوئی۔

میں اپنے ماحول سے بھی سخت متنفر اور بیزار ہوں۔ میرے رشتہ دار، میری ہمجولیاں اور خانقاہ کا یہ ظالم جبر کدہ میرے لئے سخت مہلک اور ناقابل برداشت بنا ہوا ہے !!

مجھے کسی چیز میں دلچسپی نظر نہیں آتی جو کچھ مجھے یہاں مجبوراً دیکھنا پڑتا ہے اور جو کچھ مجھے یہاں ضرورتاً کرنا پڑتا ہے سب نے مل کر میری زندگی تلخ کر دی ہے !!!

بسا اوقات میں اپنے دل کو لعن طعن کرتی ہوں اور یہ محسوس کرتی ہوں کہ میری یہ سب خدمات میرے یہ سب فرائض تمہارے لئے ہی مخصوص تھے۔

ہاں مجھے اس کا بھی غم ہے۔ مجھے اس بات کا بھی قلق ہے کہ میں نے کیوں اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ تمہاری محبت میں صرف نہ کیا!!

یہ سمجھ کر میں خوش ہو جاتی ہوں کہ اس تمام نفرت و بیزاری کا باعث جو مجھے اپنی قسمت اور زندگی کے ساتھ ہے۔ تمہاری بے پناہ الفت ہے۔ آہ اگر تمہاری محبت میرے دل میں جاگزین نہ ہوتی تو میں اس حالت میں کیا کرتی۔ اس کے بغیر مجھے پر امن زندگی ضرور میسر ہوتی۔ میری روح غم کی تلخی سے آزاد ہوتی۔ میں بے فکر ہوں۔ یہ سب کچھ ہوتا۔ لیکن کیا میں اپنے دل کے اندر ایک خلائے ابدی (جس میں سوائے مردہ و بے حس جذبات کے اور کچھ نہ ہوتا) محسوس نہ کرتی! کیا پھر میں محبت کے صحیح مفہوم سے کبھی بہرہ ور ہو سکتی—— یقیناً کبھی نہیں!!!

جو کوئی مجھ سے ملتا ہے وہ میری اس موجودہ زندگی پر نکتہ چینی کرتا ہے اور میرے مزاج میرے اطوار میری شخصیت کی تبدیلیوں کو محسوس کرتا ہے، اماں جان نے جب میری کیفیت دیکھی تو مجھ سے خفا ہو گئیں:

مگر جب انہوں نے اصلیت کو پہچانا تو کچھ مہربانی سے پیش آئیں۔ مجھے بالکل خبر نہیں کہ میں نے اُن کے استفسارات پر انہیں جواب میں کیا کیا کچھ کہا!!!

میرا خیال ہے کہ میں نے اُن کے سامنے سب باتوں کا اعتراف کر لیا۔ کانونٹ کی سنگ دل سے سنگ دل اور بے رحم راہبہ بھی میری حالت زار کو دیکھ کر مجھ پر ترس کھاتی ہے اور حقیقت حال کے کھل جانے پر وہ مجھ سے نہایت توجہ اور احترام کے ساتھ پیش آتی ہے۔

آہ۔ کوئی بھی تو ایسا نہیں جو میری مظلومیت پر رحم نہ کھائے۔ مگر ایک تم ہو کہ میری حالت سے بالکل متاثر نہیں ہوئے۔ تمہاری غفلت شعاریاں ہیں کہ کم ہی نہیں ہوتیں۔ مجھے خط بھی لکھتے ہو تو بے حد انجان اور روکھائی کے ساتھ۔ ایک ہی جملہ کی مسلسل تکرار سے خط کو بے معنی بنا دیتے ہو اور کئی دفعہ اپنی بے پروائی سے ادھورا ہی چھوڑ دیتے ہو۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خط کو کسی نہ کسی طرح ختم کرنے کے لئے تم نہایت بے تاب ہو۔

چند روز ہوئے میری سہیلی دونا برائی لس مجھ سے ملنے کے لئے آئی مجھے غمگین دیکھا تو میرا جی بہلانے کے لئے وہ مجھے بالا خانے پر لے گئی جہاں سے مارتولا کے مناظر بہ آسانی نظر آتے ہیں۔ میں اُن کے ہمراہ چلی تو گئی، مگر وہاں پہنچتے ہی اچانک تمہاری یاد آ گئی اور جو کچھ اُس وقت مجھ پر گزرا وہ میرا خدا ہی جانتا ہے۔ یقین جانو کہ میں جتنا عرصہ وہاں بیٹھی رہی تمہیں یاد کر کر کے روتی رہی اور جب واپس آئی تو بدحواس ہو کر اپنے بستر پر گر پڑی اور اپنے اس لاعلاج مرض کے متعلق دیر تک سوچتی رہی۔ مگر بے سود۔

میرا جنون اب یہاں تک تجاوز کر گیا ہے کہ اگر کوئی مجھ سے غم گساری کرتا ہے تو وہ غم گساری میرے غم کی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اُس حالت میں کہ میں قدرے بحال ہوتی ہوں۔ مجھے سینکڑوں وجوہات ایسے مل جاتے ہیں۔ جن کی بنا پر مجھے یہ اچھی طرح یقین ہو جاتا ہے کہ میری مصیبت کو ابھی اور بڑھنا ہے۔ آہ میں نے کئی بار تمہیں ان پُر بہار وادیوں میں سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے اور تمہارے رنگین نظاروں سے اپنی پژمردہ روح کو شاداب کیا ہے!! اسی جگہ آہ انہی مناظر سے میری افسردہ اور رائیگاں محبت کی ابتدا ہوئی تھی!!

جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ مجھے ایسا نظر آتا تھا کہ تمہارا دل مجھے ہر طرح سے چاہتا ہے۔ اگرچہ اُس وقت تم میرے لئے

اجنبی تھیں اور بعض تمہارے لئے۔ مگر پھر بھی میرے لئے یہ پندار کچھ کم نہ تھا کہ تم نے اُن سب میں سے (جو اُس وقت میرے ہمراہ تھیں) صرف مجھی کو اپنی توجہ کے لئے انتخاب کیا!!!

مجھے خوب یاد ہے کہ جب تم گھوڑے پر سوار تھے۔ تم نے مجھے دکھانے اور خوش کرنے کی غرض سے اچانک اپنے گھوڑے کو روکا۔ تمہاری خواہش تھی کہ تم نے جس چابک دستی اور ہوشیاری سے گھوڑے کو تھام رکھا تھا، میں اُس کی تمہیں داد دوں اور تمہیں بھی خوش کروں۔ میں اس وقت مبہوت ہو گئی تھی۔ جب تم اپنے گھوڑے کو ایک تنگ و دق اور خطرناک جگہ پر لے گئے تھے۔ سچ جانو کہ میں تمہاری ان سب حرکتوں سے دل کے اندر ہی اندر دلچسپی لے رہی تھی!!

مجھے یہ یقین ہو گیا کہ تمہیں مجھ سے بہت حد تک دلچسپی ہے اور جو کچھ تم نے میرے دکھانے کو کیا، میں نے اُس کو بغیر کسی شک و شبہ کے سچ جان لیا۔ اب تم نے محبت کے اُن اولین لمحوں کے انجام بھی خوب دیکھ لئے۔ میں نے تم سے آج تک اپنی محبت کا راز نہیں چھپایا۔ اپنا سب حال دل میں تم پر ظاہر کر چکی ہوں۔ اب میں اپنی ناکامیوں کے قصوں کو بار بار دہرا کر تمہیں اپنی محبت کا رجننا کہ تم اب بھی اس سے زیادہ مجرم بنانا نہیں چاہتی ہوں اور تم سے زبردستی یہ منوانا نہیں چاہتی کہ تم میرے گلے شکووں کو سچ سمجھ کر میری محبت کا وفاداری سے جواب دو۔ تم میری منتوں اور آہ وزاری سے کبھی بھی متاثر نہ ہو سکو گے۔ کیا میں یہ امید کر سکتی ہوں کہ خطوں کے ذریعے سے میری عجز و نیاز سے لبریز گذارشیں تمہارے دل کی سنگدلی اور قہرمانی پر کوئی اثر ڈال سکیں گی!!!

مجھے اپنی بدقسمتی پر پورا بھروسہ ہے کہ تم اپنی بے رحمی سے کبھی باز نہ آؤ گے۔ تمہاری فرقت کی سختیوں نے مجھے اب اس قابل نہیں چھوڑا کہ میں تم سے کوئی اچھی امید رکھوں۔ تمہاری بے وفائی نے میرے شکوک بڑھا دیئے ہیں۔ میں اب اپنی محبت کا کوئی روشن پہلو بھی سوچ سکنے کے قابل نہیں رہی!!

کیا تمہارے حسن کی جاذبیتوں نے صرف مجھی کو لبھایا ہے؟ کیا تم میرے سوا اب کسی دوسری عورت کو اچھے نہ لگو گے! میں اُس وقت یقیناً ناخوش نہ ہوں گی، جب تم کسی دوسری عورت کو میری طرح اپنی محبت کے فریب میں پھنسا کر یہ احساس کرا رہے ہو گے کہ اُس کے رفیق جذبۂ محبت کا بھی یہی حشر ہوا جیسا کہ میرا!!! اور پھر میں اس وقت اور زیادہ خوش ہوں گی۔ جب فرانس کی تمام عورتیں تمہارے حسن کی دلکشی سے متاثر تو ضرور ہوں گی۔ مگر تمہیں سچی محبت سے کبھی خوش نہ کریں گی۔ مگر آہ۔ میرا یہ خیال کس قدر مضحکہ خیز اور غیر ممکن ہے!!!

مجھے یہ پورا پورا یقین ہو گیا ہے کہ تم میں میری محبت کے ساتھ ثابت قدم رہنے کی یقیناً صلاحیت نہیں۔ تم مجھے بغیر کسی ترغیب کے بآسانی بھلا دو گے اور پھر اگر کسی اور عورت کی نئی محبت کا جذبہ تمہارے دل میں پیدا ہو گیا تو تمہارے لئے میرا بھلا دینا اور بھی زیادہ سہل ہو جائے گا۔ اب اگر تم کسی خاص وجہ کی بنا پر میری ساری غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش بھی کرو گے تو اس حالت میں بھی میری تسکین ہونا مشکل ہے۔

یہ یقینی امر ہے کہ تم فرانس میں میرے بغیر خوب آزادی اور خوشحالی سے زندگی بسر کرو گے۔ مگر تمہیں زندگی کی اصل لطافتیں میسر نہ آ سکیں گی۔

آہ کیا تمہیں لمبے سفر کی تکان کا خیال فرانس کی رنگین صحبتوں کے چھوٹ جانے کا غم اور میری محبت پر توجہ نہ دینے کا ڈر مجھ تک آنے سے روک رہا ہے۔!!!؟

میں تمہیں ہر طرح سے یقین دلاتی ہوں کہ تم مجھ سے ذرہ بھر بھی نہ ڈرو۔ میری ناراضگی کا تھوڑا سا بھی خیال نہ کرو تم اگر میرے پاس آ جاؤ گے تو پھر مجھے اور کیا چاہیئے۔ جب میں یہ دیکھ رہی ہوں گی کہ خدا نے دونوں کو یکجا کر دیا ہے تو اس وقت کیا میں اپنا سارا غم نہ بھول جاؤں گی! آہ اُس وقت مجھ جیسا خوش نصیب اور دنیا میں کون ہو گا۔

یہ تو میں صرف اپنی ہی دل جمعی کر رہی ہوں اور اپنے غم کی تسلی کر رہی ہوں۔ تم جیسے جابر شخص پر کسی سنگدل اور بے رحم عورت کا تو ضرور اثر پڑ جائے گا۔ مگر میرے عاجزانہ پیار و محبت سے تمہارا پتھر دل کبھی موم نہ ہو گا!!

کیا میں نے بھی کبھی بے رحم بن کر تمہارے جذبات دل کو ٹھیس پہنچائی! کیا میں بھی کبھی تمہاری محبت کے ساتھ بے دردی سے پیش آئی ہوں؟

آہ۔ اس سے پیشتر کہ تم میری محبت کی کائنات کو اپنی بے رحمی اور سنگدلی سے زیر و زبر کرنے لگو۔ ذرا رک جاؤ صرف چند لمحوں کے لئے

ٹھہر جاؤ، میرے غموں کی انتہا میری تدبیروں کی پائمالی پر غور کرو، میرے جذبات کی شکستہ حالی میرے خطوط کی پرخلوص نگارشوں پر دھیان دو، میرے شوق اور پائمال میری کچلی ہوئی آرزوؤں کا خیال کرو، خدا کے لئے ذرا سوچنے کی کوشش تو کرو!!!

تم اپنے آپ کو خود ہی بدقسمت بنا رہے ہو۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ تم میری اس مظلومیت سے کچھ تو حاصل کرو، یا کم از کم اتنا تو کرو کہ جو صدمے میں تمہاری خاطر جھیل رہی ہوں انہیں تو رائیگاں نہ جانے دو۔

تم نے چند ماہ گذرے مجھے یہ صاف صاف بتا کر کہ تم کسی دوسری عورت کو بھی چاہتے رہے ہو سخت پریشانی میں مبتلا کیا۔ میری روح کو حد درجہ تکلیف پہنچائی۔ اگر وہ تمہیں یہاں آنے سے روکتی ہے تو مجھے اعلانیہ طور پر جلد از جلد لکھ بھیجو تاکہ پھر میں اپنی حالت کو اور ابتر نہ بناؤں!!

صرف تھوڑی سی امید باقی رہ گئی ہے جس پر اب میری قسمت کا دارومدار ہے۔ اگر یہ بھی بر دئے کار نہ آسکی تو پھر میں خوشی خوشی اس کے خاتمے کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کو بھی مٹا ڈالنا چاہتی ہوں۔ مجھے اس کی تصویر بھیجو اگر اس کا لکھا ہوا تمہارے نام کوئی خط ہو تو وہ بھی بھیج دو۔ اس کی گفتگو کا جو کبھی تمہارے اور اس کے درمیان ہوئی ہو خلاصہ بھی مجھے لکھو۔ شاید اسی طرح میری کچھ تسلی ہو سکے یا شاید اسی طرح اپنی حالت کو اور زیادہ تباہ کن بنا سکوں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ میں کب تک اس موجودہ حالت میں رہ کر اپنے آپ کو خراب خستہ بناتی رہوں گی۔ بہرحال میری قسمت میں اب کسی خوشگوار تبدیلی کا امکان نظر نہیں آتا۔

اپنے بھائی اور بھاوج کی تصویریں بھی مجھے بھیج دو۔ تمہارے لئے جو چیز دلچسپی کا باعث ہے وہ مجھے بھی کیوں نہ پیاری ہو اور جو کچھ تمہیں مرغوب ہے میں بھی اُسے کیوں نہ دل و جان سے چاہوں میں نے خود اپنا شوق اپنا میلان سب بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ میں اپنی طبیعت کی پسند سے اب کچھ نہیں کرنا چاہتی! آہ مجھے بعض اوقات یہ خیال بھی کتنا دل گرفتہ کر دیتا ہے کہ میں تمہاری محبوبہ کی بھی جسے تم دل و جان سے محبت کرتے ہو گے ایک عاجز خادمہ بن کر کیوں نہ خدمت کر سکی! تمہاری غفلت طرازیوں اور بے اعتنائیوں نے مجھے یہاں تک مظلوم بنا دیا ہے کہ مجھ میں اتنی ہمت بھی تو پیدا نہیں ہوتی کہ کم از کم اپنی محبت کا آزادی کے ساتھ تم پر اظہار کر سکوں۔ مجھے یہی ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں تم ناراض نہ ہو جاؤ۔

جب میں تمہیں غمِ دل سنا کر اپنی محبت کا کچھ صلہ مانگنا چاہتی ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں دنیا میں ایک گناہِ عظیم کی مرتکب ہو رہی ہوں!!

بسا اوقات یہ خیال بھی میرے لئے سوہانِ روح سے کم نہیں ہوتا کہ میں تمہیں مجبور کرکے اپنی دیوانی محبت کے پُرخلوص جذبات کی تم سے جواب طلبی کیوں کرتی ہوں!!؟

جس افسر کو یہ خط پہنچانا ہے۔ وہ بہت دیر سے اس کا منتظر ہے کہ میں کب خط ختم کرکے اُسے دوں اور وہ تمہاری طرف روانہ ہو جائے میں نے خط لکھنے سے پہلے دل میں یہ ارادہ کر لیا تھا کہ میں جو کچھ تمہیں لکھوں ایسے پیرائے میں لکھوں جو تمہیں بُرا محسوس نہ ہو۔ خط چونکہ بہت طویل ہو گیا ہے اس لئے اب میں اسے ختم کر دینا چاہتی ہوں۔ مگر افسوس دل نہیں مانتا اس کا تقاضا یہی ہے کہ یہ خط جس قدر لمبا ہو جائے اچھا ہے۔ آہ۔ جب کبھی بھی میں تمہیں خط لکھتی ہوں۔ مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ تم میرے پاس بیٹھے ہو اور میں تم سے باتیں کر رہی ہوں۔ میں نے اپنا پہلا خط جو تمہاری طرف بھیجا تھا ارادۃً مختصر لکھا تھا اس لئے کہ تمہیں ناگوار محسوس نہ ہو۔

یقین جانو کہ میں نے اس خیال سے کہ تمہیں تکلیف ہو کبھی بھی کوئی سخت جملہ نہ لکھا ہو گا۔ اگر شاید کبھی غلطی سے ایسا ہو گیا ہو تو اُس کے لئے پشیمانی کے ساتھ ساتھ مجھے افسوس بھی ہے اور آیندہ اپنے آپ کو زیادہ محتاط رکھوں گی!!

مجھے اپنا سب کچھ بغیر کسی پس و پیش کے تمہیں سونپے ہوئے تھوڑے دنوں میں پورا ایک سال ہو جائے گا۔

آہ تمہاری محبت کو میں نے کتنا سچا جانا تھا۔ جھوٹ اور ریا سے کس قدر پاک سمجھا تھا۔ اپنی پرخلوص محبت کے تقاضا کی بنا پر مجھے تو کبھی یہ گمان تک بھی نہ گذر سکتا تھا کہ تم میرے لئے چند میلوں کے سفر کی تکلیف بھی نہ گوارا کر سکو گے اور صرف جہاز کی تباہی کی خبر سنا کر ہی مجھے ٹال دو گے۔ ذرا سوچو تو کیا میں تم سے یہی امید رکھ سکتی تھی؟ آہ کیا میں اسی سلوک کے قابل تھی؟

تم میری ندامت سے متاثر ہو گے۔ میری پریشانی کو ضرور محسوس کرو گے۔ مگر میں تم سے صرف اتنا پوچھتی ہوں۔ کیا تم نے اپنی ذات میں کبھی محبت کے حقیقی خلوص بھی پیدا کیا ہے جو محبت کے لئے اشد ضروری ہے جس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہمیشہ کے لئے وابستہ ہو جاتے!!!

چوتھی بار اُس ظالم افسر نے پھر مجھے یہ پیغام بھیجا ہے کہ میں اُسے جس قدر بھی جلد ہو سکے یہ خط پہنچا دوں کیونکہ اُسے جلد روانہ ہونا ہے!!

کاش اس ظالم افسر کو جسے اپنے روانہ ہونے کی فکر دامن گیر ہے اس بات کا بھی احساس ہو سکتا! مگر آہ اُسے یہ احساس کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ سرزمین پرتگال میں ایک بدنصیب لڑکی کو تنہا چھوڑے جا رہا ہے

الوداع۔ خط کو ختم کرنا میرے لئے سخت دشوار ہو رہا ہے۔ تمہارا مجھ سے جدا ہو جانا یقیناً اس سے زیادہ کٹھن نہ تھا!!!

مجھ میں جرأت نہیں کہ تمہارے محبوب نام کو بار بار دہراؤں اور نہ ہی اتنی سکت ہے کہ اپنے جذبات پر قابو پا سکوں! میں اپنی زندگی سے بھی ہزار بار زیادہ تم سے محبت کرتی ہوں۔ آہ میں جانتی بھی نہیں کہ میں تمہیں کتنا چاہتی ہوں۔

تم کتنے پیارے ہو! اور آہ کس قدر بے رحم!!! تم مجھے خط کیوں نہیں لکھتے۔ میں اس کا دوسری بار تم سے گلہ کر رہی ہوں۔

میرا خط نئے سرے سے شروع ہو رہا ہے اور اُدھر اُس ظالم افسر کو روانہ ہونا ہے۔ اُسے روانہ ہونے دو۔ مجھے اس کی کوئی فکر نہیں لیکن یہ خط میں تم سے زیادہ کچھ اپنے لئے لکھ رہی ہوں اور اپنے غمگین دل کو بہلا رہی ہوں مجھے یہ بھی ڈر لگا ہوا ہے کہ خط کہیں طویل نہ ہو جائے کیونکہ پھر تم اسے پڑھو گے بھی نہیں!! میرے اللہ! میں نے زندگی میں کونسا ایسا گناہِ عظیم کیا ہے کہ جس کی یہ سزا پا رہی ہوں!!

تم نے بھلا محبت کا زہریلا جام مجھے پلایا ہی کیوں تھا! آہ میں کسی دوسرے ملک میں پیدا کیوں نہ ہوئی! الوداع ... مجھے معاف کرنا میں اب تمہاری زیادہ منت و سماجت نہیں کرتی کہ تم مجھے چاہو۔ خدا کے لئے ذرا دیکھو تو کہ تم نے میری حالت کیسی غمناک کر دی ہے ——— الوداع!!!

الوداع۔

عظیم قریشی

گڈریے کا گیت

جب چاند چمکتا ہے خاموش فضاؤں میں — جب جان سی پڑتی ہے افسردہ ہواؤں میں
جب خلقِ خدا ساری سو جاتی ہے گاؤں میں — ہو جاتا ہوں بے خود دیوار کی چھاؤں میں

یہ تان اڑاتا ہوں بنسی کی صداؤں میں

بے فکر نہیں کوئی مجھ سا بھی زمانے میں — تسکین کی دولت میں رکھتا ہوں خزانے میں
ملتی ہے مجھے لذت ریوڑ کے چرانے میں — پوشیدہ مسرت ہے جو میرے ترانے میں

بار اس کو نہیں ممکن دولت کے گھرانے میں

شاہوں کو مبارک ہو آئینِ جہانبانی — اور طالبِ دولت کو دولت کی فراوانی
آرام کے خوگر کو حاصل ہو تن آسانی — اور رند و مسلماں کو رندی و مسلمانی

میں اور مرا گلّہ اور اس کی نگہبانی

غلام رسول

بجلی کا پنکھا

پنکھا نہیں ہے غافل بجلی کا معجزہ ہے
گہوارۂ صبا ہے فوارۂ ہوا ہے

بجلی کی رَو سے اس کے شہپر میں تھرتھری ہے
یا صحنِ گلستاں میں رقصاں کوئی پری ہے

بجلی کی تاب و تب سے نکلے ہوا کے جوہر
یا ہو رہی ہے قرباں اس پر نسیم آ کر

دیتا ہے یا فرشتہ ہم کو ہوا پروں سے
یا آ رہی ہے نکہت فردوس کے دروں سے

مستی میں گھومتا ہے اور گنگنا رہا ہے
کس لطف سے ہوا کے دریا بہا رہا ہے

گرمی میں روح افزا منظر دکھانے والا
فردوس کی ہوائیں شب بھر سلانے والا

ہر سمت چھا رہی ہیں افلاک پر گھٹائیں
جنگل میں گونجتی ہیں درّاج کی نوائیں

آموں کی ٹہنیوں پر کوئل بھی نعرہ زن ہے
صہبائے زندگی سے سرشار ہر چمن ہے

یہ ہے مرے مکاں میں اس حال میں پر افشاں
یا کوئی نازنیں ہے دامن اٹھا کے رقصاں

یہ ہے تو گھر بھی اپنا ہم رنگ گلستاں ہے
اس کی ہوا سے حاصل تسکینِ جسم و جاں ہے

اصغر حسین خاں نظیر

بے روزگار کی وصیّت

انیسویں صدی کے وسط میں معاشیات کے ایک مشہور جرمن حکیم نے جو لندن میں جلاوطنی کے دن گزار رہا تھا اپنی ایک معرکۃ الآرا تصنیف میں بیروزگاری کے مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نہایت تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے ——— وہ لکھتا ہے:۔

مزدور سرمایہ پیدا کرتا ہے۔ لیکن جوں جوں سرمایہ اکٹھا ہوتا جاتا ہے سرمایہ میں اضافے کی نسبت سے برسرروزگار مزدوروں کی تعداد گھٹتی جاتی ہے۔ فاضل آبادی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ——— یہ فاضل آبادی سرمائے کے اکٹھا ہونے کی محرک ثابت ہوتی ہے ——— نہیں بلکہ اسی فاضل آبادی پر سرمایہ داری کا انحصار ہوتا ہے۔ سرمایہ داری صنعت کے ماہروں کی ایک محفوظ فوج تیار کرتی ہے جو سرمائے کی ملکیت ہوتی ہے اور اسی کے رحم وکرم پر زندہ رہتی ہے ——— موجودہ صنعتی تحریک کا سارا دارومدار اسی پر ہے کہ محنت پیشہ آبادی کے ایک حصہ کو ہمیشہ بے روزگار رکھا جائے یا گھٹیا روزگار دیا جائے۔ اس کو اپنی بقا کے لئے ہمیشہ محنت پیشہ بے روزگاروں کی ایک محفوظ فوج درکار ہوتی ہے"۔

اسی "محفوظ فوج" کا ایک رکن برطانیہ کا مشہور جواں مرگ شاعر طامس چیٹرٹن تھا جس نے بے روزگاری اور مسلسل فاقہ کشی سے تنگ آکر آخرکار خودکشی کر لی۔ ہر شخص اس "محفوظ فوج" کا سورما سپاہی نہیں بن سکتا۔ طامس چیٹرٹن ۱۷۵۲ء میں برسٹل میں پیدا ہوا وہ فطری شاعر تھا اور کم سنی ہی سے شاعری کرنے لگا تھا۔ اُسے علم و ادب کی خدمت کی بڑی تمنا تھی۔ چنانچہ وہ اس غرض سے لندن پہنچا مگر ابنائے وطن نے قدر نہ کی اور فاقے کرنے لگا۔ اس نے روزگار کی تلاش میں لندن کے ہر گلی کوچے کی خاک چھانی لیکن اُسے روزگار کہیں نہ ملا۔ آخر زندگی سے تنگ آکر ۱۷۷۰ء میں اٹھارہ سال کی عمر میں زہر کھا کر جان دے دی ——— مرنے سے تھوڑی دیر قبل اس نے ایک عبرت آموز نظم لکھی تھی جو اپنی تلخی طنز اور جوش کے باعث انگریزی ادب میں خاص حیثیت رکھتی ہے یہ نظم دراصل موجودہ سماجی نظام کی خود غرضی اور ناعاقبت اندیشی کو بے نقاب کرتی ہے اور ہمیں بتاتی ہے کہ کون کون سے عناصر سماج کی افادی زندگی کی راہ میں حائل ہیں۔ جن کی خود غرضیاں بے روزگاری کو بقائے دوام کے دربار میں بار یاب کرنے کی آرزومند ہیں ——— اس نظم کا عنوان وصیت ہے۔ اس نظم کے ترجمے کے لئے میں اپنے عزیز دوست مخدوم محی الدین صاحب کا ممنون ہوں۔

وصیت

میں شہر برسٹل کا طامس چیٹرٹن ہوں۔ یہ میری آخری وصیت ہے جسے اس حال میں لکھ رہا ہوں کہ میرا جسم تندرست ہے اور میری عقل بحواس۔ میرے جسم کی تندرستی اس ڈاکٹر کی غلطی کا نتیجہ ہے جس نے آخری بیماری میں میرا علاج کیا تھا۔ رہ گئی میری عقل تو اس کا معاملہ میں موقر عدالت کے سپرد کرتا ہوں مگر اتنا ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ برسٹل کے تمام بزرگانِ دین اور اکابر مجھے "باکمال مجنوں" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ لہٰذا اگر میرے اس آخری عمل (خودکشی) کو بھی جنون قرار دیا گیا تو بزرگوں کے بخشے ہوئے خطاب کے عین مطابق ہوگا۔

(۱)

کل رات آٹھ بجے سے پہلے میں مرچکا ہوں گا۔ اگر عدالت کا فیصلہ یہ ٹھہرے کہ میں نے حالت جنوں میں جان دی ہے تو برسٹل کے پادری صاحب کے نام میری یہ وصیت ہے کہ وہ اپنے خرچ سے میری لاش برسٹل لے جائیں اور میرے خاندانی مقبرے میں مجھے دفن کریں۔ میری قبر پکی بنائیں اور تعویذ پر یہ کتبہ لگائیں۔

"اے وہ جو قبر کے سامنے سے گزر رہا ہے ذرا ٹھہر اور چیٹرٹن کی روح کے لئے دعا مانگ اور مناجات کر۔ خدا آسمان پر اس سے وہ بے تابانہ نہ کرے

جو خدا کے بندوں نے زمین پر اس سے کیا۔ یہاں وہ سو رہا ہے جس کے باپ نے شہر کا کلیسا بنایا تھا اور جس کے بزرگ ۱۱۴۰ء سے سینٹ میری کے کلیسا میں دفن ہوتے آئے ہیں۔

او قبر کو دیکھنے والے اپنے فیصلہ میں جلدی نہ کر۔ اللہ کا فیصلہ تیرے فیصلہ سے زیادہ منصفانہ ہے قبر میں سونے والا اللہ کے سامنے حاضر ہے اور تیرے فیصلہ سے بالکل بے نیاز ہو چکا ہے۔

لیکن اگر میری توقع کے بموجب برسٹل کے پادری صاحب اپنے آپ کو خبیس ثابت کریں اور میری لاش لے جانے سے انکار کریں تو کار خیر انجام دینے والی انجمن مجھے مذکورہ بالا قبرستان میں دفن کر کے اس کی قبر بنادے اور اسی طرح کا کتبہ لگا دے۔

(۲)

میں اپنی جوانی کی تمام قوت و حرارت برسٹل کے تقدس مآب لاٹ صاحب کے لئے چھوڑتا ہوں کہ انہیں جوانی کی اس قوت و حرارت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

(۳)

اپنا تقوےٰ طہارت اور نیکی تقدس مآب لاٹ پادری صاحب کے لئے چھوڑتا ہوں اور اپنی شرم و حیا کا آدھا حصہ اپنی کتابوں کے پبلشر مسٹر پروگم کے لئے اور باقی اس خاتون کے لئے چھوڑتا ہوں جسے خدا نے اس نعمت سے محروم کر دیا ہے۔

(۴)

میں اپنی ایمانداری کلیسا کے خزانچی صاحب کے لئے چھوڑتا ہوں اور ان کے خدمت گار کو یہ حق بخشتا ہوں کہ جب جب وہ اونگھیں ان کی مقدس کھوپری پر زور سے چپت رسید کر کے انہیں بیدار کر دیا کرے۔

(۵)

اپنے ایثار و قربانی کا وارث میں اپنے محبوب وطن شہر برسٹل کو قرار دیتا ہوں جس کے بازاروں میں ابتدائے آفرینش سے آج تک یہ جنس گرانمایہ کبھی پہنچی ہی نہیں۔

(۶)

میں اپنی قوت گویائی کلیسا کے واعظ صاحب کے لئے چھوڑتا ہوں تاکہ وہ جنت و دوزخ کے افسانے سنانے کے بجائے مومنوں کو مفید باتیں بتائیں۔

(۷)

اور اپنی عقل و دانش کلیسا کے امام کے لئے چھوڑتا ہوں تاکہ وہ کتاب مقدس کی جب تفسیر کریں تو سمجھ سے کام لیں اور کھوکھلی باتیں بکنے سے بچ جائیں۔ اے کاش اس بے مغز پادری کو معلوم ہو جائے کہ مجھے اس سے کس قدر نفرت ہے۔

(۸)

میں اپنی انصاف پسندی ملک کے حاکموں کے لئے چھوڑتا ہوں اپنی سیرچشمی و بردباری شہر برسٹل کے کوتوال کے لئے اور اپنی قناعت و شرافت پولیس افسروں کے لئے کہ ان سب معزز حضرات کو ان تمام چیزوں کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

(۹)

شہر برسٹل کی تمام حسینوں کے لئے میں اپنے جملہ عشقیہ مضامین اور خطوط چھوڑتا ہوں ——— وہ یقین کریں کہ ان مضامین اور خطوط سے فائدہ اٹھانے کی صورت میں میری روح بھوت بن کر انہیں چمٹے گی نہیں کیونکہ میں نے ان کی بے ہودہ . . . محبت میں جان نہیں دی ہے۔

(۱۰)

میں اپنا تمام قرض جو ۵ پونڈ ہے کار خیر انجام دینے والی انجمنوں پہ چھوڑتا ہوں۔ ان کے ممبروں میں سے جو شخص بھی یہ قرض ادا کرنے کی مخالفت کرے گا اسے شہر کی خیرات جمع کرنے پر مقرر کیا جائے۔

(۱۱)

میں اپنی ماں اور بہن کو اپنے دوستوں کے ذمے چھوڑتا ہوں اگر واقعی اس دنیا میں کوئی میرا دوست ہے۔

"پیام" حیدرآباد دکن

شعر

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

نقد و نظر

شعرائے پنجاب

ملک محمد باقر صاحب نسیم رضوانی ایم۔اے۔ نے عصر حاضر کے اردو شعرائے پنجاب کا یہ تذکرہ لکھ کر اس ضمن میں پہلی کوشش کا حق ادا کیا ہے۔ چھوٹی تقطیع کے سوا تین سو صفحات میں ۲۵ شعرا کے حالات و کوائف اور کلام کا انتخاب درج ہے اور بیشتر شعرا کی عکسی تصاویر بھی دی گئی ہیں۔ شروع میں نسیم صاحب کا مقالہ "جدید اردو شاعری کے رجحانات" بطور مقدمہ شامل ہے۔ یہ مقالہ دورِ جدید کی اردو شاعری پر ایک معقول تبصرہ ہے اور اس کا مطالعہ کتاب کے مطالب کی توضیح میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

شعرا میں بعض نام غیر معروف بھی ہیں اور بعض کا ذکر محض تکلفاً کیا گیا ہے مثلاً حضرت گرامی مرحوم کہ فارسی کے مسلّم شاعر تھے مگر بزمِ اردو میں کبھی رونق افروز نہیں ہوئے۔ نسیم صاحب کو بھی بمشکل تمام ان کے دو شعر دستیاب ہوئے ہیں جن میں سے ایک کے معنی ہماری سمجھ میں نہیں آئے۔

بعض شعراء کے کلام کا اچھا خاصہ انتخاب پیش کیا گیا ہے مثلاً حفیظ جالندھری تبسم مرحوم تاثیر۔ وقار اور عابد کے کلام کے مختلف اور متنوع نمونے دیئے گئے ہیں لیکن بعض اہم شعرا خصوصاً اقبال کے کلام کا انتخاب سرسری اور تشنہ ہے۔

نسیم صاحب کی اس کتاب کے مطالعہ سے ہم پر ایک چیز واضح نہیں ہوئی وہ یہ کہ عصرِ حاضر سے مراد کیا ہے۔ اگر عصرِ حاضر کے شعراء سے مراد وہ شاعر ہیں جو زیرِ نظر کتاب کی تالیف و ترتیب کے وقت بقیدِ حیات تھے تو پھر حضرت گرامی اور جسٹس شاہ دین ہمایوں کا ذکر اس میں کیوں شامل ہے جنھیں رحلت فرمائے کئی برس گزر چکے ہیں۔ اگر عصرِ حاضر کے زمرے میں ان شعراء کا شمول بھی ضروری ہے جن کی موت پر پندرہ بیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے تو پھر مرزا اعجاز حسین مجاز اور صادق علی صادق وغیرہ کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا۔ جو عبدالقادر کی آراستہ کی ہوئی بزمِ مخزن کے صدر نشینوں میں تھے۔

کتاب کے آخر میں اعلان کیا گیا ہے کہ تذکرۂ شعرائے پنجاب کا حصہ دوم بھی زیرِ طبع ہے اور عنقریب شائع ہوا چاہتا ہے۔ اس حصہ میں جن شعراء کا ذکر ہوگا ان کے اسمائے گرامی کی فہرست بھی دے دی گئی ہے۔ اس فہرست میں بہت سے ایسے حضرات بھی شامل ہیں جن کا کلام دیکھنے اور پڑھنے سے دنیائے ادب اب تک محروم ہے لیکن تعجب ہے کہ اس فہرست میں غلام بھیک نیرنگ انبالوی عبدالحکیم بسمل ہوشیارپوری اور محمد دین فوق جیسے کہنہ مشق سخن وروں کا کہیں ذکر نہیں۔

نسیم صاحب اگر کوشش فرمائیں اور تحقیق و تفحص کا حق ادا کریں تو یہ کتاب یقیناً اردو زبان کی ایک بہت بڑی تصنیف بن سکتی ہے۔

اچھے گیت

مصنفہ میاں عبدالمجید صاحب بھٹی مدیر ہونہار لاہور

آسان اور مفید گیتوں کا یہ دلآویز مجموعہ ہونہار بک ڈپو نے چھوٹے بچوں کے لئے مرتب کیا ہے۔ زبان سلیس۔ موضوع دلچسپ اور مطالب نتیجہ خیز

ہیں۔ چند عنوانات حسب ذیل ہیں۔ عصہ۔ لالچ۔ قرمنہ چغلی۔ صبح خیزی وغیرہ
مدارس میں طلباء دیہات سدھار وغیرہ کے متعلق جو ڈرامے کرتے رہتے ہیں۔ ان
میں یہ گیت خوبی سے داخل کئے جا سکتے ہیں۔ یہ مجموعہ اپنی نوعیت کی نئی چیز
ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اساتذہ اور طلباء کے والدین بچوں کے لئے یہ مفید اور دلچسپ
مجموعہ ضرور پسند کریں گے قیمت صرف ۴ر مجلد ۸ر ملنے کا پتہ ہونہار بکڈپو
ریلوے روڈ لاہور

ادارہ

ڈاک کے گھپلوں کی وجہ سے ہر ماہ بہت سے خریداروں کی طرف سے شکایتیں موصول ہوتی ہیں کہ انہیں پرچہ نہیں ملتا اور بعض خریدار ایسے بھی ہیں جو شکایت نہیں کرتے لیکن یہ فرض کر لیتے ہیں کہ پرچہ دفتر نے نہیں بھیجا۔ حالانکہ پرچہ چھاپا اور خریدار کو نہ بھیجنا پاگل پن اور تجارتی خودکشی سے کم نہیں۔ ادبی دنیا ہر ماہ کی ۱۶ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے اگر ۲۰ تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو سمجھئے کہ کسی ڈاک کے ڈاکو کی نذر ہوا۔ بس ایک شکایتی کارڈ اپنے حلقے کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور کارڈ ہی لکھئے تاکہ آپ کو پرچہ دوبارہ بھیجا جائے اور محکمہ ڈاک کے دروازے پر ایک اور دستک دی جائے

(مینیجر)

فہرستِ مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ اگست ۱۹۴۳ء

جلد ۱۵ تصاویر:- (۱) ساون آیا (۲) جاپان میں برسات **نمبر ۱۰**

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے (۵) ممالکِ غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگ مال روڈ لاہور سے شائع ہوا۔

بزم ادب

سر راس مسعود مرحوم

پچھلے مہینے سید راس مسعود کے انتقال سے ہمارے ملک کے علمی اور تعلیمی حلقوں میں جو ممتاز جگہ خالی ہوئی ہے وہ یقیناً کبھی پُر نہیں ہوگی۔ انتقال کے وقت سید مرحوم کی عمر صرف ۴۸ برس تھی۔ اس مختصر سی زندگی میں آپ نے ملک و قوم کی جیسی شاندار علمی خدمات انجام دیں۔ اُن کے پیش نظر بلاپس و پیش کہا جاسکتا ہے کہ آپ کو جینے کی کچھ اور فرصت ملتی تو آپ بھی اپنی پختہ سالی میں ویسے ہی زرّیں اور پائیدار علمی کارنامے انجام دے جاتے آپ کے دادا سر سید مرحوم نے اپنی آخری عمر میں پایۂ تکمیل کو پہنچائے تھے۔

سر راس مسعود ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے ۱۹۰۶ء تک علی گڈھ میں تعلیم پاتے رہے۔ اس کے بعد آپ نے پانچ برس تک انگلستان میں تعلیم کی تکمیل کی اور آکسفورڈ یونیورسٹی کی ڈگری اور بیرسٹری کی سند لے کر ۱۹۱۱ء میں واپس ہندوستان آئے۔ یہاں پہنچ کر آپ نے پٹنہ میں پریکٹس شروع کی لیکن اپنی بلند سیرت کے تقاضے سے آپ پیشۂ وکالت سے جلد ہی دست بردار ہوگئے۔ آپ یہ برداشت نہیں کرسکتے تھے کہ اپنی پریکٹس کے سلسلے میں آپ سے نادانستہ بھی حق کی مخالفت اور ناحق کی حمایت میں کوئی غلطی ہو جائے۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں آپ وکالت ترک کر کے امپیریل ایجوکیشنل سروس میں شامل ہوگئے اور کٹک کالج میں پروفیسری کی خدمات انجام دیتے رہے تعلیمی مشاغل سے آپ کو دلی مناسبت تھی اور اس میدان میں آپ نے ایسی ناموری حاصل کی کہ ۱۹۱۶ء میں حضور نظام کی نگاہ مردم شناس نے آپ کو حیدرآباد کے تعلیمی امور کی قیادت کے لئے انتخاب کر لیا۔ چنانچہ آپ ۱۹۲۸ء تک حیدرآباد میں ناظم تعلیمات رہے اسی عرصے میں عثمانیہ یونیورسٹی جسے حضور نظام کا زرّیں ترین کارنامہ کہا جاسکتا ہے ظہور میں آئی اور عثمانیہ یونیورسٹی کی تشکیل سے زبانِ اردو کے بقا و استحکام کی عملی صورت پیدا ہوگئی عثمانیہ یونیورسٹی کے تخیل اور تشکیل میں سر راس مسعود نے نہایت قابل قدر حصہ لے کر قومی تعلیم اور زبان پر جو احسان کیا وہ یقیناً ابد تک یاد رکھا جائے گا۔

بارہ سال تک حیدرآباد کی تعلیمی خدمت کے بعد جب آپ سبکدوش ہوئے تو قوم نے مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری آپ کی خدمت میں پیش کی مسلم یونیورسٹی کے انتظامی امور بے حد پیچیدہ ہو رہے تھے۔ آپ نے اصلاحِ امور کے لئے پانچ سال تک مردانہ وار جد و جہد کی۔ آخر میں کچھ دل برداشتہ سے ہوگئے تھے لیکن یونیورسٹی کے فلاح و بہبود سے دنیا میں کوئی چیز آپ کو عزیز تر نہ تھی۔ اس اثنا میں آپ کی صحت بھی بگڑ گئی۔ لیکن آپ شب و روز یونیورسٹی کے وقار کی بحالی کے لئے کوشاں رہے ۱۹۳۴ء میں ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال آپ کو کمال اصرار سے اپنے ساتھ بھوپال لے آئے اور تعلیمات اور امور عامہ کے محکمے آپ کی تفویض میں دے دئے۔

یہاں پر آپ کو نسبتاً سکون و عافیت کی زندگی ملی اور آپ ہمہ تن بھوپال کی تعلیمی و معاشرتی ترقی کی کوششوں میں منہمک ہوگئے لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا اور ابھی آپ نے فراغت کے تین سال بمشکل گذارے تھے کہ اجل کا پیغام آن پہنچا مرحوم نے حیدرآباد کے عہد ملازمت میں جاپان کا سفر کیا۔ مدعائے سفر وہاں کے تعلیمی حالات کا مطالعہ تھا۔ واپسی پر آپ نے جاپان کے نظام تعلیم پر ایک بے نظیر کتاب لکھی مسئلۂ تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اور وہ مقتدر لوگ جن کے ہاتھ میں مختلف تعلیمی محکموں اور اداروں کی باگ ہے۔ اس بیش بہا کتاب کے مطالعہ سے اپنے دائرۂ عمل سے کئی مفید اور نئی راہیں نکال سکتے ہیں۔

سر راس مسعود ایک نامور دادا کے پوتے اور ایک نامور باپ کے بیٹے تھے اور حق یہ ہے کہ انہوں نے اپنی خاندانی روایات کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ انہیں چار چاند لگائے۔ افسوس اب جبکہ ان کے تجربے اور ان کے تبحر سے فایدہ اٹھانے کا موقعہ آیا تھا موت نے انہیں ہم سے چھین لیا۔ دعا ہے کہ ان کی روح کو سکون ابدی نصیب ہو۔

(ادارہ)

آئینۂ عالم

مانٹی کارلو کا قمار خانہ

ہر سال موسم کے شروع ہوتے ہی فرانس اور دوسرے ممالک کے اخبارات ایسے لوگوں کے سنسنی خیز واقعات سنانے لگ جاتے ہیں جنہوں نے قمار بازی کے دوران میں مانٹی کارلو کے خزانے خالی کر دیئے ہوں بعض اوقات واقعات اس کے برعکس بھی رونما ہوتے ہیں یعنی جنوبی امریکہ کا کوئی جاگیر دار یا ہالی وڈ کا کوئی مشہور و معروف ایکٹر یا ایکٹرس اپنا تمام اندوختہ ہار کر اپنے عالی شان محلات کے کوڑے کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے یا پھر بلقان کے کسی مشہور مہندس کے متعلق خبر آتی ہے کہ اس نے اپنی حکمت و دانائی کے بل پر ایسے اصول وضع کئے کہ ایک ہی رات میں کروڑوں روپے جیت کر امیر الامرا بن گیا۔

یہ سب باتیں جھوٹی ہوتی ہیں اور قمار خانے کی عیارانہ نشر و اشاعت کے علاوہ ان کو کوئی وقعت نہیں دینی چاہیئے۔

حقیقت یہ ہے کہ مانٹی کارلو کا خزانہ آج تک کبھی خالی نہیں ہوا جب کسی ایک میز کی پر نقد روپیہ ختم ہو جاتا ہے تو کھیل چند منٹوں کے لئے رک جاتا ہے تاآنکہ خزانے سے مزید روپیہ نہ آ جائے۔ اس کے بعد پھر شروع ہو جاتا ہے۔

اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنہوں نے اسی کاسینو میں ڈھیروں دولت جیت لی ہے — بعض نے نرس قسمت کی یاوری سے اور بعض نے کھیل کے باقاعدہ مطالعہ سے ان کی چند غیر معمولی مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:۔

نیو یارک کے ایک ہوٹل کے خدام کا جمعدار مسٹر ڈارن برو جس نے اپنی ملازمت کے دوران میں ۲۵۰ پونڈ کی حقیر پونجی جمع کر رکھی تھی نیو یارک سے مانٹی کارلو آیا اور اسی رات سیدھا کاسینو میں آن وارد ہوا۔ چونکہ پہنچتے ہی اس نے جیتنا شروع کیا اور پھر متواتر ہر بازی میں جیتتا ہی چلا گیا۔ کاسینو کے پرائیویٹ جاسوس جو ہر وقت ایسے شاطر کھلاڑیوں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں جو ہاتھ کی صفائی، دھوکا بازی یا کسی اور ناروا طریق سے جیت رہے ہوں قدرتی طور پر مسٹر ڈارن برو کے آگے نقدی کے ڈھیروں کے ڈھیر جمع ہوتے ہوئے دیکھ کر چوکنے ہو گئے۔ جاسوسوں نے اپنی باریک بین نگاہوں سے بہتیرا کام لیا لیکن وہ اس کے کھیل میں کسی قسم کا سقم معلوم نہ کر سکے۔

مسٹر ڈارن برو کی خوش بختی نے کاسینو کے معزز سرپرستوں کی توجہ کو فوراً اس کی طرف منعطف کر دیا۔ چنانچہ بڑے بڑے سرمایہ داروں اور دوسرے امرا کے علاوہ کاسینو کی حسین ترین پریاں جو ہر وقت ایسے مردوں کی تلاش میں رہتی ہیں جن پر دولت کی دیوی مہربان ہو یک دم اس پر پل پڑیں۔

لیکن مسٹر ڈارن برو نے کمال دانشمندی سے کام لیتے ہوئے امرا کی دوستی کی پیشکش کو ٹھکرا دیا اور حوا کی بیٹیوں کی زاہد فریب نگاہوں کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ وہ سب سے بیگانہ رہ کر نہایت خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا چنانچہ گیارہ دن کے عرصے میں اس نے ۸۰۰۰۰۰۰ فرانک (اسّی لاکھ) جیت لئے۔ اس کے بعد ہوٹل کے خادموں کا یہ جمعدار کمال دانائی سے اپنا تمام سرمایہ جمع کر کے جس خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی سے رخصت ہو گیا۔ اس نے کاسینو کے ملازم کو "خدا حافظ" کہنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔

اس قمار باز کے غیر معمولی اور تعجب انگیز طرز عمل سے (جس نے نہ صرف کاسینو کے خزانے سے ایک معتد بہ رقم جیت لی تھی بلکہ جسے یہ بھی معلوم تھا کہ کھیل کس وقت ختم کر دینا چاہیئے) حکام اس قدر متاثر ہوئے کہ اس واقعے کو حکمران تک کے گوش گزار کیا گیا۔ اس ننھی مملکت کا حاکم تمام روئیداد سن کر مسکرا دیا اور بولا۔

"یہ اسی لاکھ فرانک بہت قلیل رخصت پر گئے ہیں اور رخصت

ایام گزارنے کے بعد مانٹی کارلو میں واپس آجائیں گے"۔

لیکن حاکم کی یہ پیشین گوئی غلط نکلی۔ مسٹر ڈارن برو نے واپس جاتے ہی کیلیفورنیا میں ایک رفیع الشان محل خرید لیا اور اس میں وہ نہایت عیش و آسائش کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ آج تک مانٹی کارلو میں دوبارہ نہیں آیا۔

اس کے بعد مسٹر آرتھر کورسی بودر کا قصہ ہے۔ یہ بے چارہ چلنے سے معذور تھا اور پہیوں کی پہیئے دار کرسی میں بیٹھ کر کاسینو میں آیا کرتا تھا۔ مسٹر کورسی بودر علم و فضل کے لحاظ سے چوٹی کے علماء میں شمار ہوتا تھا اور قمار بازی کو ایک فن کے لحاظ سے اس نے سالہا سال تک زیر مطالعہ رکھا تھا۔ اسی وسیع مطالعے کے ذریعے سے اس نے داؤں لگانے کا ایک باقاعدہ طریقہ تجویز کر رکھا تھا جس پر اسے بدرجۂ اتم اعتماد تھا۔ وہ اس اعتماد میں حق بجانب بھی تھا کیونکہ نہایت تھوڑی مدت میں اس نے ...... ۴۰ (چالیس لاکھ) فرانک جیت لئے تھے۔ دوسرے کھلاڑی بھی اس کی کامیابی سے متاثر ہو کر مریض کی کرسی کے گرد جمع رہتے اور جس ہندسے پر وہ داؤں لگاتا اسی ہندسے پر داؤں لگا کر جیتتے رہتے۔

مسٹر کورسی بودر ان طفیلیوں کے ہر وقت چمٹے رہنے سے چڑ گیا اور ان سے مخلصی حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنے مجوزہ قاعدے کے خلاف ایک بہت بڑی رقم ہارنے کے لئے نمبر ۲۷ پر لگا دی۔ اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب بجائے ہارنے کے نمبر ۲۷ جیت گیا اور پھر متواتر جیتتا ہی چلا گیا۔ چنانچہ اس کے پیرو بھی جو اس کی ہر حرکت کی نقل کر رہے تھے بیش بہا رقمیں جیتنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کرب و اضمحلال کا اندازہ لگائیے جو مسٹر کورسی بودر کو نہ صرف اپنے ارادے میں ہزیمت اٹھانے سے ہوا بلکہ جو انہیں اپنے مجوزہ کلیے کے غلط ثابت ہونے سے برداشت کرنا پڑا۔ چنانچہ دوسرے ہی روز وہ اپنی خطیر رقوم کو وصول کر کے مانٹی کارلو سے رخصت ہو گیا اور اپنے "طریقے" کو دوبارہ مکمل کرنے میں ایک سال اور صرف کر دیا۔ اگلے سال وہ اپنے نئے "طریقے" اور کافی نقدی سے مسلح ہو کر پھر مانٹی کارلو میں آن دھمکا۔ تین ہفتے کے اندر اندر اس نے اپنی تمام دولت ہار دی اور اس کے علاوہ ...... ۵ (پانچ لاکھ) فرانک کا مقروض ہو گیا۔ شاید کسی جگہ اس سے غلطی ہو گئی لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے اعصاب خراب ہو گئے اور اسے ہسپتال پہنچا دیا گیا۔

اعلیٰ پیمانے پر قمار بازی چند اور مقامات پر بھی ہوتی ہے۔ مثلاً کینز میں چند سال کا ذکر ہے کہ امریکہ کا ایک مشہور کروڑ پتی اپنے ذاتی جہاز میں سوار ہو کر کینز گیا۔ چند ہی دنوں کے اندر اندر اس نے اپنی تمام دولت ہارنے کے علاوہ کافی قرضہ بھی اٹھا لیا۔ آخر اس نے اپنا خوبصورت اور بیش قیمت جہاز رہن کر دیا لیکن اس سے حاصل شدہ روپیہ بھی چند لمحوں میں ضائع ہو گیا۔ پھر اس نے جہاز بیچ دیا لیکن یہ رقم بھی اسی کھاتے میں [illegible] اور بے چارہ کروڑ پتی پیسے پیسے کو محتاج ہو گیا۔ جہاز کے نئے مالک نے اس کی حالت پر رحم کھا کر پیرس تک جانے کے لئے اسے ریل گاڑی کا ٹکٹ تحفتہً پیش کیا۔

قمار بازی کا ایک اور اڈہ ڈیوویل ہے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک یونانی جس کا نام وگلیانو تھا اپنی ہر بازی میز پر رکھ کر لگا رہا تھا شیکاگو کا مشہور ساہوکار مسٹر کیسلر جو وہیں موجود تھا بولا:۔

"زیادہ سے زیادہ کتنے کی بازی لگاؤ گے؟"

"جو تم چاہو" یونانی نے جواب دیا

"دس لاکھ فرانک"

"منظور۔" یونانی نے بے پروائی سے جواب دیا اور وہ ہار گیا

مسٹر کیسلر نے آہستہ سے کہا "دگنا کرو گے؟"

وگلیانو نے منظور کر لیا اور پھر ہار گیا۔ کیسلر نے ۲۰ لاکھ فرانک میز پر ڈھیر کر دئے۔ یونانی پھر ہار گیا۔ چنانچہ ایک منٹ کے عرصے میں مسٹر کیسلر ۷۰ لاکھ فرانک کما کر اٹھا، ایک بڑا سیگار سلگا کر کاسینو کے دفتر میں داخل ہوا اور اپنے تمام روپے کی ہنڈی پیرس کے ایک بنک کے نام بنوالی۔ اس سے اگلے روز وہ سیدھا پیرس کو سدھارا اور چند روز تک پیرس میں داد عیش دینے کے بعد شکاگو چلا گیا۔ اس نے آج تک پھر جوا نہیں کھیلا۔

میڈم ڈارتھی، مانٹی کارلو کی ایک مشہور میزبانہ جسے دوسری خواتین کے مقابلے میں جوئے کے بہت سے اہم واقعات یاد ہیں کہتی ہیں کہ سب سے زیادہ عجیب و غریب روسی گرینڈ ڈیوک کا واقعہ ہے۔ یہ واقعہ اگرچہ صلح و امن کے ایام میں پیش آیا لیکن اپنی نوعیت کے لحاظ سے قابل شنید

ہے۔ روسی گرینڈ ڈیوک ایک میز پر کھیل میں مشغول تھا اور میڈم ڈارتھی اس کے پشت کی طرف کھڑی تھی۔ اتفاقاً بلا ارادہ اس نے اپنا ہاتھ گرینڈ ڈیوک کی کرسی کی پشت پر رکھ دیا۔ گرینڈ ڈیوک غضب ناک ہو کر پیچھے کو مڑا لیکن جونہی اس کی نظریں میڈم ڈارتھی کے چہرے پر پڑیں اس کی پیشانی کے شکن دور ہو گئے اور نہایت نرمی سے میڈم ڈارتھی کے ہاتھ پر ہاتھ پھیر کر ملتجیانہ انداز میں بولا "آپ یوں ہی میرے پاس ٹھہری رہیں"۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میڈم ڈارتھی کی موجودگی گرینڈ ڈیوک کے حق میں جادو کا کام کر رہی ہے کیونکہ وہ لگاتار جیتتا چلا گیا۔ ہر ہزار فرانک کے جمع ہونے پر وہ نصف حصہ میڈم ڈارتھی کو دے دیتا تھا۔ اس طرح میڈم ڈارتھی نے اس ایک رات کے دوران میں ۵۰۰۰۰ فرانک جمع کر لیے۔ اس کی خوش قسمتی کا ستارہ صرف اس وجہ سے چمکا کہ اس نے اتفاقاً اپنا ہاتھ گرینڈ ڈیوک کی کرسی پر رکھ دیا تھا۔ پو پھٹ رہی تھی جب گرینڈ ڈیوک اپنے میز سے اٹھا۔ میڈم ڈارتھی کو جھک کر سلام کیا اور رخصت ہو گیا۔ اگلے روز دوپہر کے وقت میڈم ڈارتھی نے گرینڈ ڈیوک کو ایک باغ میں ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ وہ فوراً اس کے پاس گئی اور اس کی گزشتہ رات کی فیاضی کا شکریہ ادا کرنے لگی۔ کھلاڑی کے ذی وجاہت خدوخال سے حیرت و استعجاب کا اظہار ہونے لگا اور وہ بولا۔

"محترم خاتون! معلوم ہوتا ہے آپ کو پہچاننے میں غلطی ہوئی ہے۔ میں نے آپ کی صورت اس وقت سے پہلے کبھی نہیں دیکھی"۔

گرینڈ ڈیوک اپنے خیال میں اس قدر مگن تھا کہ اس کے دماغ میں اس عورت کی صورت یا اس کی موجودگی کا احساس تک بھی باقی نہ تھا جسے اس نے پچاس ہزار فرانک دے ڈالے تھے۔

کاسینو کے ارباب اختیار اس دلچسپ سٹیج کے حزنیہ کردار کو ہمیشہ پس پردہ رکھنا چاہتے ہیں لیکن ایسے اتفاقات بھی پیش آتے ہیں کہ یہ سنسنی خیز خبریں ہزار کوشش کے باوجود دنشر ہو جاتی ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ ایک انگریزی جنگی جہاز کے کمانڈر کا ہے جو ایک روز مانٹی کارلو کے قریب لنگر انداز ہوا۔ ایک رات کپتان خشکی پر آیا اور کاسینو میں داخل ہو کر کھیل میں مشغول ہو گیا۔ شاید اس کا ستارہ برج زحل میں تھا کیونکہ وہ کوڑی کوڑی ہار گیا۔

قماربازی کے بے رحم بھوت نے اسے اپنے چنگل میں دبوچ لیا۔ وہ اپنے جہاز کو واپس گیا اور جتنا سرکاری روپیہ اس کی تحویل میں موجود تھا، سب کا سب لے آیا۔ ابھی پورا ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ تمام روپیہ دے بیٹھا وہ پھر جہاز کو واپس لوٹا اور صورت حالات پر غور کرنے لگا آخر کار اس نے کاسینو کے مہتمم کی طرف ایک خط بھیجا کہ کل ۱۱ بجے دوپہر تک تمام ہارا ہوا روپیہ واپس کر دے اور اگر ساڑھے گیارہ بجے تک اس کی تعمیل نہ ہوئی تو جنگی جہاز کی توپوں کے آتش فشاں دہانے کاسینو پر کھول دیئے جائیں گے۔

گیارہ بج گئے لیکن روپیہ نہ آیا۔ شاید الٹی میٹم کو قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ جنگی جہاز کے کمانڈر نے ثابت کر دیا کہ وہ بے معنی دھمکی نہیں دے رہا تھا۔ چنانچہ پہلا گولہ جو کاسینو پر آ کر گرا۔ اس نے ساحل کے خوب صورت زریں درختوں کے پرخچے اڑا دیئے۔ کاسینو کی طرف ایک اور ایلچی دوڑایا گیا جس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ تھا اور اس پر صرف دو لفظ لکھے تھے :۔

"آخری تنبیہ"

اس کے ۱۰ منٹ بعد ایک موٹر کشتی ساحل سے جہاز کی طرف تیزی کے ساتھ جاتی ہوئی دیکھی گئی۔ اس کشتی میں سے کاسینو کا ایک ڈائرکٹر اترا اور جہاز کے عرشے پر چڑھ گیا اس کے قبضے میں کمانڈر کی ہاری ہوئی رقم تھی۔ کمانڈر نے تمام روپیہ خزانے میں رکھ کر جہاز اپنے نائب کی تحویل میں دے دیا۔ اس کے بعد اپنے کیبن میں داخل ہو گیا، ایک گولی چلنے کی آواز آئی اور کمانڈر تختۂ جہاز پر خاک و خون میں تڑپتا ہوا دکھائی دیا۔

ایک اور مشہور کھلاڑن ایک نہایت ہی خوب صورت عورت تھی جو کئی سال سے مانٹی کارلو میں رہتی تھی۔ اس کے بیش بہا جواہرات کا ہر جگہ چرچا تھا۔ ان دنوں یہ افواہ بہت گرم تھی کہ یہ خاتون زار روس کی داشتہ ہے۔ آج اس کی حالت کیا ہے! وہ اس وقت بھی زندہ ہے، بڈھی، بدصورت اور قلاش ـــ اور نائیس کے محتاج خانے میں رہتی ہے۔

جنگ عظیم سے پہلے روسی یورپ کے قمار خانوں میں عام طور پر دکھائی دیتے تھے۔ لیکن آج کل رویرا میں صرف ایک روسی نظر آتا ہے جس کا نام ایم۔ بورس دیڈل ہے اور جو قمار خانوں کے جاسوسوں کا افسر اعلیٰ

ہے۔ یہ شخص زار کی حکمرانی کے زمانے میں سلطنت روس کی خفیہ پولیس کا افسر تھا۔ اب اس کے فرائض یہ ہیں کہ وہ کیسینو کے سرپرستوں میں دھوکہ بازوں اور عیاروں کو گھسنے نہ دے۔ کیسینو کے منتظمین کو ایسے لوگوں کے ہتھکنڈوں سے محفوظ رہنے کے لئے نہایت دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کے پاس ایسے تمام عیاروں کے فوٹو اُن کے حالات اور اُن کی مخصوص عیاریوں کی تفاصیل محفوظ ہیں۔ مسٹر بورس وِیڈل کی یادداشتیں نہایت دلچسپ ہیں جن کا ملخص پیش کیا جاتا ہے۔

ایک دفعہ ہالی وڈ کی مشہور ترین ایکٹرس پرل وہائٹ نے اپنی تمام دولت ڈیوویل کے کاسینو میں ہار دی تھی۔ ہیلن وِکٹر جو اتنی امیر تھی کہ اس نے زار روس کے جواہرات کا ایک معتد بہ حصہ خرید لیا تھا۔ بہت بڑی بڑی رقموں کی بازی لگایا کرتی تھی۔ یہ خاتون ایک روز یک بیک غائب ہوگئی اور آج تک اس کا سراغ نہیں ملا۔

بعض اوقات کاسینو کے خزانے سے لاکھوں کی رقم صرف ذرا سی بدانتظامی یا کھیل کے اوزاروں کی طرف سے ذرا سی بے احتیاطی کی وجہ سے دینی پڑ جاتی ہے۔ مثلاً کیپٹن ایلن جگارو نے ایک رات میں بیس لاکھ فرانک جیتے۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ گھومنے والے پہیے میں کچھ خرابی ہوگئی تھی جسے کیپٹن موصوف نے بھانپ لیا تھا۔ لیکن کاسینو والوں کو اس کی خبر اس وقت ہوئی جب کپتان مذکورہ رقم جیت چکا تھا۔ کاسینو والوں نے کوئی اعتراض نہ کیا کیونکہ کیپٹن صاف کھیل کھیلتا رہا تھا اور مشین کا نقص ان کی اپنی غلطی سے تھا۔

آج کل کھلاڑیوں کا رجحان بجائے مانٹی کارلو کے کینز کی طرف زیادہ ہوگیا ہے۔ چنانچہ آغا خاں، امریکی کروڑپتی نائیکو زگرافوس وغیرہ اب یہیں آتے ہیں۔ زگرافوس وہ شخص ہے جس کے داؤں کی رقم ہمیشہ غیر محدود ہوتی ہے۔

مظفر احمد

غزل

سنتا ہے کون حال پریشاں ترے بغیر
سُونی پڑی ہے انجمن جاں ترے بغیر

تیرے بغیر کچھ بھی نہیں لذتِ حیات
منزل ہے مجھ کو شامِ غریباں ترے بغیر

کس سے کریں سوال کسے دیں دعائے خیر
ویراں ہے آج محفلِ رنداں ترے بغیر

ڈر ہے کہیں فضا میں نہ رہ جائے گونج کر
ٹھہرا رہا ہے نعرۂ مستاں ترے بغیر

تیرے بغیر جان بھی کس طرح دے سعیدؔ
دشوار ہے یہ مشکل آساں ترے بغیر

سعید
الہ آبادی

حسنِ نظر

ہر گل میں نرالی ہیں ادا دیکھ رہا ہوں
ہر ذرّے پہ اک حُسن نیا دیکھ رہا ہوں

ہر سمت نظر آتا ہے اک طور کا عالم
حیران ہوں میں آج یہ کیا؟ دیکھ رہا ہوں

یہ حسن کے انوار کے پردوں سے نمایاں
کس برقِ تجلی کی ضیا دیکھ رہا ہوں

خورشید کے پرتو میں نظر آتا ہے یہ کون
مہتاب میں وہ کس کو چھپا دیکھ رہا ہوں

وہ کون ہے تاروں کے حسیں ساز پہ شب کو
مدت سے جسے نغمہ سرا دیکھ رہا ہوں

ہنگامۂ ہستی میں یہ تحریک ہے کس کی
اِن جلووں میں کیا صبح و مسا دیکھ رہا ہوں

سچ پوچھو تو میں شاہدِ فطرت میں نمایاں
محبوبِ حقیقی کی ادا دیکھ رہا ہوں

تاجور سامری

گم شدگی

(منصور کے یک آہنگ ولا نہایت سکوت کا ایک مطالعہ)

جستجوئے شوق میں اک نوجواں کھو یا گیا
ایک پروانہ بہ سوزِ قلب و جاں کھو یا گیا

میں نہ مانوں گا بقولِ حامدِ نکتہ شناس
ظلمتوں میں وہ شرارِ جاوداں کھو یا گیا

ہو گیا نظروں سے غائب اک ستارہ ٹوٹ کر
ایک شعلہ تھرتھرا کر ناگہاں کھو یا گیا

کہہ رہی تھی اک فسانہ فطرتِ شوریدہ سر
اتفاقاً از نشاطِ داستاں کھو یا گیا

باکمال انساں کا مرجانا ہے نقصانِ خدا!
کچھ خدا کا بھی تو مرگِ ناگہاں! کھو یا گیا

ہر نفس تھا جس کا اک افسانۂ مہر و وفا
آج سنتے ہیں کہ وہ افسانہ خواں کھو یا گیا

کل پیا تھا اے عدمؔ منصور کی صحت کا جام[1]
اس سے جو حاصل ہوا تھا لطفِ جاں کھو یا گیا

عدمؔ

[1] گذشتہ سال منصور احمد مرحوم کشمیر سے صحت یاب ہو کر لاہور واپس تشریف لائے تو حضرت عدم نے منصور کی صحت کا پہلا جام کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی (م)

ہندوستان کی لنگوا فرنیکا

(ضروری نہیں کہ ایڈیٹر کو مضمون نگار کی رائے سے اتفاق ہو)

زبانِ اردو نے خواہ دکن میں جنم لیا یا پنجاب میں۔ یہ اب تمام قلمروِ ہند میں رائج ہے۔ اور اسی خصوصیت کی بنا پر اس کو اس ملک کی لنگوا فرنیکا کہا جاتا ہے۔ فرانسیسی زبان میں لنگوا فرنیکا سے مراد ایک عام بول چال یا ایسی ملی جلی زبان ہے جو یورپ کی بعض کثیرالاستعمال زبانوں کے خاص خاص الفاظ کی باہم آمیزش سے وضع کی گئی ہو۔ چنانچہ اس میں فرانسیسی۔ اسپینی۔ یونانی اور اطالوی لغات کی ملاوٹ بہت پائی جاتی ہے اور وہ اب براعظم یورپ کے مغربی حصے میں جو مشرقی کی بہ نسبت بہت زیادہ تہذیب یافتہ اور تجارت و سیر و سیاحت کا مرکز ہے خاص طور پر رائج ہے۔ اسی طرح اردو بھی زیادہ تر شمالی ہندوستان۔ اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ اور دکن میں نہ صرف بولی بلکہ لکھی پڑھی بھی جاتی ہے اور اسی عمومیت کی وجہ سے اس زبان کا نام ہندوستان کی لنگوا فرنیکا رکھا گیا ہے۔ یورپ کی لنگوا فرنیکا تو مغربی سیاحوں کی آمد و رفت اور تجارت کی ضرورتوں سے پیدا ہوئی تھی اور یہ ہماری لنگوا فرنیکا ہندو مسلم اقوام کی باہمی معاشرت اور حکام وقت کی سیاسی ضرورتوں کے اقتضا سے آغاز پذیر ہوئی تھی۔ چنانچہ اب یہ امر پوری طرح پایۂ تحقیق کو پہنچ چکا ہے کہ مسلمانوں نے اس ملک میں قدم رکھتے ہی فارسی۔ عربی کو ہر مقام کی مقامی ہندی میں ملا جلا کے بولنا شروع کیا تھا۔ اور یہی ضرورت انگریزوں کو بھی لاحق ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں کلکتہ کے فورٹ ولیم میں مسلمانوں کے لئے اردو زبان کی کتابوں کو فارسی رسم الخط میں ترتیب دیا گیا اور ہندوؤں کے لئے یہی زبان ناگری حروف میں لکھی گئی۔ اس لحاظ سے اردو بطور لنگوا فرنیکا اب ناگری اور فارسی دونوں طرح کے حروف میں لکھی پڑھی جاتی ہے۔ تاہم اس کی بول چال ایک ہی ہے اور بظاہر اس میں کوئی فرق ممکن نہیں مثلاً ذیل میں سید انشا کی رانی کیتکی کی کہانی کا ایک اقتباس دیکھئے۔ آپ اس کو خواہ ناگری حروف میں لکھیں یا فارسی رسم الخط میں۔ یہ دونوں طرح ایک ہی معلوم ہوتی ہے اور اسی کا نام خالص اردو ہے۔ یہ خالص اردو ہی گویا اس ملک کی لنگوا فرنیکا ہے:

"اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو جتاتا ہے اور جیسا کچھ لوگ اسے پکارتے ہیں کہہ سناتا ہے۔ اب دہنا ہاتھ منہ پر پھیر کر آپ کو جتاتا ہوں۔ جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور آؤ چاؤ۔ کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں۔ جو دیکھتے ہی آپ کے دھیان کا گھوڑا جو بجلی سے بھی بہت چنچل ہے اچھلاہٹ میں ہرنوں کے روپ اپنی چوکڑی بھول جائے۔"

اب ہم ایک اور اقتباس جو بہت کچھ اسی قسم کی اردو سے ملتا جلتا ہے سطور ذیل میں درج کرتے ہیں۔ یہ انتخاب ایک پنڈت صاحب اجودھیا سنگھ اپادھیا کی تحریر سے کیا گیا ہے:۔

ایک گیارہ برس کی لڑکی اپنے گھر کے پاس کسی پھلواری میں کھڑی ہوئی کسی کی بات دیکھ رہی ہے۔ سورج ڈوبنے پر ہے۔ بادل میں لالی چھائی ہوئی ہے بیار (نسیم شام) جی کو ٹھنڈا کرتی ہوئی دھیرے دھیرے چل رہی ہے تھوڑی بیر میں سورج ڈوبا۔ کچھ جھٹپٹا سا ہو گیا پھلواری کی ایک اور سے کوئی آتے اور آتا دیکھ پڑا جس اور وہ لڑکی کھڑی تھی۔ کچھ بیر میں وہ آکر اس لڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ لڑکی نے ریجھ کر کہا دیونندن! اب تک کہاں تھے۔ میں بہت بیر سے یہاں کھڑی تم کو اگور رہی ہوں (اگورنا پیشوائی کرنا)

باوجودیکہ یہ عبارت بھی خالص اردو زبان میں ہے تاہم بیار۔ اور اور اگور وغیرہ کے خالص ہندی الفاظ اس کو سید انشا کی ٹھیٹھ بول چال سے قدرے مختلف کر دیتے ہیں۔ اب اس سے بھی کچھ اور مختلف اقتباس ملاحظہ

دیا۔ تیہ ا:-

"کسی منشیا کے دو بیٹے تھے۔ ان میں سے چھٹکے نے پتا سے کہا۔ ہے بتا دا سے باپ) اپنی سمپتی (جائداد) میں سے جو میرا اس حصہ ہو سو مجھے دیجئے۔ تب اس نے اس کو اپنی سمپتی بانٹ دی۔ کچھ دناں بیتے تھے کہ اس چھوٹے نے اپنی سب سمپتی لچپن میں اڑا دی"

یہ خاص بنارس کی اردو ہے۔ ذرا دیکھو اس میں ہندی الفاظ کس کثرت سے ملائے گئے ہیں۔ مگر کیوں؟ بنارس ہندوؤں کی متبرک جگہ ہے۔ اس لئے اکثریت کی زبان پہ سنسکرت کا غلبہ ہے۔

اب ہم ایک خاص فقرے کو یہاں منتخب کرتے ہیں اور دکھاتے ہیں کہ وہ کس کس طرح تمام ہندوستان میں بولا جاتا ہے:-

"وہ اس درخت کے نیچے گھوڑے پہ بیٹھا ہے"۔ یہ جملہ خالص اردو زبان کا ہے جو اگر اسی طرح کہا سنا جائے تو ہمارے کانوں کو بہت بھلا معلوم ہوتا ہے لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ بطور لنگوا فرنیکا یہ فقرہ تمام اطراف ملک میں اس طرح نہیں بولا جاتا۔ مثلاً بمبئی کے عام مسلمان بلکہ دکنی ہندو بھی اس کو یوں کہیں گے۔ "وہ اس جھاڑ کے تلے گھوڑے پو یا پہ بیٹھا ہے یا بیٹھیا ہے" اور دوآبہ گنگ و جمن کے بعض اقطاع میں "او۔ اس رکھ کے تلے گھوڑے یا گھوڑے پہ چڑھا بیٹھا اے" مگر بانگڑو بولی میں جو کہ رہتک جیند اور حصار وغیرہ میں رائج ہے کہیں گے "او اک گھوڑے پر اس رکھ کے تلے بیٹھا سے"

اسی طرح آگرہ و متھرا وغیرہ کی مشہور برج کہا اس جملہ کو یوں ادا کرے گی "وہ گھوڑے پر وا پیڑ کے نیچی بیٹھو بھو اے"۔ قنوجی یا کان پوری بولی کہے گی "واہو ایک ٹٹو اپر وا رکھ کے تارے بیٹھو ہے" لیکن بندیلی زبان سب سے جدا ہو کے یوں پکارے گی "بو یو رکھ کے نیچے گھرٹوا پارے کے بیٹھو ہے"۔ اسی طرح علاقہ گوالیار کی بول چال میں " با

گھوڑا پہ چڑھو بیٹھا رہو ہے پیڑ نیچے"۔

لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ یہ اردو زبان ہے کہ ملک بابل کا قدیم منار جس کی نسبت انجیل کا بیان ہے کہ اس منار میں بہت سے سنگر الہی لوگ جمع تھے۔ خدا نے ان کو سزا دینے کے لئے ہر ایک کی زبان دوسرے کی زبان سے بہت مختلف کر دی تو وہ لوگ سخت پریشان ہو کے رہ گئے۔

دراصل یہی حال ہمارا بھی ہوتا لیکن محمد شاہی دور کے اردو شعراء کی دور اندیشانہ طبع کو شاباش کہ انھوں نے ہندی ریختہ کی یہ گھپچ پچ زبان ترک کر کے اردوئے معلی کی بنیاد ڈالی۔ جو ولی سے لے کر اقبال کے زمانے تک کام دے رہی ہے۔ اور یہی وہ اردو ہے جس میں اساتذہ ادب مثلاً ذوق۔ غالب۔ مومن۔ حالی۔ شبلی۔ رتن ناتھ سرشار اور اکبر۔ سر سید اپنی اپنی ادبی یادگاریں باقی چھوڑ گئے لیکن یہ واضح ہے کہ ان مصنفین کی زبان کا سکہ اقلیم علم و ادب میں رائج ہے۔ ورنہ اردو بطور لنگوا فرنیکا ابھی کچھ عرصے تک اس وسیع ملک میں اسی طرح رائج رہے گی جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا۔ اور یہ بھی بہت غنیمت ہے کیونکہ بول چال کی زبان ادبی زبان سے کچھ مختلف بھی ہوا کرتی ہے اور سچ پوچھو تو ہر ایک زبان پہلے اسی طرح عام بول چال کے طور پر مستعمل ہوتی اور پھر آہستہ آہستہ علمی و ادبی زبان بن جاتی ہے یعنی اگر کوئی زبان بری یا بھلی کسی طرح بولی نہ جائے تو پھر یہ تحریر میں بھی نہیں آتی اور نہ اس سے کوئی خاص علم ادب وضع ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ بات نہایت ضروری ہے کہ اب اس ملک میں اردو بطور لنگوا فرنیکا جس جس طرح پر مستعمل ہے اس کی قدر کی جائے اور مقامی محاورات میں سے جو جو زیادہ مفید و مستعمل ثابت ہوں ان کے اضافہ سے اردو زبان کا ذخیرۂ الفاظ بڑھانے کی کوشش کی جائے۔

سرخوش

رباعی

بدبو نہیں بدبوں کو مست کہہ کے چھیڑ دو
جنت اسی دنیا کو بنا کے چھوڑ دو
پھولوں سے محبت کے جناب ازخار
دوزخ کو عداوت سے بچا کے چھوڑ دو

جگر مرادآبادی

دُوری

یہ بُعد ہے سراسر یہ محض فاصلہ ہے — جلووں کو جو یہاں کے رنگیں بنا رہا ہے

دُنیا کی ہر وہ صورت دل کو لُبھا رہی ہے — جو دور سے تجلّی اپنی دکھا رہی ہے

ہر چند کچھ نہیں ہے افتادگی کی ہستی — جب دور ہو زمیں سے دل کھینچتی ہے پستی

ہر دُور کی صدا میں اک دُھن ہے ایک گت ہے — اِس بُعد کو نہ جانے کس سے مناسبت ہے

اہلِ خرد کی باتیں کب رِند مانتے ہیں — رازِ اِس کشش کا ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں

پردے میں اس کشش کے اک پاک آرزو ہے — انساں میں یہ خدا کی پوشیدہ جستجُو ہے

دُنیا کی ہر وہ صورت دل کو لُبھا رہی ہے
جو دور سے تجلّی اپنی دکھا رہی ہے

جوشؔ ملیح آبادی

گوماں

نام ہے گومتی، پنڈت جی پیار سے گوماں کہا کرتے ہیں کہتے ہیں مجھے اس سے ایک طرح کا اُنس ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس سے پیار کرتے ہیں، اس کی محبت کا دم بھرتے ہیں، اس کے چاہنے والوں میں سے ہیں، اپنا نام اس کے جاں نثاروں میں لکھواتے ہیں۔ اس طرح کہ لوگ انہیں گومتی کا عاشق تصوّر کریں، مجھ سے کئی بار اس معاملے پر بحث کر چکے ہیں۔ "دیکھو بھئی، میں مفت میں بدنام ہو رہا ہوں لوگ طعنے دیتے ہیں اس بے چاری کو، لیکن اگر سچ پوچھتے ہو تم جانتے ہو میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاتا، دھرم سے کہتا ہوں اور تم جانتے ہو مجھے دھرم سے بڑھ کر اور کوئی چیز پیاری نہیں، مجھے گومتی سے انس ہے، بس، اس انس میں گناہ کا شائبہ تک بھی نہیں، لوگ یوں ہی بدنام کرتے ہیں۔" ایک لمبی سانس لے کر ——— "میرا کیا ہے اکیلی جان ہوں کچھ کٹ گئی ہے۔ کچھ کٹ جائے گی، مجھے تو اس بے چاری کی فکر ہے، اور اگر اس کے خاوند کو پتہ لگ جائے تو پھر کیا ہو، تم جانتے ہو مرد کتنے شکی مزاج ہوتے ہیں اور عورتوں کو اپنا ناموس کس قدر عزیز ہے، گو میری محبت پاکیزہ ہے، تم جانتے ہی ہو: سانچ کو آنچ نہیں، پھر بھی ——— خلق کا منہ کون بند کر سکتا ہے۔ تم جانتے ہی ہو، اچھا چھوڑو، اس معاملے کو، لوگ یوں ہی شوشے چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ ہمارا دل صاف ہے، لوگ جو چاہیں بکیں، آؤ چائے پئیں۔"

اور پھر ہم چائے پینے میں مشغول ہو جاتے۔

پنڈت جی بڑے مشہور ڈاکٹر ہیں، قصبہ کے اور آس پاس گاؤں کے تمام ڈھور ڈنگر اُن کے پاس بغرض علاج آتے ہیں۔ ان کا پورا نام ہے پنڈت رام دیا اگنی ہوتری آف سلوتری ہیں۔ میں نے انہیں اکثر اسی طرح دستخط کرتے دیکھا ہے، لوگ انہیں صرف "پنڈت جی" کہہ کر پکارتے ہیں۔ یوں بھی دیکھنے میں اچھے خاصے بدصورت ہیں اور انہیں اپنی کم مائگی کا اتنا ہی احساس ہے جتنا ایک حسین کو اپنے حسن کا۔

ایک دن آئینہ سامنے رکھے مونچھوں کو تیل لگا رہے تھے، یکایک بول اُٹھے "لال حسین، تمہیں پتہ ہے کنکریٹ کیا ہوتا ہے؟"

میں نے جواب دیا "نہیں۔ تو"

"دیکھو، ہم تمہیں بتلائے دیتے ہیں، کنکریٹ وہ مسالہ ہے جس سے خالق باری نے بیسویں صدی کے انسان بنائے، یہ بات سائنسدانوں نے بڑی کھوج کے بعد دریافت کی ہے، انہوں نے اس مسالہ کو تیار بھی کر لیا ہے مگر اس سے وہ انسان نہیں تیار کر سکے، اگر وہ ایسا کر سکیں تو ان میں اور پرمیشر میں کیا فرق رہ جائے، سچ ہے نا"

"بجا فرمایا آپ نے"

"تو دیکھو نا، ہم تم سب اس مسالے سے بنے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ خدا نے آپ لوگوں کو پہلے بنایا اور مجھے سب سے آخر۔"

"وہ کیسے؟"

"بڑی سیدھی بات ہے، دیکھو نا، جب خدا سب لوگوں کو بنا چکا تو جو بچا کھچا مسالہ پڑا تھا اُسے دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا آخر اس کا کیا کیا جائے بہت غور و خوض کے بعد اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ اس سے ایک ایسا مجسمہ تیار کیا جائے جو سب سے انیلا ہو، اپنی نظیر آپ ہو، جس کے رعب حسن سے عورتیں غش کھا جائیں، بچے ماؤں کی گودیوں میں چھپ جائیں، جس کے جلال سے مردوں کے پیٹ میں بل پڑ جائیں ہنستے ہنستے قولنج ہو جائے، وہ نوری مجسمہ میں ہوں، ذرا دیکھو تو ——— ناک اندر دھنسی ہوئی، چیچک کے داغ، چھالے، اور یہ ہونٹ پکے ہوئے انجیر کی طرح پھٹے ہوئے۔" یہ کہہ کر آپ نے آئینہ زور سے میز پر پٹخ دیا اور لگے اپنے آپ کو گالیاں دینے۔

پھر کچھ دیر ٹھہر کر گنگنانے لگے "عشق تیرے میں صنم۔ میں صنم بول سنے کس کس کے۔

کس کس کے!! کس کس کے!!!"

ستدمی کے مزاج میں تلون کو کتنا دخل ہے، یہ دیکھ کر میں بے اختیار ہنسنے لگا، پھر وہ بھی میرے ساتھ ہنسنے لگے، ہا۔ ہا۔ ہا۔

. . . .

گومتی حسین ہے۔ مگر اس کا حسن الجبرے کا فارمولا نہیں، ایک فن کار اس میں ہزاروں نقائص دیکھ سکتا ہے، اس کے سینکڑوں عیوب بیان کر سکتا ہے، یہ ہوتے ہوئے بھی اُس کے حسن میں کچھ ایسی دلکشی و جاذبیت ہے جو دل کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، مجھے اس کی آنکھیں بہت پسند ہیں۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، ناگوری گائے کی طرح مست اور پنڈت جی کو اس کی ٹھوڑی اور وہ شیریں لوچدار آواز پسند ہے جسے سن کر اُن کا دل کسی نامعلوم مسرت سے کانپنے لگتا ہے۔ قصبہ کے حاکم اعلیٰ یعنی نائب تحصیلدار صاحب بھی اُسے اکثر تعریفی نگاہوں سے دیکھا کرتے ہیں، گومتی ان تعریفی نگاہوں سے خوش ہو جاتی ہے یہ خیال کہ وہ حسین ہے اور لوگ اُسے چاہتے ہیں۔ اُسے ہر دم مسرور رکھتا ہے وہ اپنے خاوند پر حکومت جتا سکتی ہے، اُس سے ایک نئے زیور کی فرمائش کر سکتی ہے، روٹھ جاتی ہے اور پھر چاہتی ہے کہ اُس کا خاوند اُسے منائے۔ وہ تین بچوں کی ماں ہے۔

اس کا خاوند ایک غریب دُکاندار ہے قصبے کے چھوٹے سے بازار میں ایک سرے پر چھوٹی سی دکان ہے۔ نمک آٹا تیل، کھدر اور گجرے وغیرہ بیچتا ہے۔ قد ٹھگنا، مضحکہ خیز صورت، زن مرید۔ گومتی کو اُس سے کیسے محبت ہو سکتی ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں آج تک نہ آئی۔ اُس کے کپڑے عموماً میلے رہتے ہیں۔ بیچارہ ہر وقت دُکان پر بیٹھا رہتا ہے۔ ہمارے قصبہ کی دکانیں شام کے چھ بجے بند ہو جاتی ہیں، مگر بارہا جب ہم سیر کر کے شام کو آٹھ، ساڑھے آٹھ بجے گھر کو لوٹے ہیں، گومتی کے غریب خاوند کو ہم نے دُکان پر ہی بیٹھا پایا ہے اور اس وقت شمع کی جھلملاتی ہوئی لو میں اس کا چہرہ کتنا عجیب نظر آتا ہے۔ وہ بودھوں کے دلائی لامہ کی طرح خاموش، صمٌ بکمٌ بیٹھا ہوتا ہے۔ وہ کیا سوچتا ہے! شاید وہ سوچتا ہی نہیں، یا شاید وہ کسی گاہک کا انتظار کر رہا ہے۔ ایسے گاہک کا جو کبھی آئے گا ہی نہیں ——
یا شاید وہ الف لیلہ کا ایک بونا ہے کہ محفل ہزار داستان سے اُٹھ کر ہماری اس خاموش، خشک، رومان سے خالی دنیا میں چلا آیا ہے اور انتظار کر رہا ہے اُس زمانے کا جس کی حقیقت آج محض افسانوی ہے

منتظر ہے اُس کائنات کا جس میں ہارون الرشید، ابوالحسن، الہ دین، امینہ اور زبیدہ بستے ہیں۔ کبھی اسکی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے یکایک ٹھٹھک کر رہ جاتا ہوں، اور جب وہ اپنے شانے سکیڑے گردن نیچی کئے ہوئے بیٹھا ہوتا ہے تو مجھے ایسا احساس ہوتا ہے کہ کوئی منتر پڑھ رہا ہے زمین پر کچھ پڑھ کر پھونک رہا ہے جس کے سحر سے یہ زمین ابھی پھٹ جائے گی اور ایک جن نمودار ہوگا جو رعد کی سی آواز میں بولے گا "کیا چاہیئے؟"
—— مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا، اس رومانیت سے خالی دنیا میں ایسا کبھی نہیں ہوتا، بلکہ ہر بار یہی ہوتا ہے کہ وہ غریب بنیا بول اُٹھتا ہے:
"کیا چاہیئے، بابو جی؟"
اور میں جلدی سے گھبرا کر جواب دیتا ہوں "تین انڈے مرغی کے!"

اور پھر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ الف لیلہ کا بونا نہیں، ایک غریب دکاندار ہے، گومتی کا خاوند، گومتی جسے میں اور نائب تحصیلدار صاحب تعریفی نگاہوں سے دیکھا کرتے ہیں اور بس —— اس دنیا میں حسن ہے، مگر رومان نہیں۔ محبت ہے، مگر مجنوں ناپید، شاید یہی سوچ کر عمر خیام کو دنیا کے نامکمل ہونے کا احساس ہوا ہوگا۔

. . . .

پنڈت جی دن میں دو بار آٹھ آنہ تول افیم کی چسکی لگاتے ہیں، افیون کی اتنی مقدار غالباً ہندوستان کے آٹھ دس بے کار نوجوان گریجوایٹوں کو ابدی سکون عطا کر سکتی ہے اور ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کو گھٹانے میں ضبطِ تولید سے زیادہ ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ ہند کے اصلاح پسندوں کو مصنوعی اور غیر قدرتی طریقے چھوڑ کر اس نعمتِ خداداد کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، کیا عجب کہ اسی سے قوم کا بیڑا پار ہو جائے، پنڈت جی سے پوچھئے، چسکی لگا کر کیسی روح پرور باتیں کرتے ہیں اور پھر لالہ سے چودہ چھٹانک دیسی شراب پی کر کس طرح ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو جاتے ہیں، اس وقت دنیائے سیاست کی باگیں اُن کے ہاتھ میں ہوتی ہیں، اور کل کائنات کے اسرار و رموز ان کے متعلق ہیں۔ ایسی حالت میں جو دوا وہ تجویز کر دیں۔ بیمار حیوانوں پر اکسیر کی طرح اثر کرتی ہے۔ اس وقت کتنے ہی لوگ کہ جن کے ڈھور ڈنگروں نے اُن سے شفا حاصل کی ہے اُن کے جان و مال کو دعائیں دے رہے ہیں، کسی پیر، سادھو کے "استھان" کی طرح شفا خانے میں لوگ آپ ہی آپ دودھ، مکھن، پنیر، پھل لئے

آ رہے ہیں، پنڈت جی نیک آدمی ٹھہرے جو چیز دلی عقیدت سے پیش
کی جائے اُسے کس طرح نہ قبول کریں۔ طرفہ یہ کہ اکیلی جان، کیا کھائیں
اور کیا نہ کھائیں! چنانچہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ دودھ، مکھن، پنیر، اور پھلوں
کا بیشتر حصہ گوماں کے گھر پہنچا دیا جاتا ہے۔ ویسے بھی انہیں گومتی کی لڑکیوں
رانی اور بلا سے بہت الفت ہے یہ سب اشیا بچوں کے لئے بھیجی جاتی
ہیں، اور غالباً اسی لئے قبول کی جاتی ہیں۔ رانی بڑی شوخ و طرار ہے
پنڈت جی سے ہر روز کسی نہ کسی چیز کی فرمائش کر دیتی ہے، مگر یہ فرمائشیں
اکثر شکر کی ڈلی سے لے کر سیپ کی گڑیا تک ہی محدود رہتی ہیں۔
صبح سیر کرتے ہوئے وہ راستے میں گومتی کے گھر سے رانی یا بلا کو اٹھا کر
سیر کے لئے لے جاتے ہیں، اور شام کو ایک ہی کھاٹ پر بیٹھ کر گوماں
سے گلچھرے اڑاتے ہیں، ان دونوں کو اس طرح بیٹھے دیکھ کر بوکیشیو کے
شاہکار "حسن اور حیوان" کا تصور آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے، گوماں
کی وہ نشیلی نگاہیں پنڈت جی کے رُخ صحرائی پر ابرِ رحمت بن کر برستی ہیں۔
وہ اپنے آپ کو اُن نگاہوں کی لامتناہی وسعتوں میں کھو دیتے ہیں اور اکثر
بالکل بے خود ہو کر شام کو جھومتے ہوئے واپس گھر آتے ہیں۔

ایک شام کا ذکر ہے، میں آتشدان کے قریب پاؤں پھیلائے
اونگھ رہا تھا، مینہ برس کر بادل مغرب کے قریب شفق سے گلرنگ ہو گئے
تھے، جلتی ہوئی لکڑیاں چیخ چیخ کر مجھے لوری دے رہی تھیں اور قریب تھا
کہ میں یہ دلفریب لوری سنتا سنتا اُن کی آغوش میں گر جاتا اگر باہر کسی کے
قدموں کی آہٹ نے مجھے چونکا نہ دیا ہوتا، مڑ کر دیکھتا ہوں کہ پنڈت
جی شانے سکیڑے چہرے کو اپنے پرانے اوورکوٹ کے اٹھے ہوئے
کالروں میں چھپائے کھڑے ہیں۔

"کیا بات ہے پنڈت جی؟"

جواب ندارد

"چپ کیوں ہو گئے؟ کیا اداس ہو؟"

کامل سکوت

"کہیں بے بھاؤ کی تو نہیں پڑیں، دوست؟"

کوٹ کے اٹھے ہوئے کالروں سے ایک قہقہہ بلند ہوا، سکڑے
ہوئے شانے سیدھے ہو گئے اور خمیدہ گردن نے اپنے آپ کو اونچا کیا،
میں چہرہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا، یہ گوماں تھی ـــــ ہنس رہی تھی اور ہنستی ہوئی
دوہری ہوتی جا رہی تھی۔

میں جلدی سے ٹانگیں جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا، اور فرطِ حیرت سے
اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

کچھ توقف کے بعد میں نے گوماں سے پوچھا "آپ یہاں کیونکر
آئیں! ـــــ پنڈت جی ـــــ پنڈت جی کہاں ہیں؟"

"نالے میں پڑے آپ کی راہ تک رہے ہیں"

"ہائیں" میں نے گھبرا کر کہا، کیا ہوا، کہیں ـــــ"

وہ جلدی سے قطع کلام کر کے بولی، لیکن اب اُس کی دلکش ہنسی
غائب ہو چکی تھی۔

"ہونا کیا تھا، خاک، اُس نے تیز تر لہجہ میں کہنا شروع کیا، وہ
آپ کا دوست، پنڈت جی پنڈت جی! ـــــ بدمعاش کہیں کا . . .
لچا . . . مگر نہیں"، اک دم اس کا لہجہ بدل گیا اور وہ تاسف انگیز لہجہ
میں بولی، "یہ سب میرا ہی قصور ہے"،

"کچھ دیر چپ چاپ سر جھکائے کھڑی رہی۔ پھر اس نے سر اٹھا کر
میری طرف دیکھا، بولی، بھائی! میں اُسے کچھ اور ہی سمجھے ہوئے تھی۔ دنیا
کچھ کہے، میری نظروں میں وہ میرا بھائی تھا۔ میں نے اس کے لئے خاوند
کی گھرکیاں سہیں، رشتہ داروں کے طعنے برداشت کئے مگر اُس سے
غیروں کا سا سلوک نہ کیا۔ آج اس کا صلہ یہ ملا کہ اُس نے پکڑ کر میرا منہ
چوم لیا . . . میں . . . میں" یہ کہہ کر وہ رونے لگی اور اسی طرح روتی
ہوئی اُس نے پنڈت جی کا اوورکوٹ اتار کر مجھے دے دیا اور اسی طرح
سسکیاں بھرتی ہوئی رخصت ہو گئی۔

. . . .

"اور اُس کمبخت نے میرے بال نوچ ڈالے"، پنڈت جی آہستہ
آہستہ کہہ رہے تھے اور میں اُن کے پیٹ پر مالش کر رہا تھا "میں تو بھلا
شرابی تھا، نشے میں چور تھا" ـــــ اب وہ نشہ کدھر ہرن ہو گیا تھا ـــــ
"مگر اُس نے میرا قطعاً کوئی خیال نہ کیا ـــــ اس نے مجھے گالیاں دیں، میرا
اوورکوٹ اتار لیا، اور مجھے کان سے پکڑ کر نالے پر لے آئی، بارش بھی
ہو رہی تھی، کم بخت، آہ، بند بند دُکھ رہا ہے۔ اس نے میری رتی بھر پروا
نہیں کی۔ آہ وہ پھلوں کے ٹوکرے دودھ کے کلسے، مکھن کے گولے"

میں اُن کی دلچسپ باتیں سن رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا، میرے
کانوں میں کسی "ڈرے" کا وہ دلفریب اپکار گونج رہا تھا۔ "دل لگانے
کا نتیجہ مل گیا؟"

اُن کے کوچہ میں جو تو اے دل گیا
دل لگانے کا نتیجہ مل گیا

. . . .

دل اکثر اُداس رہتا ہے۔ پنڈت جی نے اپنی رونی صورت کو داستانہ کر لیا ہے۔ دوستوں سے بے رخی، نوکروں سے خفگی اور مریضوں سے بے اعتنائی اختیار کر لی ہے۔ بات بات پر غصہ، بات بات پر ناراض۔ وجہ؟ صلح کی سب کوششیں ناکام رہی ہیں، دودھ کے ڈول لوٹا دئے گئے ہیں، پھلوں کے ٹوکرے بغیر ہاتھ لگائے واپس بھیج دئے گئے ہیں، مکھن ایک بال نکالے بغیر پھیر دیا گیا ہے۔ کریں تو کیا کریں۔ قریب کے ایک گاؤں کا نمبردار نورحسن اپنی خوبصورت گابھن گائے کو لے آیا کہنے لگا "پنڈت جی اسے دیکھئے، شاید سردی لگ گئی ہے۔ بدن کانپتا ہے، نتھنوں سے ریشہ جاری ہے، کبھی کبھی کھانستی بھی ہے اور پچھلا داہنا پاؤں بار بار اٹھاتی ہے، پنڈت جی کوئی اچھی سی دوا دو، ابھی ایک مہینہ ہوا اسے کشتواڑ سے لایا ہوں آپ کا بھلا ہوگا"۔ پنڈت جی جلے بھنے اٹھے، جلدی سے ایک شیشی اٹھا لائے، گائے کا منہ کھول کر اور ریک چڑھا کر دوا انڈیل دی، پلانا تھا گیو مکسچر، جلدی میں پلا گئے ٹنکچر آیوڈین۔ گائے نے راستے میں ہی پران دے دئے۔ نورحسن کو شبہ ہوا۔ گابھن گائے، خوب صورت گائے، نئی خریدی ہوئی، ناگوری نسل، تھانے میں رپٹ لکھوا دی۔

. . . .

شومئی قسمت، پنڈت جی کو تو خود ہی اس "گؤ ہتیا" کا بہت افسوس تھا، اس پر "پولیس والوں" نے تنگ کرنا شروع کیا اصل میں "یہ تھانے والے" دوسروں کے جذبات اور احساسات سے قطعاً بے پروا ہوتے ہیں کبھی بھولے سے بھی ان کے دل میں یہ خیال نہیں گذرتا کہ وہ اپنے طرز عمل سے دوسروں کے نازک جذبات کو کتنی ٹھیس پہنچا رہے ہیں۔ پنڈت جی کو دیکھو "بے چارے آپ ہی آپ شرم کے مارے مرے جا رہے ہیں، اب بھلا پولیس کو دخل درمعقولات کی کیا ضرورت تھی، گائے تو نورحسن کی مری یا ماری گئی، بھلا یہ تھانیدار صاحب کیوں پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑاتے ہیں اور ہمارے ان کے تعلقات کتنے برسوں سے خوشگوار چلے آ رہے ہیں جبکہ یہ تھانیدار صاحب ابھی سرینگر میں سارجنٹ ہی ہوا کرتے تھے، خود میں نے کئی دفعہ ان کی بھینس کی مرہم پٹی کی ہے کہ جب سکول کے لونڈوں نے اُسے پتھر مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا اور آج یہ ہم سے تین سو روپیہ رشوت میں مانگتے ہیں اور طرفہ یہ کہ دھمکی دیتے ہیں جیل پہنچانے کی، حوالات کی، کیوں"۔ یہ کہہ کر پنڈت جی میری طرف تکنے لگے، میں نے نگاہیں نیچی کر لیں اور بوٹ کی نوک سے زمین کریدنے لگا گویا تین سو روپے وہیں گڑے ہوئے تھے۔

—— اور بھلا کرتا بھی کیا، تین سو روپیہ کہاں سے لاتا، پنڈت جی نے تو کبھی پھوٹی پائی بھی نہ رکھی تھی۔ تنخواہ اور "بالائی آمدن" کے علاوہ ہمیشہ ادھار مانگ کر کھایا کرتے تھے، زیادہ نہیں تو کم از کم ساڑھے تین چار سو تک انہیں قصبہ کے دکانداروں کا دینا تھا، اور ان سے اب کچھ مزید ملنے کی توقع نہ تھی —— میں غریب آدمی ٹھہرا۔ ادھر اُدھر سے مانگ تانگ کر پچاس روپیہ اکٹھے کئے مگر یہ تو اونٹ کے منہ میں زیرہ کے برابر بھی نہ تھا تھانیدار صاحب حرص و آز کے دانت تیز کئے ہوئے تھے۔ تین سو سے ایک پائی کم لینے کو تیار نہ تھے۔ بڑی مشکل کا سامنا تھا، اسی حیص بیص میں کئی دن گزر گئے، آخر ایک دن تھانیدار صاحب میرے پاس آئے، کہنے لگے "کیوں بھئی، پھر کیا صلاح ہے، چالان کر دوں، آخر کب تک چپ بیٹھا رہوں گا، نورحسن بھی بگڑا ہوا ہے، فرض کی بجاآوری تم جانتے ہی ہو"۔
قرائن سے معلوم ہوتا تھا، کہ نورحسن نے آج تھانیدار صاحب کی مٹھی گرم کی تھی، فرض کی بجاآوری اتنے دن خاموش رہنے کے بعد آج پھر چمک اٹھی تھی۔

کوئی جواب نہ پاکر تھانیدار صاحب اٹھ کھڑے ہوئے، "اچھا تو چلتا ہوں، اگر آج شام تک کچھ بن جائے تو بہتر، ورنہ کل تو معاملہ میرے اختیار سے باہر ہوگا"۔

پنڈت جی کو ساتھ لئے رات کے بارہ بجے تک در بدر گھوما کسی نے آس نہ بندھائی۔ رات ساری جاگتے کٹی۔ اور صبح میلے کچیلے بادلوں کا لبادہ اوڑھے نمودار ہوئی۔ رات کو یہ خبر قصبہ میں آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ پنڈت جی کو صبح گرفتار کیا جائے گا۔ صبح لوگ جوق در جوق آنے شروع ہوئے۔ ٹولیاں بنا کر، دو دو، چار چار کھڑے تھے۔ کوئی کچھ کہتا، کوئی کچھ، کوئی پنڈت جی کی "گئو ہتیا" پر نفرین کرتا تو کوئی تھانیدار صاحب کی روپہلی مصلحتوں کا تذکرہ کرتا جتنے منہ اتنی باتیں۔ گھر کے اندر پنڈت جی چپ چاپ بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ جب چاروں طرف سے ناامیدی نے گھیر لیا ہو، اندھیرے میں کہیں بھی

شعلۂ امید نہ دکھائی دیتی ہو، اس وقت طبیعت میں اپنے آپ سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ قلب میں دلیری اور ہر مشکل کا سامنا کرنے کی جرأت پیدا ہو جاتی ہے۔ پنڈت جی تو یوں بھی بے پروا، بے فکر، نتائج و عواقب سے بے نیاز طبیعت کے مالک تھے جو کچھ ہوگا، دیکھا جائے گا۔ صبر کرکے بیٹھ رہے۔ تھانیدار صاحب کی راہ دیکھ رہے تھے کہ آئیں تو کم از کم مغلظات سنا کر ہی اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں۔

یکایک کسی کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی اور باہر لوگوں کی چہ مے گوئیاں بھی یکایک بند ہو گئیں۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ یہ تھانیدار صاحب تھے۔ وردی پہنے ہوئے دراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ اُن کے بعد پولیس کے تین سپاہی اور ان کے بعد بیس پچیس ہمارے قصبہ کے بھائی بند۔ تھانیدار صاحب نے ایک اڑتی ہوئی نگاہ سے میری طرف دیکھا اور ـــــ سب کچھ سمجھ گئے۔ میں نے انہیں اندر لے جا کر تخلیہ میں بات چیت کی گڑگڑایا، پنڈت جی نے اُن کے پاؤں بھی پکڑ لئے۔ مگر وہ خدا کا بندہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ پچاس روپے میں وہ معاملہ کیسے دبا سکتا تھا۔ اکیلا نور حسن ہی بمشکل ڈیڑھ دو سو لے کر راضی ہوگا۔ مقدمہ بالکل صاف تھا۔ گواہ موجود تھے۔ تھانیدار صاحب کو خود بہت رنج تھا۔ کیا وہ پنڈت جی کی گرفتاری کو پسند کرتے تھے؟ ہاں وہ اتنا کر سکتے تھے کہ پنڈت جی کو ہتھکڑی لگائے بغیر گرفتار کرتے۔

جب تھانیدار صاحب اپنا منشا ظاہر کر چکے تو پنڈت جی نے اٹھ کر اپنا اوورکوٹ اوڑھا اور نگاہیں نیچی کرکے بولے، "چلئے، جدھر لے چلئے، چلتا ہوں۔"

میرا دل بھر آیا۔ پنڈت جی لاکھ برے سہی، پھر بھی میرے دوست تھے۔ بس چلتا تو اس کمبخت تھانیدار کی بوٹی بوٹی نوچ لیتا۔ مگر کیا کرتا، اپنے بس کی بات نہ تھی۔ زہر کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ پنڈت جی چلے۔ آگے آگے تھانیدار صاحب تھے، اس کے بعد پنڈت جی سر جھکائے ہوئے، ان کے بعد پولیس کے سپاہی۔ لوگ آنگن میں کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ اہل قصبہ میں ایسا کون شخص تھا کہ جس کے مال مویشی کی خدمت پنڈت جی نے نہ کی تھی۔ اُس آنگن میں رلدو رام شاہ بھی کھڑے تھے اور گھسیٹا مل بھی، چودھری پیر بخش بھی تھے اور ملک سردار خاں بھی، مگر کسی کو نہ ترس آیا، نہ خوف خدا۔ سب اہل تماشا بنے کھڑے تھے۔ تھانیدار صاحب ابھی بمشکل آنگن میں چار قدم چلے ہوں گے کہ دروازے پر کسی نے روک لیا اور کسی کی مہین آواز سنائی دی، "ٹھہرئیے،"

مجھے کسی کی میلی کچیلی ساڑھی کا پلو نظر آیا۔ آگے بڑھ کر دیکھا، گومتی تھی، سمٹی جا رہی تھی، تھانیدار صاحب ایک طرف ہو گئے۔

گومتی نے پنڈت جی کی طرف دیکھا، وہ سر جھکائے صُمٌّ بُکمٌ کھڑے تھے۔ پھر اُس نے میری طرف دیکھا اور آنکھیں جھکا کر بولی، "بھائی ـــ میرے بھائی کو چھڑا دو۔" یہ کہہ کر اُس نے آہستہ سے ایک روپوں سے بھری ہوئی تھیلی میری طرف بڑھا دی۔

عورت نشہ ہے، فریب ہے، سراب ہے، رسوائی ہے، اور وہ سب کچھ ہے جو انسان کو بدی کی طرف راغب کرتا ہے۔ عورت پاکیزگی ہے عصمت ہے، سراپا تقدیس ہے اور سب کچھ ہے جو انسان کو انسانیت کے معراج کمال پر لے جاتا ہے۔ جس آسانی سے یہ ایمان کو غارت کر سکتی ہے، اُسی آسانی سے یہ اُسے عطا بھی کر سکتی ہے

گومتی کے اس ایک جملے نے پنڈت جی کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا انھوں نے مجھے ہاتھ کے اشارہ سے روپے لینے سے روک دیا اور آگے بڑھ کر گومتی کے پاؤں چھو لئے اور دردناک لہجہ میں بولے، "بس بہن تمہارے روپے مجھے پہنچ گئے۔ میں قید سے آزاد ہو گیا ـــــ"

پھر تھانیدار صاحب کی طرف دیکھ کر پرجوش آواز میں بولے۔ "چلو، اب اب دیر کیوں لگا رکھی ہے!"

. . . .

پنڈت جی چھ مہینے سے جیل میں ہیں۔ وہاں افیم ملتی ہے نہ شراب۔ خوب مزے میں ہیں۔ کہتے ہیں گوماں نے مجھے سدھار دیا۔

کرشن چندر ایم اے

تقدیرِ عشق

حُسن نے رکھی ہے بنیادِ جہاں میرے لئے ۔۔۔ یہ زمیں میرے لئے، یہ آسماں میرے لئے

موت کی پرواز سے ہے دُور میرا آشیاں ۔۔۔ زندگانی ہے حیاتِ جاوداں میرے لئے

میں قناعت کر نہیں سکتا جہانِ تیرہ پر ۔۔۔ جادۂ راہِ طلب ہے کہکشاں میرے لئے

میری خاکِ راہ کا ہر ذرّہ ہے نوکِ سناں ۔۔۔ ہر قدم پر ہے نیا اک امتحاں میرے لئے

میری ہیبت سے ہر اک مغرور کا نیچا ہے سر ۔۔۔ جھک کے ملتا ہے زمیں سے آسماں میرے لئے

میں اگر قائم رہوں اپنی خودی پر اے حفیظؔ
وہ بدل سکتا ہے تقدیرِ جہاں میرے لئے

حفیظؔ ہوشیارپوری

غزل

کاش کچھ بہتر ہوا انجام سفر میرے لئے
رات دن گردش میں ہیں شمس و قمر میرے لئے

کیا یہی ہے حاصل لیل و نہارِ زندگی
شام سے اک کشمکش ہے تا سحر میرے لئے

ہے -

آج کس رفعت پہ ہوں تیری نگاہِ لطف سے
سر بہ سجدہ ہو نہ جائیں بام و در ے پہ لٹا دینا چاہئے

ایک نظارے نے اس کے دل کے ٹکڑے کر دیئے
آج قاتل بن گئی میری نظر میرے کے کشش

کون سن سکتا ہے اس دل کے دھڑکنے کی صدا
ایک اک آواز ہے جادو اثر میرے لئے

صاف اوجھل ہے نگاہوں سے وہ حسن بے نقاب
کس قدر دشوار ہے تابِ نظر میرے لئے

آج اُس راہِ محبت میں قدم رکھتا ہوں میں
ذرّہ ذرّہ ہے جہاں سینہ سپر میرے لئے

کون ہے میرے سوا حرماں تڑپنے کا مجاز
اک عطائے خاص ہے دردِ جگر میرے لئے

حرماں خیرآبادی

ہمہ خاندان آفتاب

(ایک ایکٹ کا مزاحیہ ڈراما)

یہ ڈراما اپنی طرز کی نئی چیز ہے ہر چند کہ اس کا کوئی خاص پلاٹ نہیں لیکن شروع سے آخر تک ایک دلچسپ ربط قائم ہے۔ عوام میں غلط الفاظ کے استعمال اور غیر روزمرہ دارنہ طریق گفتگو کی جو عادت پائی جاتی ہے۔ یہ ڈراما اس پر ایک لطیف طنز ہے۔ امید ہے کہ اب اردو میں اب اس طرز کے ڈرامے بھی لکھے جائیں گے۔ ایڈیٹر

افرادِ تمثیل

میں تقنیب۔ ایک میانہ قد موٹا تازہ انسان۔ ایک اقامت خانے کا مودب مقیم۔

۱۔ شجر حیات خاں ـــــ ایک لمبا چوڑا نہایت جسیم شخص بڑے باغ کا مہتمم
۲۔ معتبر حسین ـــــ طلبا نواز اور شجر نواز کا معمر چچا۔ پرانی وضع کا آدمی
۴۔ غوں غوں بیگ ـــــ طلبا نواز کا بڑا لڑکا
۵۔ چوں چوں بیگ ـــــ ״ چھوٹا لڑکا
۶۔ ہیلی ـــــ شجر حیات کی بیوی
۷۔ شریر ـــــ ״ کی بیٹی
۸۔ استاد ـــــ چوں چوں بیگ کا مدرس
۹۔ داروغہ ـــــ شجر حیات خاں کا داروغہ
۱۰۔ گڑبڑ ـــــ شجر حیات کا پاگل ملازم

پہلا منظر۔ [طلبا نواز بیگ کا مکان۔ ایک کمرے میں طلبا نواز بیگ کرسی پر بیٹھا ہے۔ مقابل میں منشی صاحب حساب کے کاغذات اور رجسٹر وغیرہ لئے بیٹھے ہیں۔ طلبا نواز کاغذات کو دیکھتے ہوئے گفتگو کر رہا ہے]

طلبا نواز۔ صیب! یہ کیا جیقپش ہے۔ ایسا اگڑ بگڑ حساب تو میری سمجھ میں نہیں آتا۔

منشی۔ میں دو روز سے رخصت پر تھا۔ محرر صاحب نے یہ گڑبڑ کر دی ہے آج سب ٹھیک کر لوں گا۔

طلبا نواز۔ صیب یہ تیس روپے کا ہے کے ہیں۔

منشی۔ آپ نے کاغذ منگوانے کا حکم دیا تھا۔

طلبا نواز۔ تو پھر آپ نے لکھا کیوں نہیں۔ کیسے معلوم ہو کہ کتنے تھان کاغذ آیا ہے۔

منشی۔ تین رم آئے تھے۔

طلبا نواز۔ تو پھر کیجئے نااندراج رجسٹر۔

منشی۔ بہت خوب۔

طلبا نواز۔ صیب! کل کی دعوت بڑی زور شور کی ہے ذرا انتظام اچھا کرنا۔

منشی۔ آپ خاطر جمع رکھئے میں سب انتظام نہایت سلیقے سے کردوں گا۔

طلبا نواز۔ دیکھئے صیب بہتر تو یہ ہوگا کہ ہم ہر ایک دعوتی کی جائے مخصوص پر چٹھیاں لگا دیں۔

منشی۔ جی ہاں ہر کرسی پر نام کی چٹھی باندھ دیں گے۔

طلبا نواز۔ صیب اب آپ جائیے۔ میں ذرا دوسرے کام کی خبر لیتا ہوں سنئے میں شجر حیات خاں صاحب کے خانے جا رہا ہوں۔ اگر مجھ سے کسی فعل کی ضرورت لاحقہ ہو تو وہاں آنا۔

منشی۔ میں پھر کب حاضر ہوں۔

طلبا نواز۔ جب آپ کا جی چاہے ٹھیک چار بجے [منشی چلا جاتا ہے

دوسرا منظر

[شجر حیات خاں کا دیوان خانہ۔ شجر کا پاگل ملازم گڑبڑ گنگناتے ہوئے

فرنیچر صاف کر رہا ہے۔ شجر باہر سے داخل ہو کر گڑبڑ کے قریب جاتا ہے]

شجر۔ [قریب جا کر] گدھا

گڑبڑ۔ [چونک کر] آں ں ں ٹپ آیا [شجر سے ٹکرا کر بے ترتیبی کے ساتھ گر پڑتا ہے۔ شجر غصے میں آ کر بلند آواز سے ڈانٹ ڈپٹ شروع کرتا ہے۔ یہ سن کر شجر کی بیوی داخل ہوتی ہے۔ دوڑتی ہوئی پریشانی کی حالت میں آ کر وہ بھی شوہر سے ٹکرا کر گرتی ہے۔ گڑبڑ لوٹتا ہوا نکل جاتا ہے۔ شجر بڑبڑاتا ہوا اپنی بیوی کو اٹھنے میں سہارا دیتا ہے۔ پھر اس کو ایک صوفے پر لے جا کر لٹا دیتا ہے۔ ہنبلی کراہ رہی ہے]

شجر۔ اس طرح لیٹنے میں شاید تکلیف ہو گی [گڑبڑ داخل ہوتا ہے]

گڑبڑ۔ طلبا نواز صیب آئے ہیں۔

شجر۔ اندر بلا کر لا [گڑبڑ جاتا ہے۔ شجر ہنبلی کو کروٹ لینے میں مدد دے رہا ہے۔ طلبا نواز بیگ مسکراتے اور ڈنڈا ٹیکتے ہوئے داخل ہوتا ہے] آیئے تشریف لائیے بھائی صاحب۔

طلبا نواز۔ کیوں صیب۔ یہ آپ کا زنان خانہ کچھ مکر وہات نکال رہا ہے۔

شجر۔ جی ہاں ابھی ابھی گر پڑی تھیں تکلیف کے باعث کراہ رہی ہیں۔

طلبا نواز۔ چوٹ پوٹ تو نہیں آئی۔

شجر۔ پاؤں کو مار لگا ہے۔

طلبا نواز۔ شاید گھٹنے کے ٹیلے پر۔

ہنبلی۔ اوہ ہوں گھٹنے کی پیڑ ہیں۔

طلبا نواز۔ کیوں صیب۔ یہ کیسے چت پٹ ہو گئیں۔

شجر۔ وہی حرامزادہ گڑبڑ ——

ہنبلی۔ نہیں بلکہ آپ کے پیٹ کے نقارے سے ٹکرا گئی۔

شجر۔ اجی اسی کی وجہ سے تو یہ سب کچھ ہوا۔

طلبا نواز۔ تو پھر تو صیب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو چوٹوں پر چوٹیں لگی ہیں۔

[شریرہ اور غوں غوں بیگ داخل ہوتے ہیں]

شریرہ۔ کیا ہوا امی

شجر۔ کیا خاک ہونا۔

غوں غوں۔ شاید گر پڑی ہیں۔

شجر۔ اور کیا

غوں غوں۔ چوٹ بڑی بھاری بھرکم معلوم ہوتی ہے۔

شریرہ۔ ابا حرامزادے کے پیٹ سے بھیجا جھڑا دو۔

طلبا نواز۔ نہیں صیب ایسا نہ کرنا آخر وہ آپ ہی کے گھر کا پردہ ور ہے نا۔

غوں غوں۔ بس ابا آپ تو ہمیشہ ان گدھوں کی تشبیہاں لیتے رہتے ہیں۔

شجر۔ بیگم کیوں اب تکلیف کیسی ہے (ہنبلی کراہتی ہے)

طلبا نواز۔ کیا صیب یہ بھی کوئی پرسش کرنے کی بات ہے دیکھئے گھٹنے کا ٹیکہ کتنا موٹا ہو گیا ہے درد ہو گا ضرور

شریرہ۔ اف کتنا نازک مقام ہے۔ چیٹی کی مار ہے بس آنسو ہی ٹپک پڑتے ہیں۔

غوں غوں۔ معلوم ہوتا ہے مار گھٹنے کے ٹخنے پر بھی زوردار ہے۔

ہنبلی۔ اور گھٹنے کی وادی میں بھی چوٹ آئی ہے۔

طلبا نواز۔ صیب تب تو انہیں اندر لے جا کر چوپائے پر لٹا دینا چاہیئے۔

شجر۔ جی ہاں میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔

شریرہ۔ امی چلو اندر چل کر آرام کرو [شریرہ اور غوں غوں اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں]

طلبا نواز [شجر سے] صیب آپ بھی اُن کی گردن میں ہاتھ دیجئے [شریرہ اور غوں غوں ہنبلی کو لیجاتے ہیں]

شجر۔ آیئے ادھر تشریف رکھئے بھائی جان۔

طلبا نواز۔ نہیں صیب آپ اپنی جائے مخصوص پر بیٹھئے۔ آپ کا مزاج شریف

شجر۔ دعا سے اچھا ہوں۔ بھائی صاحب معاف کرنا کہ میں خود آپ سے ملنے حاضر نہ ہو سکا۔

طلبا نواز۔ کیا مضائقہ۔ میں خود تشریف لایا ہوں نا۔

شجر۔ افسوس ہے کہ معافی کی چٹھی تک روانہ نہ کر سکا۔

طلبا نواز۔ صیب چٹھی چپٹی کی کیا ضرورت ہے جب کبھی ضرورت ہو فوراً سے اطلاع کر دینا۔

شجر۔ کہلا [illegible] لے لیا۔

طلبانواز۔ تو صحیب پھر آپ خود کیوں نہیں خرید لیتے۔ جاپانی فون بڑے سستے داموں مل جائے گا

شجر۔ جی ہاں انگریزی تو کچھ کچھ جانتا ہوں مگر جاپانی مطلق نہیں آتی پھر جاپانی فون لگا کر کیا کروں۔

طلبانواز۔ واہ صحیب کیا آپ نے فون پر کبھی گفتگو نہیں کی۔ میں سمجھتا ہوں اکیسیوں دفعہ آپ نے گفتگو کی ہوگی۔

شجر۔ جی ہاں۔

طلبانواز۔ فون پر جو بھی زبان کروگے وہی سنائی دے گی۔

شجر۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے گزٹ کے دفتر پر جو فون ہے وہاں ہمیشہ انگریزی ہی میں گفتگو ہوتی ہے اور انجمن ہندوستانی کے دفتر پر جو فون ہے وہاں صرف ہندوستانی ہی زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔ اسی طرح انگلستان میں سب فون انگریزی، فرانس میں فرانسیسی، جرمن میں جرمنی اور اٹلی میں اٹالین زبان کے استعمال ہوتے ہیں۔

طلبانواز۔ [سر کھجاتے ہوئے] صحیب بات تو ٹھیک ہے۔ انگلستان کی حد تک میں بھی تائید کردوں گا۔ وہاں میں نے فون پر کوئی دوسری زبان نہیں سنی۔ یہ بتائیے کہ آپ خاص انگلستان میں کتنے عرصے تک رہے۔

شجر۔ پورے یا دکم سوا دو سال۔

طلبانواز۔ تب تو آپ کو وہاں کی ہر چیز دیکھنے کا موقع ملا ہوگا۔

شجر۔ مصروفیت کے باعث بعض چیزیں ویسی ہی رہ گئیں۔

طلبانواز۔ کیا مضائقہ ایسے اتفاقات تو پیش درپیش آتے ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ خاص لندن میں مجھے عرصے تک رہنے کا اتفاق ہوا لیکن ٹیمس نہ دیکھ سکا۔

شجر۔ یہ ٹیمس کیا بلا ہے۔ کیا یہ کوئی ٹیک دو ڈری کا بھائی ہے۔

[illegible]از۔ [مسکرا کر] نہیں صحیب نہیں ٹیمس تو بہت ہی بڑا سمندر ہے۔ [illegible]ت بڑا تالاب ہے۔

[illegible] کا آ[illegible] کیسہ [illegible]

طلبانواز۔ صحیب! یہ مخمل سر پر ڈاڑھی کیا بکتا تھا۔

شجر۔ جی نہیں وہ دراصل ڈاڑھی پر سر کہنا چاہتا تھا [ایک پرانی وضع کے نواب لکڑی ٹیکتے داخل ہوتے ہیں۔ دونوں اٹھ کر اس کی تعظیم کرتے ہیں]

شجر۔ چچا جان آپ نے کیوں زحمت کی میں خود حاضر ہونے والا تھا۔

معتبر۔ مجھے افسوس ہے کہ کل تم جب آئے تھے میں مکان پر موجود نہ تھا

شجر۔ کیا مضائقہ میں آپ کی واپسی تک ضرور ٹھہرتا لیکن ایک بجے دن میں ڈنر پہ جانا تھا اس لئے چلا گیا۔

طلبانواز۔ صحیب بڑوں کے گھر گئے تو اتنا جلد چٹ پٹ نہ ہونا چاہئے۔

معتبر۔ کہو میاں طلبانواز اب تمہارا قارورہ کیسا ہے۔

طلبانواز۔ چند روز ہوئے میرے ٹخنے کو نزلہ ہوگیا ہے۔

معتبر۔ ہاتھ میں دردِ سر جو ہو رہا تھا وہ تو اب کم ہے نا۔

طلبانواز۔ جی ہاں وہ تو کم ہوگیا تھا مگر اس کے بعد ہی سر میں متلی اور ناک میں سے پسینہ بہنے کی شکایت شروع ہوگئی تھی۔ اس کے بعد سے یہ نیا مرض لاحقہ ہوگیا ہے آپ کا مزاج شریف

معتبر۔ کیا بتاؤں میاں بوڑھاپے کی ضعیفی کا زمانہ ہے۔ کچھ نہ کچھ شکایت رونمائی کیا کرتی ہے۔ چنانچہ چند روز کے عرصہ دراز سے بغل میں گردے کا درد شروع ہوگیا ہے۔

طلبانواز۔ جلدی بغل کٹوا دیجئے ورنہ مرض منعدد ہو جائے گا۔

معتبر۔ ہاں میاں میں بھی یہی سوچ رہا ہوں [شجر سے] کہو شجر وہاں سفر کیسا معقول رہا۔

شجر۔ کیا کہوں قبلہ ——

طلبانواز۔ [شجر سے] صحیب بزرگ بڑوں کو ہمیشہ قبلہ و کعبہ کہنا چاہئے۔

شجر۔ یوں تو بہت سی نئی چیزیں دیکھنے میں آئیں لیکن وہاں کے زو میں ایک عجیب قسم کا درخت نظر آیا۔ میں اس کا بیج لے کر آیا ہوں

معتبر۔ اجی یہ تو بتاؤ کہ وہاں دولت کی فرعونی کیسی ہے اور لوگ کتنے مالدار ہیں۔

شجر[illegible] بہت سے لوگ مالدار ہیں۔ لیکن [illegible] جائیداد نہیں۔ جہاں اور [illegible] کی ایک آدھ سختی ضرور نظر

چوں چوں۔ ملین کہو ملین۔

استاد۔ ہوں صرف ملین کہو ورنہ کچومر نکال دوں گا۔

چوں چوں۔ [دبی آواز میں] ملین۔

استاد۔ جانتے ہو ملین کس چڑیا کا نام ہے۔

چوں چوں۔ جی ہاں۔ مینا کی بہن ہو گی شاید۔

استاد۔ [خفگی سے اٹھ کر] میں تم کو نہیں پڑھاتا۔ بے وقوف کہیں کے چلو اپنے ابا سے کہہ دو کہ میں کل سے نہیں آؤں گا۔ [چلا جاتا ہے]

چوتھا منظر

[معتبر حسین کا دیوان خانہ۔ فرش پر معتبر حسین اور شجر حیات خاں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ معتبر حقہ پی رہا ہے]

معتبر۔ بھئی اب تم شام کا کھانا ہمارے ہی پاس کھا لینا۔

شجر۔ قبلہ مجھے کوئی عذر نہ تھا مگر اب بازار جانا ضروری ہے۔

معتبر۔ ایسی کیا مشکل ضرورت آن پڑی بھیا۔

شجر۔ جی ہاں چھوٹے میاں کے لئے ہنڈی کیپ خریدنے جانا ہے۔

معتبر۔ یہ ہنڈی کیاپ کیا بلا ہے بے درماں کا اسم گرامی ہے

شجر۔ میں خود نہیں جانتا۔ کل شام میں جب میں بیٹھا ہوا تھا وہ کرکٹ کا بیٹ لے کر بڑا ہی اداس آیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اگر اس کو ہنڈی کیپ مل جاتا تو وہ جیت جاتا۔ اسی لئے آج کھیل سے پہلے اس کو ہنڈی کیپ خرید کر دے دینا چاہتا ہوں۔

معتبر۔ بھیا میں یہ تو دریافت کرنا بھول ہی گیا کہ کل تم میں اور منجھلے میاں میں کیوں جھڑپ ہو گئی۔

شجر۔ جی نہیں کوئی جھڑپ وغیرہ نہیں بلکہ محض گفتگو تھی۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ کل ہم جنگل کی طرف گئے تھے۔ جب ایک تالاب پر پہنچے تو منجھو نے کہا۔ بھائی جان اتنا بڑا تالاب سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے آخر اس میں کی سب مچھلیاں کہاں گئی ہوں گی۔ اس پر ہمارے عقلمند چھوٹو نے کہا۔ کہاں جائیں گی۔ کیکر کے انہیں درختوں پر چڑھ گئی ہوں گی۔ تب میں نے کہا آخر ہمارے چھوٹے ہی تو ہو یہ سب تجربے کی باتیں ہیں تم کیا جانو۔ میاں یہ بھینسیں تھیں جو درختوں پر چڑھ جاتیں۔ بلکہ پانی آنے تک ہوا میں اُڑتی پھریں گی۔

معتبر۔ واہ جی شجرو میاں بات تو بڑی معقول بتائی۔ کیوں نہ ہو بھئی ایک عہدہ دار ہی تو ہو [دستک]

معتبر۔ کون۔

داروغہ۔ حضور میں داروغہ ہوں۔

شجر۔ اندر آؤ۔ [داروغہ آکر ادب سے سلام کرتا ہے] سنو جی ہم تم سے بہت خفا ہیں۔

داروغہ۔ جی حضور۔

شجر۔ کل میں نے کیا کہا تھا۔

داروغہ۔ حضور رسوبتی والا دسن کا گولا کہیں نہیں ملا۔

شجر۔ [معتبر سے مخاطب ہو کر] دیکھ رہے ہیں قبلہ آپ۔ کتنا کم عقل آدمی ہے [داروغہ کی طرف پلٹ کر] اجی سو کا نہیں ملا تو پونسو یا پچاس ہی پارس پور کا گولا لے آنا تھا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آج کل تمہارا انتظام کچھ ٹھیک نہیں ہے۔

داروغہ۔ سرکار میں تو ہر خدمت تن دہی سے انجام دیتا ہوں۔

شجر۔ خاک بھی نہیں۔ کل چار بجے جب میں باغ پر سے گزر رہا تھا۔ سب مالی اصطبل کے دیوان خانے میں بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے۔

داروغہ۔ ٹھیک ہے حضور۔ اس وقت انہیں کوئی کام ہی نہ تھا۔

شجر۔ کام نہ تھا کیا معنی۔ درختوں کو پانی پلانا کیا کوئی کام نہیں ہے۔

داروغہ۔ مگر حضور اس وقت تو بارش ہو رہی تھی۔

شجر۔ تو کیا ہوا۔

داروغہ۔ بارش میں پانی ——

شجر۔ بس بس یہی ہے تمہاری عقل۔ ارے کیا چھتری پکڑ کر پانی نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔

داروغہ۔ جو حکم حضور آئندہ موسلا دھار بارش بھی ہو تو ایسا ہی کروں گا۔

شجر۔ کیا وہ آم کے درخت کے پاس کا گڑھا بھروا دیا گیا۔

داروغہ۔ بڑے مالی سے معلوم ہوا کہ وہ باہر سے مٹی منگوا رہا تھا تو آپ نے منع فرما دیا۔

شجر۔ کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ کام بند کر دو۔ اس بے وقوف سے تو یہ کہا تھا کہ مٹی اتنی دور سے کیوں منگواتا ہے۔ اس گڑھے کے بازو سے کھود کر بھر دینا۔ اس پر اس نے کہا کہ وہاں گڑھا

ہو جائے گا۔ بات معقول تھی اس لئے میں یہ بولا کہ اس کے بازو سے کھود کر دوسرے گڑھے کو بھر دینا مگر یہ کب کہا تھا کہ کام ہی رک دیا جائے۔ تم لوگوں کو تو بس بہانا ملنا ہی ہے۔ دیکھ لیا قبلہ آپ نے۔

معتبر۔ ٹھیک ہے میاں ان لوگوں کے بھروسے کیا خاک ہو سکتا ہے۔

شجر۔ کیا کیا کہوں۔ چچا جان قبلہ چنانچہ پرسوں ہی کا واقعہ ہے کہ میں سینما میں بیٹھا کھیل دیکھ رہا تھا یک دم آگ لگ گئی۔ میں دوڑتا ہوا باغ پہنچا۔ سب مالی مالنوں کو گھڑے بھر کے لانے کے لئے کہا یا اور خود خود لوٹا بھر پانی لے کر سینما آ گیا۔ سینما جل جانے کے بعد یہ عقلمند صاحب چار پانچ ہنڈیوں گھڑے رکھ کر لائے تھے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ پانچ ہنڈی گھڑے بھرنے تک کتنی دیر نہ ہوتی ہوگی۔ خیر اب آپ کیوں تشریف لائے ہیں۔

داروغہ۔ منجھلے میاں آج میٹنی شو دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے آپ کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔

شجر۔ سنو۔ جاکر ان سے کہہ دو کہ اس وقت مجھے بہت سے کام ہیں اگر چاہو تو میں ان کے ساتھ سکنڈ شو کی میٹنی میں چل سکتا ہوں۔ سمجھ گئے نا؟

داروغہ جی ہاں حضور۔ سکنڈ شو کی میٹنی [سلام کر کے جانا چاہتا ہے]

شجر۔ دیکھو جی۔

داروغہ۔ جی حضور

شجر۔ ہمارا ریڈیو سٹ بن کر آ گیا۔

داروغہ۔ جی ہاں۔ فٹنگ ہو رہی ہے۔

معتبر۔ کیا میاں آپ نے بھی ریڈیو کا باجا خریدا ہے۔

شجر۔ جی ہاں [داروغہ سے] اچھا اب تم جا سکتے ہو [داروغہ سلام کر کے چلا جاتا ہے]

معتبر۔ کیا عقل حیران ہے میاں۔ فرنگی نے بھی عجیب کمال کرتے ہیں۔ انگریزی میں تھا سو تھا اب دیکھو ہندوستانی میں یہ باجا نکل گیا۔ خوب بھئی خوب [دستک ہے] آئیے [طلبا نواز بیگ داخل ہوتے ہیں۔ سلام علیک کے بعد معتبر کے مقابل میں آ کر بیٹھ جاتے ہیں] میاں مرزا بھئی یہاں تو تمہیں بڑی تکلیف ہوتی ہوگی

نہ میز نہ کرسی فقیرانہ ٹھاٹ ہے۔

طلبا نواز۔ صحیب میز کرسی گھر میں نہ ہو تو کیا ہے۔ چیز تو قرین قیاس سے رکھی ہوئی ہے [شجر کی طرف دیکھ کر] کیوں صحیب آپ کے مزاج الشریفہ کیسے ہیں۔

شجر۔ عنایت اور جناب کا مزاج۔

طلبا نواز۔ جی بندگی نوازی سے اچھا ہوں [معتبر کی آستین دیکھ کر] صحیب صحیب دیکھئے تو آپ کے پائینچے پر کچھ لال ڈلا سا نظر آتا ہے [معتبر پاجامہ دیکھتا ہے] نہیں صحیب پائینچے پر پائینچے پر دیکھئے [معتبر پھر دیکھتا ہے] نہیں صحیب قمیص کا پائینچہ دیکھئے قمیص کا۔

معتبر۔ اوہو قمیص کا پائینچہ۔ یہ تو پان کے تھوک کا دھبہ ہے۔

طلبا نواز۔ شاید لال پان کا دھبہ ہے تب ہی تو اتنا خون کا ڈلا سا نظر آتا ہے۔

شجر۔ کیوں بھائی جان غوں غوں نے موٹر خرید لی۔

طلبا نواز۔ نہیں صحیب۔ حال میں ان کے بچے کا عقیقہ ہوا تھا اس لئے رقم میں گڑھا پڑ گیا ہے اس لئے اب وہ موٹر سیکل خریدنا چاہتے ہیں

معتبر۔ الامان کہ موٹر سیکلوں کی بھی کیا کثرت۔

طلبا نواز۔ صحیب کیوں نہ ہو۔ امریکہ میں ان کی کاشت بہت ہو رہی ہے اس لئے وہ چیل کی طرح پھدکتی نظر آتی ہیں۔

شجر۔ بھائی صاحب موٹر سیکل تو کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔

طلبا نواز۔ صحیب آپ کیا جانیں۔ غوں غوں کوئی ہلکی پھلکی نہیں خرید رہا ہے بلکہ سات کینڈل پور کی۔

معتبر۔ میاں مرزا سب سامان پہنچ گیا بھئی مگر وہ برقی پنکھا نہیں آیا شاید قلی لانا بھول گئے۔

طلبا نواز۔ نہیں صحیب اس کا تن و توش بہت بڑا ہے قلفی کہاں سے لا سکتے۔ میں موٹر میں بٹھال کر لایا ہوں۔

معتبر۔ میاں تمہیں تو بڑے نفیس ہیں بھئی۔

طلبا نواز۔ صحیب نئے نہیں ہیں بلکہ قلعی سے ان کی حجامت بنائی گئی ہے تب ہی تو انسان بن گئے ہیں۔

معتبر۔ میاں مرزا یہ سن کر مجھے بہت افسوس کہ کہ اس سال چوں چوں امتحان میں مرحوم ہو گیا۔

طلبا نواز۔ کیا کہوں صحیب میں پہلے ہی سے [پیشانی کو بتا کر] یہ سینہ

تیسرا منظر

[طلبانواز بیگ کا مکان۔ باہر کے کمرے میں ایک نوجوان شخص بیٹھا ہے۔ مکان میں سے غوں غوں بیگ آتا ہے۔ سلام علیک ہوتی ہے]

غوں غوں۔ [دروازے کی طرف پلٹ کر] چوں چوں بیگ۔

چوں چوں۔ [مکان میں سے] جی بھائی جان۔

غوں غوں۔ ماسٹر صاحب آئے ہیں۔

چوں چوں۔ ابھی آیا۔

[غوں غوں چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد چوں چوں بغل میں چند کتابیں دبائے آتا ہے۔ استاد کو سلام کر کے بیٹھ جاتا ہے]

[illegible] آج پہلا گھنٹہ کس [illegible]

[illegible]

پڑھو۔ [چوں چوں کتاب کھول کر پڑھنا شروع کرتا ہے]

چوں چوں۔ [پڑھتا ہے] بنگال میں مختلف قسم کے اجناس خصوصاً چاول کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سن کی کاشت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

استاد۔ سمجھتے ہو سن کس کو کہتے ہیں۔

چوں چوں۔ ہاں ماسٹر صاحب وہی نا جس کے چاول کے لفافے تیار کئے جاتے ہیں۔

استاد۔ این یہ چاول کے لفافے کیا بات۔

چوں چوں۔ جی ابا یہی کہتے ہیں۔

استاد۔ اجی چاول کے نہیں کہو تھیلے۔ خیر آگے پڑھو۔

چوں چوں۔ کلکتہ بنگال کا صدر مقام ہے جو کسی زمانے میں ہندوستان کا پایہ تخت تھا۔

استاد۔ پایہ تخت کس کو کہتے ہیں۔

چوں چوں۔ [کچھ سوچتا ہے] جی ابھی بتاتا ہوں [پھر ذرا غور کرتا ہے] ہاں ماسٹر صاحب وہی نا۔ کل ابا نے کہا تھا۔ پایہ تخت ایک [illegible] تخت ہے جس کے پورے چار چوپائے ہوں۔

استاد۔ خاموش یہ کیا بک بک کرتے ہو۔

[illegible] ماسٹر صاحب ابا نے [illegible]

[طلبانواز باہر سے داخل ہوتا ہے۔ استاد اٹھ کر [illegible]

طلبانواز۔ کیوں صیب! آج کل ان کی رفتار گفتار کیسی ہے

استاد۔ انہیں اپنا سبق مطلق یاد نہیں۔ پایہ تخت کی تعریف [illegible] تو کہتے ہیں کہ پایہ تخت ایک ایسا تخت ہے جس کے پو[illegible] چار چوپائے ہوں۔

طلبانواز۔ [ہنس کر پھر خفگی سے] کیوں جی تم کو یاد دلانے پر بھی یاد نہیں کرتے۔ کل میں نے کیا بتایا تھا۔ پایہ تخت ایک ایسا تخت ہے جس کے پائے ہوں۔ یہ چوپائے تم نے کہاں سے پڑھ دئیے [استاد غور سے طلبانواز بیگ کی صورت دیکھ [illegible] ہے۔

طلبانواز استاد کی طرف پلٹ کر] صیب آج کل مجھے فرصت کم ہے۔ اقامت خانے کے طلبا کو ایک دوسرے سے منطبق کر[illegible] میں مصروف ہوں ورنہ ان کا تو چکمبر ہی نکال دیتا۔ اس سلسلے میں صیب پرسوں میں آپ سے مجلس کرنا چاہتا تھا آپ کو بلوا[illegible] تھا مگر ملازم نے آکر کہا کہ آپ کا مکان منقفل ہے۔

استاد۔ جی ہاں۔ میں باہر گیا ہوا تھا۔ مکان کی تلاش تھی چنانچہ اب میں وہاں سے منتقل بھی ہو گیا ہوں۔

طلبانواز۔ کیا آپ وہاں سے منفعل ہو گئے صیب۔

استاد۔ جی ہاں۔

طلبانواز۔ پھر اب کہاں خانہ بدوش ہیں۔

استاد۔ پارسی گلی میں شہر یار کاؤس جی صاحب کے پچھواڑے

طلبانواز۔ کون وہ ہمارے شہر یور صاحب نا جو کبھی کبھی ہمارے پاس وار دات ہوا کرتے ہیں۔

استاد۔ جی ہاں وہی جو آپکے پاس وارد ہوا کرتے ہ[illegible]

طلبانواز۔ اچھا صیب اب آپ اس کے ساتھ [illegible]

استاد۔ [چوں چوں [illegible] کو دیکھ کر [illegible]

...ے گی۔

طلبا نواز۔ (مسکراتے ہوئے) صحیب ان کی ملوکیت یہاں بھی تو ہے۔

معتبر۔ نہیں میاں وہ لوٹ کوئی اور مستثنیٰ ہوں گے۔

شجر۔ آپ ٹھیک فرماتے ہیں قبلہ ——

طلبا نواز۔ صحیب کتنی بار کہوں قبلہ وکعبہ کہیئے کعبہ۔

شجر۔ حضرت چچا جان قبلہ وکعبہ —— میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ میرے غائبانے کے زمانے میں گھر کی خبر لیتے تھے۔

معتبر۔ ہاں میاں آجاتا تھا۔ ارے بھئی تیرا چھوٹا بچہ تو بڑا ضدی ہے۔

شجر۔ جی ہاں چچا جان۔

معتبر۔ ایک مرتبہ میں بڑے باغ کو لے گیا۔ تاپل کو دیکھ کر بپھر گیا کہ پرلئے بغیر نہ رہوں گا۔ بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر گھر لے گیا۔

شجر۔ قبلہ بچہ ہی تو ہے۔ خرگوش سمجھ کر بولا ہوگا۔

طلبا نواز۔ واہ صحیب خرگوشت کیسے بارش کا بڑا مینڈک سمجھا ہوگا جو آسمان سے زمین پر اُڑتے ہیں

معتبر۔ شاید ہوگا میاں۔ شجر و میاں تمہارا چھوٹا بھائی گھر میں کیوں نہیں ہے۔

شجر۔ حضرت میں اس کو منقطع کر چکا ہوں۔

طلبا نواز۔ نہیں صحیب کہیئے کہ اس کو قطع و برید کر چکا ہوں۔

معتبر۔ پرسوں بھئی ایک دعوت میں ملا تھا اس وقت میں نے پوچھا تھا کہ میاں آج کل تو کہاں پر سکونت ہے تو جواب دیا کہ فنیانس کے دفتر میں ملازم ہوں۔ کیسا بے وقوف نکلا ہے بھئی۔

... آپ کا بچہ ہی تو ہے۔ دراصل اس کو کہنا چاہیئے تھا کہ بچاس ... ر طلب ہوں۔

... کو کہنا چاہیئے تھا کہ میرا مزاج پر سکونت ہے

شجر۔ کیوں بھائی جان جائے شوق جان فرمائیں گے۔

طلبا نواز۔ جی نہیں آج کل مجھے گرمی کا دورہ دورہ ہو رہا ہے۔ چائے پینے سے شاید گرمی شدید مدید ہو جائے اور ممکن ہے کانوں کی بصارت پر بھی اثر پڑے اس لئے معافی چاہنے کا خواستگار ہوں۔

شجر۔ زیادہ نہیں تو تھوڑی سہی۔

طلبا نواز۔ جی نہیں۔ دو لوا ے بھی نہیں پیوں گا۔

شجر۔ آپ کی مرضی۔

طلبا نواز۔ اچھا اب میں حاضر وناظر ہوتا ہوں۔

شجر۔ بہت خوب (طلبا نواز ہاتھ ملا کر جاتا ہے) پھر کب ملاقات ہوگی۔

(طلبا نواز پلٹ کر آتا ہے)

طلبا نواز۔ (قریب آکر مسکراتے ہوئے) صحیب ہ... بتاتے ہوئے) اس دماغ کا گدہ کچھ ل... ہم آپ کس فعل کے واسطے سے اور ... بیٹھے تھے۔

شجر۔ فرمائیے۔ تشریف رکھئے بھائی صاحب (طلبا نواز بیٹھ جاتا ہے)

طلبا نواز۔ صحیب آپ جانتے ہیں ہمارا غطرغوں آج کل بازار ...ر رہا ہے۔

شجر۔ خوب میں سمجھا۔ ابھی شتر بھی تو درخت پھاند رہی ہے۔

طلبا نواز۔ تو پھر صحیب اب دونوں کا اتصال کر دینا چاہیئے۔

شجر۔ ٹھیک تو ہے مگر بیگم کو منوانا پڑے گا۔

طلبا نواز۔ واہ صحیب آپ تو بس زن مرتد معلوم ہوتے ہیں۔

شجر۔ نہیں وہ بڑی ضدی عورت ہے۔

طلبا نواز۔ نہ مانے تو ڈنڈے سے حجامت بنائیے بہر حال صحیب اب ہمارے بچے کی شادی ہونا چاہیئے۔

شجر۔ ٹھیک ہے۔ میری بھی یہی خواہش ہے۔ کوشش کروں گا۔

طلبا نواز۔ کوشش سے کام نہ چلے گا۔ بغیر کوشش کے کیجئے۔

شجر۔ آج کل تو ہماری بیگم کی طبیعت کچھ ناساز ہے آپ چند روز انتظار کریں تو بہتر ہے۔

طلبا نواز۔ دیکھئے صحیب چند دن میں (پاؤں کی طرف ...) ...ہ پر گنتا رہوں گا۔

(... طلبا نواز ہاتھ ملا کر چلا جاتا)

بیوی خالی ہیں۔ میں گیا تھا۔ کہتے تھے بچہ بیمار ہے۔

(۳)

بھیگی ہوئی چادر کو نچوڑتے ہوئے نکھو نے بیمار بچے کے سرہانے بیٹھی ہوئی بیوی کی طرف دیکھا اور کہا حکیم نے دوا تو دے دی لیکن بہت جھڑک جھڑک کر۔ پانچ پیسے اس کے جوں کے توں سر ہیں اور ساجھی[۱] نے تو ظلم کر رکھا ہے۔ کہتا تھا ابھی پہنچو

بیوی نے اکتائی ہوئی آواز میں کہا: میں تو اس اساڑھ میں سر پیٹ رہی کہ اس ساجھی سے نہیں نبھے گی۔ تمہیں نے نہ مانا۔

چمار بولا۔ پھر وہ اٹھائیس روپے قرض کے کیسے ادا ہوتے اور کوئی زمیندار اس وقت تیس روپے پیشگی دینے کو تیار نہ تھا۔ میں کیا کرتا اب تک یہ کوٹھڑا بھی نیلام ہو گیا ہوتا۔

چماری بولی۔ نمبردار بیس روپے دے رہا تھا۔ وہی اچھے تھے۔ آٹھ روپے ساہوکار کے پھر چلے جاتے۔

چمار نے مسکرا کر کہا۔ بھلی مانس۔ وہ آٹھ بھی اٹھائیس ہو کر جاتے۔ اور پھر نمبردار اکیلا آدمی۔ آج تھانہ میں۔ آج تحصیل میں۔ سارا کام مجھ اکیلے کے سر پڑتا۔

چماری نے کہا پھر اب کیا ہوگا۔ ادھر بچہ بیمار۔ میں چار دن سے پٹی سے لگی بیٹھی ہوں۔ تمام بدن دکھ رہا ہے یہ چار پیسے کمانے کے دن تھے۔ تم اٹھائیس روپے میں بندھوا ہو گئے۔

نکھو بولا۔ گھبراؤ نہیں۔ میں ساجھی کے ہاں جاتا ہوں۔ راستے میں نمبردار ملا تھا۔ تم بچے کو دوا پلا کر ان کے ہاں چلی جاؤ۔ اُسے ساتھ لے جانا اور سائے میں کسی بنڈھ پر لٹا دینا۔

چماری نے گھبرا کر کہا۔ اس کا پنڈا پھنک رہا ہے۔ میرا یہ حال ہے نہ جاتے بنے نہ ٹھہرتے بنے۔ اچھا یہ کہہ کر اس نے ایک آہ بھری اور چھت کی طرف دیکھ کر سر نیہوڑا لیا۔

گیلے کپڑوں کو ذرا ہوا لگی تو اسی طرح بھیگی چادر اوڑھ کر نکھو لاٹھی لئے باہر نکل گیا۔ چماری نے بیمار بچے کو جوشاندہ پلایا۔ کچھ پھٹے پرانے کپڑوں میں لپیٹا اور برستے پانی میں نکل کھڑی ہوئی۔

(۴)

نمبردار کے کھیت میں پود لگ رہی تھی۔ لیکن یہاں مزدور چپ چاپ کام کر رہے تھے اس لئے کہ کوئی مزدور نہ تندرست نہ تھا۔ کسی کو زکام اور کھانسی نے گھیر رکھا تھا۔ کسی کو ہلکا ہلکا بخار تھا اور نکھو کی بیوی کا تو یہ حال تھا کہ دو دو لوٹے لگاتی اور پھر مڑ کر بیمار بچے کی طرف دیکھتی جو ایک کیکر کی جڑوں میں چیتھڑوں میں لپٹا پڑا تھا۔

آس پاس کے کھیتوں میں خوب رونق تھی۔ قہقہے۔ چھیڑ چھاڑ۔ اور ملہار کی تانیں۔ کبھی کبھی آپس میں تکرار اور تو تو میں میں بھی۔ شام تک یہی حالت رہی۔

"اب کے سال خوب رہے گا" ایک مزدور بولا

"سال تو خوب رہے گا۔ لیکن بھگوان جانے۔ دیکھے گا کون"

"جس سے ان زیادہ ہو۔ تن دکھیا رہتے ہیں"

"ہاں یار۔ جسے دیکھو وہی بیمار"

"چاول تو کھائیں گے۔ مگر بڑا کشٹ اٹھانا پڑا ہے"

"بھئی کشٹ بنا تو کچھ بھی نہیں ملتا"

نمبردار کے کھیت میں اس قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ نیم بیمار مزدور جو مجبوری سے کام پہ لگے تھے۔ اس وقت باتیں کرتے ہوئے اچھے خاصے فلاسفر معلوم ہو رہے تھے۔ زندگی اور موت۔ دکھ سکھ۔ محنت اور آرام۔ خدا اور انسان ان لوگوں کی گفتگو کا موضوع تھا جنہیں دنیا جاہل کہتی ہے اور گفتگو کا انداز دل اور جسم دکھنے کی وجہ سے ایسا سنجیدہ تھا کہ باید و شاید۔

ایک چیخ کی آواز آئی۔ نمبردار کے مزدوروں نے مڑ کر دیکھا کہ نکھو کی بیوی کیکر کے نیچے بچے کو چھاتی سے لگائے چیخ رہی ہے۔ ہائے میرا بچہ چلا۔ ہائے میرا لال چلا۔

تمام مزدور کھڑے ہو گئے۔ سب نے نمبردار کے چہرے کی طرف دیکھا۔ گویا کیکر تک جانے کی اجازت چاہتے ہیں۔ اتنے میں نمبردار کیکر کی طرف چلا اور مزدور پیچھے پیچھے ہو لئے۔ نزدیک جا کر معلوم ہوا کہ بچہ بخار کی شدت سے دم توڑ رہا ہے۔ نمبردار نے گھبرا کر کہا

"چل اسے گھر لے جا"

"ہائے اب کس چیز کو گھر لے جاؤں" اب یہ جنگل ہی بسائے گا۔ ہائے میرا بچہ"

"تو کیکام میں ہرج ہوتا ہے یا تو چپ بیٹھی رہ۔ یا اسے گھر لے جا"

---

[۱] گاؤں میں چمار جن زمینداروں کے ہاں کھیتی کا کام کرتے ہیں انہیں اپنی اصطلاح میں ساجھی کہتے ہیں۔

یہ کہہ کر نمبردار مزدوروں کو کھیت میں لے آیا اور پھر اُسی انہماک سے تمام مزدور پود لگانے لگے۔

نکھو کی بیوی بچے کی لاش ہاتھوں پہ لئے ہوئے گاؤں کی طرف چل دی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی تھی۔ لیکن کام کی افراتفری میں کوئی اس کی دل دہی کے لئے پاس تک نہ جا سکتا تھا اور جاتا بھی تو اس جنگل اور موسلا دھار بارش میں کیا کرتا۔

(۵)

چاول کی فصل تیار تھی۔ تھانیدار صاحب حسب دستور دورہ پر آئے۔ ان کے ساتھ اس مرتبہ ایک نئے افسر تھے۔ نمبردار کے مردانہ میں قیام تھا۔ دو بوری چاول تھانے تک پہنچانے کا بندوبست ہو رہا تھا۔ تھانیدار نے نئے افسر سے نمبردار کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ یہاں کے چاول بہت اچھے ہوتے ہیں سامنے گلی میں نکھو کی بیوی جا رہی تھی اُس نے تھانیدار کے لفظ سنے تو اُسے ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے اس کے کلیجے میں چھری بھونک دی۔

وقار انبالوی

رباعی

راحت کا ہے اک جان کی ساماں بن جا

ہو درد جہاں تو وہیں درماں بن جا

اتنی تو مری بات ہی لے لے اے انساں

صورت میں ہے بشر سیرت میں بھی انساں بن جا

انجمن آرا آبادی

درسِ عبرت

سدا اک آ رہا اک جا رہا ہے
زمانے کا یہی نقشہ رہا ہے

یگانہ میں رہا بیگانگی میں
پرایا غم سے مجھے اپنا رہا ہے

نمود و بود اک ناچیز شے ہے
عبث اس پر بشر اترا رہا ہے

مزا پایا اُسی نے زندگی کا
جو مر مر کر یہاں جیتا رہا ہے

سمجھ کی اب یہ حالت ہے ہماری
ہمیں نافہم بھی سمجھا رہا ہے

اسی نے ٹھوکریں در در کی کھائیں
جو دنیا میں سگِ دنیا رہا ہے

جو ہونا ہے وہ اک دن ہو رہے گا
دلِ ناداں تو کیوں گھبرا رہا ہے

وہی دنیا میں ہم سب دیکھتے ہیں
مقدر ہم کو جو دکھلا رہا ہے

ذرا دیکھو تو اپنا حال عبرت
ہے اب کیا اور پہلے کیا رہا ہے

عبرت مرحوم
(والد فراق گورکھپوری)

مرگِ رندانہ

(ایک بیمارِ مے نوش کا اصرار)

فلک پہ ابرِ جنوں زا کو دیکھ کر ساقی   فضا کو ساحلِ دریا کو دیکھ کر ساقی
مرے بجھے ہوئے دل میں اُبال آیا ہے   عجیب کیف بھرا اک خیال آیا ہے
سرور و کیف میں بھیگی ہوئی فضائیں ہیں   فرازِ چرخ پہ اُڈی ہوئی گھٹائیں ہیں
کہاں ہے؟ گردشِ ساغر کو تیز کر ساقی !   مچل کے جھوم کے لہرا کے جام بھر ساقی !
گھٹا کے دامنِ تر کی مجھے قسم ساقی !   نشے کے لطف و اثر کی مجھے قسم ساقی !
گلوں کے شوقِ تبسّم کی ہے قسم مجھ کو   کلی کے ذوقِ تکلّم کی ہے قسم مجھ کو
قسم ہے بے خود و سرشار زندگانی کی   قسم ہے تیری مہکتی ہوئی جوانی کی
پیوں گا اور بڑی شان سے پیوں گا میں   پیوں گا اور دل و جان سے پیوں گا میں
مرے حواس ہیں واژوں تو کیا ہوا ساقی   مرے جگر میں نہیں خوں تو کیا ہوا ساقی
نحیف و زار ہوں بیمار ہوں تو فکر ہے کیا ؟   مرے مزاج کا، طبعِ حزیں کا ذکر ہے کیا؟
بہک نہ جاؤں کہیں میں تو یہ سوال نہ کر   مرا خیال ہے تجھ کو؟ مرا خیال نہ کر!
مرے جنوں سے نہ کر آج اجتناب پلا   پلا خدا کے لئے اور بے حساب پلا

پلا کچھ ایسی کہ نشے میں اس کے کھو جاؤں
سکوتِ مرگ سے میں ہمکنار ہو جاؤں

خاور سہامی

ایک راہبہ کے محبت نامے!!!

پانچواں خط

(جولائی کے ادبی دنیا میں سب اڈیٹر کی غلطی سے لکھا گیا تھا چوتھا اور آخری خط" درحقیقت موجودہ خط اس دلکش سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ اب یہ سلسلہ کتابی صورت میں شائع ہوگا)

یہ تمہاری طرف میرا آخری خط ہوگا۔ اس خط کی تحریر کے لب و لہجے میں تمہیں اچھی طرح آگاہ کر دینا چاہتی ہوں۔ چونکہ تم نے مجھے اس بات کا پورا پورا یقین دلا دیا ہے کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے، اس لئے یہ اب ضروری ہو گیا ہے کہ میں بھی تمہاری محبت سے دست بردار ہو جاؤں!!

تمہاری جو جو چیزیں میرے پاس محفوظ ہیں وہ میں اپنی پہلی فرصت میں ہی تمہیں واپس بھیج دوں گی۔ تم اس بات سے نہ ڈرنا کہ میں اب کبھی تمہیں کچھ لکھوں گی، میں ان چیزوں کے پلندے پر تمہارا نام تک بھی نہ لکھوں گی!!

میری پہلی ڈونا برآنٹس (جس پر مجھے ہر قسم کی رازداری کا بھروسہ رہا ہے، اور جسے میں اپنے سے زیادہ قابل اعتبار سمجھتی ہوں) اس کام کو سرانجام دے گی، وہ ہر طرح کی احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ مجھے یہ اطمینان دلا دے گی، کہ اس نے تمہاری تصویر اور بازوبند (جو تم نے مجھے نشانی کے طور پر دئے تھے) تم تک پہنچا دئے ہیں۔ میں تم پر یہ بھی ظاہر کر دینا چاہتی ہوں کہ پچھلے دنوں میں تمہاری ان محبت کی کئی نشانیوں کو (جو مجھے کسی وقت اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھیں) ضائع کرنے لگی تھی۔ لیکن چونکہ میں نے تمہیں اپنی محبت میں سخت کمزوریاں دکھائی ہیں اس لئے شاید تم میرے اس سنجیدہ اقدام کا اعتبار نہ کرو!!

مجھے ان چیزوں کے جدا ہونے کا بہت افسوس ہے لیکن تم یقیناً مسرور ہوگے اور اپنی فتح پر نازاں ہو کر میری شکست پر اطمینان کا ٹھنڈا سانس لوگے۔ ہم دونوں کی باہمی خفت و شرمندگی کی بنا پر میں یہ اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ میں ان معمولی سی چیزوں کی واقعی بہت قدر کرتی رہی ہوں لیکن جب مجھے اس بات کا خیال آیا کہ تمہارے اور میرے درمیان اب کسی قسم کا تعلق اور رشتہ نہیں رہا تو میں نے دل کڑا کر کے یہ فیصلہ کر لیا کہ ان سب چیزوں کو ایک ایک کر کے تمہیں واپس کر دوں گی، جب کسی شخص کے پاس کسی مقصد میں کامیاب ہو جانے کے لئے معقول وجوہات ہوں تو وہ یقیناً کامیاب ہو جاتا ہے!! اور اب میں آخرکار ان سب چیزوں کو ڈونا برآنٹس کے حوالے کر رہی ہوں!!

میری محبت کے اس آخری فیصلے نے میری روح کو کتنا صدمہ پہنچایا ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ غیر ممکن بھی ہے جذبات کی بے شمار تلخیوں اور انتہائی مشکلات کے بعد (جن کا تمہیں یقیناً کوئی احساس نہیں ہو سکتا اور جن کی کیفیت میں تمہارے سامنے پیش کرنا بھی نہیں چاہتی!!) میں نے اس سے (ڈونا برآنٹس) یہ درد بھری گزارش کی ہے کہ وہ ان چیزوں کا مجھ سے اب کبھی ذکر بھی نہ کرے اور میرے اس اصرار پر کہ میں ان کو ایک بار پھر دیکھوں وہ مجھ کو ان کے دیکھنے کی اجازت بھی نہ دے اور مجھے اطلاع دئے بغیر وہ ان سب کو تم تک پہنچا دے!!

میں نے اپنی محبت کا درماں ڈھونڈنے کی کوششوں میں صرف اپنی محبت کی بے انتہا شدت اور زیادتی کو محسوس کیا ہے، آہ اگر مجھے شروع میں ہی اپنی ان مشکلات اور محبت کے ان تلخ نتائج کا (جنہیں میں محسوس کر رہی ہوں) پتہ چل جاتا تو میں تمہاری محبت میں کبھی بھی گرفتار نہ ہوتی!!

یہ بلاشبہ درست ہے کہ تمہاری محبت کو برقرار رکھنے کی نسبت

[آہ کس درجہ ناشکرگزار ہو تم!] مجھے تمہاری محبت سے علیحدہ ہو جانے سے ایک ناقابل بیان تکلیف کا احساس ہوگا!! میری محبت کا جذبہ مجھے تم سے زیادہ عزیز و محبوب رہا ہے۔ اپنی محبت کے اس خود دار جذبے کو کامیاب بنانے میں مجھے دکھ بھی تو بہت جھیلنے پڑے ہیں اور آہ آخرکار تمہارے ناروا اور زبون اطوار نے خود بخود مجھے اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ میں اب اپنے اُسی جذبۂ محبت کو نفرت اور استہزا سے بدل ڈالوں!!!

میری نسوانی کم ہمتی نے مجھے کبھی مدد نہیں دی، کہ میں تمہارے خلاف کسی قسم کا قدم اٹھا سکتی!!

آخرکار میں بھی دنیا کی دوسری عورتوں کی طرح ایک عورت ہی ہوں میرے پاس بھی دل ہے اور دل کے اندر جذبۂ خودداری ایک عورت دنیا میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہے مگر اس سے وہ جلن یقیناً برداشت نہیں ہو سکتی جو اس کے محبوب کے کسی اور عورت سے تعلقات اس کے لئے پیدا کر دیتے ہیں!!

میں نے تمہاری محبت کی ذلتیں [illegible] ہی ہیں تمہاری جانب سے ہر قسم کی نفرت و ملامت برداشت کرتی رہی ہوں۔ آہ کسی نہ کسی طرح یہ جلن بھی سہہ سکنے کے قابل ہوتی، اگر تم اتنے بے مروت اور سنگدل نہ ہوتے!!

تمہاری جھوٹی فریب کاریوں اور تمہارے آخری خط کی معنی خیز اور بے معنی سادگی نے مجھ پر ظاہر کر دیا ہے کہ میرے تمام خط تمہیں ملے اور ان سب کو پڑھ کر تمہارے دل پر ذرا بھی اثر نہ ہوا کتنے ناسپاس انسان ہو تم! میرا بھولا پن دیکھو کہ میں اس جھوٹی آس سے ہی اپنا دل بہلاتی رہی ہوں کہ وہ خطوط تمہیں پہنچائے ہی نہیں گئے یا تمہیں ملے ہی نہیں۔!!!

میں تمہاری اس سادہ پرکاری سے اب حد درجہ متنفر ہو چکی ہوں کیا میں نے تم سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ تم مجھے اس بارے میں سچ سچ لکھو؟ آہ تم نے مجھے اُس حالت میں [جس میں میں رہنا چاہتی تھی] کیوں نہ رہنے دیا؟ تمہارے لئے یہ بہت آسان تھا کہ تم مجھے خطوں کے نہ ملنے کی بابت کچھ لکھتے ہی نہ کیونکہ میں اس معاملے کی صداقت سے باخبر ہونا نہیں چاہتی تھی!!

میں نے آج تک تمہاری ہر بات پر اعتبار کیا اپنی سادگی اور بے وقوفی سے تمہاری ہر ریاکاری کو سچ جانتی رہی مگر آہ اب میں اس قابل نہیں رہی کہ تمہارے قصوروں کو جھٹلا کر تمہیں سزاوار ٹھیراؤں۔ مجھ پہ یہ راز اچھی طرح سے عیاں ہو گیا ہے کہ تم میری محبت کے بالکل نااہل تھے۔ تمہاری صفاتِ قبیحہ کا مجھے بخوبی علم ہو گیا ہے، میں نے جو کچھ تمہاری خاطر کیا اگر اس پر نظر رکھتے ہوئے تم میری اس گذارش کو ٹھکرا نہ دو تو میں تم سے صرف ایک آہ فقط ایک ہی التجا کرتی ہوں کہ تم مجھے اب آیندہ کبھی کچھ نہ لکھنا!! میری اتنی ہی مدد کرو تاکہ میں اب تمہیں ہمیشہ کے لئے بھلا سکوں!!!

اس خط کو پڑھ کر اپنے جذبۂ رحم کو میرے لئے تھوڑا سا بھی متحرک نہ کرنا۔ کہیں میں پھر فریب میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ مگر نہیں میرے جذبۂ ناراضگی میں اب کمی ہونا ناممکن ہے میں اپنے جذبۂ الفت کو دبا دینا چاہتی ہوں، اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دبا دینا چاہتی ہوں!!

میں نے جو کچھ بھی اب کرنے کے لئے قدم اٹھایا ہے تم اس میں خلل انداز نہ ہونا مجھے ڈر ہے کہ تم پھر اسی طرح [جس طرح کہ تم نے شروع الفت میں میرے دل کی دنیا کو تہ و بالا کر دیا تھا] میرے مقاصد میں اپنی بے رحمانہ شرکت سے اب بھی کہیں کھلبلی نہ ڈال دو!!!

اس خط سے تم پر جیسا بھی اثر پڑے میں اسے جاننا تک نہیں چاہتی میں اپنے مستقبل کے لئے جو راہ ڈھونڈ رہی ہوں تم اس کی یکجہتی کو ضائع نہ کرو۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ جو حالت تم میری مایوسیوں کے لئے بنانا چاہتے تھے وہ تمہاری اپنی ہی رضامندی کے مطابق بن گئی ہے!!!

میری ناکامیوں سے مجھے محروم نہ کرو مجھے امید ہے کہ کسی نہ کسی وقت مجھے ان سے ضرور سکون نصیب ہوگا!!!

میں تم سے یہ وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں کبھی نفرت سے نہ دیکھوں گی کیونکہ میرے پاس اب وہ جذبہ ہی نہیں رہا جس سے میں تمہیں نفرت کر سکنے کے قابل ہو سکوں!!!

میں یہ بہت یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ مجھے اس سرزمین میں تم سے زیادہ وفادار عاشق مل تو جائے گا مگر آہ میرے دل میں محبت کا جذبہ کون پیدا کرے گا!!!؟ کیا کسی دوسرے مرد کی محبت کا جذبہ اب مجھ پر کچھ اثر ڈال سکے گا؟ افسوس میری محبت کا جذبہ تم کو مغلوب نہ کر سکا!!!!

آہ وہ زخم خوردہ دل جو ایک بار محبت کے غم سے شکستہ و پامال ہو چکا ہو: محبت کے اولین خوابوں کو [آہ جن کی مسرتوں سے وہ تمام عمر محروم رہا] کبھی بھلا سکنے کی کوشش کر سکتا ہے؟ محبت کے اُن رنگین تصورات کو جو روح پر منقوش ہو چکے ہوں کیا کبھی فراموش کیا جا سکتا ہے!!

محبت اولین کی زرکار شعاعوں کو لوحِ دل سے ہرگز ہرگز مٹایا نہیں جا سکتا! اور نہ محبتِ اولیں کے شیریں زخم صحت و تازگی سے ہم کنار ہو سکتے ہیں!!

پہلے پیار کی سینے کے اندر دبی ہوئی خاموشیوں کو بیدار کرنا محال ہے، محبت کا سویا ہوا بے ہوش نغمہ جذبۂ مسرت سے بیدار نہیں ہو سکتا!!

الفت رفتہ کے پہلے غم آلود لب سے ہی کچھ دل کو پیارے ہوتے ہیں، اُس کے لئے کوئی نیا نغمہ مسرت بے کار ہے۔ محض بے کار!!!

میں تم سے یہ پوچھتی ہوں کہ تم نے مجھے محبت کے اس ناتمام اور ناتسلی بخش جذبے کے ساتھ ہمکنار کیوں کیا جو کبھی جاودان نہیں بن سکتا تھا!!!؟

آہ تم نے مجھے محبت کے اس ہلاکت خیز سمندر میں کیوں غرق کر دیا جس کے تلاطم میں تم خود ڈوبنا نہیں چاہتے ہے!!؟

آہ ہمیں یہ ناہنجار اور بے رحم فطرت اور ہماری محبت کا یہ اندھا جنون انگیز جذبہ کس لئے مجبور کر دیتا ہے کہ ہم اُس محبوب ہستی کا تصور دل میں جا لیں جس کا مسلک صرف ہرجائی پن ہونا ہے اور بس!!؟

مجھے امید ہے کہ میں اپنی زندگی کے لئے کوئی دوسرا باوفا ساتھی حاصل کر کے ضرور خوش و خرّم رہ سکوں گی!!

تمہاری محبت سے چونکہ مجھے کافی عبرت مل چکی ہے اس لئے میں اب اس معاملے میں بہت احتیاط سے کام لوں گی، میں نہیں چاہتی کہ جس طرح تم نے مجھے تباہ و برباد کیا ہے اسی طرح کسی غریب انسان کی زندگی کو میں بھی تلخ اور سوگوار بناؤں!!

میرے پاس تمہارے ترک محبت کے لئے فی الحال کوئی معقول وجہ نہیں۔ سچ جانو کہ میں تم سے کسی قسم کا بے رحمانہ انتقام نہ لوں گی، لیکن ابھی سے میں تمہیں اس کا پورا پورا یقین بھی نہیں دلا سکتی، کیونکہ اس کا انحصار صرف میرے مستقبل کے احساسات کی تبدیلی پہ ہے!!!

میں کوشش کر رہی ہوں کہ تمہاری تمام تر لغزشوں کو بھول جاؤں اور تمہیں معاف کر دوں، آہ، اب میری سمجھ میں یہ بخوبی آگیا کہ ایک "راہبہ" واقعی محبت کئے جانے کے قابل نہیں۔ لیکن ساتھ ہی میرا یہ خیال بھی غلط نہیں کہ اگر کوئی مرد خلوص دل کے ساتھ محبت کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہو تو دوسری عورت کے مقابلے میں "ایک راہبۂ" کی محبت اس کے لئے بدرجہا بہتر ہے!!! کیونکہ وہ اندھی بن کر اپنے جذبۂ محبت کی تکمیل کرتی ہے اُس کو صرف اپنی محبت کا غم ہی محبوب و مرغوب ہوتا ہے دنیا کی دوسری دلکشیوں اور رنگینیوں سے وہ لطف اندوز ہونا نہیں جانتی، سوسائٹی کی رنگین صحبتوں سے وہ بالکل بے پرواہ ہوتی ہے!!!

مرد فطرتاً عیش پسند ہے وہ چاہتا ہے۔ کہ اس کی محبوبہ ہر وقت محبت کے ماتم میں ہی مصروف نہ رہے بلکہ اس کے لباس کے متعلق گفتگو کرے سیر و تفریح اور دوسرے رسمی ہنگاموں کے بارے میں باتیں کرے!!۔

لیکن ایک "راہبہ" کی حالت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ اُسے مکار بن کر دل لبھانا نہیں آتا اُسے جھوٹی نمائشوں سے پیار کرنے کے ڈھنگ نہیں آتے، وہ محبت کا احترام کرتی ہے، سچائی اور صداقت کے ساتھ!! اس کی فطرت سادہ اور روح بے لوث ہے، وہ سادگی پر مرجاتی ہے اور انجان بن کر اپنے عاشق پر [چاہے وہ اعتماد کے قابل نہ ہو] اعتبار کر لیتی ہے!! اور اُس سے کسی حالت میں بھی بدظن نہیں ہوتی!!!

میں ان باتوں سے تم پر یہ ثابت نہیں کرنا چاہتی کہ تمہیں مجھ سے محبت کرنی چاہیئے تھی! آہ یہ واقعی میرا ایک مذموم اور ذلت آمیز انداز ہوگا تم سے اپنی محبت کا اعتراف کرانے کا! حالانکہ میں پیشتر کئی بار ہزار دلکش اور مناسب طریقوں میں اس بات کی ناکام کوششیں کر چکی ہوں! اور ہمیشہ نا امید رہی ہوں!! اپنی قسمت کی سیہ بختیوں سے مجھے یہ اب کبھی بھی امید نہیں ہو سکتی کہ تمہارے دل میں میری محبت کا جذبہ پیدا ہو۔ میں عمر بھر بدنصیب رہی اور رہوں گی۔ آہ جب میں تمہیں ہر روز دیکھ لیا کرتی تھی تو اس وقت میری کیا حالت تھی؛ تمہاری ملاقاتیں تمہارے فراق سے زیادہ میرے لئے اندوہگیں تھیں یہ خطرہ میرے دل کو ہر وقت محسوس ہوتا تھا کہ تم میری محبت میں ثابت قدم نہ رہ سکو گے، میری آرزو تھی کہ تم ہر وقت میری نگاہوں کے سامنے رہو مگر یہ ممکن نہ تھا تم کانونٹ [معبد] میں مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے اس ڈر سے بھی میں کانپا کرتی تھی اور جب تم اچانک مجھے چھوڑ کر فوج کے ہمراہ چلے گئے تھے، میرا جینا دوبھر ہو گیا تھا مجھے اپنی نااہلیت [جو مجھے تمہارے مقابلے میں

محسوس ہوتی تھی [کا بھی احساس تھا۔ یہ خیال مجھے بہت پریشان رکھتا تھا کہ میں زیادہ خوبصورت نہیں ہوں اور تمہاری محبت کے لائق نہیں ہوں !!

میں اکثر یہ سوچ کر شکستہ خاطر ہو جایا کرتی تھی کہ میرے اور تمہارے درمیان جو محبت کا رشتہ قایم ہو گیا ہے اس سے کہیں تم پر حرف نہ آئے۔ مجھے یہ کمی بھی محسوس ہوتی تھی کہ میں تم سے پوری طرح محبت نہیں کرتی۔ میں نے اپنے والدین کی ناراضگی پر تمہاری محبت کو ترجیح دی۔ دراصل میں اس موجودہ حالت سے [جس میں کہ میں اب گرفتار ہوں] اس وقت زیادہ خراب و خستہ حال تھی !!!

آہ اگر تم اس وقت [جب تم نے پرتگال چھوڑا ہے] تھوڑا سا بھی مجھے اس بات کا یقین دلا دیتے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے تو میں ہر ممکن طریقے سے کوشش کر کے اس جگہہ کو چھوڑ دیتی، میں بھیس بدل کر اس کانونٹ [معبد] سے بھاگ نکلتی اور جب تک تمہارے قدموں میں نہ پہنچ جاتی، اطمینان کا سانس نہ لیتی !!! اور آہ اگر تم میرے اس ایثار پر بھی مجھ سے بے پرواہی برتتے تو میری اس وقت کی تباہی کا نقشہ متصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ میرے لئے دنیا میں کیا ہوتا، صرف ذلت اور رسوائی !! آہ ایسا کر کے کیا میں اپنے عزیزہ داقارب کے [جو اس حالت میں کہ میں تمہاری محبت سے منہ موڑ رہی ہوں اب مجھے پہلے سے کئی درجہ زیادہ عزیز ہو گئے ہیں] تمام وقار خاندانی کو خاک میں نہ ملا دیتی !!!؟

یہ بہت ممکن ہے کہ اب میری حالت پہلے سے ابتر و تباہ حال ہو جائے آہ میں کس قدر سادگی اور بچلے پن سے اپنی آیندہ مظلومیت کا بیان تم سے کر رہی ہوں، اور وہ بھی ہمیشہ کے لئے صرف آخری بار !!

خیر میری حالت خواہ کچھ بھی ہو جائے تم تو میری اس پستی پر خرم و شاد ہو جاؤ گے۔ میری اس بے چارگی سے تم تو دل میں مسرت کے جوش سے پھولے نہ سماؤ گے۔ لو میں پھر احمق بن گئی، جب مجھے تم سے کسی قسم کا سروکار ہی نہ رہا تو پھر مجھے یہ جاننے کی ضرورت کیا کہ تم میری حالت سے متاثر ہو کر خوش ہو گے یا ناخوش !!!

میں نے تم سے پہلے بھی درخواست کی ہے کہ تمہاری جانب سے اب میری طرف کوئی خط نہ آئے اور اب دوبارہ پھر یہی استدعا کرتی ہوں۔

آہ، کیا تم نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا کہ تم نے میرے ساتھ کس کس قسم کے سلوک کئے۔ آہ کیا یہ تمہیں کبھی محسوس بھی نہیں ہوتا کہ تم دنیا میں سب سے زیادہ میرے صرف میرے زیر احسان ہو۔ میں نے تم سے اپنے دل کی تمام تر دیوانگی، اپنی روح کی تمام تر گہرائی کے ساتھ محبت کی، میں نے کبھی بھی تمہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی، مگر تمہارا رویہ آہ تمہارا رویہ میرے ساتھ کس قدر معیوب اور کتنا غیر شریفانہ رہا !! تمہیں میرے ساتھ کوئی فطری لاگ یا عداوت تھی، نہیں تو تم مجھ سے ضرور والہانہ محبت کرتے، میری سادگی دیکھو، میں تمہاری ادنیٰ ادنیٰ سی صفات کی گرویدہ بن گئی ادھر تم نے میرے دل کو خوش کرنے کے لئے کیا کیا۔ میری خاطر کیا ایثار کیا؟ ہاں ہاں ذرا منہ سے بولو تو، میں بھی تو سنوں کہ تم نے میرے لئے کیا کیا دکھ جھیلے !! میری ان تمام باتوں کا جواب تمہارے پاس نفی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ تم نے صرف اپنے دل کو بہلانے کی خاطر ہزاروں قسم کے مشاغل ڈھونڈے، دنیا کے عیش و طرب میں حصے لیتے رہے۔ فوج کا افسر بننا تمہیں مجھ سے زیادہ مرغوب ہوا اور آخر کار میری تمام تر التجاؤں کے باوجود تم نے میری دعوتِ محبت کو بھی ٹھکرا دیا !!!!

تم نے پرتگال [جہاں تم فرانس کی نسبت زیادہ عزت کی نگاہ سے نگاہ سے دیکھے جاتے !!] میں رہنے کے لئے اپنی ذرا سی بھی تو خواہش ظاہر نہ کی !!

بھائی کے خط آنے پر کسی قسم کا تامل کئے بغیر تم مجھے ایک دم چھوڑنے پر راضی ہو گئے اور خوشی خوشی فرانس کی طرف جانے والے جہاز پر سوار ہو گئے۔

اب مجھے احساس ہوا کہ میں نے بھی تم سے بے پروائی اختیار کیوں نہ کی! آہ یہ کتنا احمق پن تھا میرا کہ میں نے آغاز محبت میں ہی تم پر ظاہر کر دیا کہ میں اپنی روح کے تمام تر ایمان و ذوق کے ساتھ تمہاری پرستش کرتی ہوں، انسان کو محبت کے باب میں تھوڑا سا چالاک بھی ہونا چاہئے تاکہ دوسرے کے دل میں بھی وہ محبت کے شعلے کو بھڑکا سکے اور اس طرح اپنی محبت کا خراج وصول کر سکے۔ !!!

تم نے اپنے دل میں پہلے سے ہی ٹھان رکھی تھی کہ میں اکیلی ہی تم سے محبت کرتی جاؤں اور تم مجھے بے وقوف بناتے رہو اور ظاہر ہے

کہ تم اپنے اس ارادے میں کلی طور پر کامیاب بھی رہے۔

میرا جذبۂ محبت تمہیں ضرور متاثر کر لیتا اگر تمہیں بھی میرا تھوڑا سا خیال ہوتا، مگر تمہیں خود پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ جب تم یہ دیکھتے تھے کہ تم نے مجھ کو تو مغلوب کر ہی لیا ہے۔ اس لئے تم نے میری اس کمزوری سے جتنا بھی چاہا فایدہ حاصل کیا !!!!

آہ کس درجہ بے رحمی !! اور آہ کتنا جبر !!

کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم نے مجھ سے اس قسم کا سلوک کر کے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا !؟

اگر کبھی کوئی ایسا موقع پیش آجائے کہ تم پرتگال آؤ تو میں اعلانیہ طور پر تمہیں آگاہ کرتی ہوں کہ دنیا میں سب سے پہلے انسان تم ہوگے جو میرے خاندان کے جذبۂ انتقام کا نشانہ بنوگے۔ !!!

میں ایک طویل و دراز مدت تک ایک سنگین جلاوطنی اور فریب کا توہم میں مبتلا رہی ہوں اور اپنی غلطیوں کا خمیازہ اٹھاتی رہی ہوں۔ جن کا تصور بھی اب میرے لئے سخت دہشتناک ہے !!!

میرے انفعالِ محبت میں اب رحم کی طلب باقی نہیں رہی !!!

تمہاری محبت کو ترک کرنے پر [میرے اس جرم کے یقیناً تم ہی محرک ہو] مجھے سخت پشیمانی اور افسوس ہے سوائے اس کے اور میں اب کر بھی کیا سکتی ہوں۔ میرے پاس اب وہ دل ہی نہیں رہا جس کی مدد سے میں اپنے ان تاثراتِ قلبی کو مغلوب کر سکتی !!!

یہ ذہنی کشمکش مجھے کب تک اس دل گرفتگی کی حالت میں رکھے گی آہ میں کب تک اسی طرح پریشان خاطر رہوں گی ! میں اپنی مظلومیتوں کے باوجود تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میں تمہارے لئے کبھی برا نہ سوچوں گی اور حتی الامکان کوشش کروں گی کہ تم خوش رہو ! مگر آہ تم خوش کیونکر رہ سکتے ہو جب تمہارے سینے میں وہ دل ہی نہیں جو خوشی کا آرزومند ہو سکے !! میری جانب سے آیندہ خبر تمہیں میری فتح مندی کا پیغام پہنچائے گی اور تم پر یہ ظاہر کرے گی کہ میری بدقسمتیوں کے لمحے اب ختم ہو چکے ہیں اور یہ کہ اب میری روح امن و سکون کے ساتھ ہمکنار ہو گئی ہے !!!

میرا دل اس وقت مسرور ہوگا جب مجھے یہ یقین ہو جائے گا کہ نہ اب مجھے تم سے کوئی شکایت ہے اور نہ تمہاری بے انصافی کا کوئی گلہ !!

میں اس وقت اپنی کامیابی پر نازاں ہوں گی، جب مجھے اچھی طرح سے اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ اب میرے دل سے تمہاری محبت بالکل فنا ہو چکی ہے ــــ میں بھی تمہاری جانب سے قطعی بے پروا ہو چکی ہوں ــــــ اور تمہارے مظالم تمہارے تشدد کو بالکل فراموش کر چکی ہوں !!!

میں اس وقت اپنے آپ کو فتحمند تصور کروں گی، جب مجھے یہ محسوس ہونے لگے گا کہ اب میں اپنی محبت کی تمام مسرتیں اپنی محبت کے سارے غم بھول چکی ہوں اور تمہیں یاد کرنا اب صرف میری اپنی رضامندی پر موقوف رہ گیا ہے۔ جب چاہوں تمہیں یاد کر لوں اور جب چاہوں تمہیں بھلا دوں !!

میں اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ تمہیں میری زندگی کے ساتھ بہت حد تک تعلق رہا ہے۔ تم نے میری روح کو ایک ایسے جذبۂ رنگین سے ہمکنار کیا جو میرے دل و دماغ کے تمام احساسات پر غالب آگیا تھا۔ لیکن تمہیں اپنی اس فتح مندی پر زیادہ ناز نہیں کرنا چاہئے اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں جوان تھی اور ساتھ ہی نادان بھی !!

میں کانونٹ معبد کی غیر رنگین فضاؤں میں بچپن ہی سے مقید کر دی گئی تھی مجھے کبھی ایسا موقع نہ مل سکتا تھا کہ میں کسی خوبصورت اور نوجوان مرد کو دیکھ سکوں !!

اس سے پیشتر کہ میں نے تمہیں نہ دیکھا تھا، مجھے اپنے حسن کی قدر و قیمت معلوم نہ تھی ! تم نے جب میرے حسن کی دلکشی کے نغمے گائے، میری خوبصورتی کی تعریفیں کیں۔ اُس وقت، آہ اُس وقت مجھے یہ احساس ہوا کہ میرے جمال کی تمامتر جلوہ باریاں میری لطافتِ حسن کی ساری رعنایاں اور رنگینیاں صرف تمہارے آہ صرف تمہارے ہی لئے فطرت نے مجھے عطا کی ہیں !!!!

چونکہ میں نے بھی چاروں طرف تمہاری ہی شہرت کا چرچا سنا، ہر اک کی زبان کو تمہاری ہی تعریف میں رطب اللسان پایا، اس لئے تمہاری شخصیت کے رعب سے متاثر ہو کر مسحور ہو گئی !!!

لیکن اب میں اُس فریب طلسم سے بیدار ہو چکی ہوں۔ تم نے یقیناً مجھے میری کمزور فطرت کے سمجھنے میں بہت مدد دی جس کے لئے میں تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں !!!

میں تمہارے سب کے سب خطوط واپس بھیج رہی ہوں ۔

لیکن میں نے تمہارے دو آخری خط اپنے پاس محفوظ رکھ لئے ہیں۔ میں انہیں بار بار پڑھنا چاہتی ہوں تاکہ وہ آیندہ میرے لئے مشعلِ ہدایت کا کام

دیں اور میں کہیں پہلے کی طرح محبت کی کمزوری میں مبتلا نہ ہو جاؤں!!!

تمہاری محبت میرے لئے کتنی مہلک ثابت ہوئی، آہ میں کس درجہ خوش نصیب ہوتی۔ اگر تم مجھے صرف اتنا کرنے دیتے کہ میں تم سے ہمیشہ محبت کرتی رہتی!!!

مجھے اب تم سے کوئی شکایت نہیں رہی! تمہاری بے وفائی کو میں اب بھلا چکی ہوں!! میری حالت چند دنوں میں بحال ہو جائے گی اور مجھے امید ہے کہ اس سے پہلے کہ میں اپنے لئے کوئی خطرناک راستہ تجویز کروں [جس کی خبر تمہارے لئے یقیناً مسرت کا باعث ہوگی] کچھ روز آزادی سے جی سکنے کے قابل ہو سکوں گی!!!

جب مجھے تم سے کوئی سروکار ہی نہیں رہا کتنی پاگل ہوں میں کہ تم سے پھر وہی ذکر بار بار کر رہی ہوں!!!

ہاں میں نے تمہیں بھلا دیا ہے، اور میں اب تمہیں کبھی بھی خط نہ لکھوں گی اور نہ ہی تمہیں کبھی یاد کروں گی!!

خدا حافظ

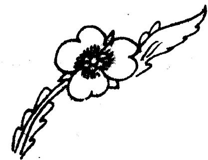
حسرت نصیب

میری آنا

عظیم قریشی

نوٹ:۔

"ایک راہبہ کے محبت نامے" یک جا طور پر عنقریب کتابی صورت میں شائع ہونے والے ہیں۔ کتاب کے ساتھ حضرت حفیظ ہوشیارپوری ایم اے مدیر رسالہ "ادبی دنیا" کا مقدمہ بھی شامل ہوگا۔



رباعیات

دکھ درد ہیں اوروں کا جو غمخوار نہ ہو
بے یار و مددگار کا جو یار نہ ہو
جنت تو ملے اس کو کہاں اے انجم
جنت میں خدا کا اسے دیدار نہ ہو

موقع ہے تو پھر نیک کمائی کر لے
بہتر ہے بروں سے بھی بھلائی کر لے
اچھا ہے یہ ہے صفت
انجم کرم عام خدا کی ہے
اس بندگی میں کچھ تو خدائی کر لے

انجم مراد آبادی

عزمِ حیات

مشرق سے یونہی پھوٹیں گے انوار کے دھارے — یہ کوثر و تسنیم سے معمور گھٹائیں
چمکیں گے یونہی رات کو چاند اور ستارے — یہ تند، سبک سیر، جہاں گرد ہوائیں
دیکھے گا زمانہ یہ دل افروز نظارے — یہ چاند یہ خورشید یہ تارے یہ فضائیں
اس بزمِ جہاں میں مگر اک میں ہی نہ ہوں گا — سب ہوں گی مگر آہ! فقط میں ہی نہ ہوں گا

برسات میں گھر گھر کے یوں ہی چھائیں گے بادل — رفعت سے اترتی ہوئی ندیوں کا ترنّم
اور دامنِ کہسار پہ لہرائیں گے بادل — جھونکوں سے ابھتے ہوئے غنچوں کا تبسّم
دنیا کو مئے خلد میں نہلائیں گے بادل — یہ دشت یہ میدان، یہ کہسار یہ قلزم
اس بزمِ جہاں میں مگر اک میں ہی نہ ہوں گا — سب ہوں گے مگر آہ! فقط میں ہی نہ ہوں گا

اُبلیں گے کہستان سے یونہی نور کے چشمے — لیکن نہیں، میں مردِ جواں عزم بنوں گا
اُبھریں گے یوں ہی سینۂ عشاق سے نغمے — اس ہستیِ فانی کو میں جاوید کروں گا
چمکیں گے بیاباں میں یونہی ریت کے ذرّے — گر موت بھی آئے گی تو میں مر نہ سکوں گا
اس بزمِ جہاں میں مگر اک میں ہی نہ ہوں گا — مر مر کے بھی میں زندۂ جاوید رہوں گا

ہو جائیں گے نابود یہ میدان یہ کہسار
یہ بحر یہ دریا یہ بیابان یہ گلزار
یہ چاند یہ خورشید یہ افلاک یہ سیّار
لیکن کسی طاقت سے بھی میں مٹ نہ سکوں گا
مٹ مٹ کے بھی میں زندۂ جاوید رہوں گا

شہید ابن علی

غزل

وہ بے نقاب تھا اے دل کہ بے نقاب نہ تھا ۔ تجھے تو ہوش بھی اے خانماں خراب نہ تھا

مری نگاہ میں محدود تھی مری ہستی ۔ ترے حضور میں جب تک میں باریاب نہ تھا

بجا ہے دل کو مرے تیرے عشق کا دعوےٰ ۔ کہ اس سے پہلے کبھی اتنا پیچ و تاب نہ تھا

اُسی گروہ میں از راہِ لطف شامل کر ۔ کہ دو جہان میں جن پر ترا عتاب نہ تھا

جمالِ یار کا ہوتا نہ کیوں یہاں چرچا؟ ۔ وہ ماہتاب نہ تھا؟ یا وہ آفتاب نہ تھا؟

نظر نے دیکھ لیا کیوں جگہہ جگہہ تجھ کو ۔ دل و جگر میں اگر جوشِ اضطراب نہ تھا

ہماری خاک ہی جاتی تمہارے دامن تک! ۔ کہ اس سے آگے کوئی اور انقلاب نہ تھا

قبولِ عام کا تب سے مجھے ملا انور!
کہ میرے رنگِ سخن کا کوئی جواب نہ تھا

لطیف انور گورداسپوری

جذبۂ محبّت

(مغربی نقطۂ نظر سے)

ہماری زندگی میں محبت اور صرف محبت ہی ایک ایسا جذبہ ہوتا ہے جو ایک انسان کو اس کی فطرت کے عین خلاف سوسائٹی سے بغاوت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے اور اس کے بنے بنائے قدیمی اور رسمی اصولوں کو تہس نہس کر دیتا ہے۔ عام طور پر واقعات کے بعد واقعات اپنی نمایاں اور رنگین تبدیلیوں کے ساتھ اور بالکل ہماری توقعات کے مطابق ظہور میں آتے رہتے ہیں لیکن جو غیر معمولی احساس اور طوفانی جوش و خروش اس جذبہ کے تحت میں پایا جاتا ہے وہ اور کسی کیفیت میں ہرگز نہیں پایا جاتا۔ ہماری زندگی کے بہت سے واقعات اور تجربات ہمارے خیالات کا بالکل اُسی طرح عکس ہوتے ہیں جس طرح ایک تصویر سے اُس کے بیک گراؤنڈ کی مناسبت اور ہم آہنگی اور ایک ساز کی سوز سے ہمنوائی۔ اُسی بنا پر ہم عام طور سے "لکیر کے فقیر" کے مصداق اپنے مستقبل کا دار و مدار بھی ماضی اور حال کی اٹل رفتار پر رکھتے ہیں۔ ایک شخص اپنے آپ کو احباب اور آشناؤں کی وابستگی کے سراب سے دھوکا دیتے رہنے کا عادی ہو سکتا ہے اور وہ خود بھی جواب میں اپنی وابستگی کے جذبے کو دوسروں کے لئے وقف کر دینے کا خیال کر سکتا ہے لیکن حقیقتاً خالص محبت کے موتی کو تلاش کرنے کے لئے احباب کے "طرزِ عمل" اور ذاتی خود فریبی کے سمندر کی گہرائیوں میں غوطہ لگانا نہ صرف لاحاصل ہے بلکہ حقیقی جستجو کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنا ہے۔ انسان نے اس "جذبۂ محبت" کے متعلق جو کچھ بھی اب تک سوچا ہے اور لکھا ہے وہ سب اپنے ذاتی خیالات اور تجربات کی بنا پر ہے حالانکہ اس کے برخلاف حقیقت یہ ہے کہ یہ جذبہ اپنی جگہ پر دنیا کے تمام تجربات پر حاوی ہے اور انسان کے سارے اصول اور تجربات اس کے سامنے سرنگوں اور بے بس نظر آتے ہیں۔ مجھے ایک فرانسیسی عالم کا قصہ یاد ہے کہ وہ اپنے دائرہ احباب میں بیٹھا ہوا اس نکتہ پر نہایت سرگرمی سے بحث کر رہا تھا اُس صحبت میں سے کسی صاحب نے اعتراض پیش کر دیا کہ وہ خود محبت کے جذبے سے ذاتی طور پر کہاں تک واقف ہے! بس اسی پر وہ فوراً مجلس سے اٹھ کر گیا اور پختہ ارادہ کر کے اٹھا کہ جب تک وہ اعتراض کی اس کمی کو پورا نہ کر لے گا۔ اس وقت تک وہ ہرگز اس مجلس میں واپس نہ آئے گا اور جب وہ دوبارہ اس مجلس میں داخل ہو تو یہ کہتا ہوا۔ "لیجئے صاحبان! میں اپنی پرانی بحث کو اب پھر سے جاری رکھنے کے لئے تیار ہوں"۔ بہت ممکن ہے کہ وہ اس جذبے کی حقیقی باریکیوں سے کامل طور پر نہ واقف ہوا ہو لیکن قصے کے انداز سے "ذوقِ سلیم" کا ضرور اندازہ ہو جاتا ہے، اور شاید یہی بات اس مضمون کے پڑھنے والوں کے لئے بھی ایک اصلاحی چیز ثابت ہو۔

جب ایک شخص محبت کی مسرت آمیز خلش میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کی حقیقی روشنی کو اپنے اندر چمکتا ہوا پاتا ہے تو وہ اپنے اندر تبدیلیاں دیکھ کر ہرگز متعجب نہیں ہوتا اور اب وہ ان وقتی تاثرات سے کہ جن کا اثر وہ کبھی کبھی قبول کرتا رہا تھا۔ کہیں بڑھ چڑھ کر اپنے اندر ایک خالص جذبہ کا پیدا ہو جانا محسوس کرتا ہے۔ اب وہ اس درد اور اُن کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے کہ جن سے وہ اپنی زندگی کو اس سے پیشتر خالی پاتا تھا۔ "جذبۂ محبت" میں مبتلا ہو جانا سوسائٹی کے اور بہت سے تفریحی ہنگاموں سے یقیناً بالکل مختلف خیال کیا جاتا ہے اور غریب گرفتار شدہ شخص کو جن بے مہریوں اور رسوائیوں سے واسطہ پڑتا ہے وہ بھی پوشیدہ نہیں ہیں۔ سوسائٹی میں ایسے شخص کی زندگی کو بالکل ایسی طرح بے بنیاد اور بے اصول سمجھا جاتا ہے، جس طرح ببول کے درخت سے آم پیدا کرنے کی توقع۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ دو شخص جن میں ایک بھی قبول صورت نہ ہو، آپس میں ملتے رہے بھی ہوں۔ ان میں گفتگو کا سلسلہ بھی رہا ہو اور دونوں کی آنکھیں بھی متعدد دفعہ چار ہوتی ہوں، اور اس قسم کی ملاقات ایک دفعہ نہیں بلکہ بیسیوں مرتبہ ان کے درمیان ہوئی ہو، اور پھر بھی کوئی نتیجہ خاص برآمد نہ ہوا ہو لیکن جب محبت کا پرکیف درد کسی کے قلب میں شعلے بن کر بھڑکنے لگتا ہے

تو ضرور دنیا بدل جاتی ہے۔ پھر وہ لوگ رفتہ رفتہ وہ درجہ اختیار کر لیتے ہیں کہ ایک کو دوسرے میں کائنات کی تخلیق کا مقصدِ اول نظر آنے لگتا ہے پھر تو وہی معمولی مسکراہٹ ایک دوسرے کے لئے وہ اہمیت رکھتی ہے کہ جہاں محبت کے متعلق دنیا بھر کے تجربات اور مقولے سرنگوں اور متزلزل نظر آتے ہیں، عاشق کی آنکھیں اپنے مطلوب کے سوا دنیا کی کسی دلچسپ سے دلچسپ چیز کو بھی دیکھنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے ذہن میں صرف ایک خیال ہوتا ہے اور اُس کے قلب میں صرف ایک تمنا۔ ان کے تمام احباب اور شناسا اپنی جگہہ پر تعجب کرتے ہیں اور آپس میں چہ مے گوئیاں کرتے ہیں کہ آخر فلاں مرد کو فلاں عورت میں اور فلاں عورت کو فلاں مرد میں ایسی کیا خصوصیت اور کشش نظر آتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لئے اس قدر بے چین ہیں۔ میرے دوستو! میں اس موقع پر یہ ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں اس معاملے میں عورتوں کے احساسات کو پیش کرنے سے بالکل قاصر ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ ایک عورت کا جذبۂ محبت اُسی وقت جوش میں آتا ہو اور اُسی وقت اس کی تسکین ہو سکتی ہو کہ جب وہ یونانیوں کے خدا اپولو کے بت میں جان پڑنے کے بعد اُس کو جسمانی شکل میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ لیکن جہاں تک ہم نااہلوں کا کہ جو اپنے آپ کو انسان کہنے کا دعوے رکھتے ہیں تعلق ہے اور جو کھانے کی میز پر خوب خوب اور طویل قہقہوں کے ساتھ خوش گپیاں کرتے ہیں، میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جہاں تک میرے مطالعہ اور مشاہدے کا تعلق ہے، ان میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ کسی عورت کے دل میں اپنے لئے کوئی جگہہ پیدا کر سکے۔ ہاں لیونارڈو ڈاونسی[1] اور گیٹے کے جوانی کے زمانے کے متعلق ضرور سنا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس قابل تھے کہ ایک عورت کے احساسات کو بیدار کر سکتے تھے۔ میں عورتوں کی اس حس کے بارے میں یقیناً دوسرا خیال رکھتا ہوں لیکن بوجہ جنسی فرق ہونے کے صحیح حالات کی صورت میں پیش نہیں کر سکتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری زندگی میں بہت سے ایسے واقعات بھی پیش آ جاتے ہیں کہ جب انسان تقدیر کو بھی بے بس و مجبور بنتا نظر آتا ہے اور بالکل اپنی خواہش کے مطابق اس سے کام لیتا معلوم ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اگر ایک انسان ہمت اور صبر سے کام لے تو وہ یقیناً بہت سے ایسے کام کر سکتا ہے، جن میں محنت اور مشقت، بلند خیالی، اور باریک بینی اور جوش و خروش کا پہلو نمایاں طور سے نظر آئے گا لیکن 'جذبۂ محبت' جیسے جذبے میں اپنے آپ کو قصداً اور ارادتاً مبتلا کر لینا ہرگز ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ سب جانتے ہیں کہ شیکسپیر جیسے ماہرِ فن کو ملکہ ایلزبتھ کی خواہش کے مطابق فال اسٹاف کو جذبۂ محبت میں مبتلا کرنے کے لئے کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ "ہنری فیلڈنگ"[2] بھی کبھی اس جذبے سے واقف ہوا ہو، سوائے اس کے کہ اس کے ناول ریاب رائے کے دو ایک موقعوں سے کوئی رائے قایم کر لی جائے ورنہ میں تو اسکاٹ کے بارے میں بھی یہی خیال رکھتا ہوں۔ یہ سب لوگ اپنی جسمانی خوبصورتی، تندرستی، اور آزاد خیالی کے لحاظ سے اس قابل تھے کہ ان کا جذبۂ محبت میں مبتلا ہونا دائرہ یقین و امکان سے باہر نہ تھا اور جب یہی لوگ اس جذبے کی حقیقی کیفیتوں سے واقف نہ ہو سکے تو اس دنیا کی زمین پر ان گنت مردہ صورت اور کوئی خاص وقار نہ رکھنے والے لوگوں سے یہ امید رکھنا کہ وہ جذبۂ محبت، جیسے نازک جذبے کی حقیقت کو سمجھے ہوں گے، عین حماقت ہے۔ جس طرح ایک شخص گیلے کپڑے پہنے ہوئے آگ میں سے بغیر کسی گزند اور تکلیف کے گذر جاتا ہے اور جس طرح ایک نابینا کے لئے دنیا کا دلفریب سے دلفریب اور جاذبِ نظر نظارہ بھی کسی قسم کی فرحت و راحت مہیا نہیں کر سکتا، اسی طرح روئے زمین پر بسنے والے لوگوں کی زیادہ تعداد ایسی ہوتی ہے کہ وہ اس جذبے کی حقیقی کیفیتوں کو سمجھنے کی ہرگز اپنے آپ میں اہلیت نہیں رکھتے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں کہ جن میں اس قسم کی اہلیت موجود ہوتی ہے، وہ یا تو ایک دوسرے سے زندگی میں کبھی ملنے نہیں پاتے اور یا ایسی منحوس ساعت اور بری گھڑی میں ملتے ہیں کہ روح کی اولین آرزو یعنی محبت ان میں اس وقت موجود نہیں ہوتی۔ اسی باعث بہت سی ممکن صورتیں نامکمل رہ جاتی ہیں۔ شرم اور مصلحت وقت کی بنا پر بھی بہت سے تعلقات آدھی دور تک ہی پہنچ کر رہ جاتے ہیں۔ اس منزل کو طے کرنے کے لئے نہایت درجہ مستقل مزاجی اور صبر و رضا کی ضرورت ہے کوئی غیر معمولی انسان ہی اپنی آرزوؤں کی پامالی کو ایک دفعہ نہیں بلکہ متعدد دفعہ دیکھ سکتا ہے، حتی کہ وہ اپنے عجز و نیاز اور ایثار کے زور سے محبوب کو

[1] ایک ماہرِ علمِ موسیقی۔ [2] ایک قابل قدر ناول نویس۔

اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ میں اس سلسلہ میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ ایک عورت یقیناً اس مرد کے سامنے انعطاف سے پیش آتی ہوگی جو مستقل مزاج اور صابر ہوگا۔ اسی وجہ سے جو شادیاں ایک دوسرے کی ناپسندگی کی بنا پر مبنی ہیں ان کا انجام یقیناً خراب ہوتا ہے اور ان کی ازدواجی زندگیاں بھی غیر خوشگوار رہتی ہیں۔ محبت ایک ازلی بشارت ہے اور اس کی مسرتیں ابدی ہوتی ہیں۔ ان دو کے تعلقات کس قدر قابل قدر اور کیسے قابل رشک ہیں جنھوں نے اس منزل کو پورے علم و ہوش کے ساتھ قدم بہ قدم طے کیا ہو ان کی مثال بالکل ان دو چھوٹے بچوں کی سی ہوتی ہے کہ جو ایک اندھیرے کمرے میں اپنی منزل مقصود کو ڈھونڈتے ہوئے جا رہے ہوں۔ ایسے لوگ ملتے ہی ایک دوسرے کا دم بھرنے لگتے ہیں اور ایک کو دوسرے کی خوشی اور پریشانی اپنی خوشی اور پریشانی معلوم ہونے لگتی ہے اور پھر تو رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ہے کہ ایک اپنی ذاتی تکلیف کے احساس کو دوسرے کی آنکھوں میں دیکھنے لگتا ہے۔ یہ سب احساسات نہایت خاموشی سے پرورش پاتے رہتے ہیں اور کچھ عرصے کے بعد دونوں اس قدر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ جو کچھ محبوب کے دل میں ہوتا ہے بالکل وہی خیال عاشق کے دل میں بھی ہوتا ہے۔

اس جذبۂ محبت میں مبتلا ہو جانا جہاں تعجب خیز ہے وہاں سود مند اور مفید بھی ضرور ہے۔ اس جذبے کو زیادتی عمر سے کوئی سروکار نہیں ہوتا بلکہ یہ ہر انسان کے سوتے ہوئے احساسات کو بیدار کر دیتا ہے۔ جب تک ایک شخص اس جذبہ میں مبتلا نہیں ہوتا اس وقت تک وہ محبت کی پرکیف لذات سے زندگی کو خالی خیال کرتا ہے۔ وہ اس راز کو اس جذبے میں مبتلا ہو جانے کے بعد ہی سمجھ سکتا ہے کہ کائنات کی کوئی مسرت محبت کی کاوشوں سے بیش قیمت نہیں ہے۔ ایک بے حس شخص زندگی کے اس مقدس ترین جذبے کی کیفیتوں کے مزے سے ناآشنا رہ کر محض فرسودہ اور غیر دلچسپ باتوں کے درمیان ہی اپنی زندگی گزارنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ وہ ایک محروم مسرت شخص کی طرح خشک زندگی بسر کرتا رہتا ہے جس میں نہ کوئی رنگینی ہوتی ہے اور نہ کوئی امنگ۔ ایسا شخص زندگی بھر سوسائٹی کے قدیمی اور رذیل اصولوں کی کورانہ پرستش میں مصروف رہنے کو اپنا ایمان سمجھتا ہے اور چونکہ اس میں روشن خیالی اور انسانی ہمدردی کا فقدان ہوتا ہے اس لئے اپنے محدود اور مقررہ راستے سے ہٹ کر سکون اور راحت کے سامان کو اور کہیں تلاش کرنا خیال خام سمجھتا ہے۔ لیکن جب وہی شخص غیر اختیاری طور پر "جذبۂ محبت" میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر تو وہ اپنی مردہ دلی، بے بسی اور خود غرضی کو اسی طرح خیرباد کہہ دیتا ہے کہ جس طرح سینٹ پال ایک کٹر یہودی نے عیسائیت قبول کرنے کے بعد کیا تھا۔ اس کی دل کی وہی حرکت جو گزشتہ سالہا سال تک نہایت صحیح اور سچے وقت کی پابندی کے ساتھ قائم رہی تھی، اب اس جذبے میں مبتلا ہونے کے بعد بے انتہا بڑھ جاتی ہے اور اس کا دل بغیر کسی پابندی کے اس کے سینے میں بلیوں اچھلنے لگتا ہے، اس کے قلب کی دھڑکن میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اب وہ ایسا محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس نے اس قسم کی پرلطف کیفیت اس سے پیشتر کبھی محسوس نہ کی تھی۔ اب اُسے اپنی تمام گزشتہ زندگی کو خواب کی سی حالت میں بسر کرنے کا یقین ہو جاتا ہے۔ اب وہ اپنے کو دنیا کی عجیب و غریب مخلوق خیال کرنے لگتا ہے۔ وہ تنہائی میں اکثر مسکراتا رہتا ہے اور چاند اور ستاروں کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھنے کا خاص طور سے عادی ہو جاتا ہے۔ ہر چند ایک عاشق کی ذہنی اور قلبی کیفیات کو کامل طور پر بیان کرنا ایک ہوشیار سے ہوشیار ادیب کے بس کی بھی بات نہیں لیکن پھر بھی جو کچھ لکھا گیا ہے اور ہمارے مطالعے میں آسکا ہے وہ یقیناً قابل قدر ہے۔ جرمن شاعر کی نظم اڈی لیٹ ٹینی سن کی نظم ماڈ اور ہینرچ ہین کے بہت سے گیتوں میں اس کیفیت کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ شیکسپیئر نے بھی اپنے ڈراما رومیو اور جولیٹ میں رومیو اور جولیٹ کو ہیرو اور ہیروین بنا کر اس جذبے کی کیفیت کا خوب خوب اظہار کیا ہے، حالانکہ چند جرمنی نقادانِ فن نے اس پر اعتراضات بھی کئے ہیں۔ اس کے علاوہ شیکسپیئر نے ڈراما انطونی اور قلو بطرہ میں بھی انطونی کو قلو بطرہ کا پرستار بنا کر اس کیفیت کے اثرات کا خوب خوب نقشہ کھینچا ہے۔ وکٹر ہیوگو کے ناول لیمزرابلز اور اسی طرح جارج لینڈ اور جارج میریڈتھ نے اپنے اپنے ناولوں میں بہت سے کرداروں کو جذبۂ محبت، میں مبتلا کر کے اس کیفیت کو خوب خوب بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس مسئلہ پر پڑھنے کے لئے اور مواد موجود ہے۔ ان تصانیف کے مطالعے کے بعد ایک جوان شخص

کی تمام خوابیدہ تمناؤں کا بیدار ہو جانا بہت کچھ امکان میں ہے

ایک عاشق کی کیفیات کا جو اس پاک جذبے کے تحت میں طاری ہوتی ہیں، وضاحت سے بیان کرنا آسان بات نہیں ہے۔ یہ جذبہ بالکل غیر اختیاری طور پر خدا جانے کس طرح یکایک انسان پر چھا جاتا ہے اور پھر وہ اپنے آپ کو نہ صرف ایک خاص نشے کی سی کیفیت میں سرشار پاتا ہے بلکہ اپنے وجود کو بھی دوسروں کے لئے مفید اور سودمند خیال کرتا ہے۔ اس کو کسی کے عشق میں مبتلا ہونے کے بعد سونے میں، چلنے میں، حرکت کرنے میں حتیٰ کہ سانس تک لینے میں ایک خاص قسم کا مزہ حاصل ہونے لگتا ہے۔ اس جذبہ سے متاثر ہونے والے بہت کم پسند کرتے ہیں کہ یہ کیفیت انہیں تک محدود رہے۔ وہ اس بات کی خواہش کرنے لگتے ہیں کہ اُن کے احباب اور رشتہ داروں کو بھی اس مزہ سے ناآشنا نہ رہنا چاہئے۔ ایک دوسرے کے پرستار جب آپس میں گفتگو کر کے خاص قسم کا حظ حاصل کرتے ہیں تو وہ اس بات کے متمنی نظر آتے ہیں کہ آخر تمام دنیا کے لوگ بھی اس مقدس جذبے میں کیوں نہیں مبتلا ہو جاتے۔ اُن کی خودداری یہاں تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ جو آسمان نیلا ہے اور یہ جو سورج چمکتا ہے محض اُن کے وجود اور اُن کی محبت کی خاطر، اور اتفاق بھی یہی ہوتا ہے کہ عام طور سے پرستار اور محبوب ایک دوسرے سے ایسے ہی خوشگوار اور دلفریب و دلکش موسم میں ملتے ہیں، ہر چند ایسے لوگ اپنے دوسرے ہم جنسوں کے ساتھ نہایت التفات اور خوش خلقی سے پیش آتے ہیں لیکن پھر بھی اپنی امتیازی شان کو ضرور علیحدہ قایم رکھنا چاہتے ہیں۔ دنیا والوں کے نزدیک عام طور سے حکمرانی اور مذہبی پیشوائی کو بہت بڑا درجہ حاصل ہے اور اس ممتاز جگہ پر پہنچ جانے والے اسے اپنے لئے انتہائے عروج و کمال سمجھتے ہیں لیکن عاشق اور محبوب کے نزدیک محبت کرنا اور محبوب بننا ہی وہ وقار اور رتبہ ہے جس کے سامنے دنیا کی تمام مادی ترقیاں ہیچ ہیں۔ اسی وجہ سے ایسے لوگ دوسروں سے ذرا دعاوت آمیز طریقے سے گفتگو کرتے ہیں اور یہی وجاہت اور امتیازی شان کا جذبہ انہیں سادگی اور انکساری کی طرف مائل نہیں ہونے دیتا۔ ہر چند وہ عورتوں کے متعلق نہایت نیک و پاک خیالات رکھتے ہیں، جیسے کہ وہ تمام اُن کی نظروں میں جون آف آرکس ہی ہوں، لیکن اُن کے طرز عمل اور برتاؤ سے ہرگز یہ بات نہیں پائی جاتی کیونکہ وہ ان کے ساتھ اکثر ترشروئی اور بدگمانی سے بھی پیش آتے ہیں۔ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آیا عورتیں مردوں کے اس قسم کے طرز عمل کو پسند کرتی ہیں یا نہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ جارج ایلٹ کے ناول ڈینیل ڈیرانڈا کے مطالعے کے بعد میں نے ان کی پسندیدگی اور غیر پسندیدگی کے متعلق سوچنے کی کوشش کرنا ہی ترک کر دی ہے۔

لوگ محبت کے جذبے کو جہاں بلند خیال کرتے ہیں — وہاں اُسے حماقت سے پُر بھی سمجھتے ہیں لیکن اگر محبت سے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا تو کم از کم محبت میں مبتلا ہونے والے دو پرستاروں کا وجود اُن کی سکون و راحت کی زندگی، دوسرے لوگوں کے لئے باعث برکت ضرور ہوتی ہے۔ غیر شخص بھی اُن کی آپس کی وابستگی اور بے لوثی کو دیکھ کر مسرور و خوش ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ جذبہ اپنی جگہ پر نہایت بلند اور مفید ہے۔ اسی دلیل کی بنا پر اس جذبے کو بے حقیقت اور بے بنیاد سمجھنا عین حماقت ہے۔ ہم مذاقوں اور ہم خیالوں کی ایک اچھی خاصی جماعت سی قایم ہو جاتی ہے۔ اس جماعت کے لوگ آپس میں ایک دوسرے کو رشک کی نگاہوں سے بھی دیکھتے ہیں۔ ایک جوڑا دوسرے جوڑے کو دیکھ کر اُن کے احساسات اور اُن کے بے لوث تعلقات کی قدر تو ضرور کرتا ہے لیکن ساتھ ہی ان کے مقابلے میں اپنے احساسات کو زیادہ بلند سمجھتا ہے اور دوسروں کے احساسات کو اپنے احساسات کی نقالی خیال کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب اسٹیج پر کسی کھیل کے دوران میں عشق کا اظہار ہوتا ہے تو پھر حاضرین میں سے بھی ایک معمولی مرد و دور ایک معمولی عورت کو اپنے جذبات پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ بہت سی باریکیوں اور گتھیوں کو سمجھنے اور سلجھانے کے لئے انسان کو اپنی عقل اور اپنے تخیل اور ذہن کی قوتوں سے کام لینا پڑتا ہے اسی عقل کی مدد سے اس کو یہاں بھی سمجھ لینا چاہئے کہ محبت کرنے والے اور محبت کرانے والوں کا وجود خلق خدا کے امن و سکون میں ہرگز مخل نہیں ہو سکتا۔ ہر چند ایسے لوگ اپنے احساسات کے مقابلے دوسروں کے احساسات کو پست ضرور خیال کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ اس جذبے کی تبلیغ کے خواہشمند بھی نظر آتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ قدرت بھی اپنی

پوری فیاضیوں کے ساتھ انسان کو مجبور کر دیتی ہے کوئی کتنا ہی بے حس اور سخت دل نہ ہو لیکن جس طرح ایک حد درجہ مصروف کار شخص کے لئے بھی شام کے وقت سورج غروب ہونے کا نظارہ دلکش اور دلعزیب بن سکتا ہے اسی طرح اُس بے حس انسان کو بھی اپنے جذبات پر قابو پانا یقیناً مشکل ہو جائے گا۔ جب وہ اس جذبے کی رنگین کیفیت کتابوں میں پڑھے گا اور یا دو افراد کو کسی خوب صورت اور ٹھنڈے سبزہ زار میں محبت کے جذبات سے سرشار راز و نیاز کی گفتگو میں مصروف پائے گا۔

دنیا والے 'جذبۂ محبت' میں مبتلا ہونے والے لوگوں کے بارے میں جو چاہے خیال کریں لیکن وہ خود کم ازکم اپنے وجود اور اپنے طرز زندگی کو ضرور بہتر و برتر خیال کرتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ نیکی کے ساتھ پیش آنا اور اپنے جذبات کی حقانیت کی تبلیغ کرنا ان کا مذہب بن جاتا ہے۔ ہر وہ چیز جو محبوب کو عزیز ہوتی ہے، عاشق بھی اسی کا فریفتہ نظر آتا ہے۔ دونوں اپنے وجود کو ایک دوسرے کے لئے باعث تقویت سمجھتے ہیں۔ اس جذبے کے تحت میں جود جاہت، خودداری اور فروتنی کے مختلف احساسات انسان پر چھا جاتے ہیں، اُن کو علٰحدہ علٰحدہ پیش کرنا نہ صرف مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ ایسے لوگوں کو خود آرائی، خوشنمائی، اور بڑھ بڑھ کے باتیں بنانے کا شوق محض اس خواہش کی بنا پر ہی نہیں ہوتا کہ اس سے اُن کے دائرہ احباب میں ان کا وقار بڑھتا ہے بلکہ ایسا کرنے سے اُن کو اپنے محبوب کی خاطر بھی منظور ہوتی ہے عاشق کی زبان پر صرف ایک نام ہوتا ہے جو چشمے کی طرح اس کے دل کی گہرائیوں سے اُبلتا ہے اور لبوں پر آکر رکتا ہے وہ ہر جگہ اور ہر وقت اسی کا ورد کرتا ہے۔ اُس کا تمام وقت اسی کوشش میں گزرتا ہے کہ کسی طرح سے اس کے محبوب کا دل میلا نہ ہونے پائے۔ عاشق اپنے محبوب کے سامنے اپنی بعض کمزوریوں کا تنہائی میں اقرار کرنے سے بھی بڑا خوش ہوتا ہے اور چشم پوشی اور دل نوازی کی اپنے محبوب سے اُمید رکھتا ہے۔ وہ اس بات کا آرزومند نظر آتا ہے کہ اُس کا محبوب اس کو کسی خاص خوبی کی وجہ سے پسند نہ کرتا ہو بلکہ اس کی محبت اس کی ذات خاص کے لئے وقف ہو۔

ایک عاشق اپنی موجودہ زندگی کے مقابلے میں گزشتہ زندگی کی باتوں کو بالکل بے حقیقت خیال کرنے لگتا ہے اور ان کی بدمزگی کا اُسے پورا پورا یقین ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی گزشتہ زندگی کی تمام اچھی اور بری خواہشات اور اس زندگی سے متعلقہ واقعات اور احساسات پر نفرین کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ اُسے گزشتہ زندگی کے ایام میں موجودہ دلچسپیوں کے بغیر کیونکر چین اور صبر آگیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک عاشق یہ ہرگز برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے کہ اس کا محبوب بھی اپنے گزشتہ تعلقات پر ایک ایسی ہی نگاہ ڈالے۔ وہ اس گتھی کو سلجھانے سے اپنے آپ کو قاصر پاتا ہے کہ اُس نے اپنی گزشتہ زندگی کے دن جب کہ وہ بالکل بے کیف اور بے حقیقت تھی، کیسے گزارے۔ وہ اپنی انتہائی بے خودی اور اپنے جنون و جوش کے عالم میں قدرت پر بھی الزام دھرنے سے نہیں چوکتا ہے اور کہتا ہے کہ جبکہ خدا فاطر الخلق اور رحیم و فہیم ہے تو اس نے مجھے اور میرے محبوب کو کچھ عرصہ کے لئے بھی کیوں دور دور رکھا!

بہت سے لوگ "حسد" کو اس بنا پر رد کرتے ہیں کہ جہاں وہ ایک مصنوعی جذبہ ہے وہاں عملی طور سے پُرقباحت بھی ہے۔ ان لوگوں کا یہ خیال بہ مشکل صحیح ٹھہرایا جاتا ہے اگر لوگوں کا اعتراض اسی بنا پر ہے کہ "حسد" بعد کی اختراع اور پیداوار ہے اور اس جذبے کو بنی نوع انسان کے وجود میں آنے کے وقت سے کوئی تعلق نہیں ہے تو ان کی یہی دلیل وفاداری، حب الوطنی، محبت اور دیگر عمدہ اور لطیف جذبات کے بارے میں بھی پیش کی جا سکتی ہے اور "حسد" کا ہم پلہ جذبہ "بدمزاجی" بھی بعد ہی کی پیداوار ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ سب کیا دھرا حضرت انسان ہی کا ہے۔ محبت کے جذبے کے لئے تاریخ کی ورق گردانی کرنا ہرگز مناسب نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یہ جذبہ جہاں ان سب باتوں سے بے نیاز ہے وہاں اپنی جگہ پر ناقابل اعتراض اور عدیم المثال بھی ہے۔ اگر کوئی صاحب یہ دریافت کرنے لگیں کہ اس جذبہ کا فلاں عہد میں اور فلاں ملک میں، مثال کے طور پر ملک یونان میں کیا رنگ تھا تو اس کے جواب میں دماغ شکوک کے وہ انبار لگا دے گا کہ اصل معاملے کی اہمیت خواب و خیال ہو کر رہ جائے گی۔

بہر صورت محبت میں "حسد" لازمی اور منطقی طریقے سے شامل ہے۔ آپ پسند کریں یا نہ کریں لیکن ہے ضرور۔

وہ حسد۔ صحیح معنوں میں بالکل حسد نہیں ہوتا جب کوئی عاشق اپنے محبوب سے علٰحدہ گزشتہ زندگی پر نگاہ ڈال کر ایک خاص قسم کا جذبہ محسوس کرتا ہے۔ ہر چند اُس کے قلب پر چوٹ سی ضرور لگتی ہے لیکن اس پر بھی ان خطوط کا تصور جو گزشتہ دنوں میں اس نے اپنے کسی دوسرے محبوب کو بھیجے تھے اس کی موجودہ وابستگی میں مخل نہیں ہوتا۔ پرستار اور محبوب خالص محبت کے تحت میں ہرگز ایک دوسرے کے بارے میں بُرے اور نامہذب خیالات دل میں نہیں لاتے ہیں بلکہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر گزشتہ زندگی کا خیال کر کر کے کڑھتے ہیں۔ وہ اس بات کے آرزومند اور خواہشمند نظر آتے ہیں کہ قدرت نے کیوں نہ اُنہیں ایک ہی وقت میں اور ایسے ہی احساسات کے ساتھ پیدا کیا۔ ایسی صورت میں اُن کا تعلق خالص اور مکمل ہوتا اور کسی قسم کی بدگمانی سے بھی اُن کے قلوب پاک رہتے اور وہ اُن کی گزشتہ زندگی کے بہت سے اذیت دہ واقعات کو ایک دوسرے سے چھپائے بغیر اپنی زندگیاں بے خوف وخطر اور بغیر کسی بدگمانی کے بسر کرتے ان لوگوں کو اپنی ملاقات سے پیشتر گزشتہ جدائی کا بھی اسی طرح قلق ہوتا جس طرح موت کے بعد اٹل جدائی کا۔ کسی نے لکھا ہے کہ محبت کا جذبہ انسان کو حیات ابدی پر اعتقاد اور یقین کرنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے کیونکہ یہ بات بعید القیاس معلوم ہوتی ہے کہ ایسے بلند رتبہ اور خالص جذبے کو بھی قدرت اس مختصر سی زندگی کے ساتھ ہی فنا کر دینا گوارا کر لیتی ہو۔ آسمان سے زمین پر اترنے والی چیزوں میں محبت سب سے زیادہ معصوم ہے۔ محبت غیر فانی ہے اور محبت والے بھی۔ ہر چند یہ یقین اپنی جگہ پر غیر ممکن اور بعید فہم سا نظر آتا ہے لیکن اگر ہم روائتوں اور مثالوں پر نگاہ ڈالیں تو اس میں کوئی غیر ممکن بات اور کم فہمی نظر نہ آئے گی۔

دنیا کے اس طلسم خانہ میں کون رہا ہے جو محبت اور محبت کرنے والے ہی رہ جاتے۔ وقت نے سب کو پچھاڑ کھایا ہے۔ وقت کی پامالیاں اٹل ہیں۔ زندگی کی بے ثباتی کا یہ عالم ہے کہ اُدھر تو وہ اندھا تیر انداز یعنی محبت کا دیوتا کیوپڈ ہنس ہنس کے بے شمار تیر چلا رہا ہے اور ادھر اجل کے فرشتہ نے اُن تیروں سے گھائل ہونے سے پیشتر ہی نشانہ کو اٹھا لیا۔ دوسرا بھی گھائل ہی ہوتا ہے ایک زخمی شکار کے مانند تڑپ کر اور خاک و خون میں لت پت ہو کر اپنی جان دے دیتا ہے۔ اسی باعث محبت اور محبت کرنے والوں کے واقعات محض افسانہ اور خواب و خیال ہو کر رہ گئے ہیں۔ اب جبکہ ایک نسل کا فاصلہ ہو چکا ہو تیس سال کے باہمی اور رہے سہے تعلقات کا خاتمہ ہو چکا ہو، کون کہہ سکتا ہے کہ ان پرستاروں اور محبوبوں کا کہ جو اپنی محبت کو دائمی سمجھتے تھے اور جو اپنے جذبات کی حقانیت کے دھن میں "موت" تک کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے، کیا حشر ہوا؟ وہی جو وقت کیا کرتا ہے اگر ان کی زندگیوں کی یاد دلانے کے لئے کوئی چیز باقی رہ جاتی ہے تو اُن کے دل سے نکلے ہوئے چند گیت، کچھ قربانیاں اور چند بچے جو عادت اور مزاج میں اُن سے بہت مشابہ ہوتے ہیں۔

"سٹیون سن"

توکل حسین

رباعی

فرسودۂ مصائب کو نہ پھر یاد کرو
بربادیوں سے دل کو نہ آباد کرو
ہر نعمتِ حاضر کو غنیمت جانو
امروز کو فردا سے بھی آزاد کرو

انجم مرادآبادی

شاعر سے خطاب

مرحبا اے شاعرِ روشن ضمیر حبذا اے پرتوِ اسمِ خبیر
آفریں اے "بینش افروزِ فقیر" شادباش اے "دانش آموزِ امیر"

فاش تیرے دل پہ ہر اک راز ہے
دانش آموزی تری اعجاز ہے

اب کہاں وہ روح پرور وادیاں وہ جہانِ قدس کی شہزادیاں
کیا کہیں کیسی ہیں یہ آبادیاں وہ زمانے اب نہ وہ آزادیاں

اپنی اپنی رو پہ ہم کو چھوڑ دے
ہو سکے تو بند سب کے توڑ دے

تو ہے آمر جو ترے فرمان ہیں قوم کی تشکیل کا سامان ہیں
تو ہے شاعر جو ترے عنوان ہیں اجتماعی زندگی کی جان ہیں

حکم دے تیرے سوا آمر ہے کون
شعر کہہ تیرے سوا شاعر ہے کون

ہاں، وہی پھر شاعرانہ التفات ہاں، وہی پھر "فاعلاتن فاعلات"
تیری ہر اک بات ہے قند و نبات شعر تیرے چشمۂ آبِ حیات

زندگی کی لہر دوڑا دے ابھی
راز "خود فہمی" کا سمجھا دے ابھی

شاعرانہ جوش لے کر مستعار　　آتے ہیں جو تیرے آگے بار بار
جن کی "نَے واری" ہے تجھ کو ناگوار　　کر اُنہیں تُو کم نگاہی کا شکار

شعر اُن کے شاعری کی نقل ہیں
عُمر کھوتے ہیں یونہی، بے عقل ہیں

تیرا بداندیش ہر نقال ہے　　مانعِ تفصیل یہ اجمال ہے
نکتہ سنجوں کا ہر اک جا کال ہے　　پھر بھی تو خوش حال تھا خوش حال ہے

سب کو حاصل انہماک ایسا نہیں
مدح و ذم کی اب تجھے پروا نہیں

اپنی فطرت سے عدو مجبور ہے　　فطرتاً تو شاد وہ رنجور ہے
اس سے رازِ شاعری مستور ہے　　رشک سے تیری طبیعت دُور ہے

دل کسی قابل جنہیں پاتا نہیں
رشک اُن پر واقعی آتا نہیں

کر گئے اُستاد دنیا سے سفر　　آتی ہے ان کی جگہ خالی نظر
لیکن اپنا رُخ نہ کر ہرگز اُدھر　　بیٹھ تو حیثیت اپنی دیکھ کر

دل سے شوقِ جانشینی دُور کر
قدر اپنی اے علی منظور کر!

علی منظور حیدرآباد

کیوپڈ کی فتح

(یونانی مائی تھالوجی کا ایک دلفریب افسانہ)

طاقت کا مغرور اور متکبر دیوتا اپالو، ظالم، خود بین اور بے رحم اپالو اپنی سنہری آتشیں رتھ میں بیٹھ کر جب مشرق سے مغرب کا سفر کرتا تو دریا کی ننھی ننھی معصوم پریاں اپنا رقص و سرود چھوڑ کر اس کے دلفریب حسن کا نظارہ کرنے لگ جاتی تھیں اور ہر خوب صورت پری اس بات کے لئے کوشاں رہتی کہ خود بین اپالو ایک بار صرف ایک بار اس کو دیکھ لے اور اپنا دیوانہ بنا دے لیکن ظالم اور جابر اپالو، طاقت کا مغرور دیوتا اپالو اپنے رتھ کو ہانکتا ہوا نکل جاتا اور ایک نگاہ غلط انداز بھی ان نازک حسین پریوں پر نہ ڈالتا، یہی نہیں بلکہ وہ اس قدر سنگ دل واقع ہوا تھا کہ ذرا بھی خیال نہ کرتا اور حسین پریوں کے اُن نازک لطیف اور دلکش پھولوں کو بالکل روند ڈالتا جو وہ اس پر عقیدت مندانہ انداز میں نثار کرتی تھیں وہ وہاں سے روز نکلتا مگر اسے اِن غریب پریوں پر کبھی رحم نہ آتا اور ہمیشہ اپنے تاج کو اپنے سر پر ٹیڑھا رکھے ہوئے بے پروائی سے نکل جاتا۔

کیوپڈ، اندھا، الگرکسن کیوپڈ، اپنے زرّیں تیر و کمان سمیت حُسن اور طاقت کے متکبر دیوتا سے ملنے جایا کرتا تھا . . .

ایک دن معمول سے زیادہ متکبرانہ لہجہ میں اپالو نے عشق کے دیوتا سے کہا "اے اندھے اور کمزور لڑکے تیری کماں کس قدر وزنی ہے اور تیرے ہاتھ کمزور پھر تو کیوں اپنی ہنسی اس طرح اڑواتا ہے لا یہ کمان اور تیر مجھے دے کہ میرے قوی اور توانا ہاتھ اس لایق ہیں کہ اس وزنی کمان کو اٹھا سکیں۔"

اندھے لڑکے نے حقارت آمیز ہنسی ہنستے ہوئے کہا "کیا خوب! اپنی طاقت کا کتنا اچھا اظہار . . . ہے"۔ اپالو بگڑ اٹھا اور نہایت کرخت آواز میں کہا "تو نا ہنجار ذلیل چھوکرے آج سے میں دیکھوں گا تیرا یہ تیر میرا کیا کر سکتا ہے، اپنی طاقت پر اس قدر ناز! یاد رکھ کہ تیرا ننھا تیر سورج کے طاقتور دیوتا پر خاک بھی اثر نہ کرے گا . . . ."

"اچھا دیکھا جائے گا . . ." کیوپڈ نے فخریہ لہجے میں جواب دیا . . . .

حسین ڈائنا کی پیاری سہیلی ڈیفنی یونان کی زہرہ تمثال لیکن معصوم دیوی اپنی لَے میں سحر سامری کا اثر رکھتی تھی، چار دانگ عالم میں مشہور تھا کہ جنگل کے درندے بھی اس کے نغموں سے مسحور ہو جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنی لَے پر گاتی اور جب وہ گاتی تو کیفِ مسرت سے کوہ المپس کا گوشہ گوشہ چپّہ چپّہ بے خود ہو جاتا، اس کے جلوہ بے پناہ اور اُس کی لَے نوازیوں نے لاکھوں دلوں کو دیوانہ بنا دیا تھا۔

. . . ایک صبح جب حسین ڈیفنی اپنی لَے نوازی سے ایک عالم کو وجد میں لا رہی تھی، وادیاں اُس کی نغمہ پرور لَے سے مدہوش تھیں اور ہر ذی حیات پر عالم وجد و سکوت طاری تھا . . . سبزہ خوابیدہ پر عالمِ وجدان . . . ہر طرف شہر خموشاں کا منظر تھا۔ . . حسین ڈیفنی کی دل نواز تانیں فضائے عالم کے سکوت میں ہیجان برپا کر رہی تھیں . . .

یکایک مشرق کی سمت سے ایک سیلاب نور امنڈتا ہوا نظر آیا، ایک طوفان ضیابار اٹھا جس نے طلسم سکوت کو توڑ کر تمام حسین اور دلکش مناظر اپنے میں جذب کر لئے . . . آہ اس طوفان میں عجیب طرح کی کشش تھی، تمام خوب صورت لڑکیوں نے سر اٹھا اٹھا کر اس جلوۂ بے پناہ کی طرف دیکھنا شروع کیا، حُسن کا دیوتا خراماں خراماں آ رہا تھا . . . .

دفعتہً حسین اور معصوم ڈیفنی کی سحر آمیز آواز اُسے سنائی دی، کچھ جھجکا . . . کچھ کیف طاری ہوا . . . اُس نے ایک محبت آمیز نظر اُس کے دل کش چہرہ پر ڈالی ننھے کیوپڈ نے جلدی سے اپنا ترکش سنبھالا

اور ایک زریں تیر نکال کر مضبوط اپالو کے سینے کو نشانہ بنا دیا۔

"کمان کڑکی اور تیر اپالو کے سینے میں [illegible]"

اب حسین ڈیفنی کی باری تھی، ایک جست کے زنگ آلودہ تیر سے اس نے ڈیفنی کو بھی نشانہ بنا دیا . . .

ادھر مغرور اپالو کمسن ڈیفنی کی جانب بڑھا، نہایت انکساری سے اپنا سر ڈیفنی کے قدموں پر جھکانا چاہا مگر . . . خوب صورت ڈیفنی . . . مجبور تھی کہ اپالو کی محبت کو ٹھکرا دے کیونکہ جست کے تیر کی یہی تاثیر تھی . . . !

دن گزرے، ہفتے گزرے مہینوں اور سالوں تک نوبت پہنچ گئی۔ اپالو کی محبت بڑھتی گئی، مگر اپالو جتنی محبت کرتا اتنا ہی ڈیفنی نفرت کرتی۔ وہ ایک مہجور انسان کی مانند پریشان حال خوبصورت ڈیفنی کا انتظار، جنگل کے گھنے درختوں کے سائے میں کیا کرتا تھا مگر . . . وہ ظالم نہ آتی . . . اس کے انتظار کی گھڑیاں ہمیشہ لمبی ہوا کرتی تھیں، وہ اپنے دل کو سکون پہنچانے کے لئے اس کا انتظار کرتا مگر کبھی جب وہ اُسے دیکھ پاتا۔ اس کے دل کی پریشانی اور بڑھ جاتی، آخر ایک دن اس نے ہمت کی اور خوب صورت ڈیفنی کو ایک مرغزار میں پا لیا وہ ایک درخت کے نیچے مصروف گلگشت تھی مجبوراً اپالو لرزتا ہوا اُس کی جانب بڑھا وہ اب بھی کانپ رہا تھا اور اس کے پیر ڈگمگائے جا رہے تھے۔

بدبخت اپالو . . . ابھی قریب نہ پہنچا تھا کہ ڈیفنی نے مڑ کر دیکھا اور ہراساں ہو کر بھاگنے پر تیار ہوئی اُس کا یہ ارادہ جان کر وہ آگے بڑھا اور افسردہ لہجے میں اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "ٹھہر اے حسن کی ملکہ! ٹھہر! او دیکھ تیرا ایک دیوانہ تجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے ایک تمنا تیرے روبرو لایا ہے ایک التجا . . . دیکھ! سورج کا طاقت ور دیوتا، وہ دیوتا جس کا سر دنیا کی کسی ہستی کے آگے نہ جھکا تھا۔ آج تیرے قدموں پر جھک رہا ہے، دیکھ میری حالت دیکھ
ڈیفنی مجھے تجھ سے محبت ہے"

حسین ڈیفنی بھاگی بہت تیز ایسی تیز جیسے ابابیل مگر . . . اپالو نیز پا اپالو اُس کے نزدیک ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اب ڈیفنی اُس کے آغوش میں تھی

مگر . . . افسوس . . . اُس کی ساری آرزوئیں اور تمنائیں خاک میں مل گئیں . . . وہ دیوانہ ہو گیا . . . بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا، کیونکہ حسین ڈیفنی کی ٹانگیں لانبی جڑوں میں تبدیل ہو کر زمین میں پیوست ہو چکی تھیں اور اس کا حسین جسم ایک نازک اور دلکش درخت میں تبدیل ہو گیا تھا۔

ہائے . . . بدنصیب اپالو یہ منظر دیکھ کر محو حیرت تھا، اس کی سرخ آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اس کے دلفریب گالوں پر بہتے ہوئے دلکش اور خوبصورت پتوں میں جذب ہو گئے اور اُس نے پر درد آواز میں کہنا شروع کیا:۔

"آہ یونان کی حسین ترین پری، خدا حافظ، اے سب سے زیادہ حسین شہزادی خدا حافظ۔ یاد رکھ کہ اب بھی میں تیری محبت کا تیر دل میں رکھتا ہوں۔ خیر اگرچہ اب میں تجھے زینت آغوش نہیں بنا سکتا مگر اے دلفریب ملکہ . . . تیری یاد قایم رکھنے کے لئے میں تیری ایک شاخ اپنے تاج میں لگاؤں گا اور ہر وہ انسان جو میری پرستش کرے گا تیری بھی کرے گا۔" یہ کہہ کر اس نے ایک پتلی سی شاخ اپنے تاج میں لگائی۔ کیوپڈ فخریہ ہنسا اور فضا عشق کے غمناک اور دل سوز نغموں سے لرزنے لگی۔

ماخوذ

جاوید قمری

رباعی

[illegible] اٹھا

[illegible] کا افسانہ اٹھا

دینداری [illegible]

اٹھ اٹھ ساقی [illegible]

[illegible] ملیح آبادی

مناظرِ قدرت

ضوفشانی صبحِ خنداں ہے   جلوہ ریزیٔ حسنِ یزداں ہے   کہکشاں ہے کہ اک طلسم راز   ماہِ تاباں کا ہے عجب انداز
لالہ زاروں میں بھی تبسم ہے   آبشاروں میں بھی ترنم ہے   جام پیتا ہوں میں جوانی کا
گلشنوں کی عجب ہے کیفیت   دشت و صحرا ہیں رشکِ جنت   لطف حاصل ہے زندگانی کا
ہے چمن پر بہار کا عالم   کس غضب کا نکھار کا عالم   آتے جاتے ہیں چرخ پہ بادل   گھر کے چھاتے ہیں چرخ پہ بادل
جام پیتا ہوں میں جوانی کا   جوش پر ہے شباب فطرت کا   بج رہا ہے رباب فطرت کا
لطف حاصل ہے زندگانی کا   ننھی ننھی ٹپکتی ہیں بوندیں   سبزیں پر ٹپکتی ہیں بوندیں
منظرِ شام ہے مسرت خیز   ذرہ ذرہ ہے کیف سے لبریز   طائروں کی نوائیں دلکش ہیں   مطربوں کی صدائیں دلکش ہیں
روح پرور شفق کی رنگینی   آسماں نے یہ کی ہے گلچینی   جام پیتا ہوں میں جوانی کا
یہ سماں بھی ہے کس قدر پیارا   دلکشا ہے ہر ایک نظارہ   لطف حاصل ہے زندگانی کا
کیف آور شراب ہستی ہے   روحِ عالم پہ جوشِ مستی ہے   روئے صحرا پہ کیا ہی غازہ ہے   راحت افزا ہوائے تازہ ہے
جام پیتا ہوں میں جوانی کا   رنگ دنیا نیا بدلتی ہے   ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جو چلتی ہے
لطف حاصل ہے زندگانی کا   چشمِ نظارہ بیں کو دعوت ہے   اور دل قلزمِ مسرت ہے
انجمن گرم ہے ستاروں کی   حسنِ فطرت کے رازداروں کی   شکوۂ رنج و غم نہیں باقی   دل میں خارِ الم نہیں باقی
ٹکٹکی باندھ کر جو تکتے ہیں   ساغرِ نور سے چھلکتے ہیں   جام پیتا ہوں میں جوانی کا
ان کی آنکھوں کے جو ستارے ہیں   رات کی زیست کے سہارے ہیں   لطف حاصل ہے زندگانی کا

اندر جیت شرما

کوئل

امروز خدا ساز ازل چھیڑ رہا ہے — فطرت کا ہر اک رازِ نہاں فاش ہوا ہے

ہر ذرہ چمک اٹھا ہے مہتاب کی صورت — کلیوں کے چٹکنے سے چمن جاگ اٹھا ہے

آ دیکھ ہرے پتوں پہ شبنم کا مچلنا — سیماب ہے جو زنگ پہ بے تاب ہوا ہے

شاخِ گل تر جھوم کے کہتی ہے اِدھر دیکھ — منہ کھول کے حیرت سے کلی کہتی ہے کیا ہے؟

تو غنچے کو دیکھے جو پسِ برگ تو کہہ دے — جنت کے دریچے سے خدا جھانک رہا ہے

پانی کی یہ نہریں ہیں کہ ہیں جدول سیمیں — جو صفحۂ اخضر پہ کوئی کھینچ رہا ہے

کس درجہ غم انگیز ہیں کوئل کی صدائیں — یہ دیکھ کے کچھ دل کا عجب حال ہوا ہے

کم بخت کی ہر ہوک مرے دل کی ہم آہنگ! — کم بخت کی ہر کوک مرے دل کی صدا ہے

ظالم کے گلے میں ہے بھری آتش دوزخ — ہر نوحۂ غم اس کا ہلاہل میں بجھا ہے

تعمیر ہے اس عالم کہنہ کی الم سے
اس ساز کا ہر تار ہے پر نوحۂ غم سے

مسعود شاہد

ضرب الامثال کے قصّے

گربہ کشتن روزِ اول

رعب پہلے ہی دن جم سکتا ہے۔ اس کا قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ دو دوستوں نے ایک ساتھ شادی کی۔ اتفاق سے دونوں کی بیویاں بدمزاج نکلیں پہلے ہی روز ایک کی بیوی جب اس کے ساتھ کھانا کھانے دسترخوان پر بیٹھی تو خاوند نے بلّی کو بھاگ جانے کا اشارہ کیا۔ مگر وہ نہ بھاگی۔ اس پر وہ طیش میں آگیا اور اٹھتے ہی بلّی کو ایک وار میں تمام کر دیا بیوی نے خاوند کا مزاج جب اپنے آپ سے بڑھا ہوا پایا تو اس خیال سے کہ کہیں اسی طرح میری شامت بھی نہ آجائے۔ دم بخود رہ گئی۔ دوسرے دوست پر اس کی بیوی شیر تھی۔ ایک روز تنگ آکر اس نے اپنے دوست سے پوچھا کہ تمہاری بیوی کے فرمانبردار ہونے کی کیا وجہ ہے۔ اس نے سب ماجرا کہہ سنایا۔ ترکیب کا پتہ لگتے ہی ان صاحب نے گھر آتے ہی اپنی بلّی کو چلے جانے کا حکم دیا اور حکم عدولی پر گردن اڑا دی۔ مگر اس نسخہ پر عمل کرنے کے بعد بھی ان کی بیوی رام نہ ہوئی اس پر انہوں نے اپنے دوست سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو وہ بولا گربہ کشتن روزِ اول۔

گٹھری اِدھر اور میں اُدھر

یہ مثل ایسے سادہ لوح کے متعلق استعمال کرتے ہیں جس کے منہ سے بے ساختہ ایسی بات نکل جائے جس سے وہ خود ملزم ثابت ہو سکے۔ اس کی ابتدا اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ ایک احمق کو کچھ روپوں کی ضرورت پڑی۔ ہزار سوچا کہ یہ عقدہ کسی طرح حل ہو جائے مگر سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آخر تدبیر سوجھی تو یہ اور صلاح ٹھہری تو یہ کہ آج رات ساتھ کے متمول ہمسایہ کے گھر درمیانی دیوار پر سے کود کر حاجت برآری کی جائے۔ چنانچہ آدھی رات کو یہ صاحب ادھر کود گئے اور خوب قیمتی قیمتی زیورات اور سامان کی ایک گٹھری باندھ لی۔ ابھی کوٹھے پر نہ پہنچے ہوں گے کہ مالک مکان پاؤں کی آہٹ سے جاگ اٹھا اور چور چور کا شور مچانے لگا۔ یہ گٹھری سر پر رکھ کر بھاگے۔ مگر دیوار پھاندتے وقت گٹھری سر پر سے گر گئی۔ یہ خیر ہوئی کہ کسی نے انہیں دیکھ نہیں لیا۔ صرف گری ہوئی گٹھڑی مالک مکان نے اپنے قبضے میں کر لی۔ صبح کو چوری کی تحقیقات کے لئے تھانیدار آیا۔ محلہ کے لوگوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اظہار رائے کر دیا۔ مگر یہ صاحب گویا ہوئے۔ تھانیدار صاحب، میرے خیال میں چور اس بیچ والی دیوار کود کر آیا ہوگا اور اسباب کی گٹھری باندھ کر اسی دیوار پر سے پھاندنا ہی چاہتا ہوگا کہ گھر والے جاگ اُٹھے اس کے آگے یہ کہنا چاہتے تھے کہ کودنے میں گٹھری ادھر گر پڑی اور چور گھبراہٹ میں ادھر کود گیا جو زبان سے نکل گیا "بس جناب گھبراہٹ میں گٹھری اِدھر اور میں اُدھر" تھانیدار نے مسکرا کر کہا۔ ہاں صاحب، ٹھیک فرمایا گٹھری ادھر اور میں اُدھر مگر اب تو آپ بھی آجائیے ادھر۔ یہ کہتے ہوئے تھانیدار نے سپاہی کو اشارہ کیا جس نے اقبالی مجرم کو ہتھکڑی لگا لی۔

کھچڑی کھاتے پہنچا اترتا ہے

اس مثل کے استعمال کا موقع یہ ہے جب نہایت معمولی کام کرتے ہوئے اتفاقاً بڑی تکلیف محسوس کی جائے۔ نازک طبع لوگوں کے لئے یہ مثل عموماً بولی جاتی ہے اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ایک نواب صاحب تھے بڑے پیٹو۔ ان کی ایک وقت کی خوراک پندرہ سیر تھی۔ ایک روز ان کی طبیعت جو علیل ہوئی تو حکیم صاحب نے خوراک میں کھچڑی تجویز کی۔ کھچڑی پکا کر نوکروں نے ایک لگن میں نواب صاحب کے سامنے لا دھری۔ اِدھر اشتہا کا غلبہ تھا۔ فی الفور نواب صاحب نے پہنچے تک اپنا ہاتھ کھچڑی میں ڈال دیا۔ کھچڑی تھی گرم گرم ہاتھ جو جلا تو فوراً کھچڑی سے باہر نکالا پھر بھی کچھ کھچڑی ہاتھ

پر لگی رہ گئی۔ اس کے دور کرنے کے لئے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ تو پہنچا اتر گیا جو آخر کار بڑی مشکل سے اپنی جگہ آیا۔

کہوں تو ماں ماری جائے نہ کہوں باپ کتا کھائے

اس کا مطلب کسی نے فارسی زبان میں یوں ادا کیا ہے۔

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زبان سوزد ٭ وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

مطلب یہ کہ نہ کہہ سکتا ہوں نہ دل میں چھپائے رکھ سکتا ہوں۔ اس کی حکایت ذرا دلچسپ ہے۔ سنا جاتا ہے خاوند اور بیوی میں گھر کے معاملات پر آئے دن تو تو میں میں ہوتی رہتی تھی۔ دونوں کی زندگی سخت تلخ ہو چکی تھی۔ عورت بھی تھی عقل کی پوری آئے دن خاوند کی مار پیٹ سے تنگ آ کر اس کے علاج شافی کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ ہمسائے کی ایک شریف عورت نے اسے بتایا کہ اگر تو خاوند کو کتے کا گوشت پکا کر کھلائے تو تمام عمر تیرا ہاتھ باندھا غلام ہو جائے۔ اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں۔ جھٹ ہمسائی کی وساطت سے ایک کتا منگوا ذبح کر کے خوب مزیدار شوربا پکا لیا گیا۔ میاں صاحب جب دفتر سے تشریف لائے تو حسب دستور ان کے آگے کھانا پیش کیا گیا۔ ساتھ ہی فرزند ارجمند بیٹھا تھا جو باوجود صغر سنی کے ماں کی سب کرتوتوں کو بہ نظر غور دیکھتا رہا تھا۔ برخوردار نے سوچا اگر باپ سے کہوں مت کھاؤ کتے کا گوشت ہے تو والدہ کی شامت آ جائے گی۔ اور اگر چپ رہوں تو میاں جی کتا کھا جائیں گے۔ یہ سوچتا رہا۔ مگر جب اس نور نظر کو اور کوئی راستہ نہ مل سکا تو جو دل میں تھا دبی زبان سے ادا ہونا شروع ہوا۔

"کہوں تو ماں ماری جائے نہ کہوں تو باپ کتا کھائے"۔

والد بزرگوار نے بیٹے کو اس حالت میں پایا تو پوچھا نور چشمی کیا بات ہے جو آج تم بیکل ہو کر ایک ہی رٹ لگا رہے ہو۔ صاحبزادے نے تمام ماجرا کہہ سنایا۔ ہم اب یہ ناظرین کے تخیل پر چھوڑتے ہیں کہ آگے بیوی کے ساتھ کیا بیتی۔

چور کی داڑھی میں تنکا

کہتے ہیں ایک گاؤں میں ایک چوری کی واردات ہوئی صبح کو نمبردار نے تمام مشتبہ آدمیوں کو جمع کیا جن میں اتفاق سے چور بھی تھا۔ اب نمبردار بولا دیکھو چور کی داڑھی میں تنکا نظر آئے گا اصل میں جو چور تھا اس نے اس خیال سے کہ تنکا ہوا تو میری ہی داڑھی میں ہو گا اپنی داڑھی کو ہاتھ لگایا۔ نمبردار نے فی الفور اسے گرفتار کروا دیا۔

ٹیڑھی کھیر سے مراد مشکل کام ہوا کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی ایک اندھے سے ایک شخص نے پوچھا حافظ جی! کھیر کھاؤ گے۔ نابینا نے دریافت کیا۔ کھیر کیسی ہوتی ہے جواب ملا سفید سفید۔ اندھے نے پوچھا سفید کیسی! اس نے کہا جیسے بگلا۔ اندھے نے مکرر پوچھا بگلا کیسے ہوتا ہے تو ظریف طبع شخص نے ہاتھ ٹیڑھا کر کے بتایا کہ ایسا۔ حافظ جی اپنے اپنے ہاتھ سے اس کے ہاتھ کو ٹٹول کر کہا یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے ہم سے نہیں کھائی جائے گی۔

غت ربود کرنا

یعنی مطلب خبط کرنا۔ ایک بے وقوف بوستان پڑھ رہا تھا۔ جب سعدی کے اس شعر پر پہنچا ؎

کہ سعدی کہ گوئے بلاغت ربود ٭ در ایام بوبکر بن سعد بود

تو اپنے استاد سے دریافت کیا کہ غت ربود کے کیا معنی ہوئے۔ لفظ بلاغت میں سے بلا کو جدا کر کے غت کو ربود سے ملا کر غت ربود بنا دیا۔

ناؤ میں خاک اڑانا

یہ بھی ایک محاورہ ہے جس کا مطلب ہے جھوٹا الزام لگانا کہتے ہیں۔

ایک شیر اور بکری دونوں ایک کشتی میں سوار تھے۔ شیر نے بکری کو ہڑپ کرنے کے ارادے سے کہا تو یہاں کیوں خاک اڑا رہی ہے بکری نے جواب دیا۔ حضور یہاں کشتی میں خاک کہاں جسے اڑاؤں۔ شیر نے کہا اچھا تو میری بات کو جھٹلاتی ہے ٹھیر تجھے مزہ چکھاتا ہوں"۔ یہ کہہ کر شیر بکری کو ہڑپ کر گیا۔

سید عباس بخاری پشاوری



غزل

سلامت اگر عشقِ ایذا طلب ہے | یہی رنج دائم رہے گا جو اب ہے

بجا! خواہشِ دید بیجا ہے لیکن | جو ہم جانتے ہیں وہ ہونا بھی کب ہے

تغافل تجاہل سے آتا ہے عاجز | مرا کچھ نہ کہنا بھی حسنِ طلب ہے

مجھے دیکھ کر مسکرا دینے والے | محبت مسبب، محبت سبب ہے

تنعم۔ تبسم۔ تکلم۔ ترنم۔ | محبت! محبت کی دنیا عجب ہے

وہی ہم وہی اضطرابِ جدائی | سکونِ تمنا نہ جب تھا نہ اب ہے

یہی اختیاراتِ ہستی ہیں یارب؟ | نہ مرنے پہ قدرت نہ جینے کا ڈھب ہے

اٹھاتا ہوں روئے حقیقت سے پردہ
مری شاعری شاد جانِ ادب ہے

شاد عارفی

رباعیات

(۱)

اردو نے کہا گلشن حالی ہوں میں
ہندی نے کہا پھولوں کی ڈالی ہوں میں
یوپی نے سنا اور کہا اے اکبر
پنجاب ہنسا اور کہا اے اکبر
حق یہ ہے کہ اس باغ کا مالی ہوں میں

(۲)

تو بغض کی آتش ہی کو ہوا دیتی ہے
تو زنگ کو آئینوں سے کھو دیتی ہے
اے زمزمہ سنج فن میں تو ترا قائل ہوں
تو تیغ و تبر ہمن کو سمو دیتی ہے

(۳)

سچ ہے کہ ہے اردو کی سہیلی ہندی
ساتھ اس کے ہمیشہ سے ہے کھیلی ہندی
کس طرح نہ ہو اس سے زیادہ بھی
اردو سے [illegible] سے کھیلی ہندی

(۴)

دنیا سے تو عیب اپنے چھپا لیتا ہوں
باتیں بھی محاسب سے بنا لیتا ہوں
پڑتی ہے میری ہی اپنی نظر جب مجھ پر
آنکھ اپنی ندامت سے جھکا لیتا ہوں

اخگر مرادآبادی

دنیائے ادب

اردو زبان کی وسعت اور ہمہ گیری

(لکھنؤ سکول کا نقطۂ نظر)

ابتدا، وسعت، ہمہ گیری | ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے آغاز سے لے کر غدر ۱۸۵۷ء تک دفاتر سرکاری میں فارسی بحیثیت زبان عدالت و حکومت بدستور رائج رہی۔ قوانین فارسی زبان میں تھے۔ فرامین و احکام فارسی میں جاری ہوتے تھے۔ انگریز حکام جو ہندوستان بھیجے جاتے تھے فارسی داں ہوتے تھے اور مقدمات کی تجاویز فارسی زبان میں لکھا کرتے تھے۔ اگر ایک طرف سنسکرت اور ہندی بھاشا کا دور دورہ تھا تو اس کے ساتھ دوسری طرف عربی اور فارسی کا بھی عام رواج تھا ہندو حضرات میں ایک سے ایک قابل اور یکتائے روزگار فارسی داں موجود تھے مسلمانوں میں بھی کوئی ایسا نہ تھا جسے ہندی بھاشا سے بیگانگی ہو۔ ہندوؤں میں بڑے بڑے قابل فخر فارسی ادیب اور مشاہیر پیدا ہوئے اور نام و نمود کے علاوہ شاہی دربار میں معزز اور ممتاز عہدوں پر سرفراز ہوتے رہے مسلمانوں میں ہندی بھاشا میں کمال لازوال اور شہرت حاصل کرنے والے بھی معدوم نہ تھے۔

مسلمان فاتحین کی زبان مادری فارسی تھی۔ اسلامی فوج کی زبان مادری فارسی تھی۔ اردو کے معنی فوج یا لشکر ہیں۔ فوجی بازار کا نام اردو بازار تھا۔ آپ کے مشاہدے میں بارہا آچکا ہوگا کہ ہندوستانی تجارت پیشہ اور کاروباری افراد جنہیں گوروں کی فوج سے معاملت کا موقع حاصل ہوتا ہے اگرچہ وہ ایک حرف بھی انگریزی نہیں جانتے مگر کسی نہ کسی طرح کچھ انگریزی کچھ اردو الفاظ ملا کر اپنا مفہوم ادا کرلے جاتے ہیں۔ طالب العلمی کے زمانے میں اپنے کانوں سنا ہوا ایک امرود فروش اور ایک فوجی گورے کے مکالمے کا ایک فقرہ مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ جو امرود فروش نے آخر دق ہو کر کہہ دیا تھا۔

"کھوسی ہونہ Take کھوسی ہو۔ Two Pice I Take" TAKE اسی قبیل کے مخلوط اور بے ربط مکالمے اردو زبان کی تعمیر کے سنگِ بنیاد تھے جو فارسی اور ہندی بھاشا کے اختلاط سے عالم وجود میں آئے تھے۔ لیکن اس سے کیا نتیجہ اخذ ہوتا ہے؟ خریداروں کی زبان فارسی تھی۔ سودا بیچنے والوں کی زبان ہندی بھاشا تھی، ہندی بھاشا کو فارسی کے ساتھ مخلوط کر کے بولنے والا کون تھا؟ بلاشبہ ہندو۔ آخر نتیجہ یہی نکلا کہ اردو ہندوؤں کی زبان ہے نہ کہ مسلمانوں کی۔ اسی مخلوط زبان کا نام اردو یعنی افواج سے گفتگو کرنے کی زبان رکھا گیا اور آگے چل کر ہندو مسلمانوں کی مشترکہ مساعی جمیلہ سے اردو زبان بن گئی جو آج ہم آپ سب بولتے، لکھتے پڑھتے، اور سمجھتے ہیں۔

دنیا کی آبادی کا ہر حصہ جہاں ہندوستانی پہنچ گئے ہیں وہاں اُن کے ساتھ ہی ساتھ اردو زبان بھی گئی ہے۔ آپ لندن جائیں یا پیرس یا چین، جاپان، آسٹریلیا کی سیر کریں، ہر جگہ آپ کو کوئی نہ کوئی حصہ آبادی کا ایسا ضرور مل جائے گا جو یا تو اردو بول اور سمجھ سکتا ہوگا یا کم سے کم سمجھ ہی سکتا ہوگا۔ انگلستان۔ امریکہ اور فرانس میں اردو والوں کے مقابل میں فارسی دانوں کی تعداد بدرجہا کم نظر آئے گی۔ ایران اور افغانستان سے قطعِ نظر کر کے جہاں اول الذکر ملک میں سارے ملک کی زبان فارسی ہے اور آخر الذکر میں اعلیٰ اور تعلیم یافتہ طبقے کی زبان فارسی ہے۔ بقیہ اسلامی ممالک، سلطنت عثمانیہ، عرب، مصر، میں فارسی کا رواج کم و بیش بدرجہ مساوی ہے یعنی کم سے کم ہے۔ بقیہ ساری دنیا کا اوسط لینے پر فارسی کے مقابلے میں کچھ عجب نہیں اگر اردو کا رواج زیادہ ثابت ہو سکے۔

اردو زبان کی ہمہ گیری کا تھوڑا بہت اندازہ اس سے بھی کیا جا سکے گا

کہ ابتدائے حکومت انگلشیہ سے آج تک کتنے اردو الفاظ انگریزی زبان میں داخل ہو کر جزو زبان بن چکے ہیں اور کتنے انگریزی الفاظ اردو زبان نے جذب کر لئے ہیں، جیسے

آبکاری۔ آہار (ahar) آیا۔ بابو۔ بہادر۔ بھتّا (Batta) بنگلا BUNGALOW کباب Cabab بیگم Begam بگھی Buggy کاروان Carvan عرق Arack جنگل Jungle

سیکڑوں انگریزی الفاظ تقریباً اپنی اصلی ہیئت میں اردو زبان میں موجود ہیں جو اردو زبان کا جزو بن چکے ہیں۔ مثلاً:۔

کلکٹر۔ کمشنر۔ اسسٹنٹ۔ ڈپٹی کلکٹر۔ ہیڈ کلرک۔ پولیس۔ انسپکٹر۔ میجر۔ سارجنٹ۔ جنرل۔ ڈرائیور۔ موٹر کار۔ لاری۔ سول سرجن۔ کمپاؤنڈر۔ پرسنل اسسٹنٹ۔ کمانڈر ان چیف۔ گورنر۔ وائسرائے سول سروس۔ ریلوے۔ ٹائپ رائٹر۔ گراموفون۔ ریکارڈ۔ سینما۔ لکچر۔ رسٹ واچ۔ کلاک۔ بریک۔ جج۔ فاؤنٹین پن۔ بٹن۔ نب۔ ہک۔ انجینئر۔ ہائی کورٹ۔ چیف کورٹ۔ پریوی کونسل۔ اپیل۔ ٹکٹ۔ سائنس۔ سول لسٹ۔ سائن بورڈ۔ گزٹ۔ گارڈ۔ پارسل۔ سرکلر۔ بائیسکل۔

اسی طرح سیکڑوں انگریزی الفاظ بدلی ہوئی صورت میں داخل زبان ہو چکے ہیں۔ مثلاً کپتان۔ لفٹنٹ۔ کرنیل۔ جرنیل۔ کارتوس[1]۔ لالٹین۔ الپین[2]۔ پارلیمنٹ۔ کمان افسر۔ بسکٹ۔ ٹماٹر۔ سانجن۔ فری پان۔ ربڑ۔ تارپیڈو۔ اردلی۔ واسکٹ۔ باڈی Bodice وغیرہ۔

انگریزی الفاظ کا اردو ترجمہ ہو کر بہت سے الفاظ داخل زبان ہوئے ہیں۔ مثلاً مقیاس الحرارت، Thermometer آبدوز کشتی، Submarine طیارہ Aeroship کلدار توپ Machine Gun رکن، Member جارحانہ اور دفاعی حملے Offensive Defensive warfare بھک سے اڑ جانے والا مادہ، Explosive رائے Vote آتشگیر مادہ Inflamable

اسیر جنگ Prisoner of War مشقت تعزیری بحالت قید Penal servitude فوجی قسم، اقرار صالح Parole آلہ نشر الصوت، Radio set قرطاس ابیض، White Paper خوردبین Microscope دوربین، Telescope

کہا جاتا ہے کہ انگریزی، فارسی، عربی، ہندی بھاشا کے الفاظ بکثرت داخل کر لینے سے اردو زبان میں وسعت پیدا ہو جائے گی اور زبان ترقی کرے گی۔ ایک حد تک یہ خیال صحیح ثابت ہو سکتا ہے، بشرطیکہ توازن اور مذاق صحیح کی روشنی آغاز سے انجام تک ہماری راہ نما رہ سکے۔ ہر مہذب قوم اور ملک نے زبان کی ترقی کو قومی ترقی کا پیش خیمہ تسلیم کیا ہے اور اس کام کی اہمیت کا صحیح انداز کر کے قوم اور ملک کے بہترین تربیت یافتہ دماغوں کی متحدہ قوت سے کام لیا ہے۔ ہر غیر ذمہ دار اور بے شعور شخص یا ایسے دو چار، سو پچاس افراد کو سادہ چک دے دینے سے یہ کام کبھی نہیں بن سکتا بلکہ بگڑ جائے گا۔ مذاق صحیح، کہنے کو تو ایک لفظ ہے مگر سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ اس کوزے میں دریا بند ہے۔ ظاہر ہے کہ جو کام ہمارے بہترین دماغوں کی متحدہ قوت سے کئے جانے کا ہے وہ کسی شخص واحد یا چند اوسط درجے کی معلومات رکھنے والے افراد کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہی ایک نکتہ ہے جو غور کرنے کے قابل ہے اور جس پر کافی توجہ نہیں کی جاتی۔

اسی طرح رائے ظاہر کی جاتی ہے کہ اردو زبان میں سلیس، سادہ عام فہم، روزمرہ کے الفاظ استعمال کئے جایا کریں۔ ہر سمجھ دار شخص تسلیم کرے گا کہ روزمرہ کی گفتگو اور خط و کتابت میں واقعی ایسے ہی الفاظ کا استعمال ہنر ہے اور اس کے برعکس ثقیل اور مشکل الفاظ کا استعمال جس طرح انگریزی یا فارسی زبان میں داخل عیب ہے اسی طرح اردو میں بھی ہے۔ مثال کے طور پر ایک سچا واقعہ عرض کروں گا۔

ایک عالم صاحب کا کمسن چھوٹا بھائی کئی روز سے بخار میں مبتلا

---

[1] یہ انگریزی نہیں ہے بلکہ ان لفظوں میں سے ہے جو ہمیں سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں فرانسیسیوں یا اس سے بھی پہلے پرتگالیوں سے ہاتھ آئے تھے۔ فرانسیسی Cartouche (تلفظ، کارتوش، معروف و کے ساتھ) تھا جس کے "ش" کو ہندوستانی سپاہیوں نے "س" کر دیا۔ اسی طرح فرانسیسی Commandant (تلفظ، کوماں داں) ہمارے ہاں "کمیدان" ہوا اور فرانسیسی Bouton (تلفظ، بُوتوں، پہلا و معروف، دوسرا مجہول) ہمارا "بوتام" ہو گیا۔ انگریزی لفظوں "کمان ڈنت" اور "بٹن" سے "کمیدان" اور "بوتام" کو کوئی واسطہ نہیں۔ (ادارہ)

[2] یہ لفظ پرتگالی Alfinete سے ہے۔ انگریزی Pin سے اسے تعلق نہیں۔ (ادارہ)

تھا۔ مریض کی والدہ تیمارداری میں مصروف تھیں۔ مریض نے پانی مانگا۔ پٹی کے پاس لوٹا رکھا ہوا تھا۔ بڑی بیگم نے پانی انڈیل کر پیش کرنا چاہا۔ عالم صاحب گھبرا کر چلا اُٹھے۔

"تپ کی حالت میں استعمال مار بارد کا اطبا کے نزدیک ممنوع ہے۔" بیگم حیران تھیں کہ کیا کہا گیا۔ حسن اتفاق سے عالم صاحب کے دوسرے بھائی وہیں موجود تھے۔ سمجھا دیا کہ بخار میں ٹھنڈا پانی منع ہے اور یہ واقعہ ایک قہقہے پر ختم ہو گیا۔

سلیس اردو نظم نے زمانۂ حال میں دو بیش بہا اور لافانی کارنامے دنیائے ادب میں پیش کئے ہیں۔ پہلی چیز جناب آرزو کی خالص اردو شاعری ہے اور دوسری جناب شوق قدوائی مرحوم کی بے اضافت نظم "عالم خیال" ہے ان دونوں کارناموں پر اردو زبان جتنا فخر کرے کم ہے

دراصل شدید ضرورت اس امر کی ہے کہ بول چال، خط و کتابت قصے کہانیاں، ناول اور افسانے دونوں زبانوں اردو اور ہندی میں ایسی آسان اور سادہ عبارت میں لکھے جائیں کہ بے تکلف محض صورت الفاظ بدل دینے سے اردو دوشیزہ کے جامہ زیب قد و قامت پر ہندی حروف کا لباس موزوں اور دلکش نظر آئے اور ہندی معشوقہ کی ناز آفرینی پر اردو الفاظ کا جامہ بار خاطر نہ ہو۔ لیکن یہ انتہائی حد ہے جس سے آگے قدم رکھنا اگر غیر ممکن نہیں تو سخت دشوار ضرور ہے۔ مثال کے طور پر انگریزی، فارسی، عربی، سنسکرت زبانوں سے علمی کتابوں کے ترجمہ کرنے کے کام پر نظر ڈالئے۔ فلسفہ، طب، منطق، علم اقتصاد، نجوم، ریاضی، وغیرہ علوم کی مستند کتابوں کے ترجمے پیش نظر فرمائیے۔ میں بلا خوف تردید عرض کر سکتا ہوں کہ اس میدان میں نہ خالص سلیس عام فہم اردو کے ذخیرے میں ایسے الفاظ کا ملنا ممکن ہے اور نہ خالص ہندی کے ذخیرے میں۔ مجبوراً ہندی کو مشکل پسند بھاشا اور سنسکرت سے مدد لینا پڑے گی اور اردو کو فارسی عربی سے۔ اور یہ موقع شکایت کا بھی نہیں ہو سکتا۔ عوام الناس بے علم یا کم علم طبقے کو ان علوم سے کوئی سروکار نہ کبھی تھا نہ آج ہے، اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔ یہ اہل علم کے کام کی چیزیں ہیں اور وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ مشکل پسندی بے ضرورت اور عمداً نہیں روا رکھی گئی، بلکہ ہم مجبور تھے، اور سوا اس صورت کے کوئی دوسرا چارۂ کار تھا ہی نہیں۔

نظر بحالات موجودہ زبان کی ترقی، ترویج، اور اشاعت کے ذرائع شعبہ جات ذیل کی ہم آہنگی اور اتحاد عمل پر تمام تر موقوف ہیں۔

(۱) علمی مرکز کا صحیح انتخاب اور اُس کا اتباع۔
(۲) مدارس، اسکول، کالج، یونیورسٹیاں۔
(۳) کتابیں جن میں تالیفات و تصنیفات نظم و نثر شامل ہیں۔
(۴) میگزین، اخبار۔
(۵) ریڈنگ روم اور کتب خانے۔
(۶) اکیڈمی۔
(۷) علمی انجمنیں، کانفرنسیں، بڑی بڑی قومی اور ملکی مجالس۔
(۸) مشاعرے۔
(۹) مسلسل، باقاعدہ، بے لوث تنقید۔

ان تمام شعبوں کی جان علمی مرکز، اس کا صحیح انتخاب اور کامل اتباع ہے۔

مشکلات: اگرچہ ولی دکنی اردو شاعری کے چاسر تھے لیکن بلاشبہ اردو کی جائے پیدائش دہلی تھی۔ اردو دہلی میں پیدا ہوئی اور وہیں ہوش سنبھالا لیکن اس کا شباب اُس کی جوانی اس کی ترقی اُس کی نشوونما لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ اس اجمال کی تفصیل آگے عرض کروں گا۔ یہاں اسی قدر عرض کرنا کافی ہے کہ اردو ممالک متحدہ کے ہندو مسلمانوں کی مادری زبان ہے اور جتنی صاف صحیح اور شستہ اردو اس صوبے میں رائج ہے ہندوستان کے کسی دوسرے حصے میں نہیں ہے۔ خواہ وہ دہلی ہو یا پنجاب یا حیدرآباد دکن۔ ہندوستان کا ملک، ملک نہیں ایک براعظم ہے۔ ایسی حالت میں کچھ عجب نہیں اگر ہر صوبے بلکہ جزو صوبہ کا لب و لہجہ ایک دوسرے سے مختلف ہو، زبان اور طرز ادا میں فرق ہو۔ ان حالات کے اندر شدید ضرورت اس امر کی ہے کہ زبان کو اپنی اصلی صورت میں قایم رکھنے اور سارے ملک میں اتحاد عمل جاری رکھنے کے لئے ہم ایک صحیح اور بہترین علمی مرکز تجویز کرلیں اور جو مرکزی حیثیت ادبی اعتبار سے انگلستان میں آکسفورڈ کو حاصل ہے وہی حیثیت ہمارے منتخب کردہ مرکز کو حاصل ہو جائے اگر ہم یہ نہ کریں گے تو اس کا نتیجہ انتشار ہوگا، اور اردو زبان کے لئے سم قاتل ہوگا۔ پنجابی اردو، حیدرآبادی اردو کا حال دیکھئے اور غور فرمائیے کہ آخر اُس کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ ہمیں مرکز کے انتخاب میں زیادہ زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ قدرت نے لکھنؤ کو پہلے ہی سے اردو زبان

کا مرکز بنا رکھا ہے۔ ہمارا کام محض اتنا ہی ہے کہ زبان اور محاورے کے معاملے میں لکھنؤ کا اتباع اختیار کرلیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو پنجابی اردو پنجاب سے نکلے گی۔ حیدرآبادی اردو حیدرآباد سے اور دہلی کی اردو دہلی سے اور ایک زندہ اور ترقی کرنے والی زبان کے لئے جس ہم آہنگی اور یکسانی کی ضرورت شدید ہے وہ ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے جاتی رہے گی، اور زبان کی نام نہاد ترقی دراصل زبان کا تنزل ثابت ہوگی۔

ہمیں واقعات کی روشنی میں اس اہم مسئلے پر نظر ڈالنا ہے اور واقعات یہ ہیں۔

مشکلات اور ان کا علاج | اس میں شک نہیں کہ اردو کی تمام ابتدائی نشو ونما دہلی میں ہوئی اور دہلی کے آخری اسلامی تاجدار بہادر شاہ "ظفر" کی سلطنت کا خاتمہ دراصل دہلی میں اردو زبان کی ترقی کا خاتمہ تھا۔ دہلی پر زوال آیا۔ لکھنؤ کی ترقی کا ستارہ آسمان اقبال پر طلوع ہوا۔ شاہان اودھ کی غربا پروری عدل گستری، سیر چشمی، فیاضی، سخاوت، علم دوستی، ادب نوازی کا شہرہ دور دراز تک پہنچا۔ دہلی کے باکمال مشاہیر، ہر علم ہر فن کے اساتذہ جوق در جوق لکھنؤ آنا شروع ہوگئے۔ دہلی اجڑ گئی لکھنؤ بس گیا۔

لکھنؤ پہنچ کر اردو زبان نے دن دونی رات چوگنی ترقی شروع کر دی۔ حتیٰ کہ مرحوم بہادر شاہ کے زمانے کی اردو اور آج کی اردو میں جتنا بین فرق ہے اہل نظر پر روشن ہے۔ بدقسمتی سے دہلی والے اپنی اسی پرانی کرم خوردہ "قلعۂ دہلی" کی زبان کے دائرے کے اندر مقید رہ گئے۔ انہوں نے اس طلسمی حصار کے باہر قدم رکھنا کفر سمجھا ہمیشہ اپنی زبان کو مستند زبان سمجھتے رہے اور آج بھی یہی سمجھ رہے ہیں۔

وہ آنکھیں کھول کر دیکھنا پسند نہیں کرتے کہ زمانہ حال کی مروجہ انگریزی ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کی انگریزی سے کتنی مختلف ہے۔ وہ سننا نہیں پسند کرتے کہ اٹلی میں لاطینی زبان کی جگہ مروجہ اطالینی زبان نے لے لی ہے۔ وہ نہیں سوچتے کہ گلستان بوستان والی فارسی اب ایران میں نہ کوئی لکھتا ہے، نہ بولتا ہے، نہ سمجھنا چاہتا ہے۔ کیا اردو بھی کوئی مردہ زبان تھی جو کم وبیش ایک صدی گزر جانے پر بھی قلعۂ معلی کی بوسیدہ چار دیواری کے اندر قیامت تک مقید رہتی اور ایک قدم بھی آگے نہ بڑھتی! آخر کس ناقابل معافی جرم کی پاداش میں اس کے لیے یہ حبس دوام کی سزا تجویز فرمائی گئی تھی؟

لکھنؤ اسکول نے شاہراہ ترقی پر گھڑ دوڑ شروع کی۔ دہلی نے اس دوڑ میں کوئی حصہ نہیں لیا اور اُسی قدیم حصار، قلعۂ معلی کی حدود کے اندر اطمینان سے بیٹھ کر پرانی لکیر پیٹتی رہی اور آج اُسے یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوا کہ دہلی کو اب تک خبر بھی نہیں ہے کہ بیسویں صدی اپنا پہلا ربع ختم کر کے دوسرے ربع کی گیارھویں منزل پر بسرعت تمام گامزن ہے حتیٰ کہ یکم جنوری ۱۹۳۷ء سے اس دوسرے ربع کی بارھویں منزل میں قدم رکھ چکی ہے۔ مگر اہل دہلی ابھی تک اسی پرانی انیسویں صدی کی تقویم پارینہ کے پرستار ہیں اور اپنے زعم باطل میں نہ محض ادیب بلکہ دنیائے ادب کے رہبر، مقتدی، ہادی اور پیشوا امام بنے بیٹھے رہ گئے اور آج دہلی اسکول کی زبان کو لکھنؤ اسکول کی زبان سے وہی نسبت ہے جو ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے زمانے کی انگریزی کو شاہ جارج ششم کے زمانے کی انگریزی سے نسبت ہے یا جو نسبت سعدی شیرازی کے زمانے کی فارسی کو رضا شاہ پہلوی کے زمانے کی فارسی سے ہے[1] کاش مجھے کافی وقت ملا ہوتا اور میں اس اجمال کی تفصیل کرسکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ دہلی اسکول نے مطلق ترقی نہیں کی۔ اُس نے زمانے کا ساتھ چھوڑا۔ زمانے نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ فطرت کا اٹل قانون ہے کہ قوی ترین، مستعد ترین، تندرست ترین ہستی زندہ رہ سکتی ہے جو ہستی اس شدید ترین معیار کی رفعت تک پہنچنے کے قابل ثابت نہ ہوگی اُسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ دہلی کی زبان اس قانون کی زد کے اندر آگئی تھی۔ زمانے نے اِس زبان کو مردہ زبانوں کی فہرست میں داخل کر دیا۔ دہلی کے نصیب میں پھر دار الحکومت بننا تھا۔ وہ پھر ہندوستان کا پایۂ تخت بنی۔ تجارتی منڈی تو تھی ہی۔ تجارت کو اور بھی فروغ ہوا۔ تجارت اپنے ساتھ ساتھ تجارت پیشہ افراد کی ایک مخلوط فوج لائی جس نے دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ دہلی اس کثیر التعداد فوج کا مقابلہ کیوں کر کر سکتی تھی۔ ایک مدت مدید تک محصور رہی۔ لیکن تا بکے؟ اُس کے تمام ترضروریات زندگی پر محاصرین قابض تھے اور وہ اُن کی محتاج تھی۔ آخر اُسے ہتھیار ڈالنا پڑے اور آج یہ صورت حال ہے کہ اگر آپ چاندنی چوک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ایک دکان کا جائزہ لینا شروع کر دیں

---

[1] یہ مسئلہ اس آسانی سے طے ہوتے نظر نہیں آتا۔ اس ساری تقریر میں جہاں جہاں دہلی کا نام ہے، وہاں لاہور اور حیدرآباد والے دہلی کے ساتھ لکھنؤ کا نام شامل کر کے اسے اپنے دعوے کی دلیل بنائیں گے۔ (ادارہ)

تو آپ دیکھیں گے کہ اس مخلوط مردم شماری میں کم و بیش نصف تو نیم تعلیم یافتہ اہلِ پنجاب ہیں اور باقی نصف میں ممالک متحدہ کے مختلف شہروں اور دیہاتوں کے قریب قریب جاہل حرف شناس قابض ہیں اور سڑکوں کا بھی یہی حال ہے۔ سڑکوں کے بعد شہر کے اندر کی آبادی میں بھی علیٰ ہذا القیاس انہیں دکانداروں کے مسکن ہیں۔ خالص دہلی کے قدیم باشندے اس مخلوط آبادی کے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہیں جو نمک کو دال کے ساتھ یا سفیدی کو ہرے ماش کے ساتھ ہو سکتی ہے اور آج جس کا نام دہلی کی زبان ہے، اسی مخلوط آبادی کی زبان ہے۔ میں نہیں کہتا کہ دہلی میں زبان داں نہیں ہیں، لیکن جو حضرات اہلِ زبان کہے جاتے ہیں ان کی زبان آخر کتنی مدت تک صحیح اور درست رہ سکتی ہے جب دن رات ان کے کانوں میں غلط اور بے محاورہ زبان گونجتی رہتی ہو۔ مسٹر اسٹد آنجہانی نے جو اپنے زمانے کے ممتاز ترین ادیب اور انگلستان کے مایۂ ناز مشاہیر میں تھے، آج سے کم و بیش چالیس برس پہلے اپنے شہرۂ آفاق "ریویو آف ریویوز" میں فریاد کی تھی کہ اب عمائدِ لندن ایسی انگریزی بولنا شروع کر رہے ہیں جیسے گورے حبشیوں کی زبان کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ان کا نوحہ تھا کہ بے شمار غیر ملکی افراد لندن میں ہمہ وقت موجود رہتے ہیں اور اُن کی غلط اور بے محاورہ زبان دن رات ہمارے دل و دماغ کا محاصرہ کئے رہتی ہے، حتیٰ کہ جو زبان ہم ہر وقت سنتے رہتے ہیں رفتہ رفتہ وہی ہم بھی بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ قیاسات نہیں ہیں، واقعات ہیں۔ انسانی فطرت جو لندن میں کارفرما ہے دہلی میں بھی ہے۔ اگر لندن کی زبان گورے حبشیوں کی تھی تو ہر شخص جسے شعور ہے اور جسے اللہ نے مذاقِ صحیح عطا فرمایا ہے آنکھیں کھول کے دیکھ سکتا ہے کہ زمانۂ حال کی دہلی کی زبان کالے حبشیوں کی زبان ہے! کاش مجھے کافی وقت ملا ہوتا اور مشاہیرِ دہلی کی مطبوعہ تحریرات کے نمونے اپنے دعوے کی دلیل میں پیش کر سکتا۔

اِن حالات کے اندر کون امید رکھ سکتا ہے کہ متبعین دہلی کی زبان لکھنؤ کے مستند اہلِ زبان کے دربار میں شرفِ قبولیت حاصل کر سکتی ہے۔ متبعین دہلی نے اُسی زبان میں نظم و نثر لکھنا اختیار کر دیا جو زمانۂ حال کی مروجہ اور ترقی یافتہ زبان سے بالکل مختلف تھی۔ شعرا نے فخریہ اپنا کلام داد پانے کے شوق میں پیش کیا۔ مولانا اودھ پنچ نے جائزہ لینا شروع کر دیا۔ سچی بات ہمیشہ کڑوی ہوتی ہے۔ اختلاف پیدا ہوا۔ اختلاف نے ترقی کر کے بغض و عناد کی خبیث صورت اختیار کی اور بیرونجات کے ناواقف شعرا کی، جو زبان اور محاورے سے اجنبی تھے، ایک مخالف پارٹی تیار ہو گئی جسے لکھنؤ کی زبان، لکھنؤ کی شاعری، اور لکھنؤ سے بغضِ للہی پیدا ہو گیا ہے اور جو جا و بے جا برمحل اور بے محل آفتاب پر خاک ڈالنے کی سعیِ لاحاصل میں منہمک ہو رہی ہے۔ یہ پہلی مشکل ہے۔

دوسری مشکل یہ ہے کہ ٹکسٹ بک کیٹیاں درسی کتابوں کے انتخاب میں سخت بے پروائی سے کام لے رہی ہیں۔ اور کتب مشروطۂ امتحان رائج الوقت میں سے شاید ہی کوئی ایسی اردو کتاب دستیاب ہو سکے جو عیوب اور نقائص سے پاک اور ہر صورت میں قابلِ سند ہو۔ وجہ یہ ہے کہ طریقِ انتخاب غلط ہے۔ پبلشر پر سارا دارومدار رکھ دیا گیا ہے۔ پبلشر عموماً زبان اور ادب کے معاملے میں مذاقِ صحیح نہیں رکھتے۔ محض ایک ہی مقصد اُن کے پیشِ نظر ہو سکتا ہے اور ہے، یعنی روپیہ کمانا۔ وہ کسی نہ کسی بازاری آدمی کو پکڑ لاتے ہیں جو اردو میں تھوڑی بہت شدبد رکھتا ہو۔ یہ شخص اپنی، اپنے عزیزوں، اپنے دوستوں کی بے مغز بکواس منتخب کر کے پیش کر دیتا ہے یا خود مذاقِ صحیح سے اجنبی محض ہونے کی وجہ سے کانٹ چھانٹ کرا نے آپ کو پانچوں سواروں میں داخل کر لیتا ہے۔ جب تک پبلشروں کے ہاتھ میں انتخاب کی کل ہے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ اونٹ کس کل بیٹھے گا۔ فقیر کے نزدیک اصلاح کی بہترین صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ٹکسٹ بک کیمیٹی میں ایسے لوگ شامل کئے جائیں جو اردو زبان میں نیک و بد کی بخوبی تمام تمیز کر سکتے ہوں، اور بجائے ایک نیم تربیت یافتہ پبلشر کے چند مستند ادیب حضرات کی کمیٹی بنادی جائے جو انتخاب کیا کرے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کمیٹی کا ہر سال نیا انتخاب ہوا کرے۔

تیسری مشکل جو اردو کی ترقی میں سدِّ راہ ہے وہ اسکول اور کالجوں کے لئے اساتذہ اردو کے قواعدِ انتخاب ہیں۔

کالجوں کے لئے اردو کی ایم اے کی ڈگری لکچرار کے عہدے کے لئے پروانۂ راہ داری ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اگر ان طلبہ کو علمی تحقیقات در یسرچ، کی قرار واقعی تربیت دی جائے تو نہایت بیش قیمت سمجھی جا سکتی ہے، لیکن کتنے طلبہ کو ایسی مکمل تربیت دی جاتی ہے؟ اور کب اور کہاں دی جاتی ہے! تھوڑی دیر کے لئے ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ دی جاتی ہے۔ بہت بہتر، مگر ذرا غور تو فرمائیے کہ جو شخص زبان اور ادب میں بالکل ہی کورا ہو، جو مذاقِ صحیح سے کوسوں دور ہو ایسے شخص کو ایسی تعلیم کہاں تک اور کس حد تک فائدہ پہنچا سکتی ہے؟ اور وہ اپنے تلامذہ کو بامِ ہوش کے

کس کنگرے تک پہنچ سکے گا؟ عقل کی بات تو یہ تھی کہ بجائے ایم اے کی ڈگری
کے اردو زبان کی مسلمہ استعداد کی شرط رکھی جاتی اور اسی کے ساتھ انگریزی
استعداد بھی مشروط رہتی۔ اردو ایم اے نہ تو اردو ہی جانتا ہے نہ انگریزی
ہی۔ اس کی ساری کائنات اس کا ڈپلوما اور گون ہے۔ نہ وہ انگریزی میں
کوئی اعلیٰ درجے کا مضمون لکھ سکتا ہے نہ اردو ہی میں۔ وہ اردو دانوں کی
صحبت میں انگریزی دانی کی اور انگریزی دانوں کی صحبت میں اردو دانی کی
داد پا جاتا ہے اور یہی اس کی روح کی غذا ہے۔

اس کے علاوہ جو لوگ زبان اردو سے اجنبی اور نابلد محض ہیں
اُن کا ایک عام حیلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زبان دہلی جانتے ہیں جس کے معنی
دوسرے الفاظ میں صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ وہ اردو جانتے ہی نہیں۔
اساتذہ کے انتخاب میں نہایت ضروری امر یہ ہے کہ استاد، زبان لکھنؤ میں
میں کامل دست گاہ رکھتا ہو تا کہ قدیم اساتذۂ دہلی کی تصانیف پر لکچر دیتے
وقت وہ تلامذہ کو سمجھا سکے کہ جو فقرہ کتاب میں زبان دہلی میں ادا کیا گیا ہے
اگر یہی لکھنؤ کی زبان میں ادا کیا گیا ہوتا تو کیوں کر ادا کیا گیا ہوتا اگر استاد
اتنی قابلیت بھی نہیں رکھتا ہے تو وہ نہ اردو جانتا ہے اور نہ اس قابل
ہے کہ اردو کا معلم مقرر کیا جائے۔

صحیح اور مستند زبان ملک میں ر[illegible] کی راہ میں سب سے
پہلی منزل یہ ہے کہ لکھنؤ کی مرکزیت تسلیم کر[illegible] زبان لکھنؤ کا
اتباع فوراً کر دیا جائے۔ ہمارے بچوں کو صحیح اور بامحاورہ ز[illegible] سکھانے
کے لئے اگر ایسے اطراف کے اساتذہ مقرر کئے جائیں جو لکھنؤ کی زبان یعنی
صحیح اور بامحاورہ اردو سے واقف نہ ہوں تو ان کے لئے جس طرح طریق
تعلیم سکھانے کے علحدہ مدارس کھولے گئے ہیں جہاں تعلیم حاصل کر
پر .C.T اور .B.T کی اسناد دی جاتی ہیں اسی طرح ا[illegible]
تعلیم کی اسناد بھی دی جایا کریں اور جب تک کسی اردو کے [illegible]
پاس ایسی سند نہ ہو اُسے کوئی مستقل جگہ اردو پڑھا[illegible]
زبان ترقی نہیں کر سکتی جب تک مسل[illegible]
پر ایک تنقید کا شعبہ قایم نہ کیا جائے۔ نقادانِ فن
جو ایمان اور انصاف سے حق بات کہنے پر [illegible]
کسی سے رنج، کاوش، بغض، عناد رکھتے ہو[illegible]
مراسم یا دوستوں کی سعی و سفارش پر کسی کی [illegible]
کر سکتے ہوں، جن کا قول قول فیصل ہو جو ہر [illegible]
یا اپنے اخبار یا رسالے کے ایڈیٹر کا دل بڑھائیں

لغو، بے ربط، اخلاق پر برا اثر ڈالنے والی تصانیف کا سدباب ہو سکے
ایسی کتابیں جیسی انگریزی زبان میں KING'S ENGLISH ہے یا ایسے
رسالے جیسا BLACK Wood Magazine
Literary Digest London ہے، عالم وجود
میں آئیں۔ انگریزی ضرب المثل ہے کہ سلطنت روما ایک ہی دن کے قلیل
عرصے میں پوری نشو و نما پر نہیں پہنچی تھی۔ یہ کام صبر او استقلال کا ہے۔
آج ہی تکمیل نہیں پا سکتا۔

ع۔ عمرے باید کہ یار آید بکنار

لیکن نیک کام کو شروع کر دینا ہی کامیابی کی منزل پر پہلا قدم
رکھنا ہے۔ لکھنؤ کی فرح بخش فضا اس کام کے لئے بے حد موزوں ہے۔
الحمد للہ کہ جو پودا جناب سجاد حسین صاحب مرحوم لکھنؤ میں نصب کر گئے تھے
اور جو انہیں کے عالم حیات میں بخوبی تمام بارآور ہو چکا تھا اُس کی آبیاری جناب
حکیم ممتاز حسین عثمانی صاحب مرحوم نے نہایت ہی نمایاں اور شاندار کامیابی
کے ساتھ کی۔ زمانے کے ظالم ہاتھ نے ہمیں اُن سے جدا کر دیا اور اُن کی
جدائی نے ادب اردو کو جو ناقابل تلافی صدمہ پہنچایا ہے اس کا [illegible]
عمر ہمارے قلوب سے مٹ نہیں سکتا۔ جناب [illegible]
نہیں ہیں لیکن اُن کا لافانی کارنامہ [illegible]
ہمیں اودھ پنچ کے [illegible]
بھی پڑے [illegible]

[illegible] محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے رصہ ممالک غیر سے دس شلنگ

لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگ لاہور سے شائع ہوا۔

محبت اور امید

(ٹامس مور کی ایک نظم کا ترجمہ)

سمندر کے ساحل پہ صبحِ بہار بجاتی تھی کرنوں کا زرّیں ستار
نمایاں ہوئے یک بیک بادباں سمندر میں تھی ایک کشتی رواں

جہاں غرق تھا نورِ خورشید میں محبت تھی آغوشِ اُمید میں
چمکتی ہوئی جگمگاتی ہوئی ستاروں سے آنکھیں لڑاتی ہوئی

محبت اُٹھی مسکراتی ہوئی تبسم کی بجلی گراتی ہوئی
یہ دولت کی تھی کشتیِ زرفشاں مگر اس میں نورِ محبت کہاں

سفر کو چلی اور کشتی پہ ہو کر سوار یہ بولی کہ ہمراہِ موجِ بہار
ابھی شام تک لوٹ آتی ہوں میں

نظر آیا ... کہ تھی دوستی جس میں سرگرمِ ناز
... عام فروز سکھاتی تھی وہ شیوۂ سازوسوز
مگر اس میں الفت کی رنگت نہ تھی محبت کی اس میں حرارت نہ تھی

... سرگی میں نہاں نہ آیا نظر پھر کوئی بادباں
... امیدیوں ہی بسر
... پلٹ کر نہ آئی مگر

حسرت کاشمیری

نوحہ تھا کہ بے شمار ...
اُن کی غلط اور بے محاورہ زبان دہلی ...
کئے رہتی ہے، حتیٰ کہ جو زبان ہم ہر وقت سنتے ...
بھی بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ قیاسات نہیں ہیں، واقعہ
فطرت جو لندن میں کار فرما ہے دہلی میں بھی ہے۔ اگر لندن کی زبان
حبشیوں کی تھی تو ہر شخص جسے شعور ہے اور جسے اللہ نے مذاق صحیح عطا
فرمایا ہے آنکھیں کھول کے دیکھ سکتا ہے کہ زمانۂ حال کی دہلی کی زبان
کالے حبشیوں کی زبان ہے۔ کاش مجھے کافی وقت ملا ہوتا اور مشاہیر دہلی
کی مطبوعہ تحریرات کے نمونے اپنے دعوے کی دلیل میں پیش کر سکتا۔
ان حالات کے اندر کون امید رکھ سکتا ہے کہ متبعین دہلی کی زبان
لکھنؤ کے مستند اہلِ زبان کے دربار میں شرف قبولیت حاصل کر سکتی ہے
متبعین دہلی نے اُسی زبان میں نظم و نثر لکھنا اختیار کر دیا جو زمانۂ حال کی مروجہ
اور ترقی یافتہ زبان سے بالکل مختلف تھی۔ شعرا نے فخریہ اپنا کلام داد پانے کے
شوق میں پیش کیا۔ مولانا ادھر ادھر ... نے جائزہ لینا شروع کر دیا۔ سچی بات ہمیشہ
کڑوی ہوتی ہے۔ اختلاف پیدا ہوا۔ اختلاف نے ترقی کر کے بغض و عناد کی
خبیث صورت اختیار کی اور بیرونجات کے ناواقف شعرا کی، جو زبان اور

... ستعمال کئے جا...
کے لئے
کالجوں
کے لئے پروانہ راہ
در یسرچ کی قرار داد ...
ہے، لیکن کتنے طلبہ کو ایسی ...
جاتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے
بہت بہتر، مگر ذرا غور تو فرمائیے
ہو، جو مذاق صحیح سے کوسوں
کس حد تک فائدہ پہنچا سکتی

ڈاک کے ڈاکو! ہر ماہ ہمیں خریداروں کی طرف سے شکایتیں موصول ہوتی ہیں کہ انہیں پرچہ نہیں ملتا اور بیسیوں خریدار ایسے بھی ہیں جو شکایت نہیں کرتے لیکن یہ فرض کر لیتے ہیں کہ پرچہ دفتر نے نہیں بھیجا حالانکہ پرچہ چھپنا اور پھر خریدار کو نہ بھیجنا پاگل پن اور تجارتی خودکشی سے کم نہیں۔ ادبی دنیا ہر ماہ کی ۱۹ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے اگر بیس تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو سمجھ لیجئے کہ کسی ڈاک کے ڈاکو کی نذر ہوا بس ایک شکایتی کارڈ اپنے حلقہ کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک کارڈ ہمیں لکھئے تاکہ آپ کو پرچہ دوبارہ بھیجا جائے اور محکمہ ڈاک کے دروازے پر ایک اور دستک دی جائے۔

(منیجر)

فہرستِ مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہِ ستمبر ۱۹۳۷ء

جلد ۱۵ — تصاویر:- ۱- بچپن ۲- باغ میں — نمبر ۱۱

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے (صہ) ممالکِ غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگ لاہور سے شائع ہوا۔

Wear FLEX SHOES

ہمیشہ فلیکس کے جوتے پہنئے

جو آرام دہ، پائیدار، اور بے مثل وضع کے ہوتے ہیں

یہی موسم ہے جبکہ لوگ اپنے لئے نئے جوتے خریدتے ہیں۔ آجکل تمام فلیکس ایجنٹوں کے یہاں فلیکس کے نئے جوتوں کا سٹاک موجود ہے۔ جن میں سے آپ اپنی مرضی کے مطابق پسند کر سکتے ہیں۔

وہ لوگ جو اپنی پوشاک کی وقعت کرنا جانتے ہیں ہمیشہ فلیکس کے جوتے ہی پسند کرتے ہیں۔ جو کہ مضبوط آرام دہ اور فرحت بخش ثابت ہو چکے ہیں۔

فلیکس کے جوتوں کے متعلق گارنٹی کی جاتی ہے کہ تمام تر چمڑے سے تیار ہوتے ہیں

تمام ہندوستان برما اور سیلون میں سات سو سے زیادہ فلیکس ایجنٹس فروخت کرتے ہیں

فلیکس البرٹ سلیپر

From Rs 4-4 Black
From Rs 4-8 Brown

فلیکس آکسفورڈ شو

روزانہ استعمال کے لیے بہترین اور سب سے عمدہ چمڑے کا اور دبے ہوئے چمڑے کا سول لگایا گیا ہے

Albert Slippers Prices from Rs. 4/4 Per Pair
Oxford Shoes Prices from Rs. 5/4 Per Pair

لوکل ایجنٹس:
دی بھلہ شو کمپنی انارکلی اینڈ دی مال لاہور
دی بھلہ بوٹ ہاؤس امرتسر — خواجہ بوٹ ہاؤس پیر الٰہی بخش
دی این بوٹ شاپ امرتسر — دی کیلاش بوٹ ہاؤس جالندھر
دی پرکاش بوٹ ہاؤس امرتسر — بخشی گیان چند اینڈ برادرس ایبٹ آباد
دی انعام بوٹ شاپ گوجرانوالہ — احمد موسیٰ اینڈ برادرس کراچی
دی کشمیر بوٹ ہاؤس راولپنڈی — دی پریم بوٹ ہاؤس سیالکوٹ
دی پاپولر بوٹ ہاؤس ملیشا پنڈی — دی جالندھر بوٹ ہاؤس جالندھر چھاؤنی
کپور دی ہوم لدھیانہ — بسنت شو کمپنی لائل پور
دہلی بوٹ ہاؤس فیروزپور کینٹ

چیف ایجنٹس: - بھلہ شو کمپنی کانپور

واحد تیار کنندگان: - دی نارتھ ویسٹ ٹینری کمپنی کانپور

تقریباً ۴۰۰ مجرب ادویہ ہمیشہ تیار رہتی ہیں

تقریباً ۴۰۰ مجرب ادویہ ہمیشہ تیار رہتی ہیں!

جناب کوی و نو وید جیوشن پت پنڈت ٹھاکر دت جی شرما وید موجد امرت دھارا کی تیار کردہ خاص ادویات سے ہزاروں مریض فائدہ اٹھا چکے ہیں!

ایک بار ضرور اچھی طرح پڑھ لیجئے

ابلارم رجسٹرڈ کثرت حیض کی بیماری خواہ کسی قسم اور کسی درجہ میں ہو آرام آجاتا ہے کوئی بے قاعدگی نہیں رہتی۔ قیمت دو روپے ۲ نمونہ ۴ آنے

پیتالی رجسٹرڈ کمی حیض کے واسطے خواہ کسی وجہ سے ہو اکسیر ہے طاقت بخشتی ہے قیمت دو روپیہ ۲ نمونہ ۸ آنے

سوماوتی رجسٹرڈ عورتوں کے سفید پانی و جریان۔ لیکوریا سیلان و رطوبت کی اکسیر دوائی ہے قیمت دو روپیہ ۲ نمونہ ۱۲ آنے

بال سکھ رجسٹرڈ بچوں کی امراض کے بدہضمی قبض دست کھانسی بخار وغیرہ کے واسطے بے نظیر دوائی ہے قیمت ایک روپیہ ۱ نمونہ چار آنہ ۴ آنے

دوائی بواسیر ۳ خونی و بادی ہر قسم کی بواسیر کے واسطے بے نظیر ہے سالوں کی بیماری دنوں میں دور ہوتی ہے قیمت دو روپے ۲ نمونہ ۲ آنے

اگر گول رجسٹرڈ ہاضمہ کی بے نظیر دوائی ہے بھوک بڑھاتی معدہ اور انتڑیوں کی تمام تکالیف کو دور کرتی ہے قیمت ۶۰ گولی ۲ ۔ ۳۰ گولی ایک روپیہ ۱ نمونہ ۴ آنے

دت ویرچن جلاب کے واسطے یہ دوائی بے نظیر ہے جتنے جلاب لینے ہوں اس سے اچھی طرح ہو جاتے ہیں قیمت ایک روپیہ ۱ نمونہ دو آنہ ۲ آنے

آرام جان رجسٹرڈ - جن کو قبض دائمی رہتی ہے وہ ان کو کھلایا کریں آہستہ آہستہ بیماری دور ہو جاوے گی قیمت ۳۲ گولی ایک روپیہ ۱ ۔ ۱۶ گولی آٹھ آنے ۸ آنے

بلادور رجسٹرڈ ان گولیوں سے افیون چھوٹ جاتی ہے سینکڑوں اشخاص چھوڑ چکے ہیں قیمت فی شیشی ڈیڑھ روپیہ ۱/۸

دت نسوار رجسٹرڈ نسوار لینے سے بلا چھینک آنے کے دردسر آدھا سیسی سدا ٹھہرہ درد کان درد نزلہ زکام دور ہوتے ہیں قیمت فی تولہ ایک روپیہ ۱ نمونہ چار آنہ ۴ آنے

گولی کھانسی رجسٹرڈ منہ میں رکھ کر چوسنے سے کھانسی خشک ہو یا تر دور ہو جاتی ہے قیمت ۶۰ گولی ایک روپیہ ۱ نمونہ چار آنہ ۴ آنے

سورج گھرت رجسٹرڈ خارش خشک و تر پھوڑے پھنسیاں سب کے ملنے سے دور ہوتی ہیں بچوں والے گھر میں ہمیشہ رہنی چاہئے۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ ۱ نمونہ چار آنہ ۴ آنے

پیڑ آئل رجسٹرڈ یہ تیل درد وغیرہ پر مالش کرنے کے واسطے ہے کسی مقام پر کہیں بھی درد ہو اسکی مالش کرنی چاہیے قیمت دو روپے ۲ نمونہ ۸ آنے

ملیریا ناشک یہ سستی دوائی اس واسطے تیار کی ہے کہ ملیریا کے دنوں میں غریب بھی فائدہ اٹھا دیں اور کونین کی ضرورت نہ رہے قیمت فی تولہ ۸ آنے

ابٹن جیت موہنی چہرہ کے بدنما داغ کیل چھائیاں دور ہو کر چہرہ صاف ہو جاتا ہے قیمت ایک روپیہ ۱ نمونہ ۴ آنے

خط و کتابت و تار کا پتہ: امرت دھارا لاہور ۹
المشتہر منیجر امرت دھارا اوشدھالیہ امرت دھارا بھون امرت دھارا روڈ امرت دھارا ڈاکخانہ لاہور

آئینۂ عالم

چین کی ممتاز بیٹیاں

مارشل چیانگ کیشک چین کا دبلا پتلا اور طویل القامت جرنیل آج اس ملک میں سب سے بڑی طاقت ہے، مگر ہر چینی جانتا ہے کہ اس قدیم بانچو سلطنت کا حقیقی اقتدار چینی مہاجر سونگ کی تین بیٹیوں اور تین بیٹوں کے ہاتھ میں ہے۔ سب سے بڑی بیٹی میڈیم سن یاٹ سین نے جو جمہوریت چین کے پہلے صدر کی بیوہ ہے چند دن ہوئے اعلان کیا تھا کہ چین ناقابلِ تسخیر ہے اور جاپان سے اکیلا لڑ سکتا ہے لیکن مشرق کی آنے والی جنگِ عظیم کے عالمگیر میدان میں اکیلا نہیں ہوگا۔

پچاس برس ہوئے چارلی سونگ بالٹی مور امریکہ میں ایک قلاش مہاجر تھا، لیکن آج اس کی تین بیٹیاں اور تین بیٹے جمہوریت چین کی اہم ترین شخصیتیں ہیں اور منجھلی بیٹی میڈیم چیانگ کیشک کی وساطت سے چالیس کروڑ نیم باز آنکھوں والے چینیوں کی قسمتوں کے مالک ہیں۔

۱۹۱۱ء کی انقلابی تحریک عظیم میں جو جمہوریت چین کے قیام کا باعث ہوئی، مہاجر سونگ نے چین واپس آکر نہایت جلیل القدر انتظامی خدمات انجام دیں اور امن قائم ہونے پر پریزیڈنٹ سن یاٹ سین کا سیکرٹری مقرر ہو گیا۔ یہاں سے اس کے خاندان کا عروج شروع ہوتا ہے۔ ایک بیٹی پریزیڈنٹ کی بیوی تھی۔ دوسری نے کینٹن کی فوج کے بلند اقبال جرنیل چیانگ کیشک سے شادی کر لی اور تیسری کا عقد نانکن کے وزیر مالیات ڈاکٹر کنگ سے انجام پایا۔ سونگ کے دو بڑے بیٹے مشرقِ بعید کے سب سے بڑے ساہوکاروں اور ماہرانِ مالیات میں تسلیم کئے جاتے ہیں اور تیسرا چیانگ کیشک کی حکومت کا وزیر تجارت ہے۔

چارلی سونگ کی انقلاب پسند بیٹیوں نے شادی کے بعد مشرقی دستور کے مطابق اپنے شوہروں کے ہاں گھریلو زندگی کی خاموشیوں میں گم ہو جانا پسند نہ کیا اور قدیم روایات سے سرتابی کرتے ہوئے وہ قومی معاملات میں سرگرم حصہ لینے لگیں اور بہت جلد ان کا شمار مشرق کی سب سے متنفذ خواتین میں ہونے لگا۔

میڈیم سن یاٹ سین ۱۹۲۶ء کے متحدہ محاذ کی پشت پناہ تھی اور تب سے اشتراکی چین کی فرمانروائی پر اس کا نمایاں اثر رہا ہے۔ اشتراکی حلقوں میں اس کا نام نہایت عزت سے لیا جاتا ہے اور اس کی رائے کی بے حد قدر و قیمت کی جاتی ہے۔ اس نے جارجیا (امریکہ) کے ویزلین کالج میں تعلیم پائی ہے۔ نہایت سنجیدہ مزاج رکھتی ہے۔ اور سیاست کے میدان میں آنے سے پہلے طب میں خاص امتیاز حاصل کر چکی ہے۔ پہلے اس قدر شرمیلی طبیعت رکھتی تھی کہ بیماری میں مرد ڈاکٹر سے علاج کرانا پسند نہیں کرتی تھی۔ لیکن بعد میں اس دبلی پتلی خاتون نے پریزیڈنٹ سن یاٹ سین کی موت پر چینی رسم و رواج کے مطابق گوشۂ عزلت اختیار کرنے سے انکار کر کے تمام چین کی رائے عامہ کو دعوت مبارزت دے دی لیکن اپنے بے نظیر اثر و رسوخ کے بل پر وہ اس عام مخالفت پر غالب آگئی اور قومی مجلسِ منتظمہ کی رکن منتخب کی گئی اور ردِ عمل کے سارے عہد میں وہ ان گنتی کے چینیوں میں تھی جو مارشل چیانگ کیشک کی مخالفت کر سکتے تھے اور جب مارشل چیانگ نے جاپانیوں کی طرف جھکنا چاہا تو میڈیم سن یاٹ نے اُسے پبلک طور پر زجر و توبیخ کرنے سے گریز نہ کیا۔

میڈیم چیانگ کیشک بھی اثر و اقتدار کے لحاظ سے میڈیم سن یات سین سے کم نہیں لیکن وہ اس جیسی سادگی پسند طبیعت نہیں رکھتی۔ میڈیم چیانگ کو اگرچہ شہرت سے گریز ہے تاہم وہ اپنے حسن و جمال کی آرائش پر بے حد توجہ دیتی ہے اور غازہ و رنگ کا خوب استعمال کرتی ہے۔ اس کی بھی تعلیم و تربیت امریکہ میں ہوئی ہے۔ وہ کافی خوبصورت ہے اور چینی سیاسیات پر ایک فیصلہ کن اثر رکھتی ہے۔

جب پچھلے سال باغی جرنیل ہیو لانگ مارشل چیانگ کو لے اڑا تھا تو میڈیم چیانگ نے تمام معاملات کی قیادت خود سنبھال لی۔ ہوائی جہاز میں اڑ کر ہیو لانگ کے پوشیدہ غار میں پہنچی۔ نہایت عقل مندی سے تمام امور طے کئے اور ہنستے ہوئے اپنے شوہر کو آزادی کے ساتھ مصنوعی دانتوں کے ایک نئے سیٹ کا تحفہ بھی پیش کیا کہ مارشل اس دوڑ بھاگ میں اپنا مستعمل سیٹ کہیں کھو بیٹھا تھا۔

بوڑھے چارلی سونگ کی تیسری لڑکی بھی ایک امریکن یونیورسٹی کی تربیت یافتہ ہے۔ وہ اپنے وزیر شوہر کو اپنے علم و تجربہ اور اثر و رسوخ سے بیش بہا فایدہ پہنچاتی رہتی ہے اور گذشتہ دنوں چین کی حکومت کو لندن سے دو کروڑ پاونڈ قرض دلوانے میں اس کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔

سونگ کے تینوں بیٹے خوبرو، مہذب، متین اور قابل جوان ہیں اور چین کی صنعت و حرفت اور تجارت پر بے پایاں اقتدار رکھتے ہیں چینی تاجروں کے حلقے میں ان کے احکام کو بے حد وقعت دی جاتی ہے۔ اور مالی امور کے متعلق وہ غور و فکر کے بعد جس رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اس بارے میں چین کی قومی پالیسی قرار پاتی ہے۔

ان چینی خاتونوں، ان کے بھائیوں اور مارشل چیانگ کیشک نے جاپان کی فوجی طاقت کا بڑی احتیاط سے اندازہ لگایا ہے۔ اور اگرچہ وہ چین کی دفاعی قوت کے متعلق کسی قسم کی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہیں۔ تاہم وہ جاپان کو فوجی قوت کے لحاظ سے ایک اول درجہ کی طاقت نہیں سمجھتے ان کی رائے میں جاپان کی ظفرمندانہ روایات کے مقابلے میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اُسے ہمیشہ غیر منظم فوجوں سے سابقہ پڑتا رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود شنگھائی میں جاپانی یلغار کو جسے اُس کے عظیم الشان تباہ کن جنگی جہازوں کی تائید حاصل تھی، ایک غیر تربیت یافتہ اور بے ساز و سامان چینی فوج نے ہفتوں رد کے رکھا۔

اب چین کی افواج پہلے سے دس گنا طاقت ور ہیں۔ ادھر مانچوکو کی سرحد پر روسی مظاہرے جاپان کی آدھی فوج کی توجہ اپنی طرف کھینچ سکتے ہیں اور اُدھر چینی لشکر میں جس کی تعداد جاپانی فوج سے یقیناً زاید ہے۔ ماؤسی تنگ کی سرخ فوج کے اڑھائی لاکھ سپاہی جو جدید اسلحہ سے آراستہ ہیں شامل ہو رہے ہیں اس متحدہ سپاہ سے حملہ آور کی یورش کا پرزور مقابلہ کرنے کی امید کی جا سکتی ہے۔ مگر آفت یہ ہے کہ چین کے بیس لاکھ فوجی سپاہیوں میں سے پورے نصف نہایت نامکمل طور پر مسلح اور محاذ جنگ کے تجربے سے بالکل عاری ہیں۔

جاپان کے چند نقوش

(ایک ترقی یافتہ ہندوستانی خاتون کے تاثرات)

تین ماہ ہوئے ٹوکیو میں ایک سہ پہر کو میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی جو پہلے ہندوستان میں کسی کالج کے پرنسپل تھے اور اب جاپانی طالب علموں کو اپنی مادری زبان انگریزی کا درس دیتے ہیں۔ وہ مجھ سے کہنے لگے تم اس مشرق کو ہندوستان سے بہت مختلف مشرق پاؤ گی میں ہمیشہ ہندوستان کو مشرق کہتا ہوں اور اس سرزمین کو اورئنٹ۔

لیکن میں کہ ہندوستان سے جاپان یعنی مشرق سے اورئنٹ کو گئی تھی اور اختلافات سے دو چار ہونے کے لئے تیار ہو کر گئی تھی ایسی بے شمار باتوں سے آشنا ہوئی جو دونوں ممالک میں مشترک ہیں نسلی طور پر ہم بیشک جاپانیوں سے بہت مختلف ہیں لیکن تہذیب و تمدن کے اعتبار سے ہماری بہت سی باتیں آپس میں ملتی جلتی ہیں ہندوستان نے جاپان کو بدھ مذہب دیا جو اب تک وہاں کی اکثریت کا مذہب ہے۔ آبائی دستور و آئین جو جاپان کے سارے سوشل نظام کا ڈھانچہ ہے، ہمارے مشترکہ خاندان کے طریقہ کے بہت مماثل ہے۔ سوائے اس فرق کے کہ جاپان میں گذشتہ بزرگوں اور اجداد کو ہندوستان کی بہ نسبت بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ جاپان میں شہنشاہ کی جو بے حد قدر و منزلت بلکہ عبادت کی جاتی ہے۔ اس کی بھی اصل وجہ یہی ہے کہ شہنشاہ کو ہر معزز جاپانی شہری کے معزز اجداد کا پیکر سمجھا جاتا ہے۔ جاپان کے ایک بہت مقبول کلاسیکل ڈرامے "سمورائی کی قربانی" میں دکھایا جاتا ہے کہ سمورائی یعنی ایک قبیلہ کا سردار اپنے اکلوتے بیٹے کا قتل ہو جانا قبول کرتا ہے تاکہ اُسے اپنے اجداد کے سامنے سرخروئی حاصل ہو

اس سے بظاہر مُردوں کے لئے زندوں کی بے فایدہ قربانی کی حوصلہ افزائی عیاں ہے۔ لیکن جاپان میں یہاں کی بہ نسبت ظاہری دنیا روحانی دنیا سے بے حد قریب واقع ہوئی ہے اور اجداد کو محض اس لئے نیست و نابود تصور نہیں کر لیا جاتا کہ وہ اس ظاہری زندگی سے انتقال کر چکے ہیں۔ موت کو بہت اہمیت نہیں دی جاتی۔ اسے صرف معزز آبا و اجداد سے اتصال کا اور خود اس معزز گروہ میں شامل ہونے کا ایک آسان ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ ہارا کیری (جاپانی خودکشی) کی اس سرزمین میں موت بہت سستی ہے اور زندگی کا سب سے بڑا حادثہ اور مصیبت بے عزتی کو سمجھا جاتا ہے

میلے ٹھیلوں کا شوق

ذہنیت کی اسی افتاد نے ہی شاید جاپانیوں کو ان کے موجودہ درجے تک پہنچایا ہے۔ وہ بلا شبہ دنیا کی بہادر ترین اقوام میں سے ہیں۔ وہ اپنے اعصاب پر اس حد تک قابو پا لیتے ہیں کہ بعض دفعہ وہ موت کے کھیل میں نہایت دلچسپی لیتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً جاپان میں موٹر ٹیکسی پر سوار ہونے کے بعد آپ ہر لحہ اپنے گزرے ہوئے بزرگوں سے ملاقات کی امید کر سکتے ہیں۔ ڈرائیور بے تحاشا موٹر چلاتے ہیں۔ پٹڑیوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ راستے چلنے والوں سے بال بھر کا فرق رکھ کر برق رفتاری سے گزر جاتے ہیں۔ بس ان کا حیرت ناک اعصابی اختیار اور کمال مہارت ہی انہیں اور ان کی بے اختیار سواریوں کو موت کی آغوش میں بے تکلفانہ پھینک دئے جانے سے بچاتا ہے۔ اگر کہیں رفتار پر پابندیاں ہیں بھی تو کوئی ان کی پروا نہیں کرتا اور اگر حادثات ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس اندھا دھند موٹر بازی سے کتنے حادثات ہوتے ہوں گے تو انہیں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور نہ اخبارات میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔ نتیجتہً زخمی ہونے یا موت واقعہ ہو جانے کی صورت میں بھی نقصان رسیدہ شخص یا اس کے ورثا کو کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا۔

جاپانیوں کی اجداد پرستی اور ان کی فوجی شجاعت کی قدیم روایات کو ان میلے ٹھیلوں اور قدیم قسم کے جاپانی ڈراموں سے بہت تقویت ملتی ہے جن کا جاپانیوں کو بے حد شوق ہے۔ بہت سے قدیم روایات کو زندہ رکھنے والے میلے منعقد ہوتے رہتے ہیں اور گھروں اور تھیٹروں میں عہد ماضی کے بہادروں کی داستانیں ذوق شوق سے سنی اور سنائی جاتی ہیں اور ان سے متاثر ہو کر جاپانی نوجوان اپنی رگوں میں خون گرم کی روانی کا احساس کرتے ہیں۔ جس کی انہیں دور جدید کے مشکل ترین معرکوں میں پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ ضرورت ہے۔ ۵ مئی کو جاپانی لڑکوں کے میلے کی تقریب پر میں ٹوکیو میں تھی۔ اُس دن چھوٹے لڑکوں کو عجیب شکلوں کے کھلونے دئے جاتے ہیں تاکہ وہ اپنا ڈرائنگ روم اور گھروں کی چھتوں سے نقرئی رنگ کی مچھلی کرپ کی شکل کے جھنڈے اڑائے جاتے ہیں یہ مچھلی جاپانی لڑکپن کا نشان ہے۔ کیونکہ کرپ دریا میں پانی کے بہاؤ کے خلاف تیرتی ہے اور صرف ایک ہی مچھلی ہے جو جاتو کی دھار کے نیچے تڑپا نہیں جاتی۔

خواندگی کی بلند اوسط

یہ امر کہ جاپان میں زندگی کو کم قیمت سمجھا جاتا ہے اور اپنے ماضی کو بیحد احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ جاپان کی موجودہ زمانے کی ضروریات یا مستقبل کی ممکنات سے غفلت کا باعث نہیں ہوا بلکہ جاپان اس بارے میں بے حد بیدار ثابت ہوا ہے۔ ساٹھ سال گزرے جاپان کی وہی کیفیت تھی جو تین سو سال قبل کے ہندوستان کی تھی یعنی ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ ان ساٹھ برسوں میں جاپان اس قدر سرعت سے آگے بڑھا ہے کہ بیشتر متمدن ممالک اس سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ کیفیت تعلیم کے حلقے میں بہت نمایاں ہے۔ آج دنیا بھر میں جاپان کا اوسط خواندگی بلند ترین ہے۔ جاپان کے مرد عورت لڑکے لڑکیوں میں ۹۹ فی صدی لکھ پڑھ سکتے ہیں اور انہیں ہماری الف بے تے کی طرح چھبیس تیس حروف سیکھنے نہیں پڑتے۔ بلکہ ان کے حروف تہجی سینکڑوں چینی طرز کے نشانات پر مشتمل ہیں۔ حکومت کی طرف سے ہر جاپانی لڑکے اور لڑکی کے لئے چھ سال تک ابتدائی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ جب میں ٹوکیو میں تھی تو اخبارات اس بات پر زور دے رہے تھے کہ لڑکوں کے لئے دو سال کی بیشتر درا نہ تعلیم کا اضافہ کیا جائے اور یہ اُس لازمی فوجی تربیت کے علاوہ ہے جو ہر صحت مند جاپانی لڑکے کو حاصل کرنی پڑتی ہے اور جو نوجوان فوجی تعلیم کے ناقابل قرار دیا جائے وہ اسے اپنی بڑی بے عزتی سمجھتا ہے جو اسے اس کے اجداد کی نگاہوں میں ذلیل کر دیتی ہے۔

جاپان کی صنعتی عظمت اور تجارتی ترقی کے متعلق ہم نے بہت کچھ سن رکھا تھا اور جاپان نے دنیا کی تجارتی منڈیوں پر جیسا بے پناہ غلبہ حاصل کیا ہے وہ بھی سب کو معلوم ہے۔ اس کے باوجود ہندوستان سے جانے والا سیاح جاپان کے صیغہ دار سٹوروں کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں اس قسم کی عظیم الشان دکانوں سے ملتی جلتی کوئی چیز نہیں۔
ہر سٹور کی کم و بیش سات منزلیں ہوتی ہیں جو جاپان کی صنعتی اور تجارتی پیداوار
اور آرٹ کے نمونوں سے بھرپور ہوتی ہیں۔ شوخ رنگوں کا ایک طوفان ہر طرف
امڈا ہوا دکھائی دیتا ہے اور بے شمار خریداروں اور بیچنے والی لڑکیوں کی چہل
پہل عجیب دلکش سماں پیدا کر دیتی ہے۔ ہر منزل پر جانے کے لئے لفٹ اور
متحرک سیڑھیاں موجود ہیں جو چشم زدن میں خریدار کو سٹورز کے مختلف
حصوں میں پہنچا دیتی ہے ان دکانوں میں تمام چیزیں جاپانی ساخت کی فروخت
ہوتی ہیں۔ کہیں کہیں کوئی غیر ملکی چیز بھی دکھائی دے جاتی ہے۔ لیکن اس
کے ساتھ ہی اس کی جاپانی نقل بھی رکھی ہوتی ہے اور دونوں کی قیمت میں
عموماً چار اور ایک کا تناسب ہوتا ہے۔ اسی لئے جاپان میں سودیشی پروپیگنڈا
کی اب ضرورت نہیں رہی، ہر جاپانی چیز غیر ملکی کے مقابلے میں بے انتہا
سستی ہے۔ ین کی ہندوستانی شرح تبادلہ ۱۳ اور ۱۴ آنے کے درمیان
ہے۔ لیکن جاپان میں ایک ین کی قوتِ خرید ہمارے ملک میں ایک روپے
کی قوتِ خرید سے کہیں زیادہ ہے۔ اسی لئے جاپانی عوام نقابلتہً کم آمدنیوں
پر نہایت اعلیٰ درجے کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

اخلاق و تواضع

جاپانی انکسار و اخلاق کا صحیح اندازہ جاپانیوں میں رہے بغیر ہرگز
نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اپنے سو کام چھوڑ کر بھی پردیسیوں کی راہ نمائی کرنے
اور انہیں ہر قسم کی اخلاقی امداد دینے سے گریز نہیں کرتے۔ کسی دردناک
واقعے کا ذکر بھی مسکرا کر کرتے ہیں تاکہ سننے والے کے احساس کو تکلیف
نہ ہو۔ وہ ہر وقت مسکرانے اور شکریہ کے الفاظ استعمال کرتے رہتے
ہیں۔ جب کبھی آپ کسی سے ملنے جائیں یا مل کر رخصت ہوں۔ ایک تبسم
آمیز خیر مقدم اور خدا حافظ آپ کے لئے وقف ہوگا۔ ٹرام گاڑیوں میں
کنڈکٹر نہایت نرم آواز میں لوگوں کو مختلف جگہ پہنچنے کے متعلق آگاہ کرتے
ہیں۔ بلند اور کرخت آواز نکالنا ایک اخلاقی جرم تصور کیا جاتا ہے۔ مسافر
جب ٹراموں سے اترتے ہیں تو کنڈکٹر نہایت مودب طریق پر ان کے پیچھے
چھتریاں اور ٹوپیاں ان کو پیش کرتا ہے۔ چائے کی دکانوں اور ریسٹورنٹوں
سے آپ خورد و نوش کے بعد نکلیں تو کھلانے والی خادمہ آپ سے کہے
گی۔ "براہ مہربانی آئندہ بھی تشریف لائیے"۔ بل دیتے وقت وہ ہمیشہ
آنکھیں نیچی رکھے گی اور اس کے چہرے پر ایک قسم کی خجالت ہوگی
گویا کہ یہ بل ایک پر لطف ملاقات کی مسرت ضائع کرنے کے جرم میں
خود سے شرمندہ ہو رہا ہے۔ آپ اگر کسی دکان سے بغیر کچھ لئے دئے رخصت
ہو جائیں تو بھی فروخت کرنے والے آپ کی تعظیم کے لئے جھک جائیں
گے اور اگر آپ اپنی کوئی چیز دکان میں بھول جائیں تو دکان کا سائیکل سوار
ملازم آپ کا پیچھا کرے گا اور آپ کو وہ چیز پہنچا جائے گا۔

ٹوکیو کے ریلوے سٹیشن کے باہر پٹڑی پر ایک اخباروں کی
دکان ہے یہ جگہ بمبئی کے بوری بندر سے زیادہ پر رونق اور آباد ہے
آنے جانے والوں کی ایک لامتناہی رو ہر وقت رواں رہتی ہے۔ اس
دکان پر ایک کھلا ہوا طشت ریزگاری سے بھرپور پڑا رہتا ہے۔ لوگ اپنی
پسند کا اخبار چنتے ہیں اور اس طشت میں قیمت رکھ دیتے ہیں۔ اگر ریزگاری
پاس نہ ہو تو ین رکھ کر باقی ریزگاری اٹھا لیتے ہیں۔ اخبارات اور نقدی کے
طشت کی کوئی نگرانی نہیں کرتا کیونکہ دکان میں کوئی آدمی نہیں ہوتا۔ ہجوم
جس میں امیر غریب اور بہت غریب سبھی ہوتے ہیں۔ سارا دن یہاں
سے گزرتا رہتا ہے۔ مگر کوئی روپے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا اور
ٹوکیو سٹیشن کی اخباروں والی دکان بدستور قائم ہے اور ہر شام اپنے
مالک کو پورا پورا حساب دے دیتی ہے۔ جاپانی ہجوم کبھی بے ترتیب نہیں
ہوتا۔ نہایت مرتب نہایت سنجیدہ اور نہایت با اخلاق کے الفاظ اگر
کسی موصوف کے لئے ٹھیک استعمال ہو سکتے ہیں تو وہ جاپانی ہجوم ہے

مناظرِ قدرت سے الفت

جاپانیوں کی ایک نہایت دلکش خصوصیت خوب صورت چیزوں
سے محبت ہے جس کا سرچشمہ جاپان کے لطیف اور رنگین مناظر ہیں۔ چیری
اور شفتالو کے پھولوں کا ہلکا گلابی رنگ، بانس کے جھنڈوں کی دلآویز ہریاول
اور چیڑ کے بلند درختوں کا گہرا رنگین پس منظر اور سب سے بڑھ کر پہاڑوں
کی برف پوش چوٹیاں۔ ان سب نے مل کر جاپانیوں میں امتزاج رنگ
کا ایک غائت درجہ لطیف مزاج پیدا کر دیا ہے جس کا اظہار اُن کی ہر قسم
کی مصنوعات مثلاً چھینٹوں، پردوں، چھتریوں، چینی کے برتنوں، پنکھوں
حتیٰ کہ مکانات کے در و دیوار کی آرائش میں ہوتا رہتا ہے۔ ان کے گھروں
میں پھولوں کی زیبائش ایک فن کی حیثیت رکھتی ہے اور کوئی گھر اس
زیبائش سے خالی نہیں ہوتا۔

جاپان کا مقبول عام پھول چیری فلاور ہے۔ میں اپریل کے
آغاز میں وہاں پہنچی تھی بہار میں جب چیری کا شگوفہ کھلتا ہے لوگ
ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت موسم کی خوبی اور منظر کی خوب صورتی

پر مبارک باد دیتے تھے۔ کوہ و میدان اس نازک ترین پھول کے طوفان رنگ سے شرابور تھے اور لوگ جوق در جوق باغات اور جنگلوں میں اس طوفان میں غرق ہونے کے لئے نکل گئے تھے۔ اس پھول کی پتیاں دیکھتے ہی بکھر جاتی ہیں۔ مجھے ایک جاپانی نے نہایت شاعرانہ انداز میں کہا (چیری کے معاملے میں ہر جاپانی شاعر بن جاتا ہے) "اس پھول کی زندگی ہمارے جاپانی سپاہی کی زندگی کی مانند ہے۔ یہ مرجھاتی نہیں بلکہ بکھر جاتی ہے"۔

چیری کے درخت کو حسین ترین عورت کی روح کا پیکر سمجھا جاتا ہے شنٹو مذہب جو بدھ مذہب سے قدیم تر ہے۔ اور جاپان میں اسی قدر پیرو رکھتا ہے۔ ہر پھول اور پودے میں ایک زندہ روح کی موجودگی تسلیم کرتا ہے اور اس کی پرستش پر زور دیتا ہے۔ اس مذہب کی رو سے جاپان کے بہت سے دیوتا اور دیویاں ہیں اور ان میں لگاتار اضافہ ہوتا رہتا ہے یہ نئے دیوتا وہ لوگ ہوتے ہیں جو جاپان کی خدمت میں اپنی قربانی کر دیتے ہیں۔ گزشتہ اپریل میں توکیو میں دیوتا بنانے کی ایک عظیم الشان قومی رسم انجام پائی تھی جس کی رو سے ۱۱۴۸ نئی روحوں کو دیوتاؤں کی فہرست میں جگہہ دی گئی ان میں سے ۱۹ اراکین حکومت، ۷ منچوریا ریلوے کمپنی کے افسر اور کارکن ۱۱ منچوکو میں بسنے والے جاپانی مہاجر۔ ۱۲۰ جنگی ملاح۔ اور ۹۹۸ فوجی سپاہی تھے۔ جس کے معنی ہیں کہ ایک سپاہی کے لئے کسی دوسرے شخص کے مقابلے میں دیوتا بننے کا دس گنا امکان ہے اور ایسا ہوتا رہے گا جب تک کہ جاپان کی موجودہ فوجی روایات ایسی ہی مضبوط رہیں گی جیسی کہ وہ آج ہیں۔

ادارہ

رباعی

ایامِ شباب کی کہانی ہمدم
روتا ہوں اب جب وہ زندگانی ہمدم
اے دامنِ کوہ کے غزالِ چنچل
میری گزری سی جوانی ہمدم

عباس بیگ منش

خونابۂ دل

(۱)

اے علم و ادب کی جانِ منصوبا   اے مرہمِ تلخئ جوانی

اے زیبِ دہِ بہارِ اُردو   اے روحِ روانِ خوش بیانی

تکلیف میں دکھ میں درد و غم میں   رکتی نہ تھی طبع کی روانی

یہ بار اٹھائے کون آکر   موقوف تھی تجھ پہ نکتہ دانی

محروم ہوئی زبان تجھ سے   ٹوٹی ہے بلائے ناگہانی

تو نے ہی سنی تھی جب سنی تھی   اب کون سنے مری کہانی

سیفیؔ کو بھی اپنے ساتھ لے چل   اک بارِ گراں ہے زندگانی

کیوں درد کو آہ سے گھٹاؤں   باقی ہے یہی تو اک نشانی

ممکن ہو اگر تو ڈھونڈھ لاؤں
اس نیند سے کس طرح جگاؤں

(۲)

حسرت رہی کہ تجھ کو دیکھوں   چہرے سے کفن ذرا ہٹا دے

محروم رہا ہوں گفتگو سے   جاتے جاتے ہی کچھ سنا دے

اے ملکِ عدم کے جانے والے   کب آئے گا وقت تو بتا دے

بے یار ہیں خُلق اور مروت   اِن کو کہیں راہ سے لگا دے

پھر ڈال نظر لحاظ والی   بگڑی ہوئی بات پھر بنا دے

احباب ترے لئے ہیں بے چین   اُن کو دیدار سے شفا دے

میری باتوں کی سادگی کو   ہمت افزائی سے جِلا دے

اخلاص بھری تسلّیوں سے   اکھڑے ہوئے دل کو پھر جما دے

دنیا ہے وہی۔ وہی جہاں ہے
اے یارِ عزیز تو کہاں ہے

سیفیؔ نوگانوی

عزمِ شاعر

میں تری راہ سے بے خوف گزر جاؤں گا — موت! اک بار تو حیراں تجھے کر جاؤں گا

چند انفاس کا مجموعہ ہے میری ہستی — مثلِ بُو عالمِ امکاں میں بکھر جاؤں گا

دردِ ہستی سے ہوں بے چین مثالِ سیماب — مبتلا سب کو اسی درد میں کر جاؤں گا

بحر و بر روئیں گے پتھر بھی پگھل جائیں گے — جس طرف لے کے میں یہ دیدۂ تر جاؤں گا

بادۂ عشق سے ہر ساغرِ دل خالی ہے — اس مئے کہنہ سے پھر اس کو میں بھر جاؤں گا

موت کے نام سے ہوگا نہ ہراساں کوئی — روح بے خوف وہ انسانوں میں بھر جاؤں گا

تاجور آیا ہوں میں بہرِ مداوائے جہاں

جس طرح بھی ہوا دا قرض یہ کر جاؤں گا

تاجور سامری

شاخِ نبات

گردید حالِ من ز غمِ ہجر زار تر — دلِ بے قرار تر شد و جاں سوگوار تر

سازم بہ ہر بلائے کہ از آسماں رسد — تا کلفتِ غمِ تو شود سازگار تر

دانستہ ام کہ در پسِ ہر خندہ گریہ ایست — زیں غم شدہ است دیدۂ من اشکبار تر

یاراں بہ صحنِ باغ نشینیم و مے خوریم — باشد کہ نوبہار شود نوبہار تر

چشمے کہ بادہ ہا خورد از حُسنِ مست کار — از مست میگسار بود میگسار تر

بے پردہ جلوۂ تو گدا از نگاہ را — حُسنِ تو در نقاب بود آشکار تر

زاں ناامیدئ کہ بتو در نمی رسد

دل شرمسار و چشم ازاں شرمسار تر

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

فریبِ خیال

دعوت میں شریک ہونے والوں کی تعداد سو سے کسی صورت کم نہ تھی۔ کوٹھی کے وسیع احاطے میں نہایت قرینے سے چھوٹی چھوٹی میزیں اور کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔ جلسے کا اہتمام بڑے تکلف سے کیا گیا تھا اور کھانے پینے کی ہر چیز سے خوش سلیقگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ مہمانوں میں ہر طبقے اور ہر مذاق کے لوگ موجود تھے۔ وکلاء تھے، اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر تھے، سرکاری حکام تھے۔ رؤسا تھے۔ چند مشہور شاعر اور مصوّر بھی تھے۔ موسم نہایت خوشگوار تھا۔ سبزے کے فرش پر جگہ جگہ پھولوں کے گملے رکھے ہوئے تھے اور رنگ برنگ کاغذ کے پھولوں کی بیلیں لہرا رہی تھیں۔ میزبان اور ان کے دونوں صاحبزادے خود مہمانوں کی خاطر تواضع میں مصروف تھے۔ اس مجمع میں ایک شخص اپنی وضع قطع کے اعتبار سے زیادہ نمایاں نظر آ رہا تھا۔ دوہرے بدن کا نکلتا ہوا قد۔ جسم پر سیاہ سمور کا لمبا کوٹ، حالانکہ سمور پہننے کا رواج مدت ہوئی ختم ہو چکا تھا۔ پاؤں میں چمک دار چمڑے کا پمپ اور سفید زمین پر سیاہ لکیروں والے کپڑے کی پتلون۔ سر کے بال بہت لمبے جنہیں پشت کی طرف پھینکا ہوا تھا۔ قلمیں بڑھی ہوئیں جو رخسار کے عین وسط تک پہنچ رہی تھیں۔ جب جلسہ ختم ہو چکی تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کبھی اس میز پر کبھی اُس میز پر جا کر لوگوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ بعض مہمان اُس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا "یہ کون صاحب ہیں؟" اُس نے جواب دیا "نام تو میں نہیں جانتا لیکن یہ شاید یہاں وِنیس تھیٹر میں پیانو بجاتے ہیں۔"

دعوت کے اختتام پر صاحبِ خانہ نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور تقریب بخیر و خوبی انجام پذیر ہوئی۔

اس واقعہ کو ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ اتوار کے دن صبح نو بجے میرا ملازم ایک ملاقاتی کارڈ میرے پاس لایا جس پر انگریزی حروف میں "ایم۔ ایچ۔ شیدا بی اے" مرقوم تھا۔ میں اس نام کے کسی شخص سے واقف نہ تھا۔

میں نے ملازم سے پوچھا "تم جانتے ہو یہ کون صاحب ہیں؟"

اُس نے جواب دیا "جناب، اس سے پہلے تو یہ کبھی نہیں آئے میں نے بھی آج ہی انہیں دیکھا ہے۔"

میں نے کہا "انہیں بڑے کمرے میں بٹھاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

دس منٹ کے بعد جب میں بڑے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ میرا ملاقاتی وہی شخص ہے جو دعوت میں سیاہ سمور کا کوٹ اور چمک دار چمڑے کا پمپ پہن کر شریک ہوا تھا۔ میں نے کہا "معاف کیجئے، اُس روز پارٹی میں آپ سے شرفِ نیاز حاصل نہ ہو سکا۔" میں مدت کے بعد لاہور آیا ہوں اس لئے نئے دوستوں سے ملاقات پیدا کرنے کے لئے بھی کچھ وقت چاہیئے۔"

اُس نے کہا "یہ صحیح ہے لیکن میری جرأت تو دیکھئے کہ آپ سے متعارف ہوئے بغیر میں آپ کے مکان پر آ دھمکا ہوں۔"

میں نے کہا "آپ کی اس تکلیف فرمائی کا بے حد شکریہ۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔ شوق سے تشریف رکھئے۔" جب ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے تو میں نے کہا "کیا میں آپ کا پورا اسمِ گرامی دریافت کر سکتا ہوں؟"

اُس نے جواب دیا "میرا نام محمد ہارون شیدا ہے۔ دو سال سے لاہور میں مقیم ہوں۔ اس سے پہلے الہ آباد میں تھا۔ بچپن کلکتے میں بسر ہوا ہے۔ کسی ایک شہر کو وطن کہنا میرے نزدیک جائز نہیں۔ ہم لوگ دنیا کے باشندے ہیں۔"

میں نے ہنس کر کہا "میں بھی وطن پرستی کو شرکِ مکانی سمجھتا ہوں لیکن اس کے باوجود ایک جگہ سے تعلقِ وطن قائم ہے۔"

اُس نے کہا "ہاں میں نے آپ کی تحریروں میں دیکھا ہے کہ آپ بہت التزام سے اپنے نام کے ساتھ اپنی نسبتِ وطن ظاہر کرتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟"

میں نے جواب دیا "اس کی وجہ وطن پرستی نہیں بلکہ محض اپنے

نام کو ایک امتیازی رنگ دینا ہے۔"

اُس نے کہا "رسمیاتِ عہد کی پابندی صرف اُن لوگوں کا کام ہے جو اپنی انفرادی شخصیت کے شعور سے محروم ہیں۔ یہ شعور بہت سے اشخاص میں فطری طور پر موجود ہوتا ہے لیکن تقلید کے اس جذبے سے جو ہندوستان میں عام ہے دب کر ضائع ہو جاتا ہے۔ لکیر کا فقیر بنے رہنے سے انسان کی اجتہادی قوتیں بروئے کار نہیں آ سکتیں۔"

میں نے کہا "صحیح بات یہ ہے کہ سماج کی عافیت تقلید ہی میں ہے۔ رسمیاتِ عہد کی پابندی سے انحراف کرنا پیغمبروں کو زیبا ہے یا باغیوں کا کام ہے۔ ایک عام آدمی کے لئے یہ انحراف اس وقت تک نقصان رساں نہیں جب تک اُس کے اعمال و خیالات قانون سے متصادم یا ہم جنسوں کی آسائش میں خلل انداز نہ ہوں۔ قانون اور اخلاق نے انسان کی آزادی پر چند حدود عاید کر دی ہیں جن کے اندر رہ کر ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اپنے شوق کی تشفی کے لئے جو سامان چاہے پیدا کرے۔"

ہم نے فوراً محسوس کیا کہ ہماری گفتگو بہت ٹھوس ہو رہی ہے اور پھر دو آدمیوں کا پہلی ہی ملاقات میں اس قسم کی باتیں لے بیٹھنا یوں بھی کچھ بھلا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے کہا "شیدا صاحب، چھوڑیئے اس قصّے کو۔ آپ شاعر ہیں اپنے شعر سنائیے"۔

اُس نے کہا "معاف کیجئے، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں شاعر نہیں ہوں۔ شیدا میرا تخلص نہیں ہے۔ یہ فقط ایک خاتون کا عطیہ ہے جنہیں میرا نام پسند نہیں تھا۔ انہوں نے میرے نام کے ساتھ اس لفظ کا اضافہ صرف اس لئے کر دیا کہ وہ مجھے اس نام سے بلانا چاہتی تھیں"۔

میں نے کہا "پھر تو یہ تخلص سے بھی زیادہ دلچسپ اور رومان انگیز چیز ہے۔ اپنی داستانِ معاشقہ کا کوئی باب ہی سنائیے"۔

شیدا نے قہقہہ لگا کر کہا "آپ نے یہ کیوں کر جانا کہ لفظ شیدا کا تعلق کسی داستانِ معاشقہ سے ہے"؟

میں نے کہا "میرے پاس دلیل تو کوئی نہیں۔ البتہ آپ کی باتوں سے یہ جھلک رہا ہے"۔

شیدا اور میں جلد ہی ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ وہ بہت خوش مزاج اور زندہ دل انسان معلوم ہوتا تھا۔ وہ دراصل پنجاب کا رہنے والا تھا لیکن اپنی عمر کا ابتدائی حصہ اُس نے اپنے چچا کے پاس کلکتے میں بسر کیا تھا۔ اسکول کی تعلیم اُس نے وہیں ختم کی تھی اور پھر وہ علی گڈھ چلا گیا تھا جہاں سے اُس نے بی اے کی سند حاصل کی تھی۔ کلکتے کے قیام کے دوران میں شیدا کو موسیقی سے خاص اُنس ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ کچھ تو کلکتہ کا ماحول تھا اور کچھ اُس کا اپنا فطری رجحان۔ علی گڈھ میں بھی طالب علمانہ مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اس شوق سے غافل نہیں رہا تھا۔ تعطیلات میں وہ اکثر لکھنؤ چلا جاتا تھا۔ جہاں ماتادین، بندراین اور ظہیر خاں جیسے ماہر فن اُستادوں سے تلمذ پیدا کر کے اُس نے کسبِ فیض کیا تھا۔ ساز بجانے میں بالخصوص اُسے کمال حاصل تھا۔ ستار، دلربا، وائلن، پیانو، ہارمونیم غرض کہ ہندوستانی اور ولایتی دونوں قسم کے سازوں میں اُسے خوب مہارت تھی۔ اُس کے چچا جو ابتدا سے اُس کی پرورش کر رہے تھے اس شوق کو پسند نہیں کرتے تھے۔ شروع میں تو وہ اس خیال سے خاموش رہے کہ آج کل کے نوجوان گانے بجانے کے شوقین ہوا ہی کرتے ہیں لیکن جب اُنہوں نے دیکھا کہ یہ شوق جائز حدود کو عبور کر کے پیشہ ورانہ شغف کی صورت اختیار کر رہا ہے تو انہوں نے اُس کی مخالفت کی۔ شیدا کی خود سری نے اس مخالفت کو اور زیادہ بدمزگی کا رنگ دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طرفین میں رنجش بڑھتی گئی اور شیدا جب علی گڈھ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلا تو کلکتے جانے کی بجائے وہ سیدھا بمبئی چلا گیا جہاں ایک فلم کمپنی میں اس نے ملازمت اختیار کر لی۔ بمبئی کی فضا اُس کے حسبِ خاطر نہ تھی اس لئے مختصر سے قیام کے بعد وہ الہ آباد لوٹ آیا۔ یہاں گلوب تھیئٹر میں آرکسٹرا کا مہتمم مقرر ہو گیا اُس کی طبیعت میں آزادروی اور جدت پسندی شروع سے تھی۔ اب کہ وہ معاش کی طرف سے ایک حد تک مطمئن ہو چکا تھا اُس نے زندگی کی شاہراہ پر صرف اپنے ذوق اور اپنی ذہانت کو رہنما بنا لینا کافی سمجھا۔ تقلید اور پیروی سے اُسے سخت نفرت تھی۔ اگر کھانے پینے اور پہننے میں انسان صرف اپنے ہی ذوق کی رعایت روا رکھے اور مروجہ رسوم کی پروا نہ کرے تو بھی سماج کے طور طریقوں سے اس کا تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے، لیکن شیدا تو اپنے مذاق کی پذیرائی کے سامنے معاشرت کی پابندیوں اور تمدن کے اصولوں کی بھی پروا نہ کرتا تھا۔ ایسے باغی کے لئے بھلا قدامت پسند اور روایات پرست دنیا میں کہاں گنجائش ہو سکتی ہے۔ الہ آباد میں آہستہ آہستہ وہ طعن و تشنیع کا ہدف بننا شروع ہوا۔ بعض لوگ اُس کی ہنسی اڑاتے تھے بعض اُس سے نفرت کرتے تھے

اور بعض اُس کے دشمن بن گئے تھے۔ جب اُس نے محسوس کیا کہ ہیئت اجتماعی اُس کی انفرادیت کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہے تو اُس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یو پی کے باشندے سخت دقیانوسی قسم کے لوگ ہیں جو ہر جدت کو بدعت سمجھ کر روشن خیالی کے بدترین دشمن ہیں۔ پنجاب کے متعلق وہ ہمیشہ حسن ظن کا شکار رہا تھا۔ چنانچہ الہ آباد سے دل برداشتہ ہو کر وہ لاہور چلا آیا اور وہیں تھیٹر میں پیانو بجانے پر ملازم ہو گیا۔ تھوڑے عرصے میں اُس کی انوکھی روش نے یہاں بھی اُس کو لوگوں کی توجہات کا مرکز بنا دیا۔ طلبہ کے حلقے میں وہ یقیناً روز بروز مقبول ہو رہا تھا لیکن سنجیدہ اشخاص میں اس کو چنداں وقعت حاصل نہ تھی۔ چونکہ گانے میں اس کو مہارت تھی اور علی گڈھ کا گریجوایٹ ہونے کی وجہ سے وہ گویا علمی وقار کا مالک بھی سمجھا جاتا تھا اس لئے اکثر تقاریب میں اُس کو شرکت کے دعوت نامے موصول ہوتے رہتے تھے۔ ظاہری وضع قطع میں بھی اُس نے ایسا پہناوا اختیار کر رکھا تھا کہ بڑے بڑے مجمع میں اُس کی جانب انگلیاں اٹھنا شروع ہو جاتی تھیں کبھی وہ اچکن کے ساتھ جودھ پوری طرز کی پگڑی باندھ کر آجاتا تھا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ وہ بہت بڑا کلاونت ہے کبھی سیاہ فراک کوٹ اور سرخ ترکی ٹوپی پہن کر خالص علی گڈھی لباس میں نمودار ہوتا تھا بعض اوقات کھلی آستینوں کا کرتہ اور تہمد اور پاؤں میں سلیپر پہن کر وہ اس طرح بے تکلفی سے آجاتا تھا کہ گویا یہی مہذب دنیا کا لباس ہے کبھی جی چاہتا تو گاندھی ٹوپی اور کھدر کی دھوتی پہن کر نکل آتا تھا۔ سوٹ پہننے میں تو اُسے ایسا ملکہ حاصل تھا کہ کم ہندوستانیوں کو ہو گا۔ میں نے جب اُسے پہلی مرتبہ دیکھا تو سمور کا بنا ہوا لباس زیب تن کئے ہوئے تھا۔

ہم بہت دیر تک بیٹھے الہ آباد اور کلکتے کی باتیں کرتے رہے۔ وہ مجھے وہاں کے دلچسپ حالات سنا رہا تھا اور کبھی کبھی کسی لطیفے پر ہم ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ دفعتاً مجھے یہ ندامت آمیز خیال آیا کہ میں نے اُسے چائے تک کا نہیں پوچھا۔ میں نے کہا "رشید صاحب، معاف کیجئے میں نے آپ کو نہ کھانے کا پوچھا ہے نہ چائے کا۔ اگر آپ کہیں تو ملازم چائے لے آئے۔"

اُس نے فوراً جواب دیا "جی نہیں۔ کھانے سے زیادہ لذیذ اور چائے سے زیادہ مفرح تو یہ گفتگو ہے۔ بھوک ہو تو میں کبھی عذر نہیں کیا کرتا لیکن محض رسم کا لحاظ کر کے دوستوں کے کام و دہن کی تواضع کرنا مجھے ہرگز پسند نہیں۔ ہمارے ہاں یہ عجیب دستور ہے کہ جب کوئی شناسا یا دوست یا عزیز ملنے کے لئے مکان پر آئے تو ضرورت ہو یا نہ ہو سب سے پہلے اُسے کچھ کھلانا پلانا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ اگر یہ فرض فوراً سر انجام نہ دیا جائے تو ملاقاتی بھی خفا اور صاحب خانہ بھی نادم۔ میرا خیال ہے جب انسان ارتقائی دور کی اولیں منزل میں تھا تو اُسے سوا اپنا پیٹ بھرنے کے اور کوئی کام نہ تھا۔ جوں جوں انسانی عقل و خرد اور تخیل و احساس کی کارفرمائی بڑھتی گئی پیٹ کی ضروریات مؤخر اور قلب و دماغ کی ضروریات مقدم حیثیت اختیار کرتی گئیں۔ آج جبکہ علم و فن نے دنیا کی کایا پلٹ دی ہے۔ انسانی ضروریات کا وہی مذاق اور معیار برقرار رکھنا جو زمانہ ماقبل تاریخ میں تھا غلطی ہے۔"

میں نے کہا "تو کیا آج تعلیم یافتہ انسان ہوا پھانک کر گزارہ کرتے ہیں؟ کیا اُنہیں جسم و جان کا رشتہ بحال رکھنے کے لئے روٹی کی ضرورت نہیں؟"

اُس نے ہنس کر کہا "ہوا پھانک کر تو یوں گزارہ کرتے ہیں کہ آج کل ہر دماغی کام کرنے والا شخص سوء ہضم کا شاکی ہے۔ پھر ایسی سوسائٹی میں جہاں سوء ہضم کی شکایت اس درجہ عام ہو یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ خاطر تواضع کا تنہا یہ طریقہ باقی رکھا جائے کہ موقع بے موقع معدہ وامعا پر بوجھ لاد دیا جائے۔ انسان مراد حواس خمسہ سے ہے۔ ہم نے صرف حاسہ ذائقہ کی تواضع ضروری سمجھ رکھی ہے اور باقی چاروں حواس نظرانداز کر دئے ہیں حالانکہ ایک تربیت یافتہ سماج میں ترتیب بالکل اس کے الٹ ہوتی ہے جب علم و ادب کی ترقی سے سوسائٹی میں تہذیب و شائستگی پیدا ہو جائے اور فنون لطیفہ کے رواج سے جمالیات کا شعور فروغ حاصل کر لے تو پھر افراد کا فرض ہے کہ سامعہ، باصرہ اور شامہ نواز اشیاء سے ایک دوسرے کی خاطر مدارات کیا کریں۔"

میں نے کہا "بہت اچھا حضرت، اب آپ کے لئے ناچ رنگ کا انتظام کرتا ہوں۔"

چند ہفتوں میں میرے اور رشید کے مراسم کافی ترقی کر گئے۔ ہم ایک دوسرے کے ہاں بے تکلفی سے آنے جانے لگے۔ وہ عجیب خصوصیات کا آدمی تھا۔ اپنے افعال کے لحاظ سے بالکل بے ضرر لیکن خیالات کے اعتبار سے بہت پریشان کن اور دلچسپ۔ مذہب سے اُسے سخت عناد تھا۔ وہ کہتا تھا کہ "مذہب چند بے جان رسوم کا نام ہے جنہوں نے انسان کے ہوش و حواس پر اس طرح قبضہ جما رکھا ہے کہ غور و فکر کرنے کی تمام صلاحیتیں

سلب ہو گئی ہیں۔ ہندوستان میں مذہب کے ہاتھوں جس جس طرح ہماری
مٹی پلید ہو رہی ہے اُس کا سب سے دردناک پہلو ہماری غلامی ہے
غور کیجئے کہ یہاں ہم کھڑے ہیں اور سامنے آزادی کی دیوی ہے جس کے
جلو میں دولت و حکومت کی تمام نعمتیں اور جاہ و حشمت کی تمام سرفرازیاں ہیں
لیکن ہمارے اور اس دیوی کے درمیان مذہب ایک اژدہے کی طرح
حائل ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اس لاش کو کب تک اپنے کندھوں پر
اٹھائے پھریں گے"۔

اُس کی خواہش تھی کہ وہ روزمرہ زندگی کی فرسودہ اور پامال روش
سے ہٹ کر چلے خواہ اُسے یہ امتیاز پیدا کرنے کے لئے لوگوں کے تمسخر و
استہزا کا نشانہ ہی بننا پڑے۔ اس خواہش نے اُس کے ذوقِ نظر
میں بھی ندرت پیدا کر دی تھی۔ ایک روز میں اس کے ہاں گیا تو وہ کہنے
لگا "آیئے، آج آپ کی آنکھوں کی ضیافت کروں"۔ یہ کہہ کر اس نے ایک
بڑا سا البم کھولا جس میں قدیم و جدید مصوّری کے بہترین نمونے موجود تھے۔
چند حسین و جمیل عورتوں اور خوشنما قدرتی مناظر کے فوٹو تھے۔ وہ ورق الٹتا
رہا اور ہنرِ تصویر کی فنی خوبیاں بڑی شرح و بسط سے بیان کرتا رہا۔ گانا تو وہ
تفریحاً ہر ملاقات میں سناتا تھا۔ مختلف قسم کے سازوں کی آوازیں علیحدہ
علیحدہ نکال کرتا تھا اور پھر اُن میں سے بعض کو ہم آہنگ کر کے کبھی سخت
کرخت اور کبھی نہایت لطیف آواز پیدا کرتا تھا۔ ایک دن وہ میرے
مشام جاں کی مدارات کرتا رہا۔ لکھنؤ، قنوج اور جون پور کے بیش بہا عطر
اُس کے پاس موجود تھے۔ طرح طرح کی ولایتی اور ایرانی خوشبوئیں بھی
تھیں۔ ان سب کو شیشیوں میں بند کر کے اُس نے ایک صندوقچی میں
مقفل کر رکھا تھا۔ اسی طرح ایک اور دلچسپ واقعہ مجھے یاد ہے۔ جاڑوں
کے دن تھے اور سردی خوب زوروں پر تھی۔ ایک روز شام کے قریب
میں اس کے مکان پر گیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پکار اٹھا "آپ بہت اچھے وقت
آئے۔ بس آج رات یہیں رہیئے"۔

میں نے تعجب سے پوچھا "خیریت تو ہے؟"

کہنے لگا "بالکل خیریت ہے۔ میں نے بمبئی سے ایک نہایت اچھی
چیز منگوائی ہے جسے آپ اس موسم میں یقیناً پسند کریں گے"۔

میں نے کہا "بمبئی میں ان دنوں پرتگال کی بنی ہوئی شراب
کثرت سے فروخت ہو رہی ہے۔ کہیں اس کی سو پچاس بوتلیں تو
نہیں منگوا لیں؟"

ہنس کر کہنے لگا "لاحول ولا، آپ کو بھی کیا سوجھا ہے" اور دوسرے
کمرے میں گھس گیا۔ وہاں سے لکڑی کا ایک بکس اٹھا لایا جس میں سے ایک
ریشمیں لحاف نکال کر میرے اوپر ڈال دیا۔ یہ بمبئی کی ایک مشہور ولایتی فرم کا
بنا ہوا نہایت خوب صورت اور نرم و نازک لحاف تھا جس کے اندر بہت
نفیس اور قیمتی پر بھرے ہوئے تھے۔ میں نے لحاف کے بیش قیمت مکلّف
و مطلّا کپڑے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اس لحاف کو اوڑھ کر سونا جسمانی
عشرت کی معراج ہے"۔

کہنے لگا "میں نے اب تک اسے استعمال نہیں کیا۔ جی یہی چاہتا
تھا کہ کبھی آپ تشریف لائے تو اس سے آپ کی تواضع کروں گا"۔

شیدا نے اب تک شادی نہیں کی تھی اور نہ بظاہر اس کا ارادہ
شادی کرنے کا تھا۔ شیدا کے مکان سے تھوڑی دور، اسی سڑک پر،
ہومیوپیتھک کے ایک ڈاکٹر رہتے تھے۔ اُن کی بیوی شعر و سخن کی دلدادہ
اور کسی قدر گانے بجانے کی بھی شوقین تھی۔ شیدا کو اُس سے محبت ہو گئی۔ ایک
روز مجھ سے کہنے لگا "ڈاکٹر نے اس عورت کی زندگی کو بے حد تلخ بنا
رکھا ہے"۔

میں نے پوچھا "کیوں کر؟"

کہنے لگا "ڈاکٹر خود تو بالکل ٹھوس اور جامد طبیعت کا انسان ہے
اور وہ بہت رنگیں خیال، شگفتہ مزاج اور خوش طبع خاتون ہے۔ دونوں
کے مذاق میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ کمبخت دن
رات اُسے طعنے دے دے کر جلاتا رہتا ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ گانا بجانا
رنڈیوں کا کام ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ شرفا کی بہو بیٹیوں کو شعر و سخن سے
کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیئے۔ مجھے اس عورت سے ہمدردی ہو گئی ہے
بلکہ یوں کیوں نہ کہوں کہ محبت ہو گئی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اُسے اپنے
پاس لے آؤں"۔

میں نے چونک کر کہا "اس سے آپ کا کیا مطلب؟ کیا ڈاکٹر
اسے طلاق دے رہا ہے؟"

"طلاق ولاق میں نہیں جانتا۔ کیا آپ کسی بدمذاق آدمی کے ساتھ
ایک گھنٹہ بھی بسر کرنا پسند فرماتے ہیں؟ کیا یہ ظلم نہیں کہ صحبتِ ناجنس کے عذاب کو تمام
عمر محض اس لئے برداشت کیا جائے کہ مذہب نے اس پر جواز کی مہر
ثبت کر دی ہے؟ سماج یہ تو گوارا کرتا ہے کہ دو انسان جو فطری و معنوی
طور پر ایک دوسرے سے اس قدر اجنبی ہیں کہ عام حالات کے اندر

وہ شاید آپس میں گفتگو کرنا بھی پسند نہ کریں صرف اس لئے ایک دوسرے کے ساتھ شکنجے میں جکڑے رہیں کہ سوءِ اتفاق سے ایک مُلّا کی زبان سے چند کلمات نکل چکے ہیں لیکن سماج کو یہ منظور نہیں کہ دو ہم خیال، ہم ذوق اور ہم مشرب افراد اطمینان و مسرت سے ایک دوسرے سے مل کر زندگی بسر کریں۔ نکاح آخر ہے کیا؟ جب دو دل مل جائیں تو پھر کسی بے معنی رسم کی ادائی کی ضرورت ہی کب باقی رہتی ہے! رسموں نے انسان کی روح کو کچل دیا ہے۔ نہ صرف روح کو ہی نہیں کچلا جسمانی مسرتوں کو بھی تباہ کر دیا ہے۔"

میں نے حیرت سے کہا "میں آپ کا صحیح مفہوم اخذ نہیں کر سکا۔ کیا آپ اس فعل کو قابلِ اعتراض نہیں سمجھتے کہ ایک بیاہتا عورت اپنے خاوند کو چھوڑ کر دوسرے مرد کے پاس چلی جائے؟"

وہ بہت جوش سے کہنے لگا "مجھے کوئی اعتراض نہیں میں اسے جائز سمجھتا ہوں۔ چند بے جان رسوم کی خاطر زندگی جیسی گراں مایہ چیز کو رائگاں کھو دینا حماقت ہے۔ انسان دنیا میں ایک ہی مرتبہ آتا ہے۔ بار بار زندگی کسے نصیب ہوتی ہے"۔

ایک روز اچانک مجھے کچہری سے ٹیلی فون آیا۔ شیدا بول رہا تھا۔ "جلدی آؤ۔ خدارا جلدی پہنچو" میں بھاگا بھاگا وہاں گیا تو عجب منظر دیکھا۔ شیدا کے ہتھکڑی لگی ہوئی تھی اور وہ پولیس کی حراست میں عدالت کے کمرے سے باہر کھڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ ڈاکٹر کی بیوی کو اغوا کر لایا ہے اور ڈاکٹر نے اس کے خلاف استغاثہ دائر کر کے اسے گرفتار کرا دیا ہے۔ اب وہ مجھے بلا رہا تھا کہ آ کر ضمانت دوں۔ شیدا کی طلاقتِ لسانی ختم ہو چکی تھی۔ رنگ اڑا ہوا تھا اور منہ سے بات نہ نکلتی تھی میں نے ضمانت دی اور شیدا صاحب کو پولیس کے چنگل سے نجات ملی۔ بڑی جدوجہد اور مصیبت کے بعد مستغیث "راضی نامہ" پر آمادہ ہوا اور مقدمہ عدالت سے واپس لیا گیا۔

اب شیدا صاحب نہایت چپ چاپ زندگی بسر کرتے ہیں بہت کم بولتے ہیں۔ سماج کے خلاف بغاوت کے آثار ان میں نظر نہیں آتے۔ سنا ہے کہ لاہور کو خدا حافظ کہنے کا ارادہ کر رہے ہیں +

عاشق حسین بٹالوی

خوابوں کی شہزادی

تو مرے خوابوں کی دنیا کی تھی شہزادی کبھی

مسکراتی تھی مرے پاکیزہ رومانوں میں تو
رنگ و بو بن کر بسی تھی میرے افسانوں میں تو

تو مرے احساسِ شعری کی حسیں تعبیر تھی
زیست کے خوابِ پریشاں کی جواں تعبیر تھی

تجھ سے تھیں رعنائیاں میرے حزیں افکار میں
تجھ سے سوزِ عشق پنہاں تھا مرے اشعار میں

ارتعاشِ نغمہ بن کر سازِ کے پردوں سے تو
ذرے ذرے میں بپا کرتی تھی حشرِ رنگ و بو

اور کبھی زندہ تھا تجھ سے شیوۂ عشقِ جواں
میرے قدموں پر کبھی جھکتی تھی جوئے کہکشاں

تو نے بخشا تھا مرے دل کو محبت کا غرور
زندگی کو سوز، اشکوں کو چمک آنکھوں کو نور

اور تیرے ہوتے متاعِ دو جہاں کچھ بھی نہ تھا
یہ زمیں کچھ بھی نہ تھی یہ آسماں کچھ بھی نہ تھا

تو مرے خوابوں کی دنیا کی تھی شہزادی کبھی

تابش صدیقی

غزل

یار کی بزمِ ناز میں جو نہ کٹیں جوانیاں
وہ بھی کسی حساب میں آئیں گی زندگانیاں؟

تازہ جہاں میں ہے ابھی قصۂ قیس عامری
اور جم و کیقباد کی بھول گئیں کہانیاں

سرو و سمن بہار میں کس کے ہیں انتظار میں
کس کے خرامِ ناز کی باغ میں ہیں نشانیاں

بھول گئی جفائے دوست یہ بھی تھی اک ادائے دوست
یاد رہی وفائے دوست، یار کی مہربانیاں

ناز و نیاز میں ہوا روزِ ازل معاملہ
عشق کی جانفروشیاں حسن کی دل ستانیاں

حُسن کی وہ ادائے ناز کچھ نہ سمجھ سکے کلیم
دعوتِ شوقِ دید تھیں طور کی لن ترانیاں

لختِ جگر کباب ہے، خونِ جگر شراب ہے
آج خیالِ یار کی دل میں ہیں میہمانیاں

کہہ دیا چشمِ شوق نے حُسن سے ماجرائے دل
کام زباں کا دے گئیں عشق کی بے زبانیاں

کس نے یہ بزمِ حسن میں چھیڑ دیا ربابِ عشق
وجد میں آئیں پریاں رقص میں ہیں جوانیاں

ناظرِ خوشنوا اگر بزمِ چمن میں آ گئے
بھول گئی ہیں بلبلیں اپنی وہ نغمہ خوانیاں

چوہدری خوشی محمد ناظر

کوریا کی قدیم شاعری

ابتدائے عالم سے انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر ہجرت کرتا آیا ہے۔ اپنی جنم بھومی اپنے وطن کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا ایک نہایت سنجیدہ اقدام ہے۔ لیکن اس کی تہ میں ضروریاتِ انسانی اور تقاضائے وقت کے علاوہ تجسس کے ہلکے جذبے کو بھی دخل ہے۔ آریہ لوگ وسط ایشیا سے نکلے کچھ مغرب میں پہنچ کر اپنے ماخذ کو بھول بیٹھے، اور باقی سلسلۂ ہمالیہ کی حدیں پار کر کے ہندوستان کے طلسم خانے کی گوناگون سحر طرازیوں کے جلووں میں کھو گئے۔ مغرب اور ہندوستان دونوں جگہ آریاؤں نے مختلف اور ممتاز تہذیب و تمدن کی بنیاد ڈالی۔ لیکن تاریخ میں ایسی ایک اور مثال بھی ہے۔ کوریا کے رہنے والے آبادی کی کثرت سے برانگیختہ ہو کر روحِ انتقال کے متوالے بنے اور چین کے وسیع علاقے کو آباد کیا۔ وطن کو چھوڑ دیا لیکن خاکِ وطن کی زردی ہمیشہ چہروں پر چھائی رہی اور اس کے علاوہ اولیں اندرونی خصوصیات بھی برقرار رہیں۔ کوریا ہی کی قدیم تہذیب کو چینیوں نے اپنے نئے ملک میں پھیلایا۔ ہر ملک کی طرح چین کی شاعری بھی وہاں کے تہذیب و تمدن کا آئینہ ہے۔ چینی شاعری کی بہت سی مثالیں ہندوستانی کے دامن میں آ چکی ہیں۔ لیکن اس موقعے پر ہمیں کوریا کی شاعری کا اظہار مقصود ہے۔

سنِ عیسوی کی ابتدائی صدیوں سے ہی کوریا (یا "سکون صبح کی بستی") میں علم کے حصول کو ایک قابلِ فخر و اعزاز امر تصور کیا جاتا رہا ہے۔ وہ جنم کے لحاظ سے خواہ کسی ادنےٰ گھرانے سے ہی کیوں نہ متعلق ہو، سیاسی عہدوں کی تقسیم کے وقت ہمیشہ ایک عالم کو ترجیح دی جایا کرتی تھی۔ لیکن چند نمایاں مستثنیات کے علاوہ شعراء عموماً ناکامیاب سیاست داں ہی ثابت ہوئے اور کوریا کی بہترین نظموں میں سے اکثر شعراء نے اس زمانے میں لکھیں جب انہیں اپنے عہدوں پر ناکامی کے باعث جلاوطن یا نظربند کر دیا گیا تھا۔

۱۸۹۴ء سے "گواگو" (سرکاری امتحان)، کوریا کی مہذب نگاہوں کا مرکز تھا اور اس امتحان کا ایک نمایاں اور لازمی جزو شاعری تھا۔ جس طرح آج کل ہندوستانی نوجوانوں کا منتہائے نظر سول سروس ہے، کوریا میں ہر نوجوان جسے ذہانت اور قابلیت کا ذرا بھی دعوےٰ ہوتا اپنی کامیابی کا معیار اسی سرکاری امتحان کو ٹھہراتا۔ لیکن اس سرکاری امتحان سے عہدہ برآ ہونا کوئی آسان مرحلہ نہ تھا۔ اس میں بے حد جاں فشانی اور محنت اور مشقت درکار تھی۔ دو تین سال کے وقفے سے اوپر تلے چار امتحان پاس کرنا ہوتے تھے اور چوتھا امتحان شہنشاہ کے محل خاص میں ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس آخری آزمائش میں شامل ہونے والے بہت نہ ہوتے تھے۔ اکثر پہلی تین منزلوں کی بھینٹ ہو کر قعرِ گمنامی میں کھو جاتے "شہنشاہ کے سامنے قلم تھامنا" ہر شاعر کی انتہائی اُمنگ ہوا کرتی تھی جو طلباء اس چوتھی آزمائش کی کسوٹی پر بھی پورے اُترتے انہیں "ہان لِن" یعنی شاہی اکاڈمی کا ممبر بنا دیا جاتا۔ یا کوریا کی عام شاعرانہ زبان میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ "قلموں کے جنگل میں خراماں" ہوتے تھے۔

کوریا کی عام زندگی علم ادب سے لبریز تھی۔ ہر شخص ہر موقعے پر شعر کہہ لیا کرتا تھا۔ شعر گوئی فطرتِ ثانی کے درجے کو پہنچ چکی تھی۔ کوریا کے جس قدر قدیم ترین اشعار دستیاب ہوئے ہیں، اُن میں سے ایک نظم ۱۷ قبل مسیح میں شاہِ یوری کی کہی ہوئی ہے۔ واقعہ یہ تھا۔ بادشاہ کی بڑی رانی چھوٹی رانی سے روٹھ کر محل چھوڑ گئی۔ بادشاہ رانی کو منانے چلا، لیکن وہ نہ مانی۔ ملول و غمگین، اپنے ناکام سفر سے لوٹتے ہوئے اس نے سرِ راہ ایک درخت کی شاخ پر دو پرندے دیکھے۔ روحِ شاعری

بیدار ہوگئی اور اُس سے متاثر ہو کر ذیل کا گیت لکھا:۔

گیت

سنہرے راستے پر زرد کرنوں میں
کھڑا ہوں میں تن تنہا!
یہ سب میرے ہیں، میرے! — کھیت چاول کے!
سنہرا اسنہ میرا!
یہ سب میرے ہیں، میرے ہیں!
مگر اک بات حاصل ہی نہیں مجھ کو،
تمنا دل میں ہے جس کی!
یہیں ایک پیڑ پر دو زرد طائر پیار کرتے ہیں،
مگر یہ کس لئے گاتے ہیں اتنی شادمانی سے؟"

کوریا کی شاعری پر چینی خیالات کا اثر نہایت آسانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ جب چین پر تی-آنگ۔ خاندان کی حکومت تھی، اُس زمانے میں یہ اثر بہت نمایاں ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس وقت کی چینی نظمیں کوریا میں اس قدر مقبول و معروف ہوئیں کہ کوریا ہی کی قومی ملک سمجھی جانے لگیں۔ نیز اس وقت کوریا کے شعرانے بھی جو کچھ لکھا اُس میں چین ہی کا تتبع کیا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود کوریا کے کلام میں اپنی ملکی روح کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور باقی رہا۔

کوریا کے ابتدائی علم ادب پر ملک کی جغرافیائی حالت کا بھی اثر پڑا۔ کوریا ایک الگ تھلگ سا کوہستانی جزیرہ نما ہے۔ ایسے ملک میں ذرائع آمد و رفت قدرتاً بہت مشکل اور ناقابل اطمینان سے تھے اور اس لئے دوسرے ممالک سے راہ رسم پیدا ہونا ذرا دور کی بات تھی۔ لیکن سفر کی مشکلات کے باوجود ہمیں کئی سفری نظمیں ملتی ہیں، ان میں کوریا کی شاعری کا ایک نہایت خوشگوار پہلو نظر آتا ہے۔ اِن سے شعراء کے ذاتی مشاہدے اور زندہ دلی کا پتہ چلتا ہے۔ مشاہدہ اور زندہ دلی اس زمانے میں کوریا کے شعرا کی مخصوص افتادِ طبیعت تھی۔ اس قسم کی نظموں کی مثال کے طور پر ۱۵۵۴ء میں لکھی ہوئی "پی-چونگ-کو-ی" کی ایک نظم پیش کی جا سکتی ہے:۔

چین کو سفر پر جاتے ہوئے

"یہ کاروانسرائے اک مثال ہے سکون کی،
کنارے جوئے آب پر!
کنارِ جوئے آب پر ہیں زرد زرد بید سر نکال کر کھڑے ہوئے،
فضائے نیستاں سے!
یہاں پر نرم نرم نیلگوں غبارِ آسمان صبح کو
شکستہ کر رہے ہیں پارہ ہائے ابرِ دُرفشاں!
یہاں پر شام ایک ریشمی علَم بنی ہوئی،
چھا گئی —
کوہ کی چٹان پر!
سفر کے دن خطوط بن کے جلوہ گر ہوئے رُخِ فسردہ پر،
مگر میں جانتا نہیں،
کہ کوئی ساعت اس سے ہو سکون میں بڑھی ہوئی،
میرے خیال اس طرح ہیں جس طرح ہوں جھاڑیاں،
کنارِ جوئے آب پر جہاں جہاں!
یہ میرے نغمے موجہائے آبشارِ خواب ہیں!!"

چونکہ تمام شعرا کی اولین حیثیت علما کی ہوتی تھی، اس لئے ان کے کلام میں عشقیہ جذبات کا فقدان ہے۔ کوریا کے شاعروں کے لئے عورت اور مرد کی محبت کا موضوع جذباتی اور جمالیاتی، دونوں حیثیتوں سے ناقابل قبول تھا کیونکہ وہ جنسی تحریک کو بھی کھانے اور پینے کی طرح زندگی کا ایک لازمی پہلو سمجھتے تھے اور اس میں اُن کے لئے کوئی شاعرانہ دلچسپی اور دلکشی نہ تھی۔ لمبے لمبے مباحثوں کو بھی نظم کی صورت میں لکھنے کا رواج تھا لیکن وہ ہماری اختصار پسند طبیعتوں کے لئے بیزار کن ہو سکتے ہیں۔ اور اُن میں ہماری ذہنیتوں کے لئے کوئی بات قابل توجہ نہیں۔ سیاسی ہجویں بھی لکھی جایا کرتی تھیں لیکن ان کا بھی یہی حال ہے۔ فن کے لحاظ سے اچھی خاصی ہونے کے باوجود وہ علم ادب کے مطالعے کے لئے صرف فضائے بعید کا کام ہی دے سکتی ہیں۔

کوریائی شعرا کے موضوع تین سرخیوں کی ذیل میں آسکتے ہیں — ۱۔ فکریہ نظمیں، ۲۔ دوستوں کے متعلق (اور اسی میں نوحے اور مرثیے بھی شامل ہیں) اور ۳۔ طنزیہ نظمیں۔

لیکن ان طنزیہ نظموں میں سے بہت ہی کم ایسی ہیں جن کا لطف ترجمے میں بھی برقرار رہ سکے۔ ایک نظم مثال کے طور پر دی جاتی ہے۔ جسے "لی-اِن لو" نے لکھا تھا۔ یہ شاعر اپنے زمانے کے مشاہیر میں شمار ہوتا تھا لیکن اس کا شاعرانہ کلام بہت ہی کم ہے:۔

عہدِ نو پر خیالات

شمع جلتی ہے، یہ شعلہ ہے کہ لَو مرمر کی،
شانہ جاتا ہے مِرے بالوں میں ایسے . . . ایسے . . .
اب چلا ایک طرف، ــــ اب یہ چلا ایک طرف۔
سر ہے اب صاف مِرا!
مردہ جو بال تھے وہ گر کے زمیں پر بکھرے!
تازہ اور چسپ کیا، باندھ لیا پھر سے انہیں[1]۔
کاش! اس طرح سے ہم ملک میں شانہ کر دیں،
حرص کو اور حماقت کو روانہ کر دیں!
ہاں، اسی طرح سے پژمردہ خیالوں کو نکالیں دل سے!
اور نئی قوتیں پیدا کریں دشمن سے نبٹنے کے لئے!
شمع جل جل کے بجھی، لو وہ بجھی ــــ لو وہ بجھی۔
مرمریں شعلہ لرزتا ہوا خاموش ہوا!
نیند میں ڈوب گئیں ساری امنگیں دل کی!

فکریہ نظموں میں کوریائی شاعر کا محبوب ترین موضوع چاند ہے صدیوں سے یہ اُس کے دل کو لبھاتا آیا ہے۔ آئے دن نت نئی تشبیہیں اور استعارے اس کے لئے وضع کئے جاتے رہے ہیں۔ کبھی اسے "مشعلِ بے دود" کہا جاتا ہے، کبھی اسے "ماہ امبر" پکارتے ہیں، اور کبھی "کشادہ، خنک محل" کا لقب دیتے ہیں۔ صرف ایک چیز، چاند کے لئے ہی اتنے بے شمار ناموں کا تواتر ترجمے میں پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے۔

کوریا کی چاندنی صاف ستھری اور شفاف ہوتی ہے اور اس میں ایک جادو کی سی خاصیت ایک سیدھے سادے گاؤں کو رات کے وقت ایک "مرمریں بستی" میں تبدیل کر دیتی ہے۔ ذیل کا گیت دوسری صدی عیسوی کے آغاز میں "چوئے چنگ" نے لکھا تھا۔ وہ ایک نیک اور متین آدمی تھا اور اُس نے یہ گیت سرود اور ڈھولک کے ساتھ گانے کے لئے تصنیف کیا تھا۔

رات کا وقت

مشعلِ سیمیں کا نور
نور ــــ بے دودِ فغاں!

ساتویں طبقے سے گہری نیند کے
مجھ کو لے آیا اشاروں میں یہاں!
ایک سایہ ہے صنوبر کا در و دیوار پر،
اور چلمن پر مری
سایہ آسا کوہ ہے!
میرے گھر میں زندگی بھی آج اک سایہ سا ہے!
مجھ کو کچھ احساسِ بیداری نہیں،
نیند کا احساس بھی معدوم ہے!
ایک موسیقی ہے اس گہری خموشی میں رواں!
کیا صنوبر میں ہے یہ بادِ پریشاں کی صدا،
اور یا پارہ ہے ایسے گیت کا،
جس کا حامل ہے کوئی سازِ نہاں؟

چھٹی اور آٹھویں صدی عیسوی میں کوریا کے تہذیب و تمدن ترقی کی انتہائی بلندی پر پہنچے، اور پھر رفتہ رفتہ ان کا زوال شروع ہوا، اسی زمانے میں مردوں کے باہمی عالمانہ اُنس و رفاقت نے علم ادب پر ایک گہرا اثر کیا۔ اکثر یوں ہوتا کہ دو امنگوں بھرے دل والے نوجوان اکٹھے سرکاری امتحان کی تیاری کرتے آخر اُن کی ہمدمی اس قدر گہری ہو جاتی کہ وہ "شگفتہ لوکے باغیچے کی قسم" کھاتے۔ یہ ابدی رفاقت کی قسم کا نام تھا اور اس کے بندھن تمام زندگی بلکہ موت کے بعد بھی قائم سمجھے جاتے تھے۔ اس قسم کی رفاقتوں سے کوریا کے گلستانِ ادب میں نادر ترین پھول کھلے۔ باہمی جرأت افزائی اور ہمدردانہ نظرِ انتقاد سے ادبی معیار بہت بلند ہو گیا۔ اگر کوئی دوست مر جاتا تو دوسرا اس کی یاد میں نوحہ یا مرثیہ لکھتا اور عموماً وہ مرثیہ ایک ادبی جوہر ثابت ہوتا۔ ہم ایسے مرثیوں کی مثال کے طور پر ۱۴۷۰ء میں "یی سونگ ان" کا لکھا ہوا نوحہ درج کرتے ہیں۔

دوست کا نوحہ

(۱)

دل ہے بھرپور غموں سے میرا!
جھینگروں کی یہ صدا بارش میں
شادماں شادماں خرم خرم،
مجھے یاد دلاتی ہے ترے!

[1] کوریا کے مرد بھی پنجاب کے سکھوں کی طرح بلکہ جنوبی ہند کے باشندوں کی طرح سر کے مختصر بالوں کو جوڑے کی صورت میں لپیٹ کر باندھ لیا کرتے تھے۔

(۲)

چشم لبریز غموں سے میری!
لالہ گوں صبح کا رنگیں پردہ
کوہ شفاف پہ آویزاں ہے،
گویا ہے تیری عبائے زریں،
سُرخ اور سبز سے رنگوں والی!

(۳)

گھر ہے بھرپور غموں سے میرا!
گھر میں جتنی بھی صدائیں ہیں سُنے
طنز کرتی ہیں اُس آواز پہ سب
خواب آسا ہے جو میرے دل میں!

اسی قسم کی عالمانہ اُنس و رفاقت کی مثالیں ان مطالعہ گاہوں میں بھی دیکھی جا سکتی تھیں جہاں علماء اور طلباء مقدس کتابوں پر بحث و تمحیص اور مطالعہ و تعلیم کی خاطر اکٹھے ہوا کرتے۔ کوریا کے مذہبی اور ادبی خیالات پر کئی صدیوں تک ان مطالعہ گاہوں کے اثرات پھیلتے رہے۔
کسی غیر زبان میں ہر نظم کا ترجمہ یوں کرنا کہ فرداً فرداً ہر ایک شاعر کے طرز و بیان کا اندازہ ہو سکے، بہت ہی مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ لیکن اس کے باوجود چند مخصوص رجحانات ہیں جن کی بنا پر ہم ان میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ وہ شعراء جو گوشہ نشینی کی علیحدگی اور سکون میں غور و تفکر کے ساتھ شاعری کرتے تھے، اُن کا کلام فنی لحاظ سے زیادہ نفیس اور زیادہ مکمل ہے۔ ان کے کلام میں درباری شاعر کے کلام کی نسبت زیادہ پُر وقار تخیل کی موجودگی معلوم کی جا سکتی ہے۔ بارھویں صدی میں لکھی ہوئی ذیل کی دو نظموں سے اندازِ بیان کا یہ اختلاف واضح ہو سکتا ہے۔ ان میں سے ایک "کواک۔ کو" کی لکھی ہوئی ہے جو ایک کامیاب سیاست داں تھا۔ وہ اپنی عالمانہ قابلیت کی وجہ ہی سے سیاسی حلقے میں داخل ہوا اور اس نے شاعر ہونے کے باوجود اپنے کو کامیاب ثابت کیا۔ اس کا دوست میی۔ چان۔ یون" ابھی اپنی پبلک زندگی میں کامیابی اور شہرت کے درجے پر ہی تھا کہ تارک الدنیا ہو گیا۔ تیس سال کے بعد "کواک۔ یو" اپنے دوست سے ملنے کے لئے گیا۔ کوریائی رواج کے مطابق دونوں عالموں نے اس واقعے کے متعلق ایک ایک نظم لکھی۔ پہلی نظم "کواک۔ کو" کی ہے۔

دور و نزدیک

"پربت کی فضائیں،
اک عرصہ گذرنے پر ہیں ہم دونوں ملے آج،
ہم دونوں — جوانی میں جو اک جان تھے — اک جان!
شمع کے اجالے میں کئے کام — کئے کام،
ہم دونوں نے مل کر،
طے کہ ہوئی صبح، گئی رات کی رانی!
لیکن ہمیں اب دور کیا بیتے دنوں نے،
ہاں، تم نے نگاہوں کو ہٹایا،
"گلزار" کے در سے!
"گلزار" کا ہر برگ بلا نا رہا بیکار،
تم لوٹ کے کب آئے! — نہ آئے!
بس، چرخ پہ اڑتی ہوئی کونجیں،
اور ابر کے پارے،
تھے سر پہ تمہارے،
تم چلتے گئے، چلتے گئے، چلتے گئے تم!
تھے شام و سحر پیرہن جسم تمہارے،
اور ساغر مہتاب تھا تمہاری رضا پر،
تم نوش کرو تا کہ نئے ماہ کے ساغر!
اب دیکھتا ہوں تم کو، جھجکتا ہوں،
میرے لب پہ ہے اک قفل خموشی!
اب کیسے ملیں روحیں ہماری"!

اس نظم میں ہم دیکھتے ہیں کہ کوریا کی شاعرانہ اصطلاحوں کا جابجا استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً "گلزار" کے معنی گلزار ہی نہیں، اس سے مراد نگارخانہ ہے۔ گویا ایک دوست دوسرے دوست کو تارک الدنیا ہونے کی وجہ سے طنزیہ مخاطب کر رہا ہے۔
اس قسم کی اصطلاحوں، استعاروں اور تشبیہوں کا مطالعہ شاعری میں ایک مخصوص اہمیت رکھتا تھا اور اس فن کو مکمل طور پر جاننے کے لئے ضروری تھا۔ نہ صرف ایک استعارے، تشبیہہ یا محاورے ہی کو ذہن نشین رکھنا ضروری تھا بلکہ اُس کے متعلقہ خیالات بھی چونکہ شاعرانہ تصور کو تکمیل دینے میں لازمی حصہ دار ہوتے تھے اس لئے لفظ کے سامنے

آتے ہی ان سب کا تازہ ہو جانا بھی ایک فیصلہ شدہ امر تھا۔

صنعت ابہام اور دوسرے ذومعنی اشارات جاپانی شاعری میں بہت پائے جاتے ہیں لیکن کوریا کے شاعروں کے کلام میں شاذ ہی ان کی موجودگی دریافت کی جا سکتی ہے۔ مثلاً "کواک کو" کی مندرجہ بالا نظم میں ان کی بھرمار ہے۔ "چرخ پر اڑتی ہوئی کونجیں" اور "ابر کے پارے" نہ صرف سفر کے منظر کی تصویر کو بناتے ہیں بلکہ مخصوص محاورے میں ان سے روحانی اور علمی خیالات بھی مقصود ہوتے ہیں۔ یہ گو یا استعارہ ہیں، یعنی ایسے خیالات ابدیت کی طرف رجوع کرتے ہوئے بلندی کی جانب لے جاتے ہیں۔

اس نظم کے جواب میں "پی جان یون" نے بھی "کنج عزلت میں دوست سے ملاقات" کی سرخی سے ایک نظم لکھی تھی۔ اگرچہ وہ بہت لمبی ہے اور تمام کی تمام پیش نہیں کی جا سکتی لیکن اس کے اقتباس اس طریقے پر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں کہ کمل بھی معلوم ہو اور دونوں شاعر دوستوں کے خیالات اور احساسات کا اختلاف بھی ظاہر ہو جائے

کنج عزلت میں دوست سے ملاقات

"رات ــــ ہاں کل رات تھا ماہ خزاں،
اور پرواز و داعی تھی عیاں!
آج آمد ہے تری،
لوٹ کر آئی بہار!
"جب تلک فرقت مری ساتھی رہی،
میں تھا اور تیرے خیال!
رات کو کہتا تھا میں یوں چاند سے،
جھانک کر روزن سے دیکھ آئے تجھے!
تاکہ جب لوٹ آئے پھر اس کوہ پر،
دوست کی حاصل ہو مجھ کو کچھ خبر!
آہ! لیکن چاند چپکا ہی رہا!
وہ نہ پہنچا، وہ نہ لوٹا، اور نہ اس نے کچھ کہا!
"جب کبھی دھیان آ گیا مجھ کو ترا،
میں نے بس سوچا یہی،
جلد تو تنگ آ جائے گا تو اپنی مصروفیتوں سے اے ندیم!
"آہ! اتار اپنی کلاہ،
گیسوؤں کو اپنے آزادی دلا!
دور کر دے گی ہوا سر سے ترے گرد جہاں!
اور اس سنگین بستر پہ ذرا آرام کر،
پُرسکوں دل اپنے پہلو میں لئے۔
"میں نہیں کہتا صنوبر کے شجر خاموش ہیں،
ان کی ہلکی ہلکی سی سرگوشیاں کوئی نہیں!
لیکن ان کے دل میں سازش کا گمان کوئی نہیں!
پاسبان انجم تلاش عیب میں نازاں نہیں،
ابر کے دامن میں خنجر کوئی بھی پنہاں نہیں!"

اس نظم کے شروع میں ایک دورسی تشبیہیں استعمال کی گئی ہیں مثلاً "پرواز وداعی" سے کونجوں کے اڑ کر رخصت ہو جانے کی طرف اشارہ ہے اور "آ بہار" سے مقصد مسرت کی تازگی ہے، دوست سے دوبارہ ملنے پر لیکن اس کے بعد شاعر کا انداز بیان اس سادگی کا حامل ہو جاتا ہے جو اس کے سادہ زندگی بسر کرنے کا نتیجہ تھی۔

آخر میں ہم ان دونوں دوست اور عالم شاعروں کا بیان مکمل کرنے کے طور پر تین صدی بعد رشتہ کے ایک شاعر یی۔ وہانگ کی ایک نظم درج کرتے ہیں جو اس نے "پی جان یون" سے صد درجہ عقیدت ہونے کی وجہ سے لکھی تھی۔

"گورو کا خیال کرتے ہوئے"

"شام کا وقت ہے، آکاش پہ بھورے بادل،
جمع ہو ہو کے ملے، ان سے بنا اک جنگل!
جھومتا جھومتا دریا بھی چلا جاتا ہے،
سمت پچھم کی وہ چپ چاپ بہا جاتا ہے!
قلب لرزاں کو لئے پہلو میں، ہوں میں بھی رواں،
اُسی رستے پہ، وہ اک روز خراماں تھا جہاں!
مرا آقا، انہیں رستوں میں، یہیں رہتا تھا،
ہل چلاتا ہوا کھیتوں میں یہیں رہتا تھا!
ایسے گیانی کے خیالوں میں جو ڈوبے کوئی،
وقت دھندلا کے مٹے، یاد نہ پھر آئے کبھی!
ماہ سے جیسے سر اک لحظہ فلک ہے روشن،
روح اس کی بھی یوں ہی نور کا تھی اک مخزن!
کلۂ کوہ کی مانند تھی اس کی [illegible]

تھی بلندی کو رواں پھول کے ہر اک پتی!
ان پہاڑوں کی خموشی کا شکوہ ابدی،
عمر بھر کے لئے اس روح کا تھا اک ساتھی!
اس کے دل میں نہ تھی دنیا کی تمنا کوئی،
ہیچ تھی دہر کی ہر بات نظر میں اُس کی"!

یہ نظم عقیدت مند شاعر نے اپنے روحانی رہنما کے مسکن یعنی اُن پہاڑوں کی زیارت کے وقت لکھی تھی۔

ان دونوں عالم شاعروں کے تیس سال بعد کوریا کے قدیم ادبی حلقے میں ایک اور بڑا آدمی پیدا ہوا۔ اس کا نام "پی۔کیو۔یو" تھا اور یہ بیک وقت شاعر بھی تھا، عالم بھی اور سیاست دان بھی۔ مختلف تحریروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص ہر پسندیدہ انسانی صفت کا مالک تھا۔ اس کی ابتدائی زندگی غربت سے جنگ اور کشمکش حیات میں گذری۔ علم کے حصول میں اُس نے اکثر اپنا پیٹ کاٹا۔ فاقے کئے اور علم کو ترجیح دی اور یوں اس جادۂ مستقیم سے ذرا منحرف نہ ہوا جسے اس نے اولو العزمی سے اپنا مقصود بنا رکھا تھا۔ جوانی کے زمانے سے ہی اس نے اپنی قوتِ ارادی کو تربیت دے کر اپنے ذہن پر اس درجہ قابو پا لیا تھا کہ جسمانی آسائش اور تن آسانی کے خیال اس کی نظر میں بے بنیاد اور ہیچ تھے۔ وہ تحریر اور تقریر میں ایک بے لاگ اور صاف گو انسان تھا اور اس لئے اُس کے کئی دشمن پیدا ہو گئے تھے۔ اپنے زمانے کے لحاظ سے وہ ایک نہایت صاف دل انسان تھا اور اس کی یہی خوبی بسا اوقات ترقی کے راستے میں ایک روک ثابت ہوتی رہی۔ لیکن مخاصمت اور مخالفت کے باوجود وہ بے خوفی اور مستقل مزاجی سے اپنے راستے پر گامزن رہا۔ سرکاری امتحان پاس کرنے کے بعد اسے دربار میں ایک عہدہ مل گیا۔ لیکن جلد ہی اُسے ایک سال کے لئے جلاوطنی برداشت کرنا پڑی۔ بہر حال ایک سال کے بعد اُسے از سر نو سرکاری ممتحن کے عہدے پر بحال کر دیا گیا۔ لیکن دنیوی قدر و منزلت اور ترقی کا بیان اس کی روحانی اور ذہنی نشو ونما کی بہ نسبت دلچسپ نہیں ہے۔ اس کی فطرت ایک مستقل شعلۂ سوزاں تھی۔ موسیقی اور شاعری ہی حقیقتاً اُس کی اصل زندگی تھی۔ انہیں سے اس نے اپنی ہستی کو برقرار رکھا۔ انہیں سے اُس نے ایک ایسی آسمانی قوت حاصل کر لی جس کی وجہ سے کوئی طاقت اس کے امن و سکون کو برہم نہ کر سکی۔ اس کی شاعری شخصی اور داخلی ہے

اور اس میں موضوع کا ایک حیرت ناک تنوّع پایا جاتا ہے۔ اس کی بہترین نظمیں عموماً لمبی ہوتی ہیں لیکن یہاں پر ہم تین مختصر نظموں کو پیش کرتے ہیں۔

صبح کی آمد

زاغ اپنے آشیاں میں محو گویائی لبِ دریا پہ ہے،
جانتا ہوں میں سحر ہونے کو ہے،
زرد ہوتا جاتا ہے سیمیں رُخِ ماہِ تمام!
ہیں سپید لہریں خراماں
جیسے سائے بادلوں کے چاند پر!
اور نسیم صبحگاہی جاگ اٹھی
اس جگہ ــــــــ
جس جگہ کھاتے ہوئے خم چھو لیتے ہیں کچھ شجر!
اور اس گہری خموشی میں کہیں سے ــــــــ دور سے ــــــــ
ایک نغمہ آرہا ہے بے نشاں رفتار سے بہتا ہوا،
رفتہ رفتہ ہوتا جاتا ہے وہ یوں آتے ہوئے،
نزد سے نزدیک تر!
رات کا ہر اک مچھیرا جا رہا ہے اپنے گھر کو لوٹ کر،
اُجلے، پھولوں سے ہیں اُن کے پیرہن،
جس طرح اجلی ہیں کرنیں چاند کی!
دونوں گویا ایک ہیں!
یہ کوئی روحیں ہیں یا انسان ہیں، مجھ کو نہیں اس کی خبر!
رفتہ رفتہ اُن کے نغمے مٹ گئے!

دوسری نظم کی سرخی "رخصت" ہے۔ اس کے ساتھ ہمیں ایک نوٹ بھی ملتا ہے "تیسرے چاند کے آخری دن شاعر تصور میں بہار کے دیوتا کی رخصت کا منظر دیکھتا ہے"۔

رخصت

گرے پتوں سے، پھولوں سے بنا گلزار میں بستر ما
ہے سویا موسمِ گل کا بستی دیوتا اس پہ!
فلک پر چاند اب دھندلا چلا ہے، آخرِ شب ہے،
مگر سویا ہوا ہے دیوتا، وہ ہوش میں کب ہے؟
یکایک نیند میں اس نے کیا محسوس یوں، گویا۔

کوئی گل نکہتِ شبنم کو اس کے پاس لے آیا !
ہوئی جب نیند سے دوری، وہ ہنستے ہنستے جاگ اٹھا،
اور اپنے بسترِ گلہائے تر کی قید سے نکلا !
بنا تھا بوئے گل کے نشے سے مخمور، مستانہ،
تلاشِ عشق میں ہر سمت وہ پھرنے لگا تنہا !
وہ اپنی کیفیت کا اب کسے ہمدم بنائے گا ؟
وہ شفتالو سے اپنے عشق کا اظہار کر دے گا !
مگر عشووں نے اس کے دیوتا کو ہے تھکا ڈالا !
تو کیا خوبانیوں کا پیڑ اس کے دل کو بھائے گا ؟
نہیں اس میں بھی اک تندی ہے دل اس پر نہیں آتا !
مگر اک پھول کے پودے کا پیراہن تھرکتا ہے،
چمکتا ہے کہ گویا کوئی پروانہ لرزتا ہے !
اور اس کے برگ ہائے سرخ میں لرزش ہوئی پیدا!
بسنتی دیوتا کا نام اس لرزش میں جاگ اٹھا۔
یہی اب ہمدمِ کیفیتِ مخمور ہو جائے،
یہی گل، جس سے بڑھ کر آسماں بھی پھول کب لائے ؟
فلک پر چاند اب مٹنے لگا ہے، آخرِ شب ہے،
وہ شعلے صبح کے آئے، وداعِ ماہ و کوکب ہے!
صدا آتی ہے دھندلی سی کسی دوری سے قدموں کی !
سحر کی اب حکومت چھا گئی، گلزار خالی ہے،
جلوسِ رنگ و گل کی گونج ہی محسوس ہوتی ہے !
گری جاتی ہے ہر پتی، یہ اب حالت ہے پھولوں کی!
سحر کی اب حکومت چھا گئی، گلزار خالی ہے !
صدا کچھ آنسوؤں کی کان میں رہ رہ کے آتی ہے !

تیسری نظم واقعاتی ہے اور اس سے "پی کیو۔ یو" کی خاص ذہنی افتاد کا اظہار بھی ہوتا ہے کیونکہ کوریا جیسے رسمی خیالات والے ملک میں لڑکیوں کی کوئی اہمیت نہ تھی اور ایک باپ کی نظروں میں ہمیشہ بیٹے کا درجہ ہی بڑا ہوتا تھا۔ ہم اس نظم کا ترجمہ نثر میں پیش کرتے ہیں۔

ننھی بچی کی موت پر

میری ننھی بچی، چمکتی ہوئی برف سے چہرے والی،
خاموش صحن کیسا سونا معلوم ہوتا ہے،
ایک دن یہیں اس کے رنگین پیراہن پھولوں میں نظر آیا کرتے تھے !
ابھی دو ہی سال کی تھی کہ میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگی،
جب تین برس کی ہوئی تو بڑی پیاری بڑی شرمیلی، چپ چاپ تیز دل۔
اس سال وہ چار برس کی ہو جاتی۔ وہ اپنے ننھے سے ہاتھ میں قلم لیتی
اور میں اسے لکھنا سکھاتا۔
لیکن وہ تو چلی گئی۔ صرف قلم ہی باقی رہ گیا۔
اس گھر کے آشیانے میں رہنے والی میری ننھی سی چڑیا!
تو اتنی جلدی کیوں اڑ کر چلی گئی۔
جیسے بجلی چمکے — تو آئی، اور یونہی چلی گئی، جیسے بجلی چمکے!
گذرتے ہوئے دنوں کو چپ چاپ دیکھتے رہنا میں نے سیکھا ہے،
میں یہ گذرتے ہوئے دن کاٹ سکتا ہوں۔
لیکن ایک ماں کے آنسوؤں کو کون خشک کر سکتا ہے ؟
کھیتوں میں آندھی کے طوفانی آثار دکھائی دے رہے ہیں۔
آج رات ہوا کے تھپیڑوں سے اناج کی کئی بالیں گر کر ضائع ہو جائیں گی۔
کسان جس قدر بوتا ہے، اتنا اُسے کاٹنے کو نہیں ملتا!

"پی کیو۔ یو" کے علاوہ عام رجحانات سے مختلف ذہنیت رکھنے والا ایک اور شاعر بھی کوریا میں ہوا ہے۔ اس کا نام "ای رسونگ۔ ان" تھا اور اس کا زمانہ چودھویں صدی میں ہے۔ اس کی نظم "خزاں کا گیت" مختصر نظموں کی ایک اچھی مثال ہے۔ اس میں کم جگہ میں شدید اختلافات کو سمویا گیا ہے۔ اور یہ انداز چودھویں صدی سے لے کر کئی سالوں تک کوریا میں مقبول اور رائج رہا ہے۔

"خزاں کا گیت"

بگولوں کی طرح اڑتے ہیں پتے صحنِ گلشن میں، —
گذشتہ سال تھی آواز محو رقص قدموں کی،
مگر امسال آتی ہے صدا آنسو کے نغموں کی !
سیاہ و سُرخ سایہ پیڑ کا پانی کے دامن میں، —
گذشتہ سال قلبِ شاداں مسرورِ شاعر کا،
مگر امسال خونِ سرخ ہے ہر فردِ لشکر کا !

سولھویں صدی کا ایک شاعر جو زیادہ تر "یول۔ کوک" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لوگوں کی نظروں میں ایک مہاسنت کا رتبہ رکھتا ہے۔ اس کے زمانے سے عالمانہ فرقے کی وہ قدر و منزلت نہ رہی جو پہلے تھی۔ بدنتا

ہوا زمانہ تھا اور تنزل کا دور دورہ۔ اُس کی ایک نظم ہے:۔

وطن کے مصائب کے خیال میں

تین مہینے آج سے پہلے!

تین مہینے آج سے پہلے
میں نے کہا تھا اپنے دل سے
"اب کے چاند پہ کٹ جائے گا"
اے دل! میری دکھ یہ تیرا!"

آئی بہاریں، چھائی بہاریں،
سوکھے اور مرجھائے پتے،
ان سب پر ہریالی چھائی!
پھول کھلے، کھل کر مسکائے،
چاند نیا آکاش پہ آیا!
ساون کی برکھا نے اپنا گھیرا سارے جگ پر ڈالا!
پربت کی چوٹی سے بہتی ہر اک دھارا زور سے گرجی!
برکھا نے جب ایک ہی پل کو،
سانس لیا، اور بیٹھی چپ ہو،
پھلواری میں دادر بولے،
آنسوؤں جل نینوں سے برسا،
پھر سے جاری ہو گئی برکھا!

جیسا کہ پیشتر لکھا جا چکا ہے محبت کی نظمیں قدیم شعرا میں شاذ ہی ملتی ہیں لیکن اس کے باوجود چند ایسے نغماتِ عشق ہیں جن کی طرف توجہ کرنا چاہئے۔ ایسی نام نظمیں یا گیت اکثر طوائفوں، داشتاؤں یا رقاصہ لڑکیوں کی تصنیف ہوتے ہیں اور اس لئے ان کے لکھنے کے نام کا کبھی پتہ نہیں چلتا۔ یہ گمنام ہی رہتے ہیں۔ اگرچہ ان کو کوریا کی بلند یا معیاری شاعری میں جگہ نہیں دی جاتی۔ پھر بھی ان میں اپنی ایک گونہ دلکشی موجود ہوتی ہے۔ مثال ذیل میں لیجئے:۔

"دھوکا"

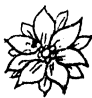
کئی بار دیکھے ہیں میں نے،
ترے لوٹ کر آتے قدموں کے سپنے؛
مگر آنکھ کھلنے پہ دیکھا،
صدا تھی وہ بارش کی روزن کے پردے پہ،
اور پیڑ کی ٹہنیوں پہ!
یہ کیفیتیں اس قدر دیکھ بیٹھی ہوں، ڈر ہے،
کہ اب راہ تکتے ہیں، چپ سے،
کہیں آنہ جائے تو برسات کا اک دھندلکا ہی بن کر!

کوریائی ادب کا زوال رفتہ رفتہ ہوا انیسویں صدی کے آغاز میں اس انقلاب کے آثار خاصے نمایاں ہو گئے۔ جوں جوں غیر ملکی اجنبیوں نے ملک میں داخل ہونا شروع کیا، اور ہر قسم کے مغربی اثرات نے اپنے پاؤں جمانے شروع کئے، اشیا اور حقائق کی قدر و قیمت کا وہ پہلا احساس دھندلا ہو کر معدوم ہوتا گیا۔ قومی زندگی میں عالمانہ ارتقا کی وہ اہم ترین حیثیت باقی نہ رہی۔

رفتہ رفتہ پرانے اور نئے زمانے کے ان اختلافات کی درمیانی حدود کا فاصلہ بڑھتا گیا۔ کوریا کا پرانا باشندہ فضائے بعید میں دکھائی دینے لگا، کنفیوشس کے عقاید کو دل میں لئے ہوئے، عالم اور شاعر جس کی روح خیالی دنیاؤں کی سیاح تھی اور ماضی کی اس باوفا شکل کے مقابلے میں آج کل کے کوریا کا نوجوان نظر آنے لگا۔ ان دونوں کے باہمی اختلافات کی کوئی حد ہی نہیں۔

کوریا کے ادب کا آج کیا درجہ ہے یا مستقبل میں اس کی کیا حالت ہوگی، اس بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن کوریا کے شاعروں کی روشن اور متفاول افتادِ طبع اور رجحانِ ذہنی سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ کوریا کے ہر شاعر کا مطمعِ نظر بلندی اور ترقی کی طرف ہوتا ہے۔

میراجی



دعوتِ شوق!

بنائے عہدِ محبت کو استوار کریں! بُھلا کے شکوے گلے آؤ مل کے پیار کریں!

تمام عمر اسی انتظار میں گزری نہیں کہو کہ ابھی کب تک انتظار کریں

وہ دل کہ ہیں غمِ فرقت سے تیرہ و تاریک نشاطِ وصل سے پھر ان کو زرنگار کریں

بہار لائی ہے رنگینیوں کے میخانے دلوں کو آؤ ذرا ہم بھی مے گسار کریں

بجا ہے پیرہنِ ضبط و احتیاط کو ہم جنونِ فصلِ بہاری میں تار تار کریں

پہن کے پھول کریں رقص صحنِ گلشن میں ربابِ شوق و محبت کو نغمہ بار کریں

فضائے روح میں بھر دیں گلوں کی رنگینی سرودِ دل کو ہم آہنگ آبشار کریں

صلائے رقص، صلائے طرب، صلائے سرود کچھ احترامِ صلاہائے نوبہار کریں

بہار آئی ہے، اے کاش تم بھی آجاؤ!

کھلے ہیں پھول ذرا تم بھی مسکرا جاؤ!

اثر صہبائی

غزل

سناؤں تجھ کو میں کیوں کر غمِ نہاں اپنا
نہیں ہے رازِ دروں محرمِ زباں اپنا

دکھاؤں کیا تمہیں نظارہ اپنی پستی کا
کہیں زمیں سے بھی نیچے ہے آسماں اپنا

نری جفا ہی پہ کیا منحصر ہے لذتِ درد
فلک بھی خیر سے ہے ایک مہرباں اپنا

کرشمہ ہے یہ اک ادنےٰ سا حُسنِ فانی کا
ہوا ہے عشق زمانے میں جاوداں اپنا

سنا ہے منزلِ مقصود رہ گئی پیچھے
ابھی روانہ ہوا تھا نہ کارواں اپنا

الٰہی اس کی تلافی بھی کوئی ہے کہ نہیں
گیا ہے وقت جو جینے میں رائگاں اپنا

رہوں قفس میں تو کچھ روز مطمئن ہو کر
چلوں جلا کے گلستاں سے آشیاں اپنا

کچھ ایسا اپنے خیالوں میں محو ہوں شاہد
الگ جہاں سے ہے اک اور ہی جہاں اپنا

مسعود شاہد

صدمہ

"کچھ بھی ہو، ان کا رویہ نہایت قابل اعتراض ہے، اگر میں آپ کی جگہ ہوتی تو میں ایسے شخص کو کبھی پسند نہ کرتی۔"

"جنک! اپنے پتا کے لئے ایسے الفاظ نہ کہو، وہ تمہارے پتا ہیں اور ——— وہ نہایت اچھے آدمی ہیں، میں تمہیں سچ کہتی کہ ایسا انسان ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتا، میں نے تمہیں وہ راز اس لئے نہیں بتایا تھا کہ تم اپنے پتا سے نفرت کرنے لگو بلکہ انہیں اچھی طرح سمجھ کر ان سے زیادہ محبت کرو، تو بہ! وہ دوسرے شرابیوں کی طرح آسمان کو سر پر نہیں اٹھا لیتے ——— اگر میں تمہیں نہ بتاتی تو کیا تمہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ شراب پیتے ہیں، ذرا کمزور ہو گئے ہیں اس لئے کبھی کبھی پی لیتے ہیں تاکہ طاقت بحال رہے اور معدے کی کمزوری کی وجہ سے کبھی کبھی پی کر مجھ سے جھگڑ بھی پڑتے ہیں۔"

"ماتا! میں جانتی ہوں تم ان کی طرفداری کر رہی ہو، ان حالات کے ماتحت ان کی یہ حرکات حد درجہ معیوب ہیں۔"

سیٹھ ہردے شنکر کسی وقت ایک متمول آدمی تھا، لاہور میں موٹر کی تجارت کی ابتدا اسی نے کی تھی، خوب روپیہ کمایا، لوگ اس وقت سے اُسے سیٹھ کہنے لگے، ایک وقت ایسا آیا جو ہر ایک تاجر پہ آیا کرتا ہے، اس سے غلطی ہوئی اور بڑی بھاری غلطی ——— اس نے ایک ہی ماڈل کی بہت سی کاریں منگوا لیں، وہ ماڈل پسندیدہ نگاہوں سے نہ دیکھا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ موٹریں اس کی دکان میں ہی پڑی کی پڑی رہ گئیں، سیٹھ ہردے شنکر نے اپنا سارا روپیہ اس ماڈل پر صرف کر دیا تھا، یہ ایک صدمہ تھا جس سے سنبھلنا بہت مشکل تھا، اس نے ساتھ ہی آٹو موبائل ریپیئر کا ایک کارخانہ بھی کھول لیا لیکن اس میں بھی خاطر خواہ کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی، سیٹھ جس ٹھاٹھ سے پہلے رہتا تھا اسے گنوانا بھی نہ چاہتا تھا لیکن وہ شان کب تک رہ سکتی تھی، کوٹھی تو خیر اپنی ہی تھی البتہ بنج کے تمام نوکر ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے، بیوی کے تمام زیور بک چکے تھے، قیمتی سامان بھی فروخت ہونے لگا، سیٹھ صاحب دن رات کام کرنے کے باوجود روپیہ نہ کما سکے اس لئے اُن کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ چکے تھے، مزاج میں نشہ کا بہت دخل ہو چکا تھا، ہر روز بیوی سے لڑنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر ہی لیا کرتے تھے اور اپنے خیال کے مطابق محض اس لئے کثرت سے شراب پینی شروع کر دی کہ وہ اپنا غم غلط کر سکیں، کچھ دن ہوئے ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر بھی قسطوں پر خرید لیا تھا، وہ یہ نہیں جاننا چاہتے تھے کہ قسطوں کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا، لیکن ہر لمحہ انہیں یہ خیال چین نہ لینے دیتا تھا کہ ان کا دوست اور ہمسایہ شو دیال بیرسٹر تو ہر روز شام کو موٹر پر سوار ہو کر نکلے اور ان کے اپنے خیال میں ان کی کوٹھی کے عین سامنے زور زور سے ہارن بھی بجائے اور ان کے پاس موٹر نہ ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

موٹر خرید لینے سے انہیں ایک اچھی خاصی مصروفیت ہو گئی تھی، وہ ہر روز بگڑ جاتا تھا اور سیٹھ صاحب دن بھر ہتھوڑا لے کر اس کی مرمت میں لگے رہتے تھے، چونکہ وہ خود ہی مستری بھی، کلینر بھی اور ڈرائیور بھی تھے اس لئے وہ اپنی بیوی اور اپنی بیٹی کو بھی موٹر پر بٹھانا اپنی حق تلفی خیال کرتے تھے۔

ان کی بیوی نہایت سمجھدار متحمل مزاج تھی۔ اس نے بہتیرا سمجھایا کہ کسی طرح سیٹھ صاحب موٹر خریدنے سے باز آ جائیں لیکن سیٹھ صاحب کی ضد کا مقابلہ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، بچاری لہو کے گھونٹ پی کر رہ گئی، اس کو علم ہو گیا تھا کہ جنک کماری اپنے باپ کی طرف سے کچھ کھچی کھچی رہتی ہے اس لئے اس نے تمام واقعات ٹھیک ٹھیک اس کے سامنے دہرا دئے تاکہ جنک کو معلوم ہو جائے کہ وہ کس قدر غریب ماں باپ کی بیٹی ہے ———

جنک کماری اس دن بھری بیٹھی تھی،

"ماتا! آپ خواہ مخواہ ان کی طرفداری کر رہی ہیں، کیا میں ابھی نادان ہوں جو آپ اس طرح کی باتیں کرتی ہیں! میں خوب سمجھتی ہوں۔"

جنک سیدھی اپنے باپ کے کمرے میں گئی وہ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی، گویا اس نے مدت کے بعد ایک مجرم کو پکڑ لیا تھا،

وہ خاموش تھی، آنکھیں نمناک تھیں، وہ اس کے سامنے کھڑی ہوئی محسوس کر رہی تھی کہ وہ ایک ایسا راز جان گئی ہے جو اسے نہ جاننا چاہئے تھا، وہ اس کی تمام کمزوریوں سے واقف ہو چکی تھی، وہ دل ہی دل میں اپنے باپ کو مخاطب کر کے کہہ رہی تھی،

"میں وہ بات جانتی ہوں جو تمہیں معلوم نہیں کہ میں جانتی ہوں"۔

سیٹھ ہردے شنکر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا، مقابلے کے جذبات جنک کے حسین چہرے پر صاف عیاں تھے۔

"بیٹی! کیا بات ہے"؟

"ماتا کے پاس پہننے کو اچھے کپڑے بھی نہیں ہیں اور آپ موٹریں خریدتے پھرتے ہیں" یہ کہہ کر جنک چیخیں مار کر رونے لگی اور روتی ہوئی باہر بھاگ گئی، چند لمحوں تک میاں بیوی ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے، سیٹھ نے غم انگیز مسکراہٹ سے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے جنک کا دماغ خراب ہو گیا ہے"۔

جنک دیر تک اپنے کمرے میں روتی رہی یہاں تک کہ اس کے دل کی بھڑاس نکل گئی، وہ اپنی ماں سے اتنی محبت کرتی تھی کہ کسی اور کے لئے اس کے دل میں جگہ باقی نہ رہی تھی، اس کی ماں کس قدر حلیم، شریف النفس، متحمل مزاج اور بے مزا عورت تھی! اس کا باپ کس قدر چڑچڑا، ضدی، ہٹ دھرم اور فضول خرچ آدمی تھا ــــ! یہ خیال اسے بار بار آتا اور ہر بار ماں کی محبت میں اضافہ ہوتا جاتا،

اس کی ماں اسے تسکین دے رہی تھی،

"جنک! اتنا کرودھ بھی تو اچھا نہیں، تمہارے پتا کیا کہتے ہوں گے"!

"یہی کہتے ہوں گے کہ جنک کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کاش انہیں معلوم ہو جاتا کہ مجھے سمجھ آ گئی ہے"۔

"بیٹی! میں انہیں اس وقت سے سمجھے بیٹھی ہوں جب تم پیدا بھی نہ ہوئی تھیں اور اس وقت سے یہ جانتے ہوئے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں غلط اور نامناسب کر رہے ہیں ہمیشہ ایک آدھ دفعہ کہہ دینے کے بعد خاموش رہی ہوں اور خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتی رہی ہوں، تو مجھ سے بہت پریم کرتی ہے، میری ہمدرد ہے، میرا دکھ دیکھ نہیں سکتی لیکن یہ کب تک، کب تک تو میرا دکھ بٹاتی رہے گی؟ کل تو بیاہی جائے گی تو میری وہی زندگی ہو گی اس لئے تمہارا کڑھنا بے سود ہے"۔ "ماتا! میں تمہیں کبھی نہ چھوڑوں گی، میں تمہیں اس حالت میں نہیں چھوڑ سکتی"۔

ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جنک! یہ کیا کہہ رہی ہو! تمہاری تو بات بھی پکی ہونے والی ہے، شو دیال بیرسٹر نے اپنے بیٹے منوہر کے لئے پیغام بھیجا تھا، تمہارے پتا نے مجھ سے بھی مشورہ کیا، لڑکا شریف اور لائق بھی ہے اگلے سال وکالت کا امتحان پاس کرے گا، تمہارا اور اس کا جوڑ بھی خوب ہے، بچپن سے ایک ساتھ کھیلے ہو اس لئے میں نے بھی ہامی بھر دی"۔

"ماتا! ایسا کبھی نہ ہو گا، میں اس سے ــــ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی"۔

"جنک! بیٹی ایک ایسا میوہ ہے جو پک جانے کے بعد سڑنا شروع ہو جاتا ہے"۔

لالہ شو دیال بیرسٹر کا لڑکا منوہر اگرچہ حسین تھا لیکن نہایت خود پسند اور خود بین واقع ہوا تھا، چونکہ منوہر اور جنک بچپن سے ہی اکٹھے رہے تھے اس لئے ان میں محبت کی [illegible] اور تیزی تو ہرگز پیدا نہ ہو سکتی تھی، منوہر یہ جانتے ہوئے کہ جنک حسین ہے اور شہر کی حسین ترین لڑکیوں میں سے ہے یہ بات بھی نہ بھول سکتا تھا کہ وہ ایک قلاش سیٹھ کی بیٹی ہے، ایک بار نہیں بلکہ کئی بار اس نے جنک کے نازک محسوسات کو صدمہ پہنچایا۔ وہ اپنی خود داری کو صدمے پہنچاتی رہی اور دن گذرتے گئے،

جنک کے دل میں اپنی ماں کی محبت اور منوہر سے نفرت بڑھتی گئی،

ایک دن اس نے اپنی ماں سے کہہ ہی دیا۔

"ماتا! تم نے خواہ مخواہ اس دن منوہر کی یہ بات مان لی کہ وہ مجھے اپنی کار پر بٹھا کر ہر روز کالج چھوڑ آیا کرے گا، وہ تو اس قدر خود پسند ہے کہ میں آپ سے کیا بیان کروں، جب میں کار میں بیٹھ جاتی ہوں تو وہ چلاتے ہوئے ارد گرد اس طرح دیکھتا ہے گویا وہ لوگوں سے یہ کہہ رہا ہے کہ یہ لڑکی پہلے پیدل چل کر کالج جایا کرتی تھی اب میں اسے اپنی موٹر میں بٹھا کر لئے جا رہا ہوں۔ ماتا! وہ میری طرف اس طرح دیکھتا ہے گویا وہ مجھ پر ترس کھا رہا ہے، جب کبھی وہ اپنے دوستوں سے میرا تعارف کراتا ہے تو صرف یہی کہتا ہے "میں انہیں کالج چھوڑنے جا رہا ہوں یہ میرے پتا کے ایک دوست کی بیٹی ہیں"، گویا پتا جی کا نام لیتے ہوئے بھی اسے شرم آتی ہے، اس میں شک نہیں کہ وہ کبھی کبھی محبت کا اظہار بھی کرتا ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ وہ

محض اپنی خود پسندی کو تسکین دینے کے لئے ایسا کرتا ہے، اس کی
ہر بات میں تصنع ہے، وہ مصنوعی ماحول میں پل کر جوان ہوا ہے، زندگی
کی صحیح کیفیتوں سے وہ بالکل آگاہ نہیں۔

اپنے موٹر، اپنے لباس، اپنی گفتگو غرض کہ ہر وہ چیز جو اس کی
اپنی ہے اس سے وہ مجھے مرعوب کرنا چاہتا ہے اور یہ توقع کرتا ہے
کہ میں اس کی ہر غلط بات کی تائید کردوں، ماتا! اگر ہم غریب ہو گئے ہیں تو
اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنا ضمیر بھی بیچ ڈالیں، ابھی کل کی بات ہے،
سکول سے آتے وقت وہ مجھ سے کہنے لگا، چلو نہر کا چکر ہی لگاتے
چلیں، میں نے اعتراض تو نہ کیا۔ البتہ میں نے بُرا ضرور محسوس کیا،
راستے میں اپنے خاندان کی جو بات تھی اس نے مجھ سے کہہ ڈالی البتہ
تمام کمزوریوں کو چھپاتے ہوئے، وہ مجھے حقیر سی شے سمجھ کر اپنے آپ کو
اتنا بڑھا رہا تھا گویا میں وہاں موجود ہی نہ تھی، کبھی نہایت تیزی سے موٹر
چلاتا اور مجھے میٹر کی طرف دیکھنے کا اشارہ کرتا، یہ بہت چھوٹی چھوٹی باتیں
ہیں ماتا! لیکن مجھے باغی بنا دینے کے لئے کافی ہیں، کل مجھ سے یہ بھی کہہ
رہا تھا،

"جنک! تم نے تو دنیا دیکھی ہی نہیں، کاش تم کلب میں گئی ہوتیں
تو تمہیں معلوم ہوتا کہ آج کل کی لڑکیاں کس قدر مہذب، تعلیم یافتہ اور
چست و چالاک ہوتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "مجھے بھی آج لے چلنا!"

وہ خاطر خواہ جواب نہ دے سکا اور بے رخی سے کہنے لگا "اچھا
میں آج آؤں گا تو وہاں فیصلہ کریں گے۔"

"بیٹی! تم زود رنج ہو گئی ہو۔ منوہر نہایت سمجھ دار لڑکا ہے، اگر اس
قسم کی حرکات وہ کرتا بھی ہے تو محض بچپن کی وجہ سے، تم یہ نہیں جانتیں
کہ وہ بچپنے سے تمہارے ساتھ کھیلا ہے اور تم سے بہت پریم کرتا ہے۔"

"پریم! وہ خود نما نوجوان پریم کو کیا جانے! میں تو اتنا جانتی ہوں۔"

باہر موٹر کی آواز آتی ہے،

"میرے خیال میں منوہر آ گیا ہے۔"

منوہر سیٹی بجاتا ہوا کمرے میں داخل ہوتا ہے اور نہایت فخریہ
انداز میں کہتا ہے،

"ماتا جی! آج مجھے جنک نے کلب جانے کو کہا تھا"

جنک نے بظاہر خلوص کے ساتھ کہا۔

"ہاں! ہاں! میں تیار بیٹھی ہوں۔"

"لیکن جنک میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ لوگ تمہاری ہنسی اڑائیں
ٹینس تم نہیں کھیل سکتیں، برج تمہیں کھیلنی نہ آئے، وسکی سوڈا کو تم ہاتھ
نہ لگاؤ، تو کلب میں جانے کا فایدہ! وہاں بُت بن کر بیٹھے رہنا بالکل "اپ ٹو
ڈیٹ" کے خلاف ہے، اگر کوئی لڑکی تم سے گفتگو کرے گی تو تم "ماڈرن"
موضوعات کو سمجھ ہی نہ سکو گی، یوں ہی نادم ہونے کا کیا فایدہ! مجھے
کچھ عذر نہیں۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں جان بوجھ کر تمہیں ساتھ نہیں لے جانا
چاہتا، اس میں تمہارا ہی فایدہ ہے۔ اور ــــ"

جنک نے ماں کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور
مسکرا کر کہا،

"مسٹر منوہر! میں بھی یہ نہیں چاہتی کہ لوگ میری ہنسی اڑائیں،
آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ آپ کی کلبوں
میں تہذیب کس حد تک ترقی کر چکی ہے اور ہم جیسی گنوار لڑکیاں وہاں
جا کر کچھ سیکھ بھی سکتی ہیں یا نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہاں جانے
سے پیشتر لڑکی کو پورا مہذب اور "اپ ٹو ڈیٹ" بن جانا چاہیے۔"

"میں نے تمہیں گنوار تو نہ کہا تھا، تم یونہی بات بات پر بگڑ جاتی ہو،
یہ بھی "اپ ٹو ڈیٹ" کے خلاف ہے۔"

جنک خاموش ہو گئی، ماں نے بیٹی کی طرف پرغور نگاہوں سے
دیکھا، صرف ماں کی آنکھیں دیکھ سکتی تھیں کہ جنک کی آنکھوں کی عمیق
ترین گہرائیوں میں آنسو جھلک رہے تھے،

منوہر سیٹی بجاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا، جنک کی بڑی بڑی
آنکھوں سے آنسو ڈھلک پڑے۔

"ماتا! دیکھ لیا آپ نے؟ مجھے اس بات کا رنج نہیں کہ وہ مجھے اپنے
ساتھ کلب میں کیوں نہیں لے گیا ــــ ایشور جانتا ہے کہ میں ہرگز
وہاں جانا نہ چاہتی تھی ــــ لیکن جس بہانے سے اس نے مجھے "ٹالا"
ہے اس میں میری کس قدر ذلت اور سبکی پنہاں ہے، پنہاں نہیں بلکہ
آشکار، ماتا! کاش تم جانتیں کہ ان باتوں سے میری روح کو کس قدر
صدمہ پہنچا ہے۔"

"بیٹی! میں سب کچھ جانتی ہوں لیکن ــــ"

"ــــ لیکن مجھے صبر کرنا ہی ہوگا۔ یہی کہنے لگی تھیں ماتا! آخر یہ کیوں؟
زہر کے گھونٹ کس لئے پینے ہوں گے؟ اپنی روح کو کیوں کچلنا ہوگا؟

اس لئے کہ ہم غریب ہیں؟

یہ کوئی معقول وجہ نہیں ہے! روح کا دُکھ سارے دکھوں سے بڑھ کر ہے، میری محبت صرف تمہارے لئے ہے میں اس میں کسی اور شخص کو شریک نہیں کرنا چاہتی اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے"۔

بیٹی کا یہ فیصلہ اس نے ہردے شنکر تک پہنچا دیا اور اس نے بلا تکلف شودیال بیرسٹر کو جواب دے دیا، بیرسٹر امیر ہونے کے باوجود نہایت متحمل مزاج انسان تھا، اس نے چپکے سے ہردے شنکر کے جواب کو سنا اور پھر اس طرح بھلا دیا۔ گویا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں تھا، اس کے بعد اس نے یہ کوشش کی کہ ان کے دیرینہ تعلقات خوشگوار رہیں لیکن ان حالات کے بعد ایک خفیف سی کشیدگی کا پیدا ہو جانا قدرتی امر تھا، جنک نے منوہر کی کار میں کالج جانا بھی بند کر دیا جس سے منوہر کو کافی رنج ہوا اور اسی رنج کی بنا پر اس نے جنک سے ملنا جلنا بالکل بند کر دیا۔

منوہر خود بیں اور خود پسند تھا، اس لئے اسے بہت صدمہ ہوا، اس میں شک نہیں کہ وہ جنک سے محبت نہ کرتا تھا لیکن اکٹھے رہنے سے انتہا درجے کا انس ضرور پیدا ہو چکا تھا، کالج کے نوجوانوں کے جذبات میں پختگی نہیں ہوتی، کومل اور لچکدار ڈالیوں کی طرح خفیف سے خفیف ہوا کے سامنے بھی بل کھا جاتے ہیں، وہ اکثر اوقات خود فریب کھا جاتے ہیں لیکن اس زعم میں رہتے ہیں کہ وہ دوسروں کو فریب دے رہے ہیں۔

منوہر نے جنک کی شخصیت کو کبھی اہمیت نہ دی تھی، وہ تیز طرار اور عشوہ طراز لڑکیوں کو بہت پسند کرتا اور اسی ماحول میں وقت گزارتا تھا، جنک کو ایک آسان شکار سمجھ کر وہ اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیا کرتا تھا، کلب میں بھی اس نے جنک کو ساتھ لے جانے سے محض اسی لئے ٹال دیا تھا تاکہ وہ اس کی کمزوریوں سے واقف نہ ہو جائے، وہ ہر روز جنک کو کالج لے جایا کرتا تھا اور اس نے کبھی یہ محسوس نہ کیا تھا کہ اگر وہ اُسے نہ لے جائے تو اس کی حالت کیا ہو گی، دراصل یہی سمجھے ہوئے تھا کہ اس کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے، لیکن پہلے ہی دن اس نے محسوس کیا گویا ایک پوشیدہ سی دلکشی اس کے پہلو سے چھین لی گئی ہے، اس نے بارہا اپنے جی میں کہا۔

"کلب کی لڑکیوں کے مقابلے میں جنک کیا چیز ہے؟ میں خواہ مخواہ اسے یاد کر رہا ہوں، عجیب پاگل ہوں"۔

دو دن اسی کشمکش میں گزر گئے، تیسرے دن وہ رنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔

"جنک! تو مجھے کیوں بار بار یاد آ رہی ہے! میں سچ کہتا ہوں مجھ تجھ سے محبت نہیں"۔

ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی بار اس نے اپنے آپ کو فریب دیا لیکن انتہائی جدوجہد کے باوجود جنک اس کی رگ و پے میں سرایت کرتی گئی اس نے محسوس کر لیا تھا کہ جنک میں ایک بات ایسی بھی جو عشوہ طراز چھوکریوں میں نہ تھی۔

ایک دن وہ اپنی کار لے کر اس راستے پر کھڑا ہو گیا۔ جہاں سے جنک کالج کی طرف جایا کرتی تھی، آج وہ محسوس کر رہا تھا کہ جنک کو دیکھ کر اس کے سینے میں ایک خفیف سا ہیجان پیدا ہو گیا تھا، وہ حیران تھا کہ یہ تو وہی جنک ہے ——— وہی پہلی جنک ——— جس پر وہ ترس کھایا کرتا تھا، ایک غریب اور بیکس لڑکی سمجھ کر اس کے مکان پر جایا کرتا تھا، اور اس کے مقابلے میں اپنے آپ کو ایک بہت بڑا انسان تصور کرتا تھا ——— لیکن آج اسے دیکھ کر اس کا رنگ زرد کیوں ہو رہا تھا، گویا وہ خود کو ایک شہزادی کی موجودگی میں پا رہا تھا، وہ سنبھلنا چاہتا تھا۔

"جنک! یہ نہ خیال کرنا کہ میں تمہارے لئے مرا جاتا ہوں لیکن تم نے میری کار میں جانے سے انکار کر دیا تھا، اس لئے مجھے سخت صدمہ ہوا بلکہ میری توہین ہوئی تمہیں معافی تو مانگ لینی چاہئے تھی"۔

"میں معافی کی خواستگار ہوں"۔

"لیکن میرا مطلب یہ تھا کہ میں آپ ——— "سے کچھ کہوں یہی مطلب تھا آپ کا؟"

"میں کوئی ایسی بات تو کہنا نہیں چاہتا جس سے تمہیں رنج ہو لیکن ایک نہایت ضروری پیغام تمہیں دینے آیا تھا"۔

"کس کا پیغام؟"

"پیغام تو میرا اپنا ہی ہے، تمہیں زیادہ فکرمند نہیں ہونا چاہئے، میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ کلب چلا کرو"۔

"منوہر! کلب جانے کا وقت اب گزر گیا ہے، میں کسی جگہ بھی تمہارے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہوں، میں ایک ایسے شخص کا انتخاب کرنا چاہتی ہوں جس سے مجھے محبت ہو اور میں آئندہ صرف اسی کی معیت میں رہوں گی، میں خوب جانتی ہوں کہ تم مجھ سے محبت نہیں کر سکتے اور تمہیں یہ بھی معلوم ہو جانا چاہئے کہ میں بھی تم سے محبت نہیں کر سکتی،

میرے سینے میں وہ دل نہیں ہے جو تم سے محبت کر سکے"۔

"لیکن میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم ہر وقت میرے ساتھ رہو"۔

"یہ اور بات ہے"!

"لیکن میں تو ـــــ"

"تمہارا خیال ٹھیک ہوگا لیکن میں تم سے محبت نہیں کر سکتی، ایک ٹہنی پر ایک رنگ کے دو پھول اکٹھے کھل کر بھی الگ الگ ہی رہتے ہیں"۔

اس کے بعد منوہر خاموش ہو گیا۔

وقت گزرتا تھا، وہ تو بیتا لیکن منوہر کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا چلتی ہوئی تھم گئی ہے، اسے یقین نہیں آسکتا تھا کہ جنک بھی اس کی محبت کو ٹھکرا سکتی ہے، جسے وہ حقیر عورت تصور کرتا تھا۔

وہ یکایک پُرتمکنت اور باسطوت شہزادی بن کر نمودار ہوئی تھی، اس نے اپنی خود پسندی اور خود نمائی کو شکست دے کر جنک کے سامنے اپنی درخواست پیش کی تھی جو اس نے ایک پرمعنی انداز سے ٹھکرا دی، اس کی حسیات کا خون ہو گیا، انتہائی صدمے کے باوجود اس میں قوت برداشت پیدا ہو چکی تھی۔ اس نے غم و غصہ کے ہلاکت خیز زہر کو ایک شیریں گھونٹ سمجھ کر پی لیا اور بظاہر اس کے محسوسات سے یہی معلوم ہوتا تھا گویا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں لیکن حقیقت میں وہ زندگی کی اس منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں سے بازیافت مشکل تھی، وہ خوب سمجھ چکا تھا کہ وہ جنک سے محبت کرنے لگا ہے لیکن اس کے باوجود اسے بھول جانا چاہتا تھا،

وہ کلب میں کثرت سے جانے لگا، لڑکیوں سے اس نے مراسم بہت بڑھا لئے، ہر شام وہ کسی نہ کسی لڑکی کو ساتھ لے کر سینما جاتا اور خود بھی شراب پیتا اور لڑکی کو بھی پینے پر مجبور کر دیتا، چاروں طرف اس کی عیاشی کے تذکرے ہونے لگے اور وہ کلب کا ہیرو تصور کیا جانے لگا اور سوسائٹی اس کے اعزاز میں دعوتیں دینے لگی،

جنک سب کچھ سن رہی تھی لیکن وہ خاموش تھی کیونکہ اسے خاموش ہی رہنا تھا۔

جنک کے چچازاد بھائی گورچرن کی امرت سر میں شادی تھی، کئی دنوں سے وہ والدین کے ہمراہ جانے کو تیار ہو رہی تھی لیکن اتفاق کی بات دیکھو کہ روانگی سے ایک دن پیشتر وہ بخار میں مبتلا ہو گئی،

بخار کی حالت میں وہ سوچ رہی تھی کہ اسے بخار نہ ہونا چاہئے تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا پتا اپنی کار امرت سر لے جائے گا اور سمجھانے کے باوجود اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے گی کہ اپنی کار میں پٹرول کا خرچ بہت زیادہ ہوتا ہے اور سب سے بڑا خطرہ جو جنک محسوس کر رہی تھی۔ وہ یہ تھا کہ سیٹھ صاحب ضرور شراب کے نشے میں چور ہو کر موٹر چلائیں گے اور راستے میں کوئی نہ کوئی حادثہ ضرور پیش آئے گا، اپنی پیاری ماں کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے تھی، اس نے بخار کی حالت میں بہت کوشش کی کہ یہ سفر ملتوی ہو جائے لیکن سیٹھ ہردے شنکر راضی نہ ہوا، شام کے وقت یہ فیصلہ ہو گیا کہ جنک گھر پہ رہے گی اور اس کے والدین صبح سویرے اپنی کار میں امرت سر جائیں گے اور شام تک لوٹ بھی آئیں گے،

جنک رات بھر نہ سو سکی، وہ کروٹیں بدلتی رہی اور سوچتی رہی کہ یہ سفر نہایت خطرناک ہوگا، پتا جی ضرور اندھا دھند گاڑی چلائیں گے اور اس کے بعد معلوم نہیں کیا حشر ہو، رات کے پچھلے پہر اس کی آنکھ لگی تو کیا دیکھتی ہے کہ اس کی ماں موٹر کی ٹکر کی وجہ سے ہسپتال میں مردہ پڑی ہے اور اس کا باپ اگر مرا نہیں لیکن بُری طرح زخمی ہوا ہے، وہ چلا کر اٹھی اور خدا کا شکر بجا لائی کہ یہ خواب تھا لیکن وہ انہیں آج امرتسر نہ جانے دے گی۔

"کم از کم پتا جی اپنے کار میں تو نہ جائیں گے"۔ یہ خیال کر کے وہ دبے پاؤں گراج میں گئی اور ایک تیز دھار والے چاقو سے موٹر کے اگلے دونوں پہئے پنکچر کر دئے اور خود آرام سے آ کر لیٹ گئی،

وہ مطمئن ہو کر سو گئی اور دیر تک سوتی رہی،

صبح نو بجے اٹھی تو نوکر سے معلوم ہوا کہ سیٹھ صاحب دیر تک موٹر سے سر کھپاتے رہے لیکن دیر ہوتی جا رہی تھی اس لئے مجبوراً لاری پر سوار ہو کر چلے گئے ہیں اور یہ کہہ گئے ہیں کہ شام تک یقینی طور پر وہ واپس آ جائیں گے، جنک خوش تھی کہ وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو گئی،

شام کے قریب جنک کا بخار بھی ذرا ہلکا ہو گیا، اس لئے وہ بستر سے اٹھی، بکھری ہوئی چیزوں کو قرینے سے لگایا اور رسوئیے کو کھانے پکانے کی ہدایت کی،

سورج غروب ہوتے ہی وہ اپنے والدین کا انتظار کرنے لگی چاروں طرف اندھیرا چھا گیا لیکن وہ برآمدے میں آرام کرسی پر لیٹی ہوئی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی، اگر جا کے گھڑیال نے نو

بجائے وہ اس خیال سے اٹھی اور اٹھ کر بستر پر جا لیٹی کہ چلنے سے روک لیا ہوگا اور خصوصاً ایسے موقعوں پر تو مجبوراً بھی رک جانا پڑتا ہے۔

اس نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند نہ آئی، اس نے کروٹ بدلی لیکن پھر بھی آنکھوں سے نیند غائب تھی، وہ سوچنے لگی، ایک وہم سا اس کے دل میں اٹھا لیکن جلد ہی اس نے اپنے آپ کو تسکین دے لی "میں بھی نری پگلی ہوں، کیسے کیسے وسوسے دل میں آ رہے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے پھر سونے کی جد و جہد کی لیکن اس کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا، اسی کشمکش میں رات کا پچھلا پہر ہو گیا۔

تکان سے چور حسین آنکھیں کچھ دیر کے لئے جھکیں اور وہی گزشتہ بھیانک خواب دیکھنے کے لئے بند ہو گئیں —— بالکل وہی خواب!

جنک گھبرا کر اٹھی، خواب کا اثر اتنا تھا کہ وہ دیوانہ وار ادھر ادھر بھاگ رہی تھی، اس نے کمال تیزی سے ساڑھی درست کی، رات کے پچھلے پہر کے اندھیرے میں منوہر کی کوٹھی کی طرف بھاگی ہوئی گئی، جب اس نے پھاٹک سے اندر کی طرف چھلانگ لگائی تو تین چار کتے اس کی طرف لپکے، وہ ہر ایک کتے کا نام لے کر پکار رہی تھی لیکن اس کے باوجود کتے اسے نہ پہچان سکے، کتوں کی کرخت آواز میں سے ایک نازک اور نرم آواز کوٹھی کی فضا میں گونج رہی تھی،

"منوہر! منوہر!"

منوہر میٹھی نیند سو رہا تھا، وہ خواب دیکھ رہا تھا کہ وہ بھیانک نا پیکوں میں راستہ گم کر بیٹھا ہے، سامنے سے بار بار اس کا ایک ہولناک طوفان امڈا آ رہا ہے وہ تکان سے چور ہو چکا ہے لیکن اسے راستہ نہیں ملتا، یکایک سامنے پہاڑی پر ایک روشنی نمودار ہوتی ہے، وہ روشنی جنک کے ہاتھ میں ہے، جنک زور زور سے آوازیں دے رہی ہے،

"منوہر! منوہر!"

منوہر کی آنکھیں کھلیں تو باہر "منوہر! منوہر!" کی صدا ابھی تک بلند ہو رہی تھی وہ بھاگا ہوا باہر گیا دور سے ہی کتوں کو آواز دی اور بھاگتا ہوا جنک کے پاس آیا،

"جنک! اس وقت؟"

"ہاں! منوہر! میں اس وقت مدد کے لئے تمہارے پاس آئی ہوں ماتا اور پتا جی دونوں آج صبح سے امرت سر گئے ہیں، آج شام تک انہیں ضرور آ جانا تھا لیکن وہ ابھی تک نہیں آئے، مجھے وہم آ رہا ہے، کیا اس وقت تم میرے ساتھ امرت سر نہ چلو گے؟" "جنک! تمہارا وہم فضول ہے، صبح ہونے دو وہ آ ہی جائیں گے کسی خاص وجہ سے وہاں رک گئے ہوں گے۔" "اس کا مطلب ہے کہ تم میرے ساتھ نہیں جاؤ گے!" "جنک! میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں، تم یہیں ٹھیرو میں پتلون پہن لوں، ٹھیرو! میں پہلے گراج میں سے کار نکال لوں۔"

یہ کہہ کر وہ بھاگا ہوا گیا اور گراج میں سے کار باہر نکال لایا۔

جنک نہایت پھرتی سے اس میں بیٹھ گئی، اسے وہ دن بھول گیا تھا وہ گھڑیاں اس کے دماغ سے بالکل محو ہو چکی تھیں جب منوہر نے درخواست کی تھی کہ وہ صبح اس کی کار پر کالج جایا کرے اور اس نے صاف انکار کر دیا تھا

کار فراٹے بھرتی ہوئی سڑک پر جا رہی تھی، منوہر نے اپنے دائیں پہلو سے وسکی کی بوتل نکالی اور ایک ہی کش میں تین چار گھونٹ پی گیا،

جنک کو شراب سے سخت نفرت تھی، منوہر بھی اس بات کو جانتا تھا لیکن جنک کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی، اس نے غور سے منوہر کی طرف دیکھا۔ پھر سامنے دیکھنے لگی اور دل ہی دل میں یہ کہہ رہی تھی۔

"منوہر! آج جس قدر شراب تم پی سکتے ہو پیو، کیونکہ تم اس کے نشے میں نہایت تیز رفتار سے کار چلاؤ گے اور میں وہاں اڑ کر پہنچنا چاہتی ہوں"

امرت سر سے پانچ چھ میل ورے انہیں سڑک پر ایک اوندھی پڑی ہوئی لاری دکھائی دی، منوہر پتہ چلانے کے لئے اترا، جنک کے دل کی دھڑکن دور تک سنائی دے رہی تھی،

"جنک! ہمیں سیدھا امرت سر کے ہسپتال میں چلنا چاہئے لیکن پتا جی اس میں کہاں آئے ہوں گے؟"

"حادثہ کب ہوا؟"

"کل شام، لاری درخت سے ٹکرا گئی، بہت سے آدمی زخمی ہوئے ہیں۔"

"منوہر! میرا دل دھڑک رہا ہے، جلدی ہسپتال چلو، آہ! میرا خواب ——"

"جنک! گھبراؤ نہیں، تم تو بہت وہمی ہو گئی ہو۔"

"منوہر! میں نے کبھی وہم نہیں کیا۔"

وہ دونوں ہسپتال پہنچے، جنک پاگلوں کی طرح ایک چار پائی سے دوسری چار پائی پر لپک رہی تھی۔

ایک "نرس" نے جنک کو گرنے سے تھام لیا۔ جنک کی ماں آخری سانس لے رہی تھی، جنک دیوانہ وار اس سے لپٹ گئی لیکن اب تو اس کی ماں اسے پہچان بھی نہ سکتی تھی،

سیٹھ ہردے شنکر کے زخم معمولی تھے۔ بیٹی کو روتا دیکھ کر اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

جنک کی حسین آنکھوں میں سے دو ندیاں بہ رہی تھیں، منوہر اسے تھامے باہر لا رہا تھا،

"منوہر! میرے سینے میں صرف ایک دل تھا وہ اس ہستی کی محبت سے بھرپور تھا جو آج دنیا میں نہیں، اس کے چلے جانے سے میرے لئے ساری دنیا تاریک ہو چکی ہے، میری روح میری رگ وپے سے نکل چکی ہے، محبت سے بھرا ہوا جام سرشار آج الٹ کر خالی ہو گیا ہے، اس کے بعد میں صرف ——— میں اپنی شکست تسلیم کرتی ہوں، میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے محبت نہیں کر سکو گے لیکن دنیا میں میں کسی اور مرد کو جاننا نہیں چاہتی"!

یہ کہہ کر اس نے اپنا سر منوہر کے کاندھوں پر جھکا دیا،

موٹر سڑک پر آہستہ آہستہ جا رہا تھا، اچانک اس میں سے ایک چیز باہر گر کر چکنا چور ہو گئی۔

یہ شراب کی بوتل تھی ———!

خلیل

آتش پارے

بھری تھی ساقی نے کیا شیشۂ شراب میں آگ
لگا دی جس نے مرے خاطرِ خراب میں آگ

وہ شعلہ رو نظر آیا ہمیں عتاب میں آگ
اب اس کے آگے نہیں ہے کسی حساب میں آگ

پڑا جو اُن کے رُخِ آتشیں کا آب میں عکس
تو بولی دیکھ کے دنیا لگی ہے آب میں آگ

ملا جو عارضِ گلگوں پہ اُس نے غازۂ سُرخ
پکار اٹھا یہ زمانہ لگی گلاب میں آگ

نہیں نقاب میں وہ روئے آتشیں انور
بساطِ چرخ پہ ہے دامنِ سحاب میں آگ

سیّد ولایت حسین
ایم ایل اے

اشعار

ان کا دامن مری آنکھیں یہ خدا کی قدرت
اب تو قسمت کا ستارہ ہے مرا ہر آنسو

میں یہ سمجھوں گا ہوئی قدر مرے رونے کی
اپنے دامن سے ذرا پونچھ دو ہنس کر آنسو

شرف

غزل

نگاہِ لُطف مجھ پر کب نہیں ہے؟ جو پہلے تھی مگر وہ اب نہیں ہے

مری قسمت اُن آنکھوں پر ہے موقوف رہینِ گردشِ کوکب نہیں ہے

مری تقدیر ہی کو تو بدل دے انہیں احساسِ غم یارب نہیں ہے

محبت داستانِ جذبِ دل ہے حدیثِ چشم و گوش و لب نہیں ہے

محبت ایک مجبوری ہے ورنہ مجھے تم سے کوئی مطلب نہیں ہے

اُمیدِ صبح سے بہلا نہ دل کو! سحر جس کی ہو، یہ وہ شب نہیں ہے

زباں پر آئے کیا حرفِ تمنّا

کوئی محرم ہی اس کا جب نہیں ہے

حفیظ ہوشیارپوری

غزل

ذرہ ذرہ معدنِ تنویر ہے میرے لئے
ہر تجلی حسن عالمگیر ہے میرے لئے

کاش مجھ کو پھونک دے اُس کی نگاہِ برق پاش
خاک ہو جانا مرا اکسیر ہے میرے لئے

گر نہیں اس میں محبت کی کرشمہ سازیاں
یہ طلسمِ دہر بے تاثیر ہے میرے لئے

آج حاصل ہوں گی ساری زندگی کی لذتیں
آج میرا ہر نفس شمشیر ہے میرے لئے

دل بنائے ہر الم ہستی سراسر قیدِ غم
زندگی اک آہنی زنجیر ہے میرے لئے

سُن رہا ہوں ہر بُنِ مو سے صدائے دردِ دل
زیست کیا ہے عشق کی تفسیر ہے میرے لئے

یہ مری شانِ تحمل مر رہا ہوں ضبط پر
آہ کرنا باعثِ تحقیر ہے میرے لئے

میں فریبِ دامِ ہستی سے نکل جاؤں تو کیا
یہ نظامِ دو جہاں تقدیر ہے میرے لئے

مجھ کو حرماں عشق میں مٹنا مبارک ہو گیا
سُن رہا ہوں اِک جہاں دلگیر ہے میرے لئے

حرماں خیرآبادی

برائے فروخت

طلوعِ آفتاب سے پہلے، خاموش سمندر کے کنارے کنارے، شبنم آلود کھیتوں میں پیادہ پا چلنا کس درجہ مست خیز ہوتا ہے۔

یہ مسرت نورِ سحر کی ہر لہر اور نسیمِ صبح کی ہر موجِ عنبریں کے ساتھ مشامِ جاں میں سرایت کر جاتی ہے

نہ جانے ہمارے حافظے میں ایسے لطف اندوز لمحے کیوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پیوست ہو جاتے ہیں، جو ہم کبھی وادی میں اور کبھی دریا کے کنارے قدرتی مناظر کا مشاہدہ کرتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔

ایسے لمحوں میں سے ایک لمحہ میرے ذہن میں اچھی طرح محفوظ ہے جب ایک روز میں آہستہ آہستہ سمندر کے کنارے کنارے سیر کر رہا تھا یہ مقام کوم برل کے قریب واقع ہے اور برٹنی کا دلکش ترین حصہ ہے۔

بہار کا آغاز تھا، اور صبح کا سہانا وقت ایسا وقت جبکہ ہر شخص اپنے آپ کو بیس سال کا نوجوان محسوس کرنے لگتا ہے اور مردہ امیدیں اور جوانی کے بھولے بسرے خواب از سرِ نو شگفتہ ہو جاتے ہیں۔

میں کھیتوں اور سمندر کے درمیان سے گزرتی ہوئی ایک تنگ سڑک پر چل رہا تھا۔ غلے کے پودے ساکت و جامد کھڑے تھے۔ سمندر میں لہریں آہستہ آہستہ اٹھ رہی تھیں۔ ہوا پکے ہوئے کھیتوں کی سوندھی سوندھی خوشبو سے بسی تھی، میں برٹنی کے ساحل کے ساتھ ساتھ سیدھا جا رہا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں کوئی خیال جاگزیں نہ تھا۔ میرا دل انتہائی اطمینان کی حالت میں تھا اور میرے قدم اس طرح ہلکے پھلکے معلوم ہوتے تھے، جیسے کسی نے ابھی ابھی سفر شروع کیا ہو!

اس وقت جسمانی اور روحانی طور پر، مجھ پر ایسی مسرت مسلط تھی جو جانوروں کو اچھلنے کودنے، اور پرندوں کو آسمان کی نیلی چھت کے نیچے چہچہانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ میں دور فاصلے پر دلکش آوازیں سن رہا تھا۔ اتوار کا دن تھا اور یہ آوازیں شاید کسی ضیافت کی جگہ سے بلند ہو رہی تھیں میں نے ایک طرف کو مڑ کر ذرا غور سے دیکھا کہ یک پانچ شکاری کشتیاں نمودار ہوئیں جن پر مرد، عورتیں اور بچے بیٹھے تھے۔

ہوا خاموشی سے بادامی رنگ کے بادبانوں میں داخل ہو رہی تھی۔ اور کشتیاں آہستہ آہستہ ساحل کے ساتھ ساتھ جا رہی تھیں کشتی نشین سب کے سب گا رہے تھے۔ مرد مستول کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ ان کے سروں پر بڑی بڑی انگریزی ٹوپیاں تھیں اور وہ نہایت استقلال اور خوبی سے گیت گا رہے تھے۔ عورتوں اور بچوں کی ہم آہنگ آوازوں نے ایک قیامت برپا کر رکھی تھی۔

یہ پانچوں کشتیاں آگے پیچھے چلی جا رہی تھیں اور ان میں سے ایک ہی قسم کی آوازیں بلند ہو کر آسمان تک پہنچ رہی تھیں۔

میرے قریب ہی سے گذر کر یہ کشتیاں دور چلی گئیں اور ان کی آوازیں آہستہ آہستہ فضا میں گم ہوتی گئیں۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے جوانی کے امید افزا خواب دیکھ رہا ہوں۔ آہ جوانی، جو زندگی بھر میں خوابوں کا ایک خوشگوار ترین زمانہ ہے، کتنی سرعت سے گذر جاتی ہے۔ آہ سنہری خوابوں سے بسی ہوئی زندگی کتنی خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔

مجھے اس وقت محسوس ہو رہا تھا جیسے میں خوابوں کی بستی میں ایسے شیریں خواب دیکھ رہا ہوں جن سے آدمی کبھی سیر نہ ہو ــــ دولت، عزت راحت کے الم ربا خواب!

میں لمبے لمبے قدم اٹھاتا جا رہا تھا میرے ہاتھ گندم کے نرم نرم ریشوں کو چھو رہے تھے اور میری انگلیوں کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی حسینہ کے شگفتہ بالوں سے مس کر رہی ہوں۔

تھوڑی دیر میں میں ایک ایسے سبزہ زار میں پہنچ گیا، جو راس کی شکل میں دور تک سمندر میں چلا گیا تھا۔ وہاں ساحل کے قریب ایک سفید رنگ مکان میری نظر پڑا جو ساحل سے تین سیڑھیوں کی بلندی پر بنا ہوا تھا۔

نہ جانے اس مکان کو دیکھ کر میرے دل میں مسرت کا ایک بحرِ بے پایاں کیوں موجیں لینے لگا۔ مجھے معلوم نہیں، مگر بعض اوقات سیر کرتے کرتے،

ہم ایسی سرزمین میں پہنچ جاتے ہیں جس سے ہماری آنکھیں دیر سے آشنا معلوم ہوتی ہیں اور جسے دیکھتے ہی ہمارے دلوں میں محبت کا ایک بے پناہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس زمین کی ہر چیز ۔۔۔ افق، درخت، اور زمین کا رنگ، ہمارے اندر مسرت کے ایک عمیق جذبے کو بیدار کر دیتا ہے۔

یہ دلکش مکان ذرا اونچی جگہ پر بنایا گیا تھا۔ اونچے اونچے ثمردار درخت ایسے فراخ چبوتروں پر اُگے تھے، جو بڑی بڑی کشادہ سیڑھیوں کی شکل میں بتدریج پانی تک پہنچ گئے تھے۔ ہر چبوترے کے ایک کنارے پر بڑے بڑے شگفتہ پھول اُگ رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے بہت سے سنہری تاج پودوں کے سروں پر پہنا دئیے ہوں۔

اس رہائشی مکان کو دیکھ کر میں حیرانی کے عالم میں وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔ میری انتہائی تمنا تھی کہ میں اسی جگہ اپنی زندگی تمام کر ڈالوں۔

میں دروازے کے قریب پہنچا۔ میرا دل فرطِ تمنا سے اس وقت بے تاب ہو رہا تھا۔ دروازے کے ایک ستون پر "برائے فروخت" لکھا تھا۔

یہ الفاظ دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہونے لگا، گویا یہ مکان مجھے پیش کیا جا رہا ہے۔

"برائے فروخت!" تو یہ مکان اب کسی خاص شخص کا نہیں۔ ہر اس شخص کے قبضے میں آسکتا ہے جو اسے خریدے۔ خواہ زید ہو۔ خواہ بکر۔ خواہ میں۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں ایسا شاندار مکان نہیں خرید سکتا۔ پھر بھی، نہ جانے کیوں میرا دل کسی پراسرار مسرت سے اچھل رہا تھا۔

میں مکان کے باغیچے میں داخل ہوا۔ آہا کتنا فرحت افزا باغ تھا . . . اس کے بلند سے بلند تر چبوترے، اس کے خوشنما درخت، اس کے سنہری پودوں کے جھنڈ اور ہر چبوترے کے سرے پر انجیر کے دو درخت، یہ سب چیزیں اس کی خوبصورتی کو دوبالا کر رہی تھیں۔

وہاں کھڑے ہو کر میں نے گرد و پیش کے مناظر پر نگاہ دوڑائی۔ اس چھوٹی سی خلیج کے ریتلے ساحل کا پانی میرے پاؤں کو چھو رہا تھا۔ کھلے سمندر اور ساحل کے درمیان تین عظیم الہیئت چٹانیں پڑی تھیں جو طوفان کے دنوں میں شاید بند کا کام دیتی ہوں گی۔

میں نے کچھ اس انداز سے دروازہ کھٹکھٹایا جیسے میں اپنے مکان پر دستک دے رہا ہوں۔ چھوٹے سے قد کی ایک بوڑھی خادمہ جس نے سیاہ گون اور سفید ٹوپی پہن رکھی تھی، اور جو ایک پرانی کنواری معلوم ہوتی تھی، دروازے پر نمودار ہوئی۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں اس سے آشنا ہوں۔ میں نے اس سے کہا۔

"کیا تم برٹنی کی رہنے والی ہو؟"

اُس نے جواب دیا۔ "نہیں، میں لورین سے یہاں آئی ہوں۔"

پھر اُس نے مجھ سے پوچھا۔ "تم اس مکان کو دیکھنے آئے ہو گے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں، ہاں، یقیناً" اور میں اندر داخل ہو گیا۔

تمام فرنیچر، حتیٰ کہ دیواروں سے بھی میں آشنا معلوم ہوتا تھا اور ہال میں اپنی چھڑی کونہ پا کر حیران ہو رہا تھا۔

میں نے ڈرائنگ روم کا راستہ لیا۔ ایک دلکش کمرہ تھا۔ اس کی تین بڑی بڑی کھڑکیوں سے سمندر کا وسیع منظر دکھائی دیتا تھا۔ کائی سے بنا ہوا فرش اس پر بچھا تھا۔ انگیٹھی پر چین کے خوشنما ظروف اور کسی عورت کی ایک بڑی سی تصویر رکھی تھی۔ میں جھٹ تصویر کے قریب پہنچا۔ مجھے یقین تھا کہ میں اس سے کبھی آشنا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ گو میرا خیال تھا کہ اس سے دوچار ہونے کا مجھے کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا میں اسی ایک عورت کے لئے اتنے عرصے سے ہمہ تن انتظار تھا اور یہی دل ربا چہرہ میرے خوابوں کو شیریں بنا رہا تھا۔ یقیناً یہی وہ حسینہ تھی جس کی تمنا میں بنی نوعِ انسان کا ایک ایک فرد مضطرب و بے چین نظر آتا ہے۔ یہی وہ عورت تھی جس کی تلاش میں ہر شخص گلی کوچوں اور شہروں کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ اسی محبوبہ کے لئے میں ہوٹلوں، گاڑی کے ڈبوں اور دور دراز مقامات کو اپنا مسکن بناتا رہا۔ یہ وہی حسینہ تھی۔ یقیناً یہ وہی حسینہ تھی۔

میں نے اسے ان آنکھوں سے، جو میری طرف دیکھ رہی تھیں، ان بالوں سے جو انگریزی فیشن میں مزین تھے اور سب سے زیادہ اس کے چہرے، اور اس کے دلربا تبسم سے، جو دیر سے میرے تخیل میں جاگزیں تھا، پہچان لیا۔ میں نے فوراً پوچھا۔

"یہ عورت کون ہے؟"

بوڑھی خادمہ بولی۔ "یہ مادام ہے۔"

میں نے کہا۔ "تمہاری مالکہ؟"

اس نے متانت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ "نہیں، نہیں!"

میں بیٹھ گیا اور استقلال سے پوچھا۔ "اس کے متعلق کچھ بتاؤ تو۔"

وہ حیرانی کے عالم میں ساکت و صامت کھڑی تھی۔ میں نے اصرار سے پوچھا

"تو پھر کیا یہ اس مکان کی مالکہ ہے؟"

"نہیں جناب!"

"تو پھر یہ مکان کس شخص کا ہے؟"

"میرے آقا موسیو ٹونیلی کا۔"

میں نے تصویر کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"اور یہ حسینہ کون ہے؟"

"یہ مادام ہے۔"

"تمہارے آقا کی بیوی؟"

"نہیں نہیں، جناب۔"

"اس کی محبوبہ؟"

خادمہ یہ سن کر خاموش ہوگئی۔ میرا دل موسیو ٹونیلی کی رقابت سے جل رہا تھا۔ کیونکہ وہ مجھ سے پہلے ایسی عورت سے آشنا ہو چکا تھا۔ میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ "اب یہ دونوں کہاں ہیں؟"

خادمہ زیر لب بولی۔ "موسیو تو پیرس میں ہے۔ مگر مادام کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں۔"

میں حیران سا ہو کر رہ گیا اور پوچھنے لگا "تو اب یہ دونوں اکٹھے نہیں رہتے"۔

خادمہ بولی۔ "نہیں۔"

میں نے ہمہ تن گوش ہو کر نہایت متانت سے پوچھا۔ "مجھے تمام ماجرا سناؤ، شاید میں تمہارے آقا کی کوئی خدمت بجا لا سکوں۔ میں اس عورت کو جانتا ہوں۔"

خادمہ نے میری طرف دیکھا اور میرے اخلاص آمیز اندازِ گفتگو پر اعتبار کرتے ہوئے بولی:۔

"دیکھئے۔ اس عورت نے میرے آقا کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔ وہ پہلی مرتبہ اس سے اٹلی میں شناسا ہوا اور اسے یہاں اپنے ساتھ لے آیا۔ یہ بڑی دلکش آواز سے گاتی تھی۔ وہ اس پر اس درجہ فریفتہ تھا کہ اس کے عشق نے اسے دیوانہ ہی بنا دیا تھا۔ یہ دونوں پچھلے سال اس علاقے میں سیر کرنے آئے تھے کہ یہ مکان ان کی نظر پڑا۔ مادام نے اسی وقت اسے خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ میرے آقا نے اسے خوش کرنے کی خاطر مکان خرید لیا۔ انہوں نے گذشتہ پچھلی گرمیاں اور سردیاں یہیں بسر کیں۔ پھر ایک صبح ناشتے کے وقت آقا نے مجھے بلا بھیجا اور پوچھنے لگا کیا مادام آگئی ہے؟"

میں نے جواب دیا "نہیں آقا"۔ اور ہم سارا دن اس کا انتظار کرتے رہے آقا دیوانہ ہو رہا تھا۔ ہم نے ہر جگہ اس کی تلاش کی۔ مگر وہ ہمیں کہیں نہ ملی۔ نہ معلوم وہ کیوں چلی گئی اور کہاں چلی گئی"۔

خادمہ سے یہ قصہ سن کر میرے دل میں مسرت کی ایک برقی لہر دوڑ گئی۔ میں چاہتا تھا کہ اس خوشی میں خادمہ کو اپنے بازوؤں میں لے لوں اور ڈرائنگ روم میں رقص کرنے لگوں۔

آہ میری حسینہ نے، میرے رقیب کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا تھا وہ اس کی محبت سے سیر ہو گئی تھی۔ وہ اس سے متنفر ہو گئی تھی اور میں اس بات سے اپنی خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔

بوڑھی خادمہ بولی "موسیو فرطِ غم سے مرا ہی چلا تھا۔ اب وہ پیرس واپس چلا گیا ہے اور مجھے اور میرے شوہر کو مکان بیچنے کے لئے یہاں چھوڑ گیا ہے وہ اسے بیس ہزار فرانک پر فروخت کرنا چاہتا ہے"

میری توجہ اب خادمہ کی باتوں پر نہ تھی۔ میں حسینہ کے شیریں تصور میں محو تھا۔ یکایک مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں اس سے ضرور کہیں ملاقات کر سکتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ اب بہار کا موسم ہے اور وہ ضرور اس مکان ــــ اس دلکش مکان کو، جسے وہ اتنی شدت سے چاہتی تھی، دوبارہ دیکھنے آئے گی۔

میں نے دس فرانک خادمہ کے ہاتھ میں دئیے اور حسینہ کی تصویر کو انگیٹھی پر سے اٹھا کر وہاں سے بھاگ نکلا اور پہلی سڑک پر ہو لیا۔ راستے میں میں تصویر کی طرف دیکھتا جاتا تھا۔ یہ بات کتنی امید افزا تھی کہ وہ موسیو ٹونیلی کے دامِ الفت سے اپنے آپ کو چھڑا کر چلی گئی ہے۔ میرا خیال تھا کہ آج یا کل اس ہفتے یا آئندہ ہفتے اس سے ضرور میری ملاقات ہو جائے گی۔ نہ معلوم اب وہ دنیا کے کس خطے میں ہو گی۔ میں اس کی صورت سے آشنا ہو چکا تھا اور اب صرف اس سے دو چار ہونے کی فکر میں تھا۔

میں نے تمام راستہ پودوں کے نرم و نازک ریشوں سے اپنی انگلیوں کو مس کرتے اور سمندری ہوا سے اپنے پھیپھڑوں کو بھرتے ہوئے طے کیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ سورج کی خوشگوار شعاعیں میرے چہرے پر بوسے دے رہی ہیں۔ میں فرطِ مسرت سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں جلد ہی اس سے ہمکنار ہو جاؤں گا اور پھر اسی خوشنما مکان میں اس کے ساتھ عیش و نشاط کی زندگی گذاروں گا۔

(موپاساں)

طاہر قریشی بی اے

نیرنگِ حیات

زندگی کا ہر گھڑی نقشہ بدلتا ہی رہا
اور انہی نیرنگیوں سے جی بہلتا ہی رہا

کارخانہ صانعِ عالم کا رکتا ہے کہیں؟
کارکن مرتے رہے اور کام چلتا ہی رہا

دل ہی شاید دینِ الفت میں رہے ثابت قدم
عقل کا مذہب تو ہر ساعت بدلتا ہی رہا

روندنا چاہا خرد نے جب کبھی جذبات کو
پاؤں ہر ہر گام پر اُس کا پھسلتا ہی رہا

نفس جس کی تربیت میں زندگی کا راز تھا
زاہدِ ناداں اُسی کا سر کچلتا ہی رہا

ذوقِ عصیاں بڑھ کے خود بنتا گیا جاں کا عذاب
ہم یہی سمجھے خدا کا حکم ٹلتا ہی رہا

میں نے ثابت کر دیا اپنے گناہوں کا صواب
اُن میں نیکی کا کوئی پہلو نکلتا ہی رہا

ہوش آنے پر بھی غفلت کی تلافی کچھ نہ کی
وقت کے کھو بیٹھنے پر ہاتھ ملتا ہی رہا

اے اسدؔ پایا خوشی کو اور نہ غم کو دیرپا
زندگی کا ہر گھڑی نقشہ بدلتا ہی رہا

اسد ملتانی

اشتراکی شاعری

ہندوستان میں اشتراکیت کی ابتداء[۱۹۲۰ء] القریبًا میں ہوئی۔ اس کے مقاصد اور اصول وہی قرار دئے گئے جو لینن نے تیسری بین الاقوامی کے لئے مقرر کئے تھے یعنی وجود الٰہی کا کلی انکار، زمینداروں اور سرمایہ داروں کا قلع قمع، اور مزدوروں کی حکومت کا قیام۔ اشتراکیت پسندوں کا انتہائی مقصد یہ ہے کہ روایاتی زندگی کو بالکل بدل دیا جائے اور اس کی جگہ ایسی زندگی پیدا کی جائے جو آج تک زمین کے پردے پر نظر نہیں آئی۔ ان کا خیال ہے کہ اب تک زندگی کے جس قدر قوانین وضع کئے گئے ہیں وہ محض سرمایہ داروں کے لئے مفید تھے، غریبوں یا مزدوروں کو ان سے کسی ترقی یا آسائش کی امید نہیں۔ چنانچہ اشتراکیوں کے نقطۂ نظر سے فنون لطیفہ کا فروغ بھی اب تک اس جذبے کے ماتحت ہوا ہے۔ ان فنون میں انسانی آبادی کے بڑے حصہ یعنی مزدوروں اور کسانوں کے جذبات کی ترجمانی نہیں کی گئی اس لئے انہوں نے ہر اس چیز کو ٹھکرا دیا جس میں ذرا بھی قدامت کا شائبہ تھا۔ شاعری میں بھی انہوں نے یہی روش اختیار کی۔ قدیم شاعری کو ٹھکرا کر جدید شاعری کی بنا ڈالی جس میں صرف مزدوروں کے جذبات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاعری وہی چیز ہے جو شعرا دماغی کاوش سے شعر کہتے ہیں ان کے کلام میں کبھی وہ زور نہیں آسکتا جو ایک حقیقی شاعر کے یہاں ہوتا ہے لیکن اشتراکیت پسند اس نظریے کو صحیح نہیں سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہبی شاعر اور الہام محض ڈھکوسلے ہیں غیب سے مضامین کی آمد کا خیال بے سروپا ہے، ہر شخص شاعر بن سکتا ہے اور اگر اس کو تربیت دی جائے تو اس کے کلام میں وہی ندرت پیدا ہو سکتی ہے جو ایک فطین کے یہاں ہوتی ہے۔ دنیا کی شاعری میں اب تک یہی مانا جاتا ہے کہ شاعر میں ایک خاص باطنی دانش ہوتی ہے جس کے ذریعے سے وہ کائنات کے ان سربستہ رازوں کو دیکھ سکتا ہے جو عوام کی نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں لیکن اشتراکیت اس کی قائل نہیں اُس کے ماہرین علم الاعضا نے بہت سے کتوں اور دیگر جانوروں پر تجربے کئے اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہر ذی روح کی قوت حاسہ میں اگر تحریک پیدا ہو تو اظہار جذبات ہوگا یعنی تحریک ہمیشہ خارجی ہوتی ہے، ان ماہرین نے مختلف اوقات میں بہت سے کتوں کے منہ میں ایسڈ ڈالا اور اس خارجی تحریک سے جو اثر روح پر پیدا ہوا اس سے قواعد بنا ڈالے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ ہر روحانی فعل کسی نہ کسی حاسہ کا ممنون ہوتا ہے۔ اسی طرح فطنت، خداداد وصف الہام وغیرہ کو بھی اس روشنی میں دیکھا گیا۔

اب ذرا اشتراکیوں کے اس نظریے پر نظر ڈالیں۔ اشتراکیوں کے علاوہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ شاعر پیدا ہوتا ہے اس کی فطرت کی تشکیل میں چند ایسے عناصر شامل ہوتے ہیں جن سے متشاعر محروم ہوتا ہے مثلاً میر اور مصحفی کا کلام دیکھئے مصحفی کی استادی کو سب نے تسلیم کیا ہے کیونکہ ان کے یہاں الفاظ جن کا تعلق مشق اور علمیت سے ہے بہت موزوں ہیں کہیں الفاظ کی نشست قابل اعتراض نہیں لیکن خیالات جنہیں شاعری کی جان کہنا چاہئے اس اثر سے محروم ہیں جو ایک الہامی شعر میں ہوتا ہے میر کی شاعری وہبی ہے، ان کے اشعار میں سوز و گداز، تڑپ، اور بلندی بدرجۂ اتم موجود ہے، یہاں الہام کی قدر آشکار ہو گئی اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اشتراکیوں کا ردِ الہام کس قدر مضحکہ خیز ہے۔

اشتراکی ماہرین دماغ کے نزدیک یہ عضوی شہادتیں شاعری کے مسئلے کو مکمل طور پر حل کر دیتی ہیں، ان کے خیال میں دماغی پیداوار غیر ارادی یا غیر معلوم نہیں ہو سکتی بلکہ یہ پیداوار ایک عضوی مشین کا ساعمل ہے جس کی درستی مرضی کے مطابق ہو سکتی ہے اشتراکی شعرا کا نظریہ یہ ہے کہ

شاعری ایک طرح کی رنگ آمیزی ہے جسے تھوڑی سی تربیت کے بعد ہر شخص سیکھ سکتا ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں شاعری فطرت میں نہیں بلکہ الفاظ، تشبیہات اور استعارات میں مضمر ہے۔

مسٹر شاوچ نے ایک رسالہ (FuturISM WITHOUT DISGUISE) میں شاعری کو محض الفاظ کا مجموعہ قرار دیا، مائکوفسکی اور اس کے شاگردوں کی بھی یہی رائے ہے کہ شاعری صرف الفاظ کو سلیقے سے ملا دینا ہے۔

زبان کا تاریخی ارتقا الفاظ کی معنوی حیثیت کو ان کی صوری حیثیت پر فوقیت دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں مسلم الثبوت استاد نئے الفاظ اور جدید تراکیب ڈھالتے ہیں، ان کا منشا یہ ہوتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے صوری حیثیت کو معنوی حیثیت پر فوقیت دی جائے، اس لئے ماہرین علم اللسان کا فیصلہ ہے کہ نئے الفاظ کی پیدائش ہمیشہ جاری رہنی چاہیئے تاکہ زبان کے ظاہری و باطنی محاسن میں اضافہ ہو، اشتراکی شاعر یہ مانتا ہے کہ زبان کے تاریخی ارتقا میں الفاظ کی معنوی حیثیت کو فوقیت ہوتی ہے لیکن چونکہ وہ اپنی دنیا بالکل مختلف بنانا چاہتا ہے اس نے اس قدیم نظریے سے بھی اختلاف کیا اور اس کی متضاد صورت یعنی صوری حیثیت کو ترجیح دی،

اشتراکی شعرا کا یہ نظریہ قطعی غلط نہیں لیکن (Sherahenhrich) نے اس کو مضحکہ خیز بنا دیا، اس کے خیال میں الفاظ کو معنی سے کوئی تعلق نہیں اور ساتھ ہی صرف و نحو کے قواعد کو دنیائے ادب سے یک قلم خارج کر دینا چاہیئے۔

شعر گوئی کے ان نظریوں کے علاوہ روس میں بات چیت کے الفاظ کو تعلیم یافتہ عوام کے الفاظ کی کیمیا سمجھا جاتا ہے، الفاظ کی کیمیا کے اس علم کو ترقی دینے کے لئے باقاعدہ ایسے کیمیا خانے بنائے گئے جہاں الفاظ کے قابل کیمیا گر نئے الفاظ نئے بحور اور نئے اصول بناتے ہیں، اسی طرح برانسوف انسٹی ٹیوٹ (Brunsov Institute) میں شعر کے تمام اجزا کی تحلیل و تشریح کر کے ان میں اضافہ یا کمی کی جاتی ہے، یہاں کے ماہرین کہتے ہیں کہ عنقریب شعر گوئی ہر شخص کو اس طرح سکھا دی جائے گی جس طرح پڑھنا یا باجا بجانا سکھایا جاتا ہے۔ اسکولوں میں دیگر مضامین کے ساتھ شعر گوئی بھی ایک مضمون ہوگا جو طالب علم چاہے اختیاری مضمون کی طرح اسے لے سکے گا۔ اس طرح یہ غلط فہمی کہ شعر گوئی محض چند لوگوں کا حصہ ہوتی ہے جاتی رہے گی لیکن قدرت سے جنگ کرنے کا نتیجہ بھی ان لوگوں کو جلد معلوم ہو گیا، پانچ سو چودہ طلبا میں سے جنہوں نے شاعری اختیاری مضمون کی حیثیت سے لی تھی صرف ۳۶ شاعر طیلسانیں (graduates) کامیاب ہو سکے۔ ان چھتیس کے متعلق بھی یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے ان میں شعر گوئی کے جراثیم ہوں یا قطعی ناکامیابی کے دھبہ کو دور کرنے کے لئے چھتیس طلبا کو ڈگریاں دے دی گئی ہوں۔

اشتراکیوں کا عقیدہ ہے کہ الہام، باطنی دانش، اصول وغیرہ محض سرمایہ داروں کی ایجادیں ہیں، ان کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں یہ نظریہ کہ شعر اور ادب زندگی کو حسین بناتے ہیں قطعی غلط ہے بلکہ زمانہ وسطیٰ کے اوہام ہیں جبکہ سرمایہ داری کا ظلم انتہائی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اشتراکیوں نے فن کا مقصد صرف یہ قرار دیا ہے کہ اشتراکی اصولوں کے مطابق زندگی کی تشکیل و تعمیر کی جائے۔ نئی قسم کی نظموں۔ ناولوں۔ ڈراموں کو جذبات، احساسات اور کردار نگاری سے کوئی تعلق نہیں بلکہ ان میں سے ہر چیز کو اشتراکیت کے نشر و اشاعت کا آلہ بنایا گیا ان کا نظریہ فن کے متعلق یہ ہے کہ فن زندگی کو پیش نہیں کرتا بلکہ نئی زندگی پیدا کرتا ہے، یہ سرمایہ داروں کے ہاتھ کا آئینہ نہیں بلکہ عوام کے ہاتھ کا ہتھوڑا ہے"۔

اشتراکیت نے نظم میں سب سے مقدم چیز انقلابی روح سمجھی۔ ہر نظم ایسی ہو جو سرمایہ داروں کے خلاف عوام میں بغاوت، نفرت اور غصہ پیدا کرے۔ اس قسم کی نظموں میں (Demianbeedny) کی نظمیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کا جذب و جوش تعجب خیز ہے، الفاظ آگ کے شرارے ہیں جو پڑھنے والے میں بھی سرعت سے اشتعال پیدا کر دیتے ہیں، اس کی ایک نظم کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے ؎

اٹھو، اٹھو، اے لوگو، دنیا کے مصائب کا بدلہ لینے والو۔
جاگو اٹھو، مار ڈالو، مار ڈالو،
ان سب کو مار ڈالو، بدکاروں کو،
ان سب کو جنہوں نے ہماری روٹیاں چرالی ہیں،
اے مزدورو، اب گودا بنا ڈالو۔
اپنے گھونسوں سے اس کا جس کو خدا کہتے ہیں۔
تم دنیا کی قسمت کے مالک ہو۔

اے مزدورو! تم آزاد ہو، آزاد،
اے حکمرانو، اب تمہارا خاتمہ ہونے والا ہے
اٹھو، اے لوگو، فتح،
آگے بڑھو، فتح، بڑھو، بڑھو،
آگے بڑھو . . . اور گولی پر گولی۔

بیڈنائی (Bedny) کی دوسری نظم جس کا عنوان "ڈی ہائی وے" ہے روس میں بہت مقبول ہوئی، اس میں مزدوروں اور سرمایہ داروں کی جنگ کا منظر بہت ہی سخت الفاظ میں دکھایا گیا ہے حتیٰ کہ گالیاں تک آ گئی ہیں، اس کے بعد مزدوروں کی فتح کے ترانے گائے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

کون ہے؟ کہو دیا — اس دفعہ تم دو ڈنک مارو!
آؤ، جہنم کے منہ میں اپنے نخروں کے ساتھ اے آقاؤ،
تم برباد، ہم اب خوشامدی نہیں، اے آقاؤ،
ہمیشہ اپنی دم افسوس سے ہلاتے رہو، ہم تمہارے جبڑوں پر ضربیں لگائیں گے۔
اے آقاؤ،
برباد ہو جاؤ، برباد،
تم وہ ہو جن کی ہڈیاں چربی میں سڑ رہی ہیں،
نیچے گر جاؤ، خون پینے والے کتو، مکارو اپنی زبان بند کرو۔
تم انسانی غلاظت ہو!
گڑھوں میں گر کر مر جاؤ،
برباد ہو جاؤ، برباد،
راہ کھلی ہوئی ہے،
اپنے تمام عملہ کے ساتھ فنا ہو جاؤ۔
ایک، دو
ایک، دو
بڑھو، بڑھو،
سرمایہ داروں کی حکومت ایک غلاظت کا ڈھیر ہے
مزدوروں نے حکومت لے لی ہے۔
مداخلت مت کرو۔

بیڈنائی (Bedny) کی نظموں سے روس کے انقلاب کو بڑی مدد ملی اور (Party Executive) اور (Red General Staff) نے ان کی بڑی قدر کی، ان نظموں نے عوام میں ایک آگ بھڑکا دی، ہر طرف انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند ہونے لگے، جو فوجیں جنگ سے تھک گئی تھیں وہ از سر نو تازہ ہوئیں اور جنگ میں بدستور سابق حصہ لینے لگیں اور سرمایہ داروں کے سر کو سر بازار توڑنا شروع کیا خصوصاً ایسے وقت میں جبکہ ان کا جوش ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اس صلہ میں حکومت نے بیڈنائی کو ۱۹۲۳ء میں سب سے بڑا اعزاز (Order of the Red Flag) عطا کیا اور درباری شاعر بھی بنا دیا، روس کی جید ہستیوں نے نہایت شاندار الفاظ میں اس کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ ٹراٹسکی لکھتا ہے "وہ ایسا شاعر نہیں جو انقلاب تک پہنچا ہو یا اس کو قبول کر لیا ہو بلکہ وہ شاعری کے اسلحہ سے آراستہ ہو کر اس کی خدمت کر رہا ہے، انقلاب اس کی شاعری کا موضوع نہیں بلکہ انقلاب ایک زبردست حاکم ہے جس نے اس کو اس رتبے پر پہنچایا ہے . . . مجموعی طور پر اس کی شاعری ایسی ہے جو اس سے قبل کبھی نہیں ہوئی"۔

بیڈنائی میں کوئی نمایاں قابلیت نہیں، اس کے دماغی کارنامے ایسے نہیں کہ اس کو دنیا کی باعظمت ہستیوں میں جگہ دی جائے۔ وہ محض ایک کسان کا لڑکا ہے۔ اس کی نظمیں صرف پروپیگنڈے کے لئے ہیں، ان میں نہ کوئی مسرت کا عنصر ہے اور نہ حیاتِ انسانی کی تشریح ہے۔ لیکن اس کی مسلسل کامیابی کا راز زبان کی روانی اور الفاظ کی سادگی میں ہے، اس کے اسلوب میں قدامت کا رنگ بھی ہے۔ لیکن اس کے جوش اور اثر کی وجہ سے حکومت نے اس رنگ کو نظر انداز کر دیا ورنہ حکومت ہر اس چیز کی دشمن ہے جس میں قدامت جھلکتی ہو۔ کچھ عرصہ بعد بیڈنائی کو بھی اسی قدامت کی وجہ سے انقلاب کا دشمن سمجھا جانے لگا۔ اس کے خلاف ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جو مایاکوفسکی (Mayakovsky) کو حقیقی انقلابی شاعر سمجھتا تھا۔ موخر الذکر میں چند خوبیاں ایسی تھیں جن سے اس کی مقبولیت اور زیادہ ہو گئی۔ وہ ہر طرح مزدور معلوم ہوتا تھا۔ اس کی کرخت آواز، اس کے قوی جسم، اس کے غیر مہذب اطوار اور اس کی اوباش مزاجی نے اسے مزدوروں کا صحیح نمائندہ شاعر بنا دیا، اس کی ایک نظم "لیفٹ مارچ" (Left March) کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو ؎

آگے بڑھو، بڑھو، بڑھو،
باتیں کافی ہوچکیں ۔ دھوکے بھی کافی ہو چکے،
فضول بکواس کا خاتمہ کردو۔
تمہارے پاس الفاظ ہیں، کامریڈ موزر،
اے آدم اور حوا کے زمانے کے قوانین
ہم تمہیں توڑتے ہیں، دنیا ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی ہے،

مائیکو وسکی کی وہ نظم جس کا عنوان "ایک سو پچاس ملین"
(150 Million) ہے انقلابی جذبات کی سچی تصویر ہے
ملاحظہ ہو ؎

رومانیت کی دنیا کے ساتھ فنا ہو جاؤ،
ہمارے بزرگوں کی قنوطیت کے ساتھ
جمع کرنے کے خبط کے ساتھ فنا ہو جاؤ،
بہادر بنو، رگوں کو سخت کرلو،
جوش سے بھری ہوئی،
تمہاری روح،
بھاپ، ٹھونسی ہوئی ہوا، بجلی کی طرح
ان زکوٰۃ دینے والوں کے
گنجے سروں پر کلہاڑی کا ناچ ہونے دو،
مار ڈالو، مار ڈالو،
شاباش، ان کی کھوپڑیوں کو راکھ دان بنالو،
بڑھو،
اپنے گھونسے ان کی پسلیوں میں برچھیوں کی طرح بھونک دو،
زکوٰۃ دینے والے شرفا کے جبڑوں میں،
اپنے گھونسے ٹھونس دو اور ان کو توڑ دو،
ان کی ناکوں میں پونچھنے کے کپڑے ٹھونس دو،
اپنے دانت تیز کرو،
وقت کو کاٹو،
نئے چہرے، نئے خواب،
نئے گیت، نئے تصور،
ہم ایک نئی دنیا کی بنیاد ڈال رہے ہیں۔

مائیکو وسکی کو بیڈنیائی پر ایک او فضیلت تھی، وہ صرف سر توڑنے اور گھونسہ مارنے ہی کی نظمیں نہیں لکھتا تھا بلکہ اُسے اصلاحات کو بھی اپنا موضوع بنایا لیکن بالآخر وہ نظمیں بیچنے والا شاعر ہوگیا۔ اس کے باقاعدہ انقلابی نظموں کو فروخت کرنے کے لئے اشتہار شائع کئے، اس کے خیال میں فن کی وہ صورت جو غیر اشتراکی ممالک میں ہے محض فریب ہے اس کا منشا فن سے صرف روزمرہ زندگی کی خدمت ہے۔ اسی خیال سے وہ صابن کے فواید میں نظمیں لکھتا ہے، شراب کے فواید کو موضوع بناتا ہے۔ غرض اس قسم کے واقعات جن کا تعلق روزمرہ زندگی سے ہے ان کا اظہار فن ہے۔

ان انقلابی مزدور شعرا کے علاوہ تخیلی شعرا نے بھی اس میدان میں قسمت آزمائی کی لیکن بیڈنیائی اور مائیکو وسکی کے سامنے ان کی ایک نہ چلی، مجبور ہوکر انہوں نے بھی ایک موضوع اختیار کیا۔ یہ مذہب تھا، چنانچہ انہوں نے مذہب کے خلاف نظموں میں پروپیگنڈا شروع کیا، اور چونکہ عوام اور حکومت دونوں پر زور طریقہ سے مذہب کے مخالف ہیں اس لئے ان کی بھی پرسش ہوئی۔ انہوں نے اپنی نظموں کو فروخت کرنے کے لئے باقاعدہ اشتہار جاری کئے اور دل کھول کر مذہب کی توہین کی، کوئی ایسا الزام نہ تھا جو مذہب کے سر نہ تھوپا گیا ہو، دنیا کے مصائب و آلام کا ذمہ دار مذہب کو ٹھہرایا اور جاہل اور غیر تعلیم یافتہ عوام کو نہایت غلط اور سطحی دلائل سے وجود باری تعالیٰ کا منکر کردیا، اسی گروہ کا سب سے بلند شاعر میر نہاف (Merienhoff) ہے۔

حکومت کو شعرا کی ان جماعتوں سے یہ خطرہ ہوا کہ کہیں ان کی نظموں میں انقلاب کے خلاف عناصر نہ جگہ پا جائیں، اس لئے تمام جماعتوں کو باقاعدہ سرکاری نگرانی میں لیا گیا اور قابل اعتماد افسر مقرر کئے تاکہ وہ یہ دیکھیں کہ ہر شاعر اپنی نظم میں کون کون سے اسمائے صفت (Adjectives) استعمال کرتا ہے؟ وزن کس قسم کا ہے؟ بحور کا انداز کیا ہے؟ انقلاب میں معاون ہیں یا نہیں؟

بیڈنیائی، مائیکو وسکی اور میر نہاف تینوں انقلابی شاعری کے درخشندہ ستارے ہیں۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد انقلابیوں کو خیال آیا کہ فنون لطیفہ ہماری سوسائٹی کی اقتصادی حالت کے موافق ہونے چاہئیں چونکہ روس میں سوسائٹی کا نظام اجتماعیت (Collectivity) پر قایم ہے اس لئے فنون کی بھی یہی شکل ہونی چاہئے۔ اس لئے ہر شاعر کو لازم ہے کہ وہ نظم میں اپنے جذبات کا اظہار نہ کرے بلکہ عوام الناس

کے جذبات کو موضوع بنائے گویا نظم شخصی (Personal) نہیں بلکہ غیر شخصی (Impersonal) ہو۔ اس نظریے کی تائید سب سے اول بوگدانوف (Bogdanov) نے کی اور کہا کہ حقیقی معنوں میں مزدوروں کے فنون کی بنیاد بھی اجتماعیت ہی پر ہونی چاہیے۔ اس کی اس تحریک پر بہت سی انجمنیں قایم ہوگئیں جہاں "الفاظ کے معمار" (Word workers) نے متحد ہوکر نئی قسم کی نظمیں لکھنی شروع کیں۔ ان کی تصانیف جو روس کی مطالعہ گاہوں میں ملتی ہیں ان پر کسی ایک مصنف کا نام نہیں ہوتا بلکہ یوں لکھا جاتا ہے "مصنفہ ۳۰ کا گروہ" "مصنفہ ۲۰ کا گروہ" "مصنفہ ۲۵ کا گروہ" فنون لطیفہ کے یہ کارخانے سال یا چھ مہینے میں اپنا گوشوارہ بھی شائع کرتے ہیں جس میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ ان کے کارخانے میں مقررہ نوع کا کتنا ادبی ذخیرہ تیار ہوا۔

اس جدید تحریک نے شخصی شاعری کو مٹا دیا اور نہ تنہا کوئی شخص خود کو شاعر کہہ سکتا ہے بلکہ ہر شاعر کا فرض ہے کہ وہ کسی نہ کسی جماعت سے منسلک ہو۔ اس اجتماعیت کا یہاں تک زور ہوا کہ مایکووسکی نے اپنی بعد کی تصانیف میں اپنا نام لکھنا چھوڑ دیا اور اس کی تصنیف "ایک سو پچاس ملین" کو ہر اشتراکی اپنی تصنیف کہنے لگا۔ محض اس لئے کہ اجتماعیت کی رو سے کوئی شخص تنہا کسی چیز کا مالک نہیں ہو سکتا۔

اشتراکی شاعری کی یہ اجتماعیت غیر شخصی تصنیفات پر بھی قانع نہ رہ سکی بلکہ اب یہ قاعدہ ہوگیا کہ کسی مجمع کے سامنے ایک کی بجائے کئی آدمی مل کر نظم پڑھتے تھے۔ اس طریقے سے بھی وہی اجتماعیت کی روح پیدا کرنا تھا۔

جب سے اجتماعیت کا دور شروع ہوا ہر ممکن طریقے سے شخصی جذبات کے اظہار کو روک دیا گیا۔ گاسٹاف نے اپنی نظموں کے متعلق خود اعتراف کیا کہ ان میں کسی فرد واحد کے جذبات نہیں بلکہ تمام جماعت کو مدنظر رکھا گیا ہے اس تحریک کے باعث بہت سی تمثیلوں کا نام صرف (MASS) رکھا گیا۔ ستیاپنائی (Stapanai) نے ایک ناول میں "اکتوبر کی بغاوت" کو موضوع بنایا جس میں ہیرو فرد واحد کی بجائے تمام جماعت کو بنایا۔ اسی طرح مالشکن (Malishkin) نے ایک افسانہ لکھا جس میں پوری فوج کو ہیرو تصور کیا۔ لیکن اشتراکی اس اجتماعیت پر بھی قانع نہ ہو سکے کیونکہ اس میں بھی کچھ شخصیت کا شائبہ باقی تھا مثلاً ہیرو تو پوری جماعت کو بنا دیا لیکن مصنف ایک ہی کہلایا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مصنف بھی پوری جماعت ہی کہلائے، گو اس نظریے کی بعض افراد نے مخالفت کی لیکن ان کی مثال نقار خانہ میں طوطی کی سی تھی۔

ان تمام جدتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اشتراکیوں کی زندگی فنون لطیفہ کے صحیح معنی سے بہت دور ہوگئی اور شاعری محض سیاست کا جامہ بن گئی۔ اشتراکی حکام نے شاعری کو جاسوسوں کا شکار بنا دیا جو ہر قدم پر موجود تھے تاکہ تمام شعرا کے کلام کا جائزہ لیتے رہیں۔ جہاں انقلاب کی ذرا مخالفت ہوتی وہیں تختہ دار کا سامان بھی ہو جاتا لیکن یہ تشدد بالآخر ناقابل برداشت ہوگیا اور کئی ایسے گروہ پیدا ہوگئے جن کا نظریہ شعر کے متعلق مختلف تھا۔ ادب لطیف (Light literature) کے متعلق جب سرکاری رپورٹ شائع ہوئی تو واردوسکی نے اشتراکی شاعری پر بہت طعن و تشنیع کی اور کہا کہ "یہ لوگ زندگی کے مسائل اور حسن کاری کو شاعری کا عنصر نہیں سمجھتے جو انتہائی غلطی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے اعلیٰ تخیل کے شعرا بیکار ہو جائیں گے اور ہم ان کی شاعرانہ قوت سے محروم رہیں گے"۔ لیکن واردوسکی کی اس تنقید کا اثر لوگوں پر بہت کم ہوا اور تمام سیاسی رہنما ادب میں بدستور مداخلت کرتے رہے۔ ٹراٹسکی بھی ایک حد تک اشتراکی شاعری کا مخالف ہی نظر آتا ہے۔ لینن (Lenin) نے یہ رائے دی کہ اس قسم کی نئی شاعری پیدا کرنے کی بجائے عوام کی تعلیم پر توجہ کی جائے اور جو روپیہ شاعری کے پروپیگنڈے میں صرف ہوتا ہے وہ تعلیم پر خرچ ہونا چاہیے لیکن اشتراکی اپنی اسی طرز کے فریفتہ ہیں۔

زین العابدین

شعر

کیوں دیکھتے ہی نقش بہ دیوار بن گئے

تم آئینے میں کس کے خریدار بن گئے

شرف

غزل

نگاہوں میں، دل میں سمائے چلا جا!
یونہی میری ہستی پہ چھائے چلا جا!

زمانے پہ پھر بے خودی چھا رہی ہے
خودی کا ترانہ سنائے چلا جا!

غزل

عشق کے گیت گا رہا ہوں میں
غم کی دنیا بسا رہا ہوں میں

اپنی ہستی مٹا رہا ہوں میں
اُن کو اپنا بنا رہا ہوں میں

بس رہا ہے مری نگاہ میں خلد
حُسن کو دیکھتا رہا ہوں میں

دنیائے ادب

ادبی قیود اور ذہنی انقلاب

حیاتِ انسانی اس گہرے اور وسیع سمندر کی طرح ہے جو لامحدود قوتوں سے مل کر بنتا ہے۔ سمندر دیکھتے وقت ہمارے ذہن میں ایک وسیع چادرِ آب، ایک نامعلوم گہرائی، موجوں کا ایک ناقابلِ فہم گر دلکش گیت، لہروں کے طوفان میں ایک ہیبت ناک اضطراب اور ہیجان، ایک طرح کے حُسن اور ایک قسم کی عظمت کا احساس ہوتا ہے اور یہ اثر ہمارے تجربات اور معلومات، ہماری قوتِ حس اور جذب کی کمی و بیشی کے ساتھ ساتھ بڑھتا گھٹتا رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح انسانی زندگی اگرچہ دیکھنے م... ہے لیکن بہت سے چھوٹے بڑے ...

یہ سننے کو تو ہم نے بہت سنا لیکن اس کی نزاکت پر غور بہت کم کرنے کا موقع ملا ہے۔ ایک ہی شعر یہاں تمام بیٹھنے والوں پر مختلف طرح کے اثر پیدا کرے گا۔ اس کی وجہ نہایت سیدھی سادی مگر اہم ہے۔ ہمارے نیم شعوری اور بعض اوقات غیر شعوری احساسات جنہیں ہم کسی وجہ سے ... نہ سکے تھے، ممکن ہے کسی شاعر ... کی آنکھ ...

اب ہمیں دیکھنا یہ چاہئے کہ بعض اوقات اس طرح کی تبدیلیاں کیونکہ ہمارے ادب کے اندر جڑ پکڑ کر مضبوط ہو جاتی ہیں اور دوسرے انقلابات کے لئے پھر جگہ خالی نہیں کرنا چاہتیں یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ ادبی قیود کی پابندی کس طرح شروع ہو جاتی ہے۔ اول تو یہ کہ ہم بغیر خود اپنے دماغ کو کام میں لائے ہوئے اپنے ماحول سے بے خبر بن کر تمام پرانی باتوں کو مان لیں اور انہیں کو قائم رکھنے کی کوشش کریں۔ دوسرے یہ کہ ماحول کے پورے اثرات جذب کرکے صرف قدیم کو جدید کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ انسانی طبائع کے اختلافات کو دیکھتے ہوئے اس کے بہت سے درجے ہو سکتے ہیں۔ اگر کسی قوم کے ذہنی ارتقا کے رک جانے کی وجہ سے خیالات کے پھیلانے کا ذریعہ بہت مانوس اور یکساں رہا ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ قیود کی بندشیں مضبوط ہوتی چلی جائیں گی اور پھر ان کو متزلزل کرنے کے لئے کسی بڑے ہیجان خیز انقلاب کی ضرورت ہو گی۔ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ تولید و تخلیق جذبات کے لئے ذہنی ارتقا اور ایک طرح کی تیاری ضروری ہے جو نئے جذبات کا استقبال کرکے اسے اچھی جگہ دے۔

ایک حسین شام جب بادل کے بے پرواہ ٹکڑے ڈوبتے ہوئے سورج کو اپنے حلقہ میں لے کر ساکت تھے، جب سورج کی آخری کرنیں دریا کے کنارے چھوٹے چھوٹے ذرات پر عکس افگن ہو کر تڑپ رہی تھیں۔ جب پانی کی لہروں پر ایک طلائی چادر بچھی ہوئی معلوم ہوتی تھی، جب طائر اپنے آخری گیت گا کر اپنے آشیانوں میں جھولا جھول کر چھپ رہے تھے۔ اس وقت آپ کے دل میں نہ جانے کتنے خیالات پیدا ہوئے ہوں گے۔ کس قدر جلد جلد آپ کا ذہن گذشتہ زندگی کے واقعات طے کر گیا ہو گا۔ اور کھ اگ ا ۔۔۔ ش۔ ۔۔۔

ہیں۔ آپ کا دل جذبات اور تاثرات کا گنجینہ بن گیا ہے۔ آپ کے احساسات اس بے پناہ سیل رنگ و بو میں غرق ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کسی نہ کسی طرح اسے کہہ دینا چاہتے ہیں لیکن آپ کو دو باتوں کا خیال پھر بھی رکھنا ہے۔ اظہار خیال کا آلہ کیا ہونا چاہئے اور یہ کہ جس کے سامنے، جس دنیا کے روبرو یہ مرقع پیش کیا جائے گا اس میں قبول کرنے کی کہاں تک صلاحیت ہے۔ آپ ایک دیہات میں مشینوں کی دکان کھول کر کوئی فروغ نہیں پا سکتے اور نہ ایک کور چشم کو بہزاد کی غیر فانی مصوری سے متاثر بنا سکتے ہیں۔ یہ دو مشکلیں ہر فنکار یا آرٹسٹ کو پیش آتی ہیں لیکن ایک ادیب کو سب سے زیادہ — صرف الفاظ کام آسکتے ہیں۔ الفاظ جن میں صرف الفاظ ہونے کی حیثیت سے رنگ و بو نہیں، جن میں گرمی اور اثر نہیں، جن میں جوش اور تڑپ نہیں، ہاں ان سب کا نازک امتزاج، ان کا حسین میل جول سب کچھ پیدا کر سکتا ہے لیکن یہ توفیق ہر ادیب کو نصیب نہیں۔ اس یادگار شام کا اثر ایک دنیا پر ڈالنا ہے لیکن اسی دنیا کے سامنے جس میں خود آپ کی ذہنی نشو و نما ہوئی ہے جو آپ کو ہر جانب سے گھیرے ہوئے ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کوئی ایسی عجیب و غریب بات نہیں کہہ سکتے جسے آپ کی ایجاد یا اختراع کہا جا سکے دوسرے یہ کہ آپ کو خود اپنے مخاطب کی قوت اور معلومات کا احساس ہونا چاہئے۔ اب آپ یہ کر سکتے ہیں کہ شام کی ۔۔۔ سے تشبیہ دیں، سورج سے دور شفق کو کسی پھول کا ۔۔۔ نارنجی بادلوں کو کسی دیوی کا اڑتا ہوا آنچل ۔۔۔ کے علاوہ اور کوئی تدبیر اس ۔۔۔ پر اثر پیدا کر ۔۔۔

کرنے میں آپ کو ان تدبیروں سے کام لینا پڑے گا۔ اس میں آپ کے تجربات، مشاہدات اور معلومات سب شریک ہیں اور یہ صفتیں آپ سے الگ نہیں کی جا سکتیں۔ یہ آپ کی ہستی کا جزو بن گئی ہیں۔ اسی کو مدنظر رکھ کر میتھو آرنلڈ نے شاعر کو تین چیزوں کا مجموعہ بنایا ہے۔

اس طرح Life (زندگی) Emotion (جذبات) اور 4 میں 1

ادب مختلف چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے جس طرح وہ شام خون کی سرخی پھول کے رنگ سے بنی تھی اسی طرح ادب بھی مجموعہ ہے۔ زندگی کے چند احساسات کا، ادب مختلف چیزوں میں کوئی مرکزی مناسبت تلاش کر کے متحد کرنے کا نام ہے۔ یوں ہماری شاعری اور نثر نگاری کے بہت سے شعبہ جات کا دارومدار ہماری قوت مشاہدہ اور معلومات پر ہے۔

تشبیہہ اور استعارات کا ذکر اس لئے اتنا زیادہ کیا گیا کہ شاعری اور مضمون نگاری میں ان کا بہت کام پڑتا ہے اور انہیں کے مانوس یا غیر مانوس، نئے یا پرانے ہونے سے ادب کی لذت میں بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ دوست کے چہرے کو چاند سے کب تک تشبیہہ دی جائے کیونکہ بہت زیادہ انس نفرت بھی پیدا کرتا ہے۔ کسی ملک کے ادب میں تخیلات اور واردات کا بار بار دہرایا جانا ایک تھکی ہوئی ذہنیت کے لادار ہونے کا پتہ دیتا ہے۔ انسانی فطرت کی یہ طرفگی بھی یاد رکھنے کے بہت مانوس اور بہت نامانوس دونوں سے گھبراتی ہے

اور کرتے ہیں بسر کی ہے سوٹ پہن کر
اس لئے کہ وہ اس سے
گ بسر کرنے میں

لئے نئی ہو سکتی ہے۔ تاج محل کو بنے ہوئے کم و بیش تین سو سال ہوئے ہیں۔ لیکن وہ ہر نئی نسل کے لئے ایک نئی چیز ہے ... تو کبھی پرانے نہیں ہو سکتے۔ ان کا بیان فرسودہ ہو جاتا ... عنوانات سے بھی تکلیف ہونے لگتی ہے کوئی صبح کسی ... بالکل مشابہ نہیں ہوتی اور نہ کوئی تاروں بھری رات کسی دوسری طرح ہوتی ہے۔ لیکن ہم اپنے مشاہدات کو کام میں نہیں لاتے بہت زیادہ مانوس اور یکساں سمجھ کر ان کی تمام خوبیوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ تشبیہہ و استعارات، طرز بیان، خیالات کا رسمی طور پر بار بار دہرایا جانا در حقیقت وہ غلامانہ ذہنیت ہے جس سے بغاوت ضروری ہے۔

اس طرح ہم نے مختصراً یہ دیکھ لیا کہ ادب میں قیود کی پابندی کا کیا مقصد ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اس میں تبدیلیاں اور ترقی کے پیدا کرنے کے لئے ہمیں کیا کیا صورتیں اختیار کرنی چاہئیں اور جس طرح حیات مختلف منزلوں سے گذرتی رہتی ہے اسی طرح ادب کیونکر ان منازل میں ساتھ دے کر حیات کا ترجمان بن سکتا ہے ادب اپنی ترقی کے لئے دو راہیں اختیار کر سکتا ہے ایک تو یہ کہ رسوم و قیود کی پابندی کرتا جائے انہیں باتوں کو بار بار دہرایا جائے جو پہلے سے چلی آ رہی ہیں لیکن آنکھیں کھلی ہوئی ہوں اور قوت مشاہدہ اپنی پوری طاقت سے موضوعات پر نئے رنگ و روغن چڑھا رہی ہو دوسری صورت یہ ہے کہ پرانی باتوں سے الگ ہو کر انقلاب کی نئی روح پھونک دی جائے۔ پہلی راہ مصلحین کی ہے اور دوسری بے لاگ اور باہمت راہبروں کی جنہیں راستہ نہیں معلوم لیکن اس یقین کے ساتھ جا رہے ہیں کہ منزل کہیں بھی ہو انہیں ضرور مل جائے گی۔ روزمرہ کی زندگی میں انقلاب

اصلاح، ترقی اور ارتقا کے ذریعے

طرح دے سکتے ہیں کہ نئے موضوعات کو اپنے
سرمایہ ہمارے دامن میں ہے اسے پھینک کر دوسرا
مایہ زیادہ عقلمندی نہیں بلکہ یہ بہتر ہوگا کہ ہم اپنے دامن
نکل بے کار چیزوں کو پھینک دیں اور وہ نئی چیزیں لیں
وں کو بڑھانے میں مدد دیں۔ دنیا تبدیل ہو رہی ہے اور
اس سے فایدہ اٹھانا چاہیئے ورنہ ہم سے زیادہ کمزور اور کوئی نہ
ہوگا۔ سیاسی، معاشرتی، علمی، ادبی، مذہبی معیار زندگی بدل رہا ہے۔
ہمیں بھی اپنی پونجی میں اضافہ کرنا چاہیئے۔ وہ سڑے ہوئے پھل ٹوکری
سے ضرور نکال دینے چاہئیں جو اچھے پھلوں کو بھی اپنی گندگی سے
سڑا دیں گے۔

جب ادب یا ذہن کے ساتھ انقلاب کا لفظ استعمال کیا جاتا
ہے تو اس کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہماری محدود نظروں میں وسعت
پیدا ہو اور ہمارے علم میں اضافہ ہو۔ ہمارے مشاہدات موجودہ دور
کی ترقی سے فایدہ اٹھائیں ورنہ ہر شعبۂ حیات تو ترقی کر جائے گا اور
ادب سب سے پیچھے رہ جائے گا کس قدر مضحکہ خیز ہوگا۔ وہ وقت
جب ہم یہ دیکھیں کہ ایک سپاہی توپ کے مقابلے کے لئے اپنی
کمان میں تیر جوڑ کر سر کرنا چاہتا ہے وہ ادب جو زندگی کے سرچشمہ سے
سیراب نہ ہوگا، جو مسائل حیات سے کنارہ کشی اختیار کرکے توہمات کی
آڑ میں پناہ لے گا اس کا مٹ جانا ضروری ہے۔ ہم اپنے پرانے زنگ
آلود اسلحوں پر صیقل کر سکتے ہیں اور بازار سے نئے خرید سکتے ہیں تو ایسا
کیوں نہ کریں

مسائل حیات میں کچھ ایسی نئی شاہراہیں معلوم ہوتی ہیں جن
سے ہم اب تک بے خبر تھے ... دور کا انسان آفتاب

حاضر کے اضطراب کا ترجمان بنانا چاہیئے، اس سے یہ غلط نتیجہ نہ نکالا
جائے کہ ہم کسی غیر ملک کی پیروی کرکے اپنے ادب کو صرف ایک طرح
کی نقالی بنالیں لیکن ہمیں یہ حق ہے کہ ہم ان مسائل کو دوسرے ملکوں
کے ادب کی مدد سے سمجھیں۔ پہلا ذہنی انقلاب خود لکھنے والوں میں ہونا
چاہیئے، ان کا تنگ زاویۂ نظر، ان کا تعصب، ان میں معلومات کی کمی
انہیں کبھی ترقی یافتہ مصنفین کی صف میں نہیں پہنچا سکتی۔ ہمیں ضرورت
ہے کہ ہم اپنی زندگی کو تپا کر سونے کی طرح چمکا دیں، ہم تھوڑا سا کٹنے
چھٹنے کے لئے تیار ہو جائیں لیکن ہیرے کی جگمگاہٹ پیدا کر دیں۔ اظہار
خیال کے لئے اب بھی الفاظ ہیں جیسے پہلے تھے لیکن مناسبتوں میں
فرق آگیا ہے۔ ہماری ذہنی وسعتیں بڑھ رہی ہیں، ہمیں نئی دنیا سے
نئی تشبیہیں اور نئے استعارات تلاش کرنے چاہئیں اور وہ جنہیں سنانا
تھا، جن تک پیغامبری کرنی تھی وہ بھی تجربات اور معلومات کے لحاظ سے
گذشتہ صدی کے لوگوں سے آگے ہیں۔ ان کا دل جد و جہد میں
مدد دینے والی کتابیں چاہتا ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم انہیں محروم
نہ رکھیں۔ ہمارے نغموں میں بھی اب لذت بڑھ جانی چاہیئے۔ ہمیں کتاب
کا ورق الٹ کر دوسرا سبق شروع کر دینا چاہیئے جس میں پچھلے سبق
سے بھی مدد ملے گی۔ ہم ابھی تک تنقید میں اپنی نظر پاک نہ کر سکے، ہم
ادبیات میں تعصب اور اوہام بے جا کا خواب دیکھ رہے ہیں ... ہم
شخصیت پرستی سے مرعوب ہو کر اپنی ذہنی ایمانداری ...
قربانی پر تیار ہو جاتے ہیں لیکن اگر ہم
مذموم رسموں سے کنارہ کش
ہو سکیں گے

مسعود حفیظ

بیداری کا ثبوت اس
یہاں جگہ دیں چ
لینے کے لئے بڑھ
سے چھانٹ کر
جو ہماری قو
ہمیں

سماج اپنے عہدِ طفلی میں کوہ کن کے پہاڑ کاٹنے کو سن کر سر دھن سکتا تھا لیکن آج جب یہ کام نہایت آسان ہو گیا ہے ہم پر دوسری طرح اثر ڈالے جانے کی ضرورت ہے، پریوں کا ذکر میر حسن، امانت اور نسیم کی زبان سے لطف دے سکتا ہے مگر اب فرضی پریوں کی جگہ جنس نازک کی ان اصلی پریوں نے لے لی ہے جن سے روزانہ ہمارا سابقہ پڑتا رہتا ہے اور ہم ان فرضی پریوں سے زیادہ گوشت پوست کی بنی ہوئی پریوں سے کیف حاصل کر سکتے ہیں۔ زمانے کی روح بدل رہی ہے اور اگر ادب زندہ رہنا چاہتا ہے تو اُسے اپنے عہد کا ترجمان بننا پڑے گا ورنہ اس کی قسمت میں ٹھوکروں کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

میں نے ختم کیا — میرے عزیز! انسان سے محبت ہے تو اُٹھو، اوہام کی زنجیر مذہبی تعصب اور بے جا جنبہ داری سے بلند ہو ڈال دو جس کی کشش تمہارے ادب کو ہندوستان کی ذمہ دار ٹھہر جائے اور وہ زبان جسے سارے ہند روایات نے پودے کی شکل میں لگایا تھا۔ ایسا تناور درخت جس کے سائے میں غریب اور دکھیا پناہ لیں۔

"تیسان"

احتشام رضوی ماہلی

ہندوستانی زبان کا مستقبل

شاہجہاں نے دہلی کو از سرِ نو تعمیر کیا اور اپنی عظمت کی یادگاریں قلعہ اور جامع مسجد جیسی بے نظیر عمارتیں چھوڑیں دیوانِ عام اور دیوانِ خاص اس گئی گذری حالت میں آج بھی اس مغل بادشاہ کے صاحب حوصلہ ہونے کی داد دے رہے ہیں۔ اگر کوئی صاحبِ نظر اپنے ذہن میں دورِ ماضی کی سطوت اور شوکت کا تصور لا کر دیوان خاص پر کندہ کئے ہوئے

بست ◆ ہمین است و ہمین است و ہمین است
سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے

ہر قوم کی ضروریات کے تحت مرتب ہوتی ہے اور اس پر اگر سیاسی دور اثر انداز ہوتے ہیں تو عارضی طور پر۔ اس کی حیثیت کہیں بلند ہے سیاسی عقاید سے اور کہیں بالاہے مذہب اور فرقہ داری سے "سلطنت مغلیہ کو زوال ہو گیا۔ بہادر شاہ ظفر کے دور میں سلطنت مغلیہ آخری سانس لے رہی تھی مگر مغلوں نے کئی صدیوں تک اقلیم ہند میں جو حکمرانی کی تھی۔ ان کے بیدار مغز فرمانرواؤں نے یہاں کے باشندوں میں جو میل جول اور محبت قایم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اکبرِ اعظم کے دربار میں سنسکرت اور فارسی کے ماہرین کی جو یکساں قدر و منزلت تھی ان سب نے ایک نئی چیز چھوڑی اور وہ زبان اردو تھی۔ مسلم اہل قلم اس کو استعمال کرتے ہوئے ڈرتے تھے [illegible] سنسکرت کے غیر مانوس

اب ہ[illegible] لیا تو نہ اس میں عرب کی لو تھی نہ شیراز کا حسن کیونکہ ہمار[illegible] یں میں کوئل کی کوک بلکہ گنگا اور جمنا کے شیریں ملار انقلابات [illegible] ایسے خوشنما طریقہ پر مل کر بج رہا تھا کہ ایک دوسرے میں تمیز [illegible] تھا۔ یہ تھی ابتدا اس زبان کی جو نہ کسی بادشاہ نے کوشش کی نہ کسی حکومت نے اس کے لئے کوئی اسکیم [illegible] عام آدمیوں نے جو ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر [illegible] کی حالت میں ایک دوسرے کے خیالات جذبات اور حسیات کی قدر کرنے اور ایک دوسرے کی معاشرت کی وقعت کرنے کے لئے مجبور تھے یہ زبان ایجاد کی اس کی سرپرستی اگر کی تو رائے عامہ نے اس کو ترقی اگر دی تو عوام نے جو لوگ فارسی رسم الخط جانتے تھے انہوں نے [illegible] اس میں لکھا جو سنسکرت رسم الخط سے واقف تھے انہوں [illegible] گنگا [illegible] کی ایک تھی جو فارسی سے [illegible] تھے۔

ہوں گی تو نہ اردو کا نام باقی رہے گا اور نہ ہندی کا بلکہ ہندوستانی زبان ہندوستان میں رائج ہو گی۔

ایک اور نئی بات جو ابھی پیدا ہو گئی ہے اور وہ یہ کہ ہر صاحب سیاست جب اردو یا ہندی کے افتراق کو رفع کرنے کے لئے نصیحت کرنے کھڑا ہوتا ہے۔ تو وہ یہ تلقین ضرور کرتا ہے کہ ہر صاحب قلم کا فرض ہے کہ آسان الفاظ لکھے اور ایسی زبان لکھے جو عام فہم ہو۔ یہ نصیحت کچھ ایسے طور پر بلا دماغ پر زور ڈالے عام ہو گئی ہے کہ اس پر بھی مختصر طور پر کچھ روشنی ڈالنی ضروری ہے۔

اگر سیاسی رہنماؤں کو علم ادب کی رہنمائی میں بھی وہی اہمیت حاصل ہوتی تو بلاشک یہ بات اور زیادہ خطرناک تھی تاہم یہ بتا دینا ضروری ہے کہ کسی اہل قلم کو کسی خاص طرز نگارش کے لئے پابند کرنا گویا زبان کو مردہ کر دینے کے مرادف ہے۔ دنیا میں جب تک علم ادب کا وجود ہے نئے نئے طرز کے شاعر انوکھے انوکھے اسٹائل کے مالک نثار پیدا ہوتے رہیں [illegible] اپنے ادبی تنوع اور کلام کے گوناگوں طرز پر ہی فخر کر سکتی [illegible] احوا اس زبان کے اہل فکر کے [illegible]

ہے ذوقِ نظر معرضِ گفتگو میں

ذرا رُخ سے آنچل ہٹائے چلا جا

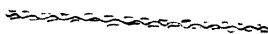
ابھی زندگی کے ہیں کچھ سانس باقی

چراغِ سحر جھلملائے چلا جا!

تری ضو سے ہے ہستیٔ وجد روشن

مرے داغِ دل جگمگائے چلا جا!

سکندر علی وجد



سعیٔ ناکام لے چلا

آندھیوں میں جلا رہا ہوں میں

اک نظر دیکھ بھولنے والے!

مدتوں آشنا رہا ہوں میں

ساز ہستی کے تار ٹوٹ نہ جائیں

نغمۂ دل سنا رہا ہوں میں

جلوے آنکھوں میں رقص کرتے ہیں

کس کی محفل سے آ رہا ہوں میں

مسعود حفیظ

سماج اپنے عہد طفلی میں کوہ کن کے پہاڑ کاٹنے کو سن کر سر دھن سکتا تھا لیکن آج جب یہ کام نہایت آسان ہو گیا ہے ہم پر دوسری طرح اثر ڈالے جانے کی ضرورت ہے، پریوں کا ذکر میر حسن، امانت اور نسیم کی زبان سے لطف دے سکتا ہے مگر اب فرضی پریوں کی جگہ جنس نازک کی ان اصلی پریوں نے لے لی ہے جن سے روزانہ ہمارا سابقہ پڑتا رہتا ہے اور ہم ان فرضی پریوں سے زیادہ گوشت پوست کی بنی ہوئی پریوں سے کیف حاصل کر سکتے ہیں۔ زمانے کی روح بدل رہی ہے اور اگر ادب زندہ رہنا چاہتا ہے تو اُسے اپنے عہد کا ترجمان بننا پڑے گا ورنہ اس کی قسمت میں ٹھوکروں کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

میں نے ختم کیا — میرے عزیز... انسان سے محبت ہے تو اُٹھو، اوہام کی زنجیر... مذہبی تعصب اور بے جا جنبہ داری سے بند... ڈال دو جس کی کشش تمہارے ادب کو ہندوستان... کی ذمہ دار ٹھہر جائے اور وہ زبان جسے سارے ہند... روایات نے پودے کی شکل میں لگایا تھا۔ ایسا تناور درخت جس کے سائے میں غریب اور دکھیا پناہ لیں۔"

"تیساں" احتشام رضوی

ہندوستانی زبان کا مستقبل

[illegible]

شاہجہاں نے دہلی کو از سر نو تعمیر کیا اور اپنی عظمت کی یادگاریں قلعہ اور جامع مسجد جیسی بے نظیر عمارتیں چھوڑیں۔ دیوان عام اور دیوان خاص اس گئی گذری حالت میں آج بھی اسلامی تمدن و تجربات و معلومات اور قدیم روایات کا مخزن ہے۔ ہم حیات کو ان چیزوں سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے اور جب یہ چیزیں الگ کر لی جائیں گی تو حیات پوری طرح ہمارے سامنے نہ آئے گی بلکہ اس کا صرف ایک رُخ پیش نظر ہو گا۔ زندگی کا وسیع مفہوم ان تمام چیزوں پر حاوی ہے اور ادب انہیں کی ترجمانی کا نام ہے۔ انسان کی عظمت اور بزرگی کا اندازہ لگانے کے بعد ہمیں ادب کی مشکلوں کا بھی کچھ اندازہ ہو جاتا ہے کیونکہ ہمالیہ کی تصویر ایک کاغذ پر بنا لینا آسان ہے۔ مگر کسی خوشی یا رنج کے اثر سے چہرے پر جو ہلکی سی تبدیلی پیدا ہوتی ہے اسے الفاظ کے سانچے میں ڈھال کر ہر شخص کو اسی طرح متاثر کر لینا آسان نہیں کیونکہ صرف لکھنے والے یا مصور کے زور قلم اور طرز بیان ہی پر اس نقاشی یا مصوری کی کامیابی منحصر نہیں بلکہ سننے اور پڑھنے والے کے احساسات اور تجربات کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔

ہم نے نہ جانے کتنی مرتبہ یہ سنا ہے کہ ادب اور آرٹ کو ہمارے جذبات سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ کسی ایسی غیر محسوس زنجیر سے وابستہ ہونا چاہیے کہ ایک میں حرکت پیدا ہونے سے دوسرے میں بھی ہو۔ کوئی ایسی کشش ہونی چاہیے کہ ایک دوسرے کی تبدیلیوں سے لطف اندوز ہو[سکیں۔ ہما]رے یہاں تند و تیز طریقے پر پیدا ہوں۔ فن کار ہر قوم کی ضرورت یعنی عوام سے پہلے انسانی جذبات کا تجزیہ کر لیتے ہیں اور جب کوئی شعر اس طرح آ جاتا ہے جس کے لئے ہماری روح میں بھی کبھی بے چینی پیدا ہوتی تھی تو ہم اس اتحاد جذبات پر چونک پڑتے ہیں اور وہ نیم شعوری احساس دماغ کی گہرائیوں سے نکل کر ایک مستقل احساس بن جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی تصویر، کوئی کتاب کوئی شعر ہمیں اس وقت تک پسند نہیں آ سکتا، ہم پر پوری طرح اثر نہیں کر سکتا جب تک کہ ہمارے جذبات اس کی پذیرائی کے لئے پہلے سے تیار نہ ہوں اور یہ پذیرائی کے لئے تیار رہنا اس قبولیت اور عدم قبولیت کے جذبے کا پیدا ہونا ماحول کے اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ دنیا ہر وقت کسی نامعلوم منزل مقصود کی طرف جاتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ دریا کا ایک تیز بہاؤ ہے جس پر بند نہیں باندھا جا سکتا۔ ہوا کا ایک طوفان ہے جو اونچی سے اونچی دیوار کو بھی عبور کر سکتا ہے اور زندگی کے اس لامتناہی بہاؤ میں ہم بھی مع اپنے ادب اور علم، مذہب اور معاشرت کے بہتے چلے جا رہے ہیں۔ دریا جب ریگزاروں سے گذرتا ہے تو بالو اپنے ساتھ لے لیتا ہے، جب پہاڑوں کو عبور کرتا ہے پتھروں کے ٹکڑے بہاؤ میں آ جاتے ہیں، جنگلوں سے پار ہوتا ہے تو درختوں کی شاخیں اور پتیاں شامل ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح زندگی انقلاب کے تمام اثرات کو ساتھ لیتی ہوئی علم ادب پر اپنا اثر چھوڑتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔

سامعین نے غور کیا تو نہ اس میں عرب کی لوا تھی نہ شیراز کا حسن صرف کوہ ہمالیہ کی وادیوں میں کوئل کی کوک بلکہ گنگا اور جمنا کے شیریں ملار کے ساتھ شیرازی بربط ایسے خوشنما طریقہ پر مل کر بج رہا تھا کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناممکن تھا۔ یہ تھی ابتدا اس زبان کی جو نہ کسی بادشاہ نے رائج کرنے کی کوشش کی نہ کسی حکومت نے اس کے لئے کوئی اسکیم بنائی۔ صرف عام آدمیوں نے جو ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی حالت میں ایک دوسرے کے خیالات جذبات اور حسیات کی قدر کرنے اور ایک دوسرے کی معاشرت کی وقعت کرنے کے لئے مجبور تھے یہ زبان ایجاد کی اس کی سرپرستی اگر کی تو رائے عامہ نے اس کو ترقی اگر دی تو عوام نے جو لوگ فارسی رسم الخط جانتے تھے انہوں نے اس کو اس میں لکھا جو سنسکرت رسم الخط سے واقف تھے انہوں نے اس کو اس طریقہ پر تحریر کیا۔ گفتگو دونوں کی ایک تھی جو فارسی سے بھی واقف تھے اس میں بیس فی صدی الفاظ فارسی کے ملا کر بولتے تھے۔ جو سنسکرت بھی جانتے تھے وہ دس بیس شبد بھاشا کے ملا کر گفتگو کرتے جہاں ہماری بدنصیبیاں اور افتراقات کا باعث ہیں وہاں دونوں کے لئے جدا رسم الخط ہونا بھی باعث افتراق ہو گیا اور وہ اشتراک عمل جو ہم کو اس زبان سے حاصل ہوا تھا۔ اس طرح کمزور ہوتا گیا کہ ایک نے اپنی زبان کو "اردو" کہا تو دوسرے نے ہندی۔

آج بدنصیبی سے یہ افتراق زیادہ وسیع ہوتا جا رہا ہے اور بے اعتمادی کی بیماری فرضی اختلافات لا کر کھڑے کر رہی ہے۔ یہ وقت نہیں ہے کہ اردو رسم الخط یا ہندی رسم الخط کی موافقت یا مخالفت کی جائے۔ تاوقتیکہ ہمارے قلوب صاف نہ ہو جائیں دونوں رسم الخط جاری رہیں گے۔ جب یہ عارضی کیفیت عوام کے دماغ سے دور ہو جائے گی تو اس وقت خود عوام بھی اپنے لئے بہترین فیصلہ کر لیں گے اور پوری توقع ہے کہ سیاسی شور و شغب سے بالاتر فیصلہ دیں گے اس وقت اردو خط شکست کی زود نویسی اور اردو تحریر کی زود فہمی کے متعلق کچھ لکھنا ایسا ہی بیکار ہے جیسا کہ ہندی کے قدیم رسم الخط کی ستائش کرنا۔

لیکن جو اپنی مادر وطن کے مستقبل کی طرف سے مایوس نہیں اور جن کو یقین ہے کہ یہ کیفیت عارضی جنون کی سی ہے ان کو یقین ہے کہ ملک کی مختلف اقوام جس وقت سکون کے ساتھ غور کرنے کے قابل ہوں گی تو نہ اردو کا نام باقی رہے گا اور نہ ہندی کا بلکہ "ہندوستانی" زبان ہندوستان میں رائج ہو گی۔

ایک اور نئی بات جو ابھی پیدا ہو گئی ہے اور وہ یہ کہ ہر صاحب سیاست جب اردو یا ہندی کے افتراق کو رفع کرنے کے لئے نصیحت کرنے کھڑا ہوتا ہے۔ تو وہ یہ تلقین ضرور کرتا ہے کہ ہر صاحب قلم کا فرض ہے کہ آسان الفاظ لکھے اور ایسی زبان لکھے جو عام فہم ہو۔ یہ نصیحت کچھ ایسے طور پر بلا دماغ پر زور ڈالے عام ہو گئی ہے کہ اس پر بھی مختصر طور پر کچھ روشنی ڈالنی ضروری ہے۔

اگر سیاسی رہنماؤں کو علم ادب کی رہنمائی میں بھی وہی اہمیت حاصل ہوتی تو بلاشک یہ بات اور زیادہ خطرناک تھی تاہم یہ بتا دینا ضروری ہے کہ کسی اہل قلم کو کسی خاص طرز نگارش کے لئے پابند کرنا گویا زبان کو مردہ کر دینے کے مرادف ہے۔ دنیا میں جب تک علم ادب کا وجود ہے نئے نئے طرز کے شاعر انوکھے انوکھے اسٹائل کے مالک نثار پیدا ہوتے رہیں گے اور کوئی زبان اپنے ادبی تنوع اور کلام کے گوناگوں طرز پر ہی فخر کر سکتی ہے۔ ورنہ اگر سب مضامین اور جملہ اشعار جو اس زبان کے اہل فکر کے قلموں سے نکلیں یکساں قسم کے آسان اور زود فہم ہوں تو ظاہر ہے کہ وہ زبان اپنے صاحبان قلم کو کس درجہ پابند کر دے گی اور اس پابندی کے نتائج یہ ہوں گے کہ کوئی خاص اہل فکر اپنا پیغام اسی وقت قوم تک پہنچا سکے گا جبکہ وہ سادہ زبان ہی استعمال کر سکتا ہو۔ گویا قوم کے ایسے افراد کی دماغی جولانیاں مسدود ہو جائیں گی۔

ہاں اگر کوئی ایسا مضمون لکھنا مقصود ہو جس کا مخاطب دیہاتی طبقہ ہو تو لازم ہے کہ ویسی ہی زبان لکھی جائے لیکن اگر کوئی شاعر یا ناثر اپنا پیغام کسی مخصوص تعلیم یافتہ جماعت تک ہی پہنچانا چاہتا ہو جس کو وہ اس پیغام کا اہل سمجھتا ہو تو اس کی تکذیب صرف اس بنا پر کر دینا کہ وہ دقیق الفاظ لکھتا ہے ہرگز موزوں نہیں۔

"ڈبتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر"

کا پابند ہونا لازمی ہو گا۔ انگریزی زبان شیکسپیئر پر ناز کرتی ہے اردو غالب کو فراموش نہیں کر سکتی اور دونوں کی وقعت ان باتوں کے باوجود ہے کہ دونوں مشکل پسند تھے ان ممالک میں جہاں تعلیم عام ہے وہاں بھی ہر شخص ایک سی علمی قابلیت کا اہل نہیں۔ خود انگلستان میں لندن کی انگریزی اور ہے مضافات کی اور۔ متعدد رسائل نکلتے ہیں جو ادبی حیثیت سے صرف مزدور پیشہ کم تعلیم یافتہ طبقہ کے مذاق

کا لحاظ رکھتے ہیں۔ دوسرے ہیں جو علمی اور ادبی انجمنوں کی سرپرستیوں میں شائع ہوتے ہیں جو ملک کی کثیر آبادی کے لئے نہ باعث دلچسپی ہیں نہ قابل توجہ مگر علمی حلقوں میں ان کو انتہا سے زیادہ اہمیت حاصل ہے
براڈ کاسٹنگ کا محکمہ بھی اس کا لحاظ رکھتا ہے کہ جس طبقہ کی دلچسپی کے لئے براڈ کاسٹ ہو رہا ہے اسی قسم کی زبان کا استعمال کیا جائے۔

پس ہندوستانی زبان کو صرف آسان اور زود فہم طرز تحریر اور تقریر کا پابند کر دینا گو ہمارے آئندہ آنے والے ادیبوں اور شاعروں کے لئے انتہائی ہمت شکن ہے اور جو نئے مسئلے پیدا ہوں گے ان پر ایک ایسی پابندی عاید کر دینا ہے جس سے اُن کا کام اور زیادہ مشکل ہو جائے گا۔

"ہندوستانی ماہنامہ"

ناقد مراد آبادی

شاعر جیل کے دروازے پر

(چین کے شاعر تسو ہنگ تاؤ کی ایک نظم کا ترجمہ)

میری محبوبہ ——!

آج کاغذ کے ایک پرزے پر عدوے وطن کے چھوٹے سے قلم نے حرکت کی —— اور میری قسمت کا فیصلہ ہو گیا —— بیس سال کے بعد ——!!

ہائیں۔ میری محبوبہ! —— تیری آنکھوں سے تو آنسو جاری ہو گئے —— تو روتی کیوں ہے؟ —— مگر تجھے رونا ہے تو میری مصیبت پر نہیں —— بلکہ اپنے دل کی کمزوری پر رو —— اپنے رونے پر رو

بیس سال —— ! کہنے کے لئے بہت ہیں —— لیکن درحقیقت ہوتے کیا ہیں؟ —— تیرے تصور میں آنکھ جھپکاتے گذر جائیں گے مجھے زندانِ ستم میں داخل ہونے کا ذرا بھی صدمہ نہیں —— ہاں اگر خیال ہے تو صرف اس قدر۔

تو سردی میں باہر کھڑی ٹھٹھر رہی ہے۔

تیرا چہرہ سردی سے سفید ہو رہا ہے۔

اور جذبۂ یاس نے چہرے کی اس سفیدی میں مزید اضافہ کر دیا۔

میں ڈرتا ہوں ——

میری محبوبہ! میں ڈرتا ہوں —— سردی کی شدت سے کہیں تیری رگوں میں خون منجمد نہ ہو جائے —— مجھے تو اس وقت سردی بالکل محسوس نہیں ہوتی —— دل میں حب وطن کی جو آگ بھڑک رہی ہے —— اس کی وجہ سے میرا خون رگوں میں اچھل رہا ہے۔

میری محبوبہ —— ! تو ہوا کے سرد جھونکوں سے کانپ رہی ہے —— لیکن —— ہوا کے یہ سرد جھونکے —— میری صبر و استقامت کی آگ کو اور بھڑکا رہے ہیں —— میری روح کو اور گرما رہے ہیں —— اچھا ہے جو اس وقت میرے اور تیرے درمیان —— قید خانہ کی آہنی سلاخیں حائل ہیں —— ورنہ ——

اگر میں کہیں تجھے اپنی آغوش شوق میں لے لیتا —— تو تیرا نازک جسم —— بھسم ہو جاتا ——

بیس سال ——!

میں جانتا ہوں سات ہزار دن ہوتے ہیں۔

لیکن میری محبوبہ —— ! تو باور کر —— دنیا بیس سال میں ہرگز ختم نہیں ہو جائے گی —— مجھے نیند آئے گی۔ تجھے یاد کرتے ہوئے۔ میں بیدار ہوں گا تجھے یاد کرتے ہوئے —— تیری ایک یاد میرے دل میں چوبیس گھنٹے رہے گی۔ میں تجھے زیادہ نہیں —— صرف سات ہزار مرتبہ یاد کروں گا اور بیس سال نہایت آسانی سے گذر جائیں گے۔

میری محبوبہ —— جرأت سے جرأت پیدا ہوتی ہے۔ کیا تجھے معلوم ہے ——! جرأت کو فنا نہیں —— موت کسی بہادر انسان کی زندگی لے سکتی ہے لیکن اس کی جرأت نہیں لے سکتی۔

جرأت ——

مرنے والے کے گوشت و پوست میں —— رگ رگ میں جذب ہو جاتی ہے

میں کسی اخلاقی جرم کا مرتکب نہیں۔

اپنے ضمیر کی آواز سن کر —— آزادیٔ وطن پر قربان ہو رہا ہوں۔

میری محبوبہ ——!

دیکھ وہ دیکھ۔ جیل خانہ کی دیوار کے باہر —— وہ بلندی پر مادر چین کا پرچم لہرا رہا ہے —— سلام ہو میرا اس مقدس پرچم کو —— میں نے اس کے سایہ میں جرأت حاصل کی ہے اور یہی نظارہ اس وقت بھی میری جرأت میں اضافہ کر رہا ہے۔

میری محبوبہ —— !

تو رو رہی ہے۔ جا چلی جا —— مجھے تیرے آنسوؤں کی ضرورت نہیں —— مادر چین کو تیرے آنسوؤں کی ضرورت نہیں —— چین —— میرے پیارے وطن چین؟

کو —— اس وقت ضرورت ہے میرے خون کی —— اور میں دلی مسرت کے ساتھ —— اپنی رگوں کا آخری قطرۂ خون بھی وطن عزیز کے قدموں پر قربان کر دوں گا —— سلام ہو میرے وطن —— میرے مظلوم وطن چین کو —— سلام ہو آزادیٔ وطن کے مقدس پرچم کو۔

کامیاب دہلی

نقد و نظر

فکر و نشاط

جوش ملیح آبادی کی ۸۰ چھوٹی بڑی نظموں کا مجموعہ مکتبہ جامعہ دہلی نے "فکر و نشاط" کے نام سے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ کتابت و طباعت نہایت شگفتہ کاغذ بہت اچھا۔ حجم ۱۱۵ صفحے قیمت (عہ)

اردو زبان میں اقبال پہلا شاعر ہے جس نے خودی کے اسرار و رموز، موت و حیات کے فلسفیانہ نکات تک کے سیاسی و اقتصادی مسائل اور مذہب و معاشرت کے دقیق پہلوؤں کا اظہار نظم میں کیا ہے۔ از بسکہ اقبال پیغمبر سخن ہے۔ اس نے ان بے کیف باتوں کو جس دلفریب اور محکم انداز میں پیش کیا ہے اس سے اس کے کلام میں نہ فن کے اسقام پیدا ہوئے ہیں اور نہ شاعرانہ لطافت ہی زائل ہوئی ہے۔

اقبال کی اس روش سے متاثر ہو کر بہت سے شعراء نے جن کا حقیقی رنگ سخن اقبال سے مختلف ہے اس راہ پر گامزن ہونا ضروری خیال کر لیا ہے۔ جوش یقیناً بہت بلند پایہ شاعر ہیں اور اگر وہ اپنے آپ کو صرف اس نوع کی شاعری کے لئے وقف کر دیں جو ان کی فطرت کا اصلی جوہر ہے تو اس رنگ میں ہندوستان بھر میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ جوش کے مرصع الفاظ کا ترنم، اس کے انداز بیان کی حلاوت اور اس کے کلام کی فسوں کاری اس وقت اپنے عروج پر ہوتی ہے جب وہ مئے کہنہ و معشوق جواں کی تعریف میں قصیدے لکھتا ہے۔ یا پھر جب وہ حسن و عشق کے معرکے اور رندی و سرخوشی کی داستانیں بیان کرتا ہے۔ اس رنگ سے ہٹ کر جوش نے جو کچھ لکھا ہے وہ نظم تو ضرور ہے لیکن شعر نہیں۔ جوش صحیح معنی میں شاعر ہے۔ اس کا مصلحت وقت کی خاطر ہر چند کہ وہ مصلحت کیسی ہی اہم کیوں نہ ہو محض ناظم بن کر رہ جانا ادب اردو پر ظلم ہے۔ "فکر و نشاط" میں بیشتر نظمیں ایسی ہیں جن میں ردیف و قافیہ کی قید سے محض واقعہ نگاری کی گئی ہے۔ اور وہ طلسم جو جوش کے کلام کی امتیازی چیز ہے موجود نہیں ہے۔

شمع فروزاں۔ سعئ لاحاصل۔ داغ جگر بیچتا ہوں۔ فریب ہستی۔ ہم لوگ۔ مشاہدات۔ تحفہ ہستی۔ بے تاب ایسی نظمیں ہیں جن میں جوش کا فکر سخن و طرز نگارش نمایاں ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ نظمیں دلآویزی کے لحاظ سے زیادہ مؤثر ہیں۔

طلسمات

سید عابد علی عابد کے پندرہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہاشمی بکڈپو لاہور نے طلسمات کے نام سے شائع کیا ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ لکھائی چھپائی بہت اچھی۔ کاغذ نفیس۔ حجم ۱۳۱ صفحات۔

عابد صاحب اردو افسانہ نویسی کی دنیا میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کے مختصر افسانے اس مجموعہ کی صورت اختیار کرنے سے پہلے ملک کے مشہور رسائل میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

فقرات کی شگفتگی اور تراکیب کی جدت سے انداز بیان کو رنگین بنانے میں عابد صاحب کو کمال حاصل ہے۔ قصہ نویسی کے فن کا انہوں نے غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اس لئے ان کے افسانے بالعموم فنی اسقام سے پاک ہوتے ہیں۔ عابد دور حاضر کی تعلیم یافتہ سوسائٹی کا فرد ہے۔ اس لئے اس کے افسانوں کے کردار بھی اس زندہ اور متحرک سوسائٹی کے عیب و صواب کے آئینہ دار ہیں۔ طلسمات کے بیشتر افسانے جس ماحول کا نقشہ پیش کرتے ہیں وہ اجنبی یا غیر مانوس نہیں۔ پڑھنے والا شخص افراد قصہ کے رنج و مسرت میں اپنے جذبات کا عکس محسوس کرتا ہے۔ عابد کا قلم بے باک بھی ہے۔ وہ گناہ و ثواب کی داستان بیان کرتے وقت ایک حقیقی صناع کی طرح چشم پوشی کو روا نہیں رکھتا لیکن اس بے محابا نگاری کے لئے جس صناعانہ قابلیت کی ضرورت ہے وہ عابد کے ہاں مفقود نہیں۔

داغ ناتمام۔ بہار۔ لاہور کی ایک رات۔ منگنی اور قسمت اور خطوط رنگیں نہایت دلچسپ افسانے ہیں۔ عشرت باقی۔ محبت کی ایک شام۔ جوانی کی پہلی محبت میں عابد کی افسانوی خصوصیات موجود نہیں ہیں اس لئے اگر انہیں اس مجموعہ میں شامل نہ کیا جاتا تو کچھ حرج نہ تھا۔

طنزیاتِ مانپوری

مانپوری کے تیرہ مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ دفتر رسالہ "ندیم" گیا (صوبہ بہار) نے مندرجہ بالا عنوان سے شائع کیا ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا۔ کتاب مجلد ہے۔ حجم ۱۳۲ صفحات قیمت عہ

اردو کے بعض انشا پردا ز اپنے نام کی بجائے صرف اپنی نسبتِ وطن لکھنا کافی سمجھتے ہیں۔ مثلاً عبدالرزاق ملیح آبادی اپنے آپ کو صرف ملیح آبادی لکھتے ہیں۔ اسی جدت کے تتبع میں زیرِ نظر مجموعہ میں مصنف نے اپنے نام کی جگہ صرف مانپوری لکھا ہے۔ اب خدا جانے یہ مانپوری کون صاحب ہیں اور ان کا نام کیا ہے۔ اس رواج کا مطلب تو یہ ہوا کہ اب مانپور اور ملیح آباد کا کوئی اور باشندہ اپنے آپ کو مانپوری اور ملیح آبادی نہیں لکھ سکتا۔ اگر یہ رواج عام ہو جائے اور جوش ملیح آبادی بھی اپنے آپ کو صرف ملیح آبادی لکھنے لگیں تو یہ کیونکر معلوم ہو سکے گا کہ فلاں تحریر جس کے نیچے صرف ملیح آبادی درج ہے عبدالرزاق کے قلم سے ہے یا جوش کے قلم سے۔ یہ طریقہ ہرگز اس قابل نہیں کہ جاری رکھا جائے۔ اگر مانپور کے کوئی اور ادیب اپنی کتاب شائع کریں اور اپنے نام کی جگہ صرف مانپوری لکھ دیں تو دنیا کے لئے یہ تمیز کرنا ناممکن ہوگا کہ وہ مانپوری کون ہے اور یہ مانپوری کون۔

اس مجموعہ کے شروع میں سید وصی احمد بلگرامی کا ایک طویل دیباچہ ہے جو بالکل بے سود ہے۔ بہتر تھا کہ یہ دیباچہ شامل نہ کیا جاتا۔ مانپوری کا ہر افسانہ ہندوستانی معاشرت کے کسی کمزور پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔ اور دلچسپ ہونے کے علاوہ سبق آموز بھی ہے۔ "میر کلو کی گواہی" میں انہوں نے یہ واضح کیا ہے کہ انگریزی عدالتوں میں قانونِ شہادت کی سخت گیری کے باوجود فرضی گواہ کس چالاکی سے جھوٹی شہادتیں دے آتے ہیں۔ اور قانون کی زد میں بھی نہیں آنے پاتے۔ "میونسپل الیکشن" میں بہت قابلیت اور خوش اسلوبی سے آج کل کے انتخاب کی بے اعتدالیوں اور میونسپل کمشنر کی زندگی کے واقعات کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ "ہاں میں ہاں" میں بتایا گیا ہے۔ کہ آج کل کے خوشامدی اور تملق پیشہ لوگ کس طرح حکام کے پاس جا جا کر ان کی ہاں میں ہاں ملانے کے عادی ہیں اور اس عادت کا نتیجہ سوا اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ انجام کار یہ بے اصول لوگ ذلیل و خوار ہو کر نکلتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے ہندوستانی معاشرت کے مختلف پہلوؤں کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ انہیں اپنے قلم پر بھی قدرت حاصل ہے۔ اور جس بے تکلفی سے وہ حالات اور واقعات کا تجزیہ کرتے ہیں وہ یقیناً قابلِ ستائش ہے۔ زبان میں بعض ایسے محاورات استعمال کئے گئے ہیں جو صرف بہار میں رائج ہیں۔ بعض غلط الفاظ کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ تفرری۔ بیگاری۔ تنزلی۔ انکساری وغیرہ۔ انگریزی الفاظ جن کے مترادفات موجود ہیں بلا ضرورت استعمال کئے گئے ہیں۔

شیرازہ

اس نام کا ایک ہفتہ وار اخبار گزشتہ چھ، سات ماہ سے لاہور سے شائع ہو رہا ہے۔ ادارہ تحریر میں سندباد جہازی اور محمود انفل بی۔ اے شریک ہیں۔ اخبار کا کاغذ اچھا اور لکھائی چھپائی دیدہ زیب ہے۔ حجم ۲ صفحات چندہ سالانہ تین روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر شیرازہ۔ دل محمد روڈ۔ لاہور۔

روزنامہ "احسان" (لاہور) کے مطائبات میں سندباد جہازی جو تیر دلنشتر استعمال کرتا ہے ان کی قدر صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں قدرت نے ذوقِ ادب کے ساتھ ظرافت کی پاکیزہ چاشنی بھی عطا کی ہے۔ سندباد جہازی ایک فرضی نام ہے جس کے پسِ پردہ ایک شعلہ طراز ادیب اور کہنہ مشق اخبار نویس کی شخصیت کارفرما ہے۔ ہماری مراد مولانا چراغ حسن حسرت سے ہے جن کی دلآویز تحریروں نے ہندوستان میں ہر جگہ ان کے مداح پیدا کر دیئے ہیں۔

"شیرازہ" کی روحِ رواں بھی حسرت کا قلم ہے۔ اس لئے بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ "شیرازہ" کے صفحات نظم و نثر کے معیاری مضامین سے مزیّن ہوتے ہیں۔ یوں تو آج مزاحیہ رنگ میں لکھنے والوں کی کمی نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ظرافت نویسی سنجیدہ نگاری سے کہیں مشکل ہے۔ "شیرازہ" کی خصوصیات میں یہ چیز لائقِ توجہ ہے کہ اس میں سیاسی، ادبی اور معاشرتی مسائل پر ایسے ہلکے پھلکے ظرافت کی نوک جھونک سے لبریز اور ہنسی دل لگی کے زیور سے آراستہ مضامین شائع ہوتے ہیں کہ زبان و ادائے بیان پر سر دھننے کے علاوہ اہلِ دانش کے لئے غور و فکر کا بھی کافی سامان ہوتا ہے۔ امتیاز علی تاج، عبدالمجید سالک، حفیظ ہوشیارپوری ایسے مشہور ادیب اکثر "شیرازہ" میں لکھتے ہیں۔ ہر نمبر میں اردو کے کسی اچھے شاعر یا ادیب کی تصویر بھی شائع کی جاتی ہے۔ وہ لوگ جو صحیح اردو پڑھنا یا سیکھنا چاہتے ہیں "شیرازہ" ضرور مطالعہ کریں۔

"ع"



ڈاک کے ڈاکو! اکثر ماہ ہمیں خریداروں کی طرف سے شکائتیں موصول ہوتی ہیں کہ انہیں پرچہ نہیں ملتا اور سینکڑوں خریدار ایسے بھی ہیں جو شکایت نہیں کرتے لیکن یہ فرض کر لیتے ہیں کہ پرچہ دفتر سے نہیں بھیجا حالانکہ پرچہ چھاپنا اور ہر خریدار کو نہ بھیجنا پاگل پن اور تجارتی خودکشی سے کم نہیں۔ ادبی دنیا ہر ماہ کی ۱۶ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو سمجھ لیجئے کہ کسی ڈاک کے ڈاکو کی نذر ہوا۔ بس ایک شکایتی کارڈ اپنے حلقہ کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک کارڈ ہمیں لکھئے تاکہ آپ کو پرچہ دوبارہ بھیجا جائے اور محکمہ ڈاک کے دروازے پر ایک اور دستک دی جائے۔ (مینجر)

فہرستِ مضامینِ ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۷ء

جلد ۱۵ — نمبر ۱۲

تصاویر:- ۱- ایجنٹا کی مصوری ۲- شہسوار شہزادیاں

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک و وی پی پانچ روپے (۵) ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام مسٹر صلاح الدین احمد پرنٹر پبلشر چھپکر دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگس مال روڈ لاہور سے شائع ہوا

بزم ادب

سالنامۂ "ادبی دنیا"

ادبی دنیا کا سالنامہ ۱۹۳۸ء حسب معمول دسمبر کے نصف اول میں شائع ہو جائے گا۔ منصور احمد مرحوم کی ابدی جدائی جس شدت سے ہمیں اس موقعہ پر محسوس ہو رہی ہے، اسے کچھ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ لیکن خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ "ادبی دنیا" ابھی تک اس راستے پر نہایت سلامت روی سے چل رہا ہے جس پر مرحوم اُسے ڈال گئے تھے اور اگر خدا کا فضل شامل حال رہا تو آئندہ بھی وہ اسی طرح گامزن رہے گا۔

مجھے اور میرے رفیقوں حضرات عاشق بٹالوی و حفیظ ہوشیارپوری کو ادبی دنیا کے تمام قلمی معاونین سے بالعموم اور منصور مرحوم کے مخلص احباب سے بالخصوص یہ توقع ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ نہایت جائز اور سچی توقع ہے کہ وہ ادبی دنیا کے آئندہ سالنامہ کو ویسا ہی شاندار بنانے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے جیسا کہ وہ مرحوم کی زندگی میں رہا ہے۔

سالنامے کے لئے مضامین موصول ہو رہے ہیں لیکن ان کی رفتار تسلی بخش نہیں۔ پس ان سطور کے ذریعے سے ہم ادبی دنیا کے تمام معاونین کو ان کے اس خوشگوار فرض کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے رشحات قلم زیادہ سے زیادہ نومبر کے وسط تک بھیج دیں۔ مضامین جس قدر جلد آئیں گے ان کی کتابت، ترتیب، تزئین اور طباعت اُس قدر اچھی ہو سکے گی۔

ادبی دنیا کے سالنامے نے اردو میں بہترین لٹریچر فراہم کرنے کے اعتبار سے جو امتیازی روایات قایم کر دی ہیں، ان کا سہرا درحقیقت ہمارے بلند پایہ مضمون نگاروں کے سر ہے اور ہم اسے اپنی انتہائی خوش نصیبی سمجھتے ہیں کہ اردو کے بہترین انشاپردازوں اور شاعروں کی ایک معقول تعداد ہمیشہ ادبی دنیا کی قلمی اعانت کو اپنا مخصوص علمی فرض سمجھتی رہی ہے۔

ہمیں نہیں بلکہ خود زبان اردو کو علم و ادب کے ان مخلص اور بے غرض خادموں پر فخر و ناز ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ مستقبل میں جب دور حاضر کی تاریخ ادب لکھی جائے گی تو ان کے کارنامے اس کے زریں صفحات پر روشن حروف میں نظر آئیں گے۔

انعامی مضامین

گذشتہ سال اعلان کیا گیا تھا کہ سالنامہ ۱۹۳۷ء کے بہترین مضامین نظم و نثر پر ادارہ "ادبی دنیا" کی جانب سے ازراہ قدردانی چند انعامات دئے جائیں گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ منصور احمد مرحوم کی طویل بیماری اور پھر انتقال کے باعث عرصہ دراز تک انعامات کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کیا جا سکا۔ مرحوم کے بعد گزشتہ گرما میں جدید ایڈیٹروں نے کام سنبھالتے ہی ہمالیہ کی بلندیوں کا رخ کیا۔ ایک صاحب شملہ اور دوسرے ڈلہوزی چلے گئے۔ اس لئے نہ وہ یکجا ہوئے اور نہ اس ضروری مسئلے کا تصفیہ ہوا۔ اب آغاز خزاں میں دونوں صاحبان لاہور آ گئے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ ہم اولیں فرصت میں اس بار گراں سے سبکدوش ہو رہے ہیں۔ ذیل میں گزشتہ انعامی مضامین کے موضوعات اور دیگر تفاصیل درج کی جا رہی ہیں:۔

(۱) بہترین طبعزاد افسانہ یا ڈراما

دو انعامات
(الف) "مہارانی کا تحفہ" (افسانہ) سردار راجندر سنگھ بیدی
(ب) "کمار" (ڈراما) جناب اندر لال داس قمر

(۲) بہترین علمی مضمون

عہد حاضر کی علمی، معاشرتی، تمدنی اور سائنٹفک ترقیوں

اور تحریکوں کے متعلق اول درجے کا انعام "تہذیب کدھر جا رہی ہے"۔ ڈاکٹر ایس ایم اختر ایم اے پی ایچ ڈی۔

(۳) بہترین ادبی مضمون

موضوع ہندوستانی ادبیات سے متعلق لسانی، تاریخی اور تنقیدی مضامین۔ اس ضمن میں حضرت علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی کا مضمون "پنجاب کا اولیں اردو ماہنامہ" بہترین تسلیم کیا گیا ہے اور اس کے بعد مندرجہ ذیل دو مضامین کا نتیجہ برابر قرار دیا گیا ہے:-

(۱) "شہزادیوں کی شاعری" از جناب تسکین عابدی

(۲) "مسلمان اور ہندی زبان" از پنڈت رام سروپ شاستری

ازبسکہ حضرتِ علامہ کی ذات بابرکات کی خدمت میں انعام پیش کرنا گستاخی سمجھا جا سکتا ہے اس لئے یہ انعام موخر الذکر حضرات میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

(۴) مزاحیہ مضمون

اس ذیل میں صرف ایک قابلِ اشاعت مضمون موصول ہوا تھا اور اسی کو انعام دیا جا رہا ہے یعنی "شیخ صاحب" از جناب خلیل بی اے۔

بہترین نظم

اس صنف ادب کا انتخاب جس قدر مشکل ہے، وہ اہل ذوق سے مخفی نہیں۔ بڑی کاوش کے بعد دس ایسی نظمیں انتخاب کی گئیں جو سب کی سب قابلِ انعام تھیں لیکن ازبسکہ انعام فقط مقرر تھا اس لئے اس مشکل کو قرعہ اندازی سے حل کیا گیا البتہ ایک کی بجائے دو انعامات دئیے جا رہے ہیں تاکہ کاوشِ انتخاب کو کچھ تو داد ملے۔ یہ دو انعامات جناب عبدالحمید عدم کو ان کی نظم "خدا اور انسان" اور حضرتِ عرشی امرتسری کو ان کی نظم "یادِ فراموشی" پر دئیے جا رہے ہیں۔

انعامات کی مجموعی رقم پچاس روپے ہے۔ اس حقیر رقم سے ان گراں قدر مضامین کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ کیونکہ انعامات تو محض قدردانی کے اظہار کا ذریعہ ہیں اور بس۔ ہم چاہتے ہیں کہ ادبی دنیا اپنے معاونین کی خدمت میں اس سے بہت زیادہ رقم کے انعامات پیش کر سکے۔ لیکن یہ امر ہمارے اہل ملک کی قدرِ علم و ادب پر منحصر ہے۔ اس بارے میں ہمارا ادب جس مجرمانہ غفلت کا شکار ہو رہا ہے۔ اس کی کہانی بڑی دردناک اور مایوس کن ہے۔ اور اپنے بیان کے لئے ایک طویل فرصت کی محتاج۔ یہ قصہ ہم کسی اور وقت پہ اٹھا رکھتے ہیں اور آج کی صحبت کو تلخی حقایق کے ذائقے سے بدمزہ نہیں کرنا چاہتے

آئندہ سالنامہ کے انعامات

ہمیں یہ اعلان کرتے ہیں بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے کہ ادبی دنیا کے سرگرم معاون اور منصور احمد مرحوم کے رفیق مخلص جناب ملک عطاء اللہ صاحب کلیم ایم اے۔ ڈپٹی کنٹرولر ملٹری اکاؤنٹس راولپنڈی نے سالنامۂ آئندہ کے بہترین علمی یا ادبی مضمون کے لئے ایک طلائی تمغہ پیش کیا ہے جو منصور احمد مرحوم کے نام سے منسوب ہوگا۔ کامیاب انعامی مضمون کا تصفیہ جنوری ۳۹ء میں ہو جائے گا۔ اور فروری ۳۹ء کے پرچے میں اس کا اعلان کر کے صاحبِ مضمون کی خدمت میں تمغہ پیش کر دیا جائے گا۔

اس طلائی تمغے کے علاوہ ادارۂ ادبی دنیا کی جانب سے مندرجہ ذیل تفصیل کے مطابق مضامین نظم و نثر پر انعامات دئیے جائیں گے۔ اور انعام حاصل کرنے والے مضامین کا اعلان فروری کے پرچے میں کر دیا جائے گا اور اس کے فوراً بعد انعامات روانہ کر دئیے جائیں گے۔

(۱) بہترین طبعزاد افسانہ ضخامت ادبی دنیا کے آٹھ صفحات سے زاید اور ۴ سے کم نہ ہو انعام دس روپے

(۲)۔ بہترین طبعزاد ڈرامہ۔ ضخامت مطابقِ بالا انعام دس روپے

(۳)۔ بہترین مزاحیہ مضمون ضخامت ۶ صفحات سے زاید اور ۳ سے کم نہ ہو۔ انعام سات روپے۔

(۴) بہترین نظم۔ انعام پانچ روپے
(۵) بہترین غزل۔ انعام پانچ روپے
(۶) بہترین رنگین تصویر۔ انعام دس روپے
(۷) بہترین فوٹو۔ انعام پانچ روپے۔
(۸) کتابت و طباعت کی غلطیاں چن کر بھیجنے کے لئے چار روپے۔

اس انعام کی غرض اصلاح نفس ہے۔ ادارہ کو اپنے بے شمار فرائض میں جس مشکل ترین فرض سے سابقہ پڑتا ہے۔ وہ کتابت و طباعت کی غلطیوں کی تصحیح ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مسودے دو دو بار صاف کئے گئے ہیں۔ کاپیاں دو دو بار پڑھی گئی ہیں۔ پروف دو دو بار دیکھے گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی کاتب، مصحح اور رنگ ساز کی متحدہ کوششیں سب ایڈیٹر کی مجاہدانہ سرگرمیوں پر غالب آجاتی ہیں اور جب پرچہ چھپ کر سامنے آتا ہے تو بے چارہ ایڈیٹر سر ندامت جھکانے کے سوا کوئی چارہ نہیں دیکھتا۔

یہ انعام ان صاحب کو دیا جائے گا جو کتابت کی زیادہ سے زیادہ غلطیاں چن کر بھیجیں گے اور اگر اس ضمن میں کوئی تحریر نہ آئی تو یہ سمجھ کر کہ سالنامہ اغلاط سے پاک ہے یہ انعام کاتب صاحب کو دے دیا جائے گا

منصور گولڈ میڈل

مندرجہ بالا سطور میں کلیم صاحب کی طرف سے جس سنہری تمغے کی پیش کش کا ذکر کیا گیا ہے اس کی نسبت ذیل میں چند تفاصیل مضمون نگاروں کی رہبری کے لئے درج کی جاتی ہیں۔

موضوع

مضمون کا موضوع مباحث ذیل میں سے انتخاب کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ اردو کے مندرجہ ذیل شعرا میں سے کسی ایک کی شاعری کا سیر حاصل تجزیہ۔ میر۔ آتش۔ مومن۔ درد۔ غالب۔ انیس۔ اکبر۔ حالی۔ اقبال۔ حسرت موہانی۔ جوش۔

۲۔ اردو کے موجودہ صاحب طرز انشا پرداز

۳۔ اردو کے ہندو، عیسائی یا یورپین شعرا (انتخاب کلام اور حالات)

۴۔ دہلی۔ لکھنؤ۔ حیدرآباد، بہار اور پنجاب میں سے کسی ایک مرکز کی خدمات اردو۔

۵۔ اردو کی درسی کتب میں اصلاح و ترقی کی ضرورت و اس کے اصول۔

۶۔ زبان اور کلچر یا زبان اور سیاست۔

۷۔ اردو کی ڈرامائی تاریخ کا خاکہ۔

۸۔ اردو کی ادبی و سیاسی صحافت پر ایک اجمالی نگاہ۔

۹۔ اردو کی ترقی میں ترجمہ کا حصہ۔

۱۰۔ شمالی ہندوستان کی آئندہ زبان اور اس کی علمی و ادبی ممکنات۔

ضخامت

مضمون کی ضخامت ادبی دنیا کے چھ صفحات سے کم اور پندرہ صفحات سے زائد نہ ہو۔

مضمون کا انتخاب

تمام ایسے مضامین جنہیں ادارہ ادبی دنیا سالنامہ کے لئے موزوں سمجھے گا سالنامہ میں طبع کئے جائیں گے اور طبع ہونے والے مضامین میں سے بہترین مضمون کا انتخاب تین اراکین کی ایک کمیٹی کرے گی۔ جو مندرجہ ذیل اصحاب پر مشتمل ہوگی۔

ایڈیٹر ادبی دنیا۔ علامہ برج موہن صاحب کیفی۔ ملک عطاء اللہ صاحب کلیم یا اُن کا نمائندہ خاص۔

اس کمیٹی کا انتخاب قطعی تصور ہوگا اور اس کا فیصلہ ادبی دنیا کے فروری نمبر میں شائع کر دیا جائے گا۔

صلاح الدین احمد

آئینۂ عالم

ہندوستان کا قومی ترانہ

کچھ عرصے سے ہندوستان کے قومی ترانے کا مسئلہ اہل ملک کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز بن رہا ہے اور اس کی قریب ترین وجہ ہندوستان کے سات صوبوں میں کانگرسی وزارت کا قیام ہے۔ عام اجتماعات، طلبا کی مجالس اور سیاسی تقریبات کے علاوہ بعض صوبوں کی مجالس قانون ساز میں جلسہ کی کارروائی شروع کرنے سے پہلے کوئی نہ کوئی ترانہ گایا جاتا ہے اور اس بارے میں سب سے زیادہ توجہ بنگالی زبان کے مشہور گیت بندے ماترم کو دی گئی ہے۔

ملک میں قومی ترانہ کی ضرورت کا احساس ایک نہایت مبارک شعور ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ اہل ہند کے دلوں میں قومیت اور وطنیت کا جذبہ روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ اس امر کا اظہار تحصیل حاصل ہے کہ کسی قوم کے جذبات وطن پرستی کے نشو ونما کے لئے ایک ایسا قومی ترانہ بے حد مفید ہوتا ہے جو سرور انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی بخش بھی ہو جس کے ترنم میں آہنگ رزم کی آمیزش ہو اور جو شام ماضی کی رنگینیوں کے ساتھ صبح مستقبل کی درخشانیاں بھی پیش کرے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ جو ترانے اس وقت ہماری قومی مجلسوں میں اس قسم کی دیگر تقریبات پر گائے جاتے ہیں، وہ مذکورہ معیار سے کس حد تک مطابقت رکھتے ہیں۔ ان ترانوں میں پہلا نمبر "بندے ماترم" کا ہے۔ یہ گیت مشہور بنگالی مصنف بنکم چند چیٹرجی کے ایک ناول آنند مٹھ سے ماخوذ ہے جس میں بھارت پر مسلم حملہ آوروں کی یورش کا افسانہ بیان کیا گیا ہے اور یہ ترانہ گویا اس یورش کے خلاف ایک احتجاج منظوم ہے۔

"بندے ماترم" کے اس پس منظر سے متاثر ہو کر بعض مقامات پر اس کی مخالفت کی گئی اور ایک یونیورسٹی کے اجتماع اور ایک صوبائی اسمبلی کے اجلاس میں اسے مسلم احساسات کے لئے باعث جراحت بیان کیا گیا اور مسلم حاضرین نے اس میں اپنی آوازیں شامل کرنے سے انکار کر دیا۔

ہمیں یہاں اس گیت کے مذکورہ پس منظر سے کوئی بحث نہیں اور نہ ہمیں اس امر سے اتفاق ہے کہ "بندے ماترم" گانے سے لازمی طور پر آنکھوں کے سامنے مسلم ترکتاز اور ہندو مدافعت کا وہ منظر سامنے آجاتا ہے جو اس گیت کی تصنیف کا محرک ہوا تھا۔ ہندوستان پر اسلامی قبضہ اب ایک بھولی ہوئی کہانی ہے۔ اور ہندو کی جدوجہد آزادی کا رخ فرنگی استعمار کی چھاؤنی کی طرف ہے۔ مسلم بادشاہت کا قلعہ مدت سے مسمار ہو چکا ہے۔

پس بندے ماترم کے نیم تاریخی نیم افسانوی ماحول کو اس کی قبولیت کے راستے میں سد راہ نہیں بنایا جا سکتا۔ ہمیں جس چیز پر اعتراض ہے۔ وہ اس کی صوبائی زبان اور اس کا تنگ اور محدود تخیل ہے۔ بنگالی زبان بنگال سے باہر نہ بولی جاتی ہے نہ سمجھی جاتی ہے۔ پس اس کا کیا فائدہ ہے اگر ہم آنکھیں بند کر کے ایک نرم اور خواب آور ترنم میں بنگالی زبان کے چند بول ادا کریں اور سمجھ لیں کہ اس گیت سے ہماری روحوں کو بالیدگی حاصل ہو گئی۔ حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہو۔ اس لحاظ سے اقبال کا قومی ترانہ "ہندوستاں ہمارا" بندے ماترم پر بہت بڑی حد تک فضیلت رکھتا ہے۔ اس کی زبان عام فہم ہندوستانی ہے جسے ایک طرف پشاور سے لے کر کلکتہ بلکہ سلہٹ تک اور دوسری جانب سری نگر سے بنگلور تک سمجھا جاتا ہے۔ جس بنیادی ہندوستانی کو جواہر لال نہرو ہندوستان کی مشترکہ زبان بنانا چاہتے ہیں۔ وہ اس

ترانے کی زبان سے بہت مختلف نہیں ہے اور اس کا ماحول احساس وطن پرستی کی وہ صبح ہے جو بیسویں صدی کے آغاز میں مطلع ہندوستان پر نمودار ہوئی اور اس کی روشنی سے ہندو مسلم۔ عیسائی موسائی گبر و ترسا سب کے گھر منور ہو گئے۔

تخیل اور زورِ بیان کے اعتبار سے بھی اقبال کا ترانہ بندے ماترم سے کسی طرح کم نہیں بلکہ اس کی لطیف بندشوں میں اہلِ ہند ایک روشن ماضی، ایک معیاری وطن پرستانہ ذہنیت اور وطن کے تقدس و عظمت کی ایک دلربا جھلک دیکھتے اور مسحور رہ جاتے ہیں (اگرچہ کہا جا سکتا ہے کہ ضرورت مسحور ہونے کی نہیں بلکہ بیدار ہونے کی ہے) اگر راقم الحروف کی یاد غلطی نہیں کرتی احمد آباد کی کانگرس منعقدہ ۱۹۲۱ء اور اس کے بعد دو تین سال تک کانگرس کی کارروائی کا آغاز بھی اقبال کے ترانہ سے ہی ہوتا رہا۔ اس کے بعد نہ معلوم کیا ہوا کہ اسے یکسر گلدستۂ طاق نسیان کر دیا گیا اور آج اس کا روح پرور نغمہ بہت کم سننے میں آتا ہے۔

جہاں تک کہ ملک کی مقبول عام زبان کا تعلق ہے کسی ذی فہم کو اقبال کے ترانہ کی فضیلت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ تخیل کے لحاظ سے بھی قدیم تر "بندے ماترم" پر "ہندوستاں ہمارا" ایک ترقی پذیر ترمیم ہے۔ اس کا ماحول بھی کسی قسم کی تلخ روایات سے ملوث نہیں۔ ہاں ایک ضروری بات میں دونوں گیت ہماری موجودہ اور مستقبل کی ضروریات کو پورا کرتے نظر نہیں آتے اور وہ ان دونوں میں ایک جارحانہ ذہنیت کا فقدان ہے ہم ایک ایسے دور میں سے گزر رہے ہیں۔ جو سیاسی نقطۂ نظر سے ہمارے لئے موت کے بعد ایک نئی زندگی کا زمانہ ہے۔ جن دنوں ترانہ لکھا گیا تھا اس زمانے میں وہ ہوا جو آج آندھی بن کر عرصۂ سیاست میں چل رہی ہے اور جس نے بڑے بڑے تناور درخت اکھاڑ پھینکے ہیں، نسیم بہار کا حکم رکھتی تھی۔ وطنیت کا آفتاب طلوع ہو چکا تھا لیکن ابھی اس کی تمازت نے نبرد آزماؤں کے صبر و ہمت کی آزمائش نہیں کی تھی۔ آزادی اخوت اور مساوات کے سحر آگیں لفظوں سے کان آشنا ہو گئے تھے لیکن قید و بند اور دار و رسن کے مکتب میں ان کے معانی کا دل نشیں ہونا باقی تھا۔ پس وہ ترانہ جو صبح زندگی کی جلوہ پاشیوں میں لکھا گیا یا وہ گیت جو پو پھٹنے سے پہلے پچھلی رات کے ہنگامۂ دار و گیر میں گایا گیا۔ اب کہ حیات تازہ کا آفتاب افق سے بہت بلند ہو چکا ہے اور خیال کی جگہ عمل۔ نظریہ کی جگہ تجربہ اور بحث و تمحیص کی جگہ جد و جہد نے حاصل کر لی ہے۔ ہماری نئی زندگی کے ساز سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ آج ہمیں ایسے قومی نغمہ کی ضرورت ہے جو ہماری رگوں میں خونِ گرم کی روانی کو تیز سے تیز تر کر دے جو ہماری منتشر حرکات کو ایک رقصِ عمل عطا کرے اور جو اپنی جاں پرور موسیقی سے ہماری کسل و ماندگی کو انبساط و تازگی سے بدل دے۔

ناظرین کی سہولت کے لئے ہم یہاں تین نظمیں درج کر رہے ہیں۔ "ہندوستاں ہمارا" اور "میرا وطن" از ڈاکٹر اقبال اور بندے ماترم کا منظوم اردو ترجمہ جو ہمارے محترم دوست حضرتِ سیماب اکبر آبادی نے کیا ہے۔ ان تینوں کے مطالعے سے ناظرین ان کے حسن و خوبی کا بخوبی اندازہ کر لیں گے اور امید ہے کہ ہماری اس رائے سے متفق ہوں گے کہ بنگالی بندے ماترم کا قبول کرنا تو ملک کے لئے بحیثیت مجموعی قطعاً ناقابلِ عمل ہے۔ اس بارے میں انڈین نیشنل کانگرس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو کی بھی یہی رائے ہے۔

"ہندوستاں ہمارا" موجودہ حالت میں سب سے موزوں اور قابلِ قبول ترانہ ہے اور ضرورت ہے کہ جب تک ایک معیاری ترانہ ملک کے سامنے نہیں آ جاتا۔ قومی مجلسوں اور اس قسم کے دیگر اجتماعات و تقریبات کا آغاز اسی ترانہ سے کیا جائے۔ "میرا وطن" بھی ایک نہایت دلکش و دل پسند نظم ہے اور طلبا کے جلسوں اور بچوں کے اجتماعات میں گانے کے لئے بہت موزوں ہے۔

اس ضمن میں ہمیں ایک اور گذارش بھی کرنی ہے۔ ملک کی اس اشد ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا ہمارے ممتاز شعراء اس جانب متوجہ نہیں ہوں گے۔ ہمارا روئے سخن سب سے پہلے حضرتِ علامہ اقبال کی طرف اور اُن کے بعد حضرات جوش۔ ساغر اور حفیظ کی جانب ہے۔ کیا وہ ملک کے لئے ایک زندۂ جاوید ترانہ لکھ کر لوحِ ہستی پر ایک نقشِ دوام ثبت نہیں فرمائیں گے؟۔

صلاح الدین احمد

منصور کی یادیں

اے مرگ ہائے، ایسا ستم، ہائے، ہائے ہائے
منصور اور کنجِ عدم، ہائے ہائے ہائے

دنیا سے شاہزادۂ "ملکِ قلم" اٹھا
تھی جس کے دم سے بزم میں رونق وہ جم اٹھا

بحرِ فنا میں ڈوب گیا ماہ تابِ حسن
آخر گہن میں آ ہی گیا آفتابِ حسن

سر اپنا پیٹنے کے لئے عشق رہ گیا
دل چشمِ اشکبار سے خوں ہو کے بہہ گیا

ماتم میں اس کے سینۂ گل چاک چاک ہے
نکہت کی جا نسیم کے دامن میں خاک ہے

اُگتا ہے لالہ داغِ جگر میں لئے ہوئے
اک شمع اس کی قبر پہ روشن کئے ہوئے

خالی ادب کے باغ کا آغوش ہو گیا
مرغ اک ترانہ ریز تھا، خاموش ہو گیا

اُف! "خاتمِ زباں" کا نگیں تھا جو اٹھ گیا
اُف! انجمن کا صدر نشیں تھا جو اٹھ گیا

ہے آدھی رات سارا جہاں ہے سکوت میں
پروانۂ غریب تپاں ہے سکوت میں

کیا جھلملا رہے ہیں ستارے سپہر کے
جل جل کے بجھ رہے ہیں شرارے سپہر کے

شبنم بھگو رہی ہے شگوفوں کو باغ میں
اشکوں کی مے ٹپک پڑی دل کے ایاغ میں

شاہدؔ گھڑی یہ خوب ہے رونے کے واسطے
بے چین اس کی یادیں ہونے کے واسطے

مسعود شاہد

ایک فرانسیسی نژاد اُردو شاعر

انیسویں صدی کے آغاز میں اردو شاعری شباب پر تھی۔ گھر گھر شعر و سخن کا چرچا تھا۔ جابجا مشاعرے ہوتے تھے۔ صدہا یورپین موجود تھے جو ہندوستان کو اپنا وطن بنا چکے تھے، اور چونکہ ہندوستانیوں سے ان کے مخلصانہ تعلقات تھے۔ اس لئے اکثر ادبی مجلسوں اور صحبتوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں شعر و سخن کا مذاق پیدا ہو گیا اور وہ خود بھی شعر کہنے لگے۔

مغربی النسل اردو شعرا کی کوششوں سے ادب اردو میں جو اضافہ ہوا ہے وہ مخصوص حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ان لوگوں نے اجنبیوں کی طرح فکر سخن نہیں کی۔ "ہندوستانیت" ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ وہ ہندوستانی طرزِ معاشرت کو اختیار کر چکے تھے۔ یہاں کے مشاغلِ تفریح کو بھی انہوں نے اپنا بنا لیا تھا۔ ان میں متعدد حضرات خاں صاحب، نواب مرزا، چھوٹے مرزا، منا صاحب وغیرہ کے عرف سے مشہور تھے۔ اس لحاظ سے انہوں نے جو کچھ لکھا وہ ہندوستانی طرزِ خیال کے مطابق تھا۔ زبان پر انہیں اچھا عبور تھا بعض مواقع پر انہوں نے شاعری کے نکات میں نہایت باریک بینی سے کام لیا ہے۔ اور وہ موشگافیاں کی ہیں کہ داد دئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ ان کے کلام میں وہ مصنوعی ترکیبیں اور بندشیں بھی پائی جاتی ہیں جو اُس عہد کی شاعری کا طرۂ امتیاز تھیں۔ یہ درست ہے کہ ان کا کلام اسقام سے خالی نہیں، تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ اپنے لازمی حدود کے دائرے میں رہ کر انہوں نے قابلِ تعریف کام کیا ہے۔

یورپین شعرائے اردو میں شور (میرٹھی) کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ ان کا نام جارج پرنس مِش تھا فرانسیسی النسل تھے۔ فارسی اردو میں اچھی مہارت تھی۔ ان کے چھ اردو دیوان چھپ چکے ہیں، لیکن نایاب ہیں۔ ایک طویل مثنوی بھی چھپ چکی ہے جس میں انہوں نے اپنے ذاتی حالات نظم بند کئے ہیں۔ ان کے والد، جان مِش مستقل طور پر علی گڈھ میں رہتے تھے اور رؤسائے شہر میں ان کا شمار تھا۔ ان کے دادا مرہٹہ فوج (گوالیار) میں کپتان تھے۔ شور کی ولادت علی گڈھ میں ہوئی۔ تاریخ پیدائش یکم دسمبر ۱۸۲۳ء ہے۔

ہندوستانی شرفا سے شور کو بہت ربط ضبط تھا۔ ان کا طرزِ معاشرت ہندوستانی تھا۔ شاعری کی خداداد قابلیت تھی۔ کلام میں شستگی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ مرزا رحیم بیگ رئیس میرٹھ سے تلمذ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شور نے سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں مشق سخن جاری کر دی تھی۔ منشی کریم الدین اپنے "تذکرۃ الشعرا" میں لکھتے ہیں کہ

> "جب میں اپنے مکان پر مشاعرہ کرتا تو وہ اکثر اپنی غزلیں خطوط میں رکھ کر مشاعرہ میں پڑھنے کے لئے بھیجتا تھا۔ اس کے خطوط اس کی دماغی اور علمی قابلیت پر دال ہیں۔ اس کا فارسی کلام بھی خوبیوں سے خالی نہیں دین عیسوی کا پیرو تھا۔ مندرجہ ذیل غزل اُس نے مجھے ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۴ء) میں بھیجی تھی"۔

دیر و حرم میں تو نہ دستر یح زاہدا	سر جس طرف جھکا یا وہی سجدہ گاہ تھی
عاجز تھا اپنی جان سے ایسا ترا مریض	دیکھے سے جس کے حالتِ عیسیٰ تباہ تھی
بل بے یہ بےخودی کہ خودی سے بھلا دیا	ورنہ یہ زیست مرگ کی اپنی گواہ تھی

شور کے زمانہ نوعمری کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ جس مثنوی میں انہوں نے اپنے ذاتی حالات نظم کئے ہیں بڑی تلاش و جستجو کے بعد اس کا ایک نسخہ دستیاب بھی ہوا تو ناقص۔ اس کے شروع اور آخر کے چند اوراق گم ہیں۔ بعض درمیانی اوراق بھی سالم نہیں ہیں۔ تاہم جو کچھ مل گیا وہی غنیمت ہے۔

شور کو تیرنے کی بہت مشق تھی۔ بارش کے ایام میں جب اپنی جاگیر واقع باغپت ضلع میرٹھ پر جانے کا اتفاق ہوتا تھا تو اکثر ہنڈن ندی

کوتیر کے عبور کرتے تھے۔ رتھ کی سواری کا بہت شوق تھا۔ ان کی پوشش ہندوستانی تھی۔ سر پر دو پلی ٹوپی، عمامہ یا مرہٹی پگڑی، اچکن کے اوپر شانوں پر پشمی دوشالہ جلوہ گر۔ اکثر کل لباس سفید رنگ کا ہوتا تھا۔ ہر طبقے کے آدمیوں سے ملا کرتے تھے۔ کم درجہ لوگوں کی دل جوئی پر فدا تھے۔

۱۹۰۴ء میں جب شور کا انتقال ہوا تو ضبط میرٹھی نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اس واقعے کا اظہار کیا تھا۔

مسٹر جارج پیش صاحب شور، رئیس۔ ارہرچند پور، افسوس کا مقام ہے کہ دو تین دن بیمار رہ کر رہ گرائے عالم جاودانی ہوئے تمام شرفاء شہر میرٹھ عموماً اور شعرائے نامدار اور زبان دانِ عالی وقار کو خصوصاً اس برگزیدہ صفات کا وہ قلق ہوا کہ تحریر کے انداز سے باہر ہے۔ خندہ روئی، خوش مزاجی، خوش خلقی میں یہ نادرۂ روزگار عدیم المثال تھا۔ شعر گوئی، شعر فہمی، فصاحت بیانی، طلاقت لسانی میں اپنا آپ ہی نظیر تھا۔ ہندوستانی وضع دل پسند تھی۔ رتھ کی سواری مرغوب تھی۔ اراکین اور رعایۂ شہر سے برادرانہ برتاؤ تھا۔ ہنود و اہل اسلام سے ملنا قدیم شعار تھا۔

ضبط نے متعدد قطعاتِ تاریخ بھی لکھے تھے۔ مثلاً

شاعرِ خوش خیال شور اے ضبط گشتہ در لحد بے نشاں اے وائے
از دلِ خلق ایں ندا آمد شور برخاست از جہاں اے وائے

. . . . .

مرگ سے جارج پیش کے ہر سمت جوش آہ و فغاں سے شور ہوا
ضبط سر پیٹ کر سخن بولا وائے رخصت جہاں سے شور ہوا

. . . . .

مر گیا جارج پیش شور اے ضبط زندگی پر ہے کس کا زور چلا
دونوں ہاتھوں سے چھوڑ کر دنیا چار سو شور اٹھا کہ شور چلا

. . . . .

شور کو اپنے عہد کے ممتاز شعرا سے کلام کی داد بھی ملتی رہی ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے اپنا دیوان ثانی مرتب کیا تو حکیم فصیح الدین رنج نے ذیل کی رباعی ان کے کلام کی تعریف میں کہی جو دیوان کے سرورق پر موجود ہے۔

اے رنج جہاں ہے عیب بینی کے لئے حالانکہ سخن ہے دلنشینی کے لئے
پردہ ہے یہ گلشنِ فصاحت جس کی سحبان آتا ہے خوشہ چینی کے لئے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جس مثنوی میں شور نے اپنے ذاتی حالات نظم کئے ہیں، پہلے اس پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔ اس سے شور کے حالات کے ساتھ اس عہد کی سوسائٹی پر بھی تھوڑی بہت روشنی پڑے گی۔

شور اگلاس میں تھانیدار تھے۔ وہاں ایک مسلمان تحصیلدار کی تعیناتی ہوئی جن سے کسی بات پر بگاڑ ہو گیا۔ وہ شور سے کھنچنے لگے۔ تحصیلدار صاحب اپنے حلقۂ احباب میں "خرانٹ" مشہور تھے۔ چونکہ مُسن اور تجربہ کار تھے اس لئے افسرانِ بالا کے بھی منہ چڑھے تھے جو افسر شور کا مربی تھا رخصت پر چلا گیا۔ ان کی جگہ ایک اور صاحب تشریف لائے تحصیلدار صاحب نے شور کے خلاف ان کے کان بھرے تو وہ مکدر ہو گئے۔ شور سے آنکھیں پھیر لیں۔ شور نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً استعفی پیش کر دیا جس کے منظور ہونے میں دیر نہ لگی۔ چندے علی گڈھ میں قیام کیا۔ بعد ازاں تلاشِ معاش میں آگرہ پہنچے۔ آگرہ پہنچ کر بھوپال جانے کا قصد کیا تاکہ

. . . . کہیں وہاں کی بیگم سے کچھ برمحل
کہ جس سے نکل آئے شکل معاش مقدم ہے انساں کو اس کی تلاش

مگر مسٹر کانسٹین نے انہیں اس ارادے سے باز رکھا۔ کلکٹر صاحب کانسٹین سے خوش تھے۔ شور کو پولیس میں کام مل گیا۔ کھیڑہ گڈھ کے تھانہ پر تعیناتی ہوئی۔ دو برس تک نہایت خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دئیے۔ افسران بالا بھی ان کے کام سے بہت خوش تھے وعدہ کیا کہ تحصیلداری عطا فرمائیں گے مگر ہنوز اُس وعدے کے وفا ہونے کی نوبت نہ آئی تھی کہ ایک نئی افتاد پیش آگئی۔

شور کے نانا، فراسوکونس نے اپنے تمام اعزہ و اقارب سے بیگانگی اختیار کر رکھی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ایک بازاری عورت کو گھر میں ڈال لیا تھا اور وہ ان کے مزاج پر اس قدر حاوی تھی کہ بڑے میاں اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہو کر رہ گئے تھے وہ انہیں تمام اعزہ سے برانگیختہ کرتی رہی اور اس طرح تقریباً ساٹھ برس تک اس کا طوطی بولتا رہا۔ اب جو فراسو کو اپنے "خاتمہ" کی صورت نظر آنے لگی تو اعزہ کی یاد ایک بار پھر تازہ ہو گئی۔ انہوں نے شور کو متعدد پیام روانہ کئے اور بار بار لکھا کہ میرا آخری وقت قریب ہے، نوکری ترک کر کے فوراً آجاؤ ــــ

شور نے ساری کیفیت اپنے مربی حاکم سے بیان کی انہوں نے مشورہ دیا کہ "نانا کی باتوں میں آکر بھری تھالی کو نہیں ٹھکرانا چاہئے۔ جب تمہارے نانا کے اختیار میں کچھ ہے ہی نہیں تو تمہیں کیا مل سکے گا، اور روپے بھی تمہارا حق تمہیں پہلے ہی مل چکا ہے"۔

ایک ماہ کی رخصت لے کر شور اپنے نانا کی خدمت میں حاضر ہوئے انہیں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ فرمایا کہ میرا چل چلاؤ کا وقت ہے اب مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ، ریاست کو دیکھو بھالو۔

مگر پہلے شادی بھی کر لو ضرور   کہ اس سے نہیں ہوگا از بس گزر

اپنے نانا کے مشورے سے شور علی گڈھ پہنچے اور اپنے والدین سے ساری کیفیت بیان کی۔

علی گڈھ پہنچتے ہی شور کی صحت کے "لالے" پڑ گئے۔ چھ ماہ تک جاڑے کے بخار میں مبتلا رہے۔ اطبا نے جواب دے دیا۔ اقربا بھی ان کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ اسی اثنا میں شور کے ایک "دوست صادق" چوبے گھنشیام داس مزاج پرسی کو تشریف لائے۔ چوبے جی نے اپنے ہاتھوں ایک دوا تیار کر کے دی۔

بروز سوم اس سے ٹوٹا بخار   تجاری گئی ہو کے ناچار خوار

غرض ایک ہی ہفتہ میں تمام شکایتیں رفع ہو گئیں، اور

ہوا غسل صحت بہ لطف و خوشی   سبھوں نے مبارک سلامت کہی

ریاست گوالیار میں ایک صاحب سلوا کو در نامی سرصوبہ تھے۔ ان کا شمار روسائے عظام میں تھا۔ وہ بہت نامور اور ذی اختیار تھے۔ انہیں کی پوتی سے شور کی شادی قرار پائی۔ انتظامات مکمل ہو گئے تو نہایت دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ شادی کے رسوم آگرہ میں ادا ہوئے۔ دو روز تک شادی کی محفل

برقص و سرود و شراب و طعام

گرم رہی۔ آٹھویں روز رخصت ہو کر علی گڈھ پہنچے۔ یہاں بھی ایک ہفتہ تک قیام کیا۔ بعد ازاں دولھا دلہن ہرچند پور روانہ ہوئے۔

ہرچند پور پہنچے تو نانا کو دہ دن "ہوا روز عید"۔ خوب شادیانے بجے اور دھوم دھام ہوئی۔ میرٹھ کی مشہور طوائفوں اور دلی کے نقالوں نے اپنے اپنے کمال کا دل کھول کر مظاہرہ کیا۔

ہوا رقص اور روشنی جا بجا   اکھاڑے کا اندر کے آیا مزا

رہا جلسہ یہ آٹھ دن صبح و شام   کسی کو نہ تھا اس سوا اور کام

غزالوں کے چشمے وہ جاری رہے   کہ ہر دم نشے سب پہ طاری رہے

بہت زاہدوں کا بھی ٹوٹا وضو   لنڈھانے لگے وہ سبو پر سبو

رہا لطف جلسہ کا لیل و نہار   کہ ہے آج تک کیف کل یادگار

ہوئی شادی ایسی ہوا شاد دل   طرب سے ہوا خانہ آباد دل

پس جلسہ انعام سب کو دیا   علی قدر دے دے کے راضی کیا

جلسہ کے بعد تمام اعزہ و اقارب علی گڈھ واپس چلے گئے، اور

. . . . . .   رہے دولھا دلہن فقط در محل

لگے رہنے مصروف با کاروبار   ریاست کے کام آئے پھر رو بکار

شادی کو صرف دو ماہ گزرے تھے کہ فتنۂ غدر برپا ہو گیا۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ تمام خاندان ہرچند پور سے میرٹھ کو روانہ ہوا، لیکن شور کے نانا بدستور وہیں رہے۔ راستے میں ہینڈن ندی پڑتی تھی۔ ڈونگی یا کشتی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ باغیوں نے پار اترنے کا کوئی سہارا باقی نہ رہنے دیا تھا۔ مجبوراً چار مشکوں پر ایک کھٹولا باندھا گیا اور اس کے ذریعے سے یہ قافلہ پار اترا۔ میرٹھ میں قدرے امن تھا، کیونکہ باغی دہلی کی طرف روانہ ہو چکے تھے اس کے باوجود طبیعت کو سکون نہ تھا۔ آئے دن نئی نئی خبریں سننے میں آتی تھیں۔ ایک دن خبر ملی کہ ہرچند پور میں بھی باغی پہنچ گئے ہیں، اور لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ فراسو کو باغیوں نے بہت ستایا، اور خزانہ طلب کیا۔ جیسے تیسے جان تو بچ گئی مگر گھر میں جھاڑو سی پھر گئی۔ فراسو کو بہت دنوں میں شفا ہوئی۔

ادھر علی گڈھ کا حال اور بھی ابتر تھا۔ تلنگوں نے لوٹ مچا رکھی تھی۔ شور کے والد نے یہ کیفیت دیکھی تو اعزہ کو ساتھ لے کر کوٹھے پر جا چھپے۔ تلنگوں نے بہت تلاش کیا مگر ان پر نظر نہ پڑی تاہم گھر کی صفائی ہو گئی۔ تھوڑے دنوں بعد پھر افواہ اڑی کہ باغی آ رہے ہیں۔ شور کے والد رات کو گھر سے فرار ہو گئے اور جا کر اپنے دھوبی کے گھر میں پناہ لی۔ دوسرے دن بڈرون صاحب کے یہاں پہنچے۔ لیکن سکون کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ بالآخر شیخ خوش وقت علی، رئیس و زمیندار سہنول نے چاروں کو اپنے گھر میں پناہ دی اور پانچ ماہ تک اپنے یہاں مقیم رکھا۔ جب غدر فرو ہو گیا اور علی گڈھ میں کاکس نامی ایک انگریز جج کا تعین ہوا تو شیخ صاحب چاروں کو ساتھ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

کہا شیخ صاحب نے لیجے انہیں + جو ممکن ہو امداد دیجے انہیں

جج نے شیخ صاحب کا شکریہ ادا کیا اور سرکار سے ان کی سفارش

کرنے کا وعدہ بھی کیا لیکن شیخ صاحب نے اس کو نامنظور کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اپنا انسانی فرض ادا کیا ہے، مجھے اس کا صلہ درکار نہیں! دو ہفتہ کے بعد شور مچا کہ باغی پھر آرہے ہیں۔ کاکس نے آگرے کا رخ کیا اور قلعے میں جا چھپا۔ شور کے والد بھی آگرہ پہنچے، اور فتح دہلی تک وہیں قیام کیا۔

شور نے پھر اپنا کام سنبھالا۔ تھوڑے دنوں بعد خبر ملی کہ فراسو کوئنس کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس سے کچھ قبل شور کے بھائی کا انتقال ہو چکا تھا۔ تازہ صدمہ سے وہ زخم پھر ہرا ہو گیا۔ رخصت لے کر سرحنہ پور پہنچے لیکن اس باگڑی عورت کی طبیعت میں فتور نظر آیا۔ دہلی میں باغیوں نے جب اودھم مچا رکھا تھا تو بہت سے انگریز اپنی جان بچا کر ادھر اُدھر فرار ہو گئے تھے۔ منجملہ ان کے بیس انگریز جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے موضع کھیکڑہ میں پہنچے اور رات کو فقیروں کے مہمان رہے۔ صبح ہوئی تو فقیروں نے فراسو کو اس واقعے کی اطلاع دی۔ انہوں نے سواری بھیج کر انہیں اپنے یہاں بلا لیا۔ بعض ان میں زخمی تھے۔ دو تین روز اپنے یہاں رکھا اور حتی الامکان ان کی مدد کی۔ اسی اثنا میں سرکاری فوج کی ایک رجمنٹ وہاں سے گزری تو فراسو نے اس کے ساتھ انہیں بھی روانہ کر دیا۔ فراسو کو اس "خدمت" کے صلے میں گورنر کے دربار سے ایک گراں بہا رقم بطور انعام عطا ہوئی تھی۔ شور کو امید تھی کہ نانا صاحب یہ رقم انہیں کے نام وصیت کر گئے ہوں گے۔ سرحنہ پور پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ سب کچھ اپنی مدخولہ کے نام یہ وصیت کر گئے ہیں۔ اس زمانے میں شور محکمہ پرمٹ میں بسانہ کی چوکی پر مامور تھے۔ وہ اپنے کام پر واپس گئے، مگر

یکایک نصیبوں نے دھکا دیا، کہ پرمٹ سے بھی پھر جدا ہو گیا۔

بات یہ ہوئی کہ جو پٹرول تبدیل ہو کر وہاں آیا تھا جب اس نے دیکھا کہ شور کا طوطی بول رہا ہے تو اس نے کمشنر میرٹھ کو متعدد جھوٹی شکایتیں کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شور کی تنزلی کے احکام صادر ہو گئے۔ ہزار کوشش کی کہ کسی طرح یہ بلا ٹل جائے مگر ایک پیش نہ گئی۔ ننگ آ کر شور نے استعفیٰ دے دیا اور سرحنہ پور چلے گئے۔

فراسو مرحوم کی مدخولہ بظاہر تو شور کی خاطر مدارات کرتی تھی لیکن درپردہ یہ کوشش تھی کہ ان کے قدم نہ جمنے پائیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک اور چال چلی۔ جے پور سے رام سنگھ نامی ایک لڑکے کو بلا لیا اور اس کو اپنا بھتیجا ظاہر کیا۔ اب وہ یہ چاہتی تھی کہ کسی طرح تمام جائیداد رام سنگھ عرف "نان جی" کے نام منتقل ہو جائے۔ مگر شور کی موجودگی نے دونوں کو الجھن میں ڈال رکھا تھا۔ ان حالات سے شور بھی باخبر تھے۔ انہوں نے ان دو کارندوں کو اپنے ساتھ ملایا جن پر تمام کاروبار کا دارومدار تھا۔ ان میں ایک شیخ علیم الدین تھے اور دوسرے لالہ دیبی پرشاد۔ شیخ صاحب مختار عام تھے۔ شیخ صاحب کے تعلقات شور سے کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھے، بلکہ وہ ہمیشہ ان کے خلاف ہی رہا۔ اس نے کسی ذریعے سے کہلایا کہ "حق خدمت" کا وعدہ کرو تو میں جائداد کو رام سنگھ کے نام منتقل نہ ہونے دوں گا۔ اس نے یہ بھی دھمکی دی کہ اگر شور التفات سے کام نہ لیں گے تو ان کے ہاتھ کچھ نہ لگے گا۔ جیسے تیسے شیخ صاحب سے سمجھوتہ ہو گیا۔

شیخ علیم الدین نے سب سے پہلے فراسو مرحوم کی مدخولہ کو سبز باغ دکھائے۔ اس سے کہا کہ جب تک نواسہ (شور) یہاں مقیم ہے، اس وقت تک خاموش رہیئے۔ اس کے جانے کے بعد تمام معاملات حسب دلخواہ طے ہو جائیں گے۔ دوسری طرف شور کے حق میں کارروائی کرتا رہا۔ لالہ دیبی پرشاد نہایت حق بین اور خیرخواہ تھے۔ طمع سے انہیں سروکار نہ تھا تاہم وہ بھی شور کے حق میں تھے۔ شیخ صاحب نے پٹواری کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اُدھر رام برہمن جو اس باگڑی عورت کا گرو تھا، اس کے دل میں بھی "رام اتر آیا" اور اس نے بھی شور کے حقوق کی حمایت کی۔ الغرض اب تمام عملہ شور کی طرف تھا۔

ایک روز شیخ نے جا کر اس باگڑی عورت سے کہا کہ "میرے خیال میں آپ کے بھتیجے کا یہاں رہنا مناسب نہیں۔ نواسہ چلا جائے تو اسے پھر بلا لیجے گا۔ کیونکہ اگر نواسے کی موجودگی میں کسی قسم کی کارروائی کی جائے گی تو اندیشہ ہے کہ معاملہ عدالت تک پہنچے گا اور مفت کی زیرباری ہو گی نواسہ فکر معاش میں کہیں نہ کہیں ضرور جائے گا، اس وقت سب کچھ ہو جائے گا۔" اس عورت نے اس مشورے پر صاد کیا اور رام سنگھ کو واپس جے پور بھیج دیا۔ مگر وہ خالی ہاتھ نہیں گیا جو کچھ لے جا سکتا تھا لے گیا۔

تھوڑے ہی دنوں میں اس باگڑی عورت پر بھی شیخ علیم الدین کی درپردہ کارروائیوں کا راز فاش ہو گیا، مگر وہ خون کے ایسے گھونٹ پی کر خاموش ہو گئی۔ اب اس کو بھی یقین ہو گیا کہ شیخ کو اپنی طرف ملائے بغیر کچھ نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ اس نے بھی وہی روش اختیار کی۔ ایک دن وہ کسی قدر

خوش تھی۔ شیخ نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور اس سے کہا کہ جو کچھ آپ چاہتی ہیں، ارشاد فرمائیے۔ میں خفیہ طور پر تمام معاملات کو سلجھا دوں گا اور اس فرنگی بچہ (شور) کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ اتنا سنتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے کہا جو کچھ میں چاہتی ہوں، آپ پر روشن ہے۔ ایسا کیجئے کہ کسی طرح یہ بیل منڈھے چڑھ جائے!

شیخ علیم الدین نے حسب قرارداد سب کچھ شور کے نام لکھ دیا مگر اپنے "حق خدمت" سے غافل نہ رہا یعنی ایک موضع کا دو ثلث اپنے نام اور ایک ثلث لالہ دیبی پرشاد کے نام لکھا۔ دستاویز کا کاتب خوب چند نامی ایک کائستھ تھا۔ اس کو بھی "حصہ" پیش کیا گیا مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ الغرض، دو برس میں تمام معاملات سلجھ گئے اور شور اپنے ہواخواہوں کے مشورے کے مطابق وہیں جم گئے۔

اس واقعہ کو زیادہ دن نہ گزرنے پائے تھے کہ وہ باگڑی عورت چارپائی سے لگ گئی۔ اس کو کم و بیش ۲۰ سال سے خلل ناف کی شکایت تھی۔ بہت کچھ علاج معالجہ ہوا مگر سب بے سود۔ آخری آٹھ دن اس کے بہت سختی سے گزرے۔ نویں روز پیام اجل آگیا۔ آخری رسوم اس کے عقیدے کے مطابق ادا ہوئے۔ اس کے بعد عدالت سے وصیت تصدیق ہو گئی اور شور جائداد پر باقاعدہ قابض ہو گئے۔

شور کے برادر مرحوم کی بیوہ کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو اس نے اپنے نابالغ بچوں کی طرف سے عذرداری داخل کی کہ داخل خارج میں ان کا نام بھی درج کیا جائے۔ ہرچندپور کے قریب دولہ نامی ایک گاؤں تھا۔ وہاں کی ایک زن فاحشہ، شور کی بھاوج کی بھیلی تھی۔ اس نے روبکاری کے لئے دو ہزار کی رقم ولیہ کو دی۔ اپنے بھائی کی وفات پر شور نے اپنے برادرزادوں کو مانگا تھا اور ان کی پرورش و تعلیم کے تمام مصارف برداشت کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر بھاوج رضامند نہ ہوئی۔ ایک سال تک مقدمہ چلتا رہا۔ آخر میں باہمی سمجھوتہ ہوگیا۔ دو گاؤں اور ایک مکان برادرزادوں کو دیا گیا لیکن دونوں گاؤں شور کے ٹھیکہ میں رہے۔ قرار پایا کہ برادرزادوں کے سن بلوغ کو پہنچنے تک انہیں ڈیڑھ ہزار سالانہ دیا جائے گا۔ لیکن اس رقم کو بچوں کی والدہ خرد برد کرتی رہی اور ان کی تعلیم وغیرہ کی مطلق فکر نہ کی سو دونوں لڑکے آوارہ ہو گئے اور کلکتہ کی آزادیوں نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔ بڑا لڑکا اس قدر خودسر نکلا کہ اپنی ماں کی بھی پروا نہ کی اور متعلقین کی اجازت و مرضی کے بغیر ایک کم رتبہ یوریین عورت سے شادی کر لی۔ خاندان والوں نے اس سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ طرّہ یہ کہ یہی صاحبزادے شور کے سخت مخالف ہو گئے۔ شور سے تعلقات تو پہلے ہی ناخوشگوار تھے کیونکہ شور کی معاشرت لباس، سوسائٹی وغیرہ ہندوستانی تھی اور صاحبزادے پورے "انگریز" بن چکے تھے۔ باہمی میل جول کی گویا کوئی صورت ہی باقی نہ تھی۔ اِدھر اپنی ماں کی باتوں میں آکر اس نے شور کے خلاف پھر ایک دعویٰ دائر کر دیا۔ جیسے تیسے یہ معاملات بھی صاف ہوئے۔ لیکن شور کو اپنے برادرزادوں کی تباہی و بربادی کا ہمیشہ قلق رہا۔

شور کے والدین اس وقت تک حیات تھے۔ علی گڑھ میں قیام تھا۔ والد کو نزلہ کی دیرینہ شکایت تھی، حتٰی کہ اسی سے ان کی آنکھیں بھی جاتی رہیں۔ آنکھیں بنوائیں نور ہی نہیں جوت بھی جواب دے گئی۔ آنکھوں کے درد نے بے قرار کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہی بے قراری ان کی موت کا موجب ہوئی۔ اس صدمے سے شور کی والدہ بھی نڈھال ہو گئیں۔ اسی دوران میں علی گڑھ میں وبائے ہیضہ پھیلی۔ ان کی والدہ بھی اس کا شکار ہو گئیں۔ مرحومین کی آخری خواہش کے مطابق شور نے انہیں خانہ باغ میں دفن کیا اور قبریں پختہ بنوائیں۔

والدین کی وفات پر شور نے ایک نظم کہی تھی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

یادگار جہان تھے یہ لوگ — مغتنم فی زمان تھے یہ لوگ
فیض ان سے ہر اک بشر کو تھا — مرجع صد جہان تھے یہ لوگ
تھے بزرگ ان کے خاص اہل فرانس — صاحب خاندان تھے یہ لوگ
اک زمانہ انیس تھا ان کا — فخر ہندوستان تھے یہ لوگ

نظم کے علاوہ شور نے قطعات تاریخ بھی لکھے تھے جو ان کی قبروں کے تعویذوں پر کندہ کئے گئے۔

تاریخ وفات عالیجاہ مسٹر جان پش، رئیس کول ضلع علی گڑھ۔

شد ز ہستی عمدۂ اہل فرانس — آنکہ بودا علیٰ و ادنیٰ را جلیس
شور چون تاریخ رحلت را بجست — داد ہاتف مادۂ از بس نفیس

یعنی از اعظم برآورده الف

گفت گور جان پش اعظم رئیس — ۱۸۷۲ء

تاریخ رحلت جنابہ معظمہ مسز میڈلین پش صاحبہ رئیسہ علی گڑھ۔

. . . .

تاریخ کا تردد تھا جب کہ شور مجھ کو
ہاتف یہ بول اٹھا باغ بہشت میں ہیں — ۱۸۷۲ء

والدین کی وفات کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ ناگاہ شور کی اہلیہ مرض نسواں میں مبتلا ہوگئیں۔

اطبائے حاذق بھی حیران تھے + دوا کرتے کرتے پریشان تھے
مہینوں حکیموں کی دارو رہی + شفا اس سے مطلق نہ حاصل ہوئی

مجبوراً انگریزی علاج کی طرف رجوع ہوئے۔ میرٹھ میں محل صاحب نامی ایک جاگیردار تھے۔ ان سے شور کے دوستانہ مراسم تھے۔ ڈاکٹر امانت علی کہ

تھا مشاق اور رچیدۂ روزگار

محل صاحب کی ملازمت میں تھے۔ محل صاحب کو شور کی پریشانی کا حال معلوم ہوا تو ڈاکٹر امانت علی سے کہا کہ جا کر شور صاحب کے یہاں رہو اور نہایت توجہ سے میم صاحبہ کا علاج کرو۔ تین ماہ تک ڈاکٹر امانت علی نے علاج کیا اور مرض میں افاقہ ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب کو "بہ اعزاز و جاہ" رخصت کیا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں بعد کرم کنکری نکل آئی۔ پھر وہی تردد و پریشانی اس بار مریضہ کو دہلی لے گئے۔ ایک ماہ تک مشہور حکما کا علاج ہوا، مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ بالآخر مریضہ کو گوالیار بھیج دیا گیا۔ حکیم امیر علی وہاں ایک مشہور طبیب تھے۔ دو برس تک ان کا علاج رہا اور مرض میں اس قدر افاقہ ہوگیا کہ آیندہ دو برس تک کسی قسم کی شکایت نہ ہوئی لیکن دو سال کے بعد مرض پھر عود کر آیا اور مریضہ کو دوبارہ گوالیار بھیج دیا گیا۔

شور صاحب میرٹھ میں تھے۔ تنہائی سوہان روح تھی۔ غم غلط کرنے کے خیال سے انہوں نے بمشورۂ احباب میرٹھ کی مشہور طوائف مغل جان کو پچاس روپے ماہانہ پر ملازم رکھا۔ ہر وقت رقص و سرود کا شغل رہنے لگا۔ مغل جان کی زبان شستہ اور لہجہ درست تھا۔ زیادہ تر وہ شور صاحب کی غزلیں گایا کرتی تھی۔ چند سال یہی کیفیت رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغل جان قرب وجوار میں مشہور ہوگئی۔ ہر طرف سے اس کو بلاوے آنے لگے۔ وہ بھی اب اغماض سے کام لینے لگی۔ شور نے اس کو برخاست کر دیا۔ اُدھر گوالیار سے خبر آئی کہ

مرض ہے ترقی پہ شام و سحر

شور فوراً گوالیار پہنچے۔ حکیم امیر علی نے کہا "بھئی میں تو علاج کرتے کرتے تھک گیا۔ میری رائے میں تم انہیں آگرہ لے جاؤ۔ آب و ہوا کی تبدیلی بھی مفید ہوگی"۔ مریضہ کو ساتھ لے کر شور آگرہ آئے۔ مرض جنون کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ ڈاکٹر نے مریضہ کا معائنہ کیا اور کہا کہ حار دواؤں کے اثر سے مریضہ پر جنون کی کیفیت طاری ہوگئی ہے۔ سب سے پہلے اُن دواؤں کے اثر کو زائل کرنے کی ضرورت ہے۔ بہرکیف ایک سال انہوں نے بھی علاج کیا مگر جنون کو مطلق افاقہ نہ ہوا۔ اِدھر ڈاکٹر نے جواب دیا اُدھر اسی شب مریضہ کا طائر روح پرواز کر گیا (۱۸۷۹ء)

در و بام سے تھی صدا رونے کی ہمیں پڑ گئی اپنی جان کھونے کی

شور واپس میرٹھ پہنچے مگر بے حد پژمردہ و مضمحل۔ احباب نے اظہار ہمدردی کیا۔ مغل جان بھی پُرسہ کی رسم ادا کرنے کو آئی۔ پھر وہی پرانا رنگ جمانے کی تدبیر ہوئی۔ مگر اب وہ بات نہ تھی۔ ویسے بھی مغل جان "اب عام" طوائف نہ تھی۔ اب اس کی طرف سے بڑی بڑی فرمائشیں ہونے لگیں جنہیں شور نے عمداً ٹال ٹال دیا۔ جب "لفظی تکرار" تک نوبت پہنچ گئی تو شور نے اُس کو رخصت کر دیا۔ احباب کو اس واقعے سے بڑی حیرت ہوئی اُن کا خیال تھا کہ مغل جان سے کھٹک ہوئے بغیر پیچھا نہ چھوٹے گا۔

مغل جان کی علیحدگی کے بعد شور نے ایک اور طوائف کو ملازم رکھا اس کا نام رمضانو تھا اس سے ایک سال کے اندر ہی اندر طبیعت مکدر ہوگئی۔ اس کو بھی رخصت کیا اور خانہ آبادی کی از سر نو فکر دامنگیر ہوئی۔ اس سلسلہ میں شور آگرہ دلکھنو تک گئے مگر اپنے "میل" کا کوئی گھر نظر نہ آیا ایک روز بیٹھے بیٹھے خیال ہوا کہ گوالیار میں سوائی سکندر کے خاندان سے قرابت بھی ہے۔ کیوں نہ انہیں کے ہاں رشتہ کا ڈول ڈالا جائے۔ مگر رہ رہ کر اپنی کبر سنی کا بھی خیال ہوتا ہے کہ اگر وہاں سے انکار ہوا۔ تو دل کو ملال ہوگا۔ آخر جی کڑا کر کے خط لکھنے کو آمادہ ہوئے۔ سکندر صاحب کا چند سال قبل انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی اہلیہ محترمہ حیات تھیں

. . . . شریف زماں فیض بخش انام
انہیں خط میں لکھا کرم کیجئے غلامی میں اپنی مجھے لیجئے

گوالیار سے جواب باصواب آیا تو جان میں جان آئی۔ مگر اغیار نے یہاں بھی روڑا اٹکایا۔ جا کر پادری کے کان بھرے کہ دولوں کا بہت قریبی رشتہ ہے۔ لہذا شادی نہیں ہوسکتی۔ پادری بھی اُن کی باتوں میں آگیا۔ معاملہ بشپ صاحب تک پہنچا۔ انہوں نے خوب تحقیقات کی اور جب ثابت ہوگیا کہ قریبی رشتہ نہیں ہے تو شادی کی اجازت دے دی۔

غرض دھوم سے پھر تو شادی ہوئی + نصیب عدو نامرادی ہوئی

شور نے اس تقریب پر خود بھی ایک سہرا کہا تھا۔ ایک شعر ہے ؎

ساقیا دور چلے آج کہ دل خوش ہے مرا + گاؤں گاپی کے برانڈی کا میں ساغر سہرا

دو روز تک گوالیار میں خوب جشن رہا۔ سکھیا طوائف کے گانوں کی دھوم مچ گئی۔ شورؔ نے سکھیا کی تعریف کی ہے۔

وہ گانے کا ڈھنگ اور بتانے کا ڈھنگ   کہ ہو جائے پانی اگر دل ہو سنگ

گلے میں وہ کھٹکا خدا کی پناہ   کہ کھٹکا کرے دل میں شام و پگاہ

اٹھاتی جگر سے تھی جب کوئی تان   چلاتی تھی تیر و سناں تان تان

سنی تان اس کی جو دن اور رین   گئے بھول تان اپنی بھی تان سین

وہ تھے رقص میں اس کے چھل بل بنے   کہ زہرہ کے دل میں بھی بل پڑ گئے

سروں کی کروں اس کی کیا میں صفات   کہ بے سر کے مردوں سے کرتی نہ بات

رسیدہ نہ ہوتی سن و سال میں   تو بھنستے جواں اس کے ہی جال میں

کہ جال اس کا جنجال سے کم نہ تھا   خرام اس کا بھونچال سے کم نہ تھا

اسی شادی کے تذکرے میں شورؔ بیان کرتے ہیں کہ ڈومنگو النطون نامی بھی ایک صاحب شریک جلسہ تھے۔ رشتے میں وہ شورؔ کے بھانجے ہوتے تھے لکھتے ہیں:۔

ہمارا راج کے وہ نمک خوار ہیں   رسالہ کے افسر ہیں سردار ہیں

ہمارے وطن دار ذی احترام   وطن سردھنہ اُن کا عالی مقام

شریکِ طرب ہمدمِ انبساط   رہے بزم میں وہ بہ لطف و نشاط

صراحی کا نغمہ سنا خوب سا   پیالہ کا دورہ رہا خوب سا

برادر وہ ایسے ہیں باغ و بہار   ہزاروں میں اک گل ہیں وہ رنگدار

. . . .

کہ سکھیا سے وہ بھی رہے پھر کھچی   نہ پاس آیا دکھ ان کے ہرگز کبھی

چند دیگر احباب کا نام بنام تذکرہ کرکے آخر میں لکھتے ہیں۔

غرض خوب خاطر ہماری ہوئی   تواضع تکلف سے ساری ہوئی

سحر کو جو رخصت ہوئی پھر برات   تو داخل ہوئی آگرہ رات رات

آگرہ میں بھی وہی محفل آرائی ہوئی، اور چار روز کے قیام کے بعد علی گڈھ پہنچے۔ وہاں کے احباب سے ملاقاتیں کرکے میرٹھ پہنچے۔ اس سفر میں کم و بیش ایک ماہ صرف ہوا۔

شادی کے کم و بیش ڈیڑھ سال کے بعد شورؔ کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی تاریخ کہی ہے۔

مژدہ تولید دخت کا سن کر   بج گیا شور شادیانہ کا

یہ تو فرزند کے برابر ہے   متفق قول ہے زمانہ کا

فکرِ تاریخ گر تجھے ہے شورؔ   لکھ دے اس کو چراغ خانہ کا ۱۸۸۱ء

شورؔ نے چھٹی بھی کہی تھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خدا نے شورؔ کو بخشی جو نور کی پتلی   تو اس پہ پھر کو لائی ہے نشاط چھٹی

دکھایا وقت ضعیفی میں یہ خدا نے دن   زمانہ کہتا ہے ایسی ہو بیٹی بار چھٹی

خوشی رہے گی جو چالیس دن تلک اس کی   تو ہو گی اس پہ بہ سو طرح نثار چھٹی

صدا جو پہنچی ہے ہنسلی کڑوں کی کانوں میں   ضرور وقت کی لپٹے ہے مالدار چھٹی

دو ماہ تک اس ولادت کی خوشیاں منائی جاتی رہیں۔ تمام ملازمین کو زر پارچہ تقسیم ہوا۔ نومولود کی نانی کی طرف سے چھوچھک بڑے تکلف اور دھوم دھام سے آئی۔

شورؔ کی ایک بیوہ بہن علی گڈھ میں رہتی تھیں۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ بھائی کی اولاد کو گود لینے کی انہیں بڑی تمنا تھی۔ چنانچہ شورؔ نے اپنی اکلوتی بیٹی ان کے حوالے کر دی۔ بڑے ناز و نعم سے اس کی پرورش ہونے لگی۔ نو ماہ کی ہوئی تو اچانک بیمار ہو گئی۔ کچھ دانتوں کا بھی خرخشہ تھا۔ ڈاکٹر نے جگر پر ورم تشخیص کیا۔ بہت دوڑ دھوپ ہوئی مگر بیکار۔ شورؔ نے نوحہ لکھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

عمر بھر میں کھلا تھا نخل مراد   تو نے بادِ خزاں اجاڑ دیا

باغباں نے بنا بنا کے چمن   کھیل کی طرح پھر بگاڑ دیا

تھے دلاور جہاں میں ہم بھی بڑے   صدمۂ غم نے پر پچھاڑ دیا

کوہِ غم سے یہ دل بھی بیٹھ گیا   کیا فلک نے مجھے پہاڑ دیا

ٹکڑے دامن کے کہہ گئے ہم نے   کہ گریباں کو ہم نے پھاڑ دیا

صدمۂ "شوری" کا وہ ہوا ہے شورؔ

پاؤں دنیا سے بھی اکھاڑ دیا

دو سال کے بعد ایک اور لڑکی پیدا ہوئی تو پہلی سالگرہ کے موقعہ پر خوشیاں منائی گئیں، اور علی گڈھ میں نہایت دھوم دھام سے جشن منایا گیا۔

جلالی ضلع علی گڈھ میں سید علی نامی ایک شخص رہتا تھا۔ اگرچہ اُس سے شورؔ کے بہت اچھے مراسم تھے مگر اس کے ہاتھوں انہیں بہت نقصان پہنچا۔ اُس نے ۲۰ سالہ مراسم کا مطلق لحاظ نہ کیا۔ طمع سے مغلوب ہو کر ان کے درپے آزار ہو گیا، اور ایسے ایسے داؤں پیچ سے کام لیا کہ شورؔ صاحب کو آٹھ دس ہزار کی رقم سے ہاتھ دھونا پڑا۔ شورؔ نے اپنی مثنوی میں ڈھائی سو سے زیادہ اشعار سید علی کی شان میں کہے ہیں، اور اس کے تمام کرتوت اور ہتھکنڈے بیان کئے ہیں۔ شورؔ کو روپیہ کے

جانے کا تو اتنا غم نہ تھا لیکن اس معاملے نے اتنا طول پکڑا تھا کہ خواب و خور حرام ہو گیا تھا۔

ہم بتا چکے ہیں کہ شورؔ سے چھ اردو دیوان یادگار ہیں۔ لیکن وہ اتنے نایاب ہیں کہ ان کی زیارت بھی ممکن نہیں۔ ذیل میں جو انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ وہ دوسرے، پانچویں اور چھٹے دیوان کا ہے، اور اس کے لئے ہم اپنے محب دلی مسٹر سلیم عابد کے مرہون منت ہیں۔

"بیکسی کا آسرا" ملاحظہ ہو ؎

عدم سے ہستی میں جب ہم آئے، نہ کوئی ہمدرد ساتھ لائے
جو اپنے یاں بھتے ہوئے پرائے، اب آسرا ہے تو بیکسی کا

کسی شاعر نے کہا ہے ع بگڑی بن جاتی ہے جب فضل خدا ہوتا ہے
شورؔ نے یہی خیال اور انہیں الفاظ میں یوں ادا کیا ہے ؎

شورؔ رکھ یاد کہ جب فضل خدا ہوتا ہے
دم میں ہو جاتے ہیں سب بگڑے ہوئے کام درست

"زر برسر فولاد نہی نرم شود" کو نظم کیا ہے ؎

انسان تو چیز کیا دل فولاد نرم ہو
دنیا میں سب سے شورؔ زیادہ ہے زر کی چوٹ

موج کی فرضی بے قراری کا فرضی سبب ؎

نہیں ہے موج کو اک دم بھی جو قرار کہیں
بھٹکتی پھرتی ہے دنیا میں کیا حباب کی روح

کنجِ قفس میں چہرے سے اڑتا ہے ایسا رنگ
ہر دم بدلتی رہتی ہے مجھ ناتواں کی شکل

چھلکا دے آج ہمیں جیسی بن پڑے ساقی
گلاب ہی کے دو دو جام، اگر شراب نہ ہو

روتی ہے اجل بھی دیکھ مجھ کو
فرقت میں یہ حال ہو گیا ہے

کیونکر بسر اوقات کروں اپنی جہاں میں
جینے کی ہے امید نہ مرنے کی خبر ہے

محرومیِ دیدار کا سبب کیا خوب بتایا ہے یہ خیال کالیداس کے تخیل کا چربہ ہے

اشک باری کے سبب محروم ہوں دیدار سے
بن گئی ہیں آنکھیں ہو گئی ہیں آنسوؤں کے تار سے

"یوم کلاں" ۱۸۷۴ء ؎

روشن ہوئے اعجاز سے جب مردم دیدہ
اس نام پہ آنکھوں سے ہوا صاد ہمارا

تہنیت یوم کلاں ۱۸۷۵ء ؎

خدا نے خیریت سے پھر ہمیں یہ دن دکھایا ہے
بڑی امید سے بارے بڑا دن آج آیا ہے

تہنیت عید پاسکوئ ۱۸۷۶ء ؎

ہے روزِ عید، روزہ دن کا آج اختتام ہے
عیسائی کیوں نہ خوش ہوں خوشی کا مقام ہے

اے شورؔ آج کھول کے دل تم پیو شراب
سب کہتے ہیں کہ عید کا روزہ حرام ہے

از قطعۂ تاریخ مرگِ الاتچی، سگ مادہ رفیق مس آنا مینسلی ؎

کیا دیکھنے ہو لوگو اس قبر پر تم آکر
ہاتھوں کا اک کھلونا مٹی میں مل گیا ہے

حسرت سے ہاتھ مل کر آنا سے شورؔ بولے
بیٹھے بٹھائے تم پر یہ کیا غضب ہوا ہے

از رقعہ ہولی بنام احباب بزم (۲۵ر فروری ۱۸۷۷ء) ؎

شفق نہیں ہے رخ چرخ پر نمایاں یہ
اڑا ہے بن کے گلابی غبار ہولی کا

تہنیت تولید فرزند بخانہ مسٹر اڈمنڈ بر فیلڈ لفٹنٹ توپخانہ، گوالیار ؎

ہوا اڈمنڈ صاحب کے جو فرزند
بر آئی شورؔ میرے دل کی امید

لبِ بامِ فلک سے آئی آواز
چراغ خانہ ہے تاریخِ تولید

حمد ؎

جس کو ملا ہے عشق حقیقی کا مرتبہ
قائل نہ ہو گا وہ کبھی کیفِ مجاز کا

لب پہ ہے گو خیالِ سیہ عصیاں سے خامشی
ہے وردِ دل میں پر اسی بندہ نواز کا

ارض و سما کی فکر میں اک عمر صرف کی
عقدہ کھلا نہ اس کے نشیب و فراز کا

"نعت مسیح علیہ السلام" ؎

اعجاز کیوں اثر نہ ہو اپنے کلام کا
مداح ہوں مسیح علیہ السلام کا

ہے چرخ پر وہ جب سے کہ مسند نشیں جاں
عرش بریں پہ ناز ہے اس کے مقام کا

میری زباں نہ کیوں ہو کلید درِ نجات
ہے نام اس کا وردِ مری صبح و شام کا

کیوں عرش پر دماغ نہ ہو ناز کا مرے
آقائے پاک چرخ نشیں ہے غلام کا

وہم و خیال کو ہو رسائی کہاں نصیب
زینہ ہے عرش سے اس کے مقام کا

قم کہہ کے مردے دم میں ہزاروں جلا دیئے
کیا معجزہ تھا اس لبِ معجز نظام کا

اے شورؔ چشم تر کو بنا چشمۂ حیات
کر وردِ جان و دل سے مسیحا کے نام کا

تو جو اس وصف سے منسوب ہوا خوب ہوا
یعنی فرزند خدا خوب ہوا خوب ہوا

حشر میں فخر نہ کیونکر ہو تری امت کو
جان دینا تجھے مرغوب ہوا خوب ہوا

جان دینے میں بجز شکر نہ نکلا منہ سے
صبر میں ثانیِ ایوب ہوا خوب ہوا

دوسری غزل میں بھی ایوب کا قافیہ باندھا ہے؎

صبر نے نام کیا سارے جہاں میں میرا پیروِ حضرتِ ایوب ہوا خوب ہوا

قطرۂ شبنم کی خجالت پر گل کی ہنسی ملاحظہ ہو؎

دیکھ کر گل بھی چمن میں ہنس پڑا اُس کو وہیں
میرے اشکوں سے خجل جب قطرۂ شبنم ہوا

اس قافیہ ردیف کی ایک غزل اور بھی ہے۔ اس میں بھی "قطرۂ شبنم" باندھا ہے۔؎

یادِ فصلِ گل میں رونے کا عجب عالم ہوا اشک جو آنکھوں سے نکلا قطرۂ شبنم ہوا

انسان کی شانِ عظمت؎

کس غضب کا ہے بنا شان خدا سے آدم کہ فرشتہ کو تمنا ہے "میں انساں ہوتا!"

"دستِ جنوں" سے لاگ کی لیتے ہیں؎

روز کیوں رہتا ہے درپے مرے دستِ جنوں چاک کیا کرتا جو باقی نہ گریباں ہوتا

بے قراری اور انتظار کی انتہا ملاحظہ ہو؎

تمام عمر نہ آیا قرار دم بھر کو خدا ہی جانے دلِ بے قرار میں کیا تھا
کھلی ہیں بعد فنا بھی مزار میں آنکھیں کسے خبر تھی مرے انتظار میں کیا تھا

مطلع قابلِ داد ہے۔؎

جلوہ یہ طور کا مجھے کس نے دکھا دیا بیخود جو دم میں صورتِ موسیٰ بنا دیا

بالعموم انسان کے دل کی یہ حالت ہوتی ہے کہ دشمن کو بھی مصیبت میں دیکھ کر بھر آتا ہے۔؎

کون ہے جس کو مرے حال پہ افسوس نہ ہو
دوست کیا، غیر بھی آئے گا تو رو جائے گا

ذیل کے شعر میں ہاتھ، پہنچے، سر، پاؤں کا تلازم ہے؎

ہاتھ بھی پہنچے نہ جن کے پاؤں تک
ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ سر پاؤں میں

چشمِ گریاں کا زور ملاحظہ ہو؎

گھٹا دی ایک پل میں آبروئے ابرِ نیساں کی
خدا آباد رکھے گھر ہماری چشمِ گریاں کا

کس غضب کا نالۂ سوزاں ہے؎

الٰہی نالۂ سوزاں کو اب لے کر کہاں ٹھہروں کہ اس آتش کے پرکالے نے تو کون و مکاں پھونکا

سچ ہے؎

خدا مہرباں ہو تو سب مہرباں ہوں خدا چاہتا ہے تو سب چاہتے ہیں

بھلے آدمی کی تعریف؎

ہے بھلا جو بھلا سنے سب کا اور کسی کا کبھی برا نہ سنے

از تہنیت سالگرہ سوم برخوردار جوزف خلف مسٹر ایڈورڈ جونس انسپکٹر پولیس میرٹھ

آتی ہے سال وار جو یہ ساعتِ سعید
عقدہ کھلا ہے یہ کہ عنایت خدا کی ہے

قطعۂ تاریخ فارسی تولید برخوردار سخانۂ شور؎

للّٰہ الحمد در کہن سالی طرب افزاست شور باغ مراد
شجرِ آرزو ثمر آورد خانۂ انبساط شد آباد
چمن آرائے گلشنِ کونین
شاہدِ رشکِ حور مہر رخ داد

مرزا غالب کی ایک غزل ہے؎

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

شور کا مطلع ملاحظہ ہو؎

عشق میں قابلِ حسرت کوئی مجھ سا نہ ہوا فردِ کامل ہوں کہ مجھ سا کوئی پیدا نہ ہوا

اسی غزل کے یہ اشعار بھی دیکھیے؎

وہ مصیبت مری خادم جو کسی جا پہ نہیں پاؤں داب ہے وہ فتنہ کو جو برپا نہ ہوا
وہ اذیت مری ہمدم کہ ہے شاگردِ اجل غم وہ غمخوار کہ جس غم کا مداوا نہ ہوا
حسرت اس دل پہ کہ جس دل کی نہ حسرت نکلی گریہ اُس لب پہ جو مشتاق ہنسی کا نہ ہوا
چھٹ گئے درد سے سوزش سے قلق سے ہم بھی فایدہ جان کے نقصان سے کیا کیا نہ ہوا

مرزا نوشہ کی اور بھی چند غزلوں پر شور نے غزلیں کہی ہیں۔ ایک غزل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں؎

یہ نہ ہوتی غم کی دھڑکی، یہ نہ ہوتی بے قراری
وہ جو ہونا تھا سو ہوتا یہ ستم ایک بار ہوتا
لب و چشم و سینہ ہر دم ہوئے وقفِ حسرت و غم
نہ یہ اضطراب ہوتا جو نہ انتظار ہوتا
جو خوشی انیسِ جان تھی کبھی بھول کر نہ آئی
بُرے وقت میں کوئی بھی نہیں غمگسار ہوتا

ایک مقطع میں اپنے ترکِ وطن کی طرف اشارہ کیا ہے؎

اس دل کا ہو برا کہ نکالا وطن سے بھی آخر کو شور بے سر و ساماں نکل گیا

اس غزل کا مطلع اور دو شعر اور ملاحظہ ہوں ؎

کانٹوں کی انکھیوں سے جو داماں نکل گیا　　دامن کے ساتھ ساتھ گریباں نکل گیا

اللہ ری بیخودی کہ بدن کا نہیں ہے ہوش　　دامن نکل گیا کہ گریباں نکل گیا

پھر کاوشوں پہ کیوں ہے مژہ کو نہیں ہے لاگ　　پھر کیوں کھٹک ہے دل میں جو پیکاں نکل گیا

ایک غزل ہے ؎

وحشت نہ کیوں ہو، دوست بھی دشمن سے جا ملے

ہم خاک ہو کے دشت کے دامن سے جا ملے

اس غزل میں ایک شعر یہ ہے ؎

پتلون کوٹ کا یہ چلن گھر بہ گھر ہوا

سب اہل ہند صاحب لندن سے جا ملے

اشعار ذیل قابل داد ہیں۔ پوری غزل مرصع ہے ؎

جا ملا اس کے روئے انور سے　　آئینہ روٹھ کر سکندر سے

چشم مخمور سے ہیں ہم مسرور　　دور رہتے ہیں دور ساغر سے

واہ وا دوسرا نہیں تم سا　　بولا عکس آئینہ کے اندر سے

نالہ سے اپنے ہے مجھے شکوہ　　جو کہ گرجے بھلا وہ کب برسے

ذیل کے دو شعروں میں کیا اچھی باتیں کہی ہیں ؎

نہ وہ سونے میں نہ چاندی میں نہ اکسیر میں ہے

جو مزا خاک میں اور خاک کی تاثیر میں ہے

رفتہ رفتہ جو بڑھے چاہ تو ہے اُس کو قیام

نہیں تعجیل میں وہ لطف جو تاخیر میں ہے

ایک غزل میں شورؔ نے خاص طور پر مذہبی جذبات کا اظہار کیا ہے ؎

گناہوں سے جہاں پر کچھ مصیبت ہونے والی ہے

نظر ہے چرخ کی بدلی کچھ آفت ہونے والی ہے

ضعیفی ہے مصیبت ہے غضب کی ناتوانی ہے

بدن سے روح کچھ روزوں میں رخصت ہونیوالی ہے

نہ یاروں میں رہی یاری نہ اپنوں میں وفاداری

خدا جانے کہ کیا دنیا کی حالت ہونے والی ہے

بھروسا تو خدا پر رکھ، ہراساں ہو نہ اے غافل

کہ تجھ پر اس کا فضل اور اس کی رحمت ہونیوالی ہے

مسیحا کی شفاعت سے ہمیں امید ہے کامل

وسیلہ سے اسی کے ہم کو جنت ہونے والی ہے

اس قسم کی ایک اور بھی غزل ہے۔ اس کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ترا دیدار خداوندا مشکل ہے　　ترے جلوہ کی کسے تاب اور امشکل ہے

ایک آتا ہے یہاں دوسرا جاتا ہے وہاں　　سب کو اک دن ہے فنا لطف بقا مشکل ہے

عاشقِ حق میں جو تکلیف ہے راحت اُن کو　　اُن کی آسان ہر اک روز جزا مشکل ہے

کس نے دیکھا ہے اسی منزل مقصود کو دور　　سچ تو یہ ہے بخدا راہ خدا مشکل ہے

یوں تو ہر شخص ہے دنیا میں خدا کا بندہ　　ساتھ ایمان کے پر خوفِ خدا مشکل ہے

اور باتیں تو زمانہ میں ہیں آسان ساری　　غور سے دیکھا تو اک طرز وفا مشکل ہے

تم جو مانگو گے خدا سے وہی پاؤ گے ضرور

صدق دل سے مگر اے شورؔ دعا مشکل ہے

شورؔ نے رضوان مرادآبادی کی غزل پر مصرعے لگائے ہیں ؎

نے برق کی شوخی ہے نہ چشمک ہے شرر کی　　نے نور نگہ کا ہے نہ تیزی ہے نظر کی

نے حسن شب مہ نہ سپیدی ہے سحر کی　　خورشید کا جلوہ نہ تجلی ہے قمر کی

پھیلی ہوئی ہے روشنی روئے مسیحا

ہو زمزمہ اک دم بھی نکلتے نہ دہن سے　　اور رنگ یہ کھلتے کبھی اس کے دہن سے

رکھتی نہ غرض رنگ سے رعنا نہ پھبن سے　　بلبل کو محبت کبھی ہوتی نہ چمن سے

پھولوں میں نہ بس جاتی اگر بوئے مسیحا

ہاں جلوہ انوار وفا اس کو ملے گا　　فیض اثر کیف دعا اس کو ملے گا

لطف ثمر صدق و صفا اس کو ملے گا　　تعبیر ہے دیدار خدا اس کو ملے گا

جو خواب میں دیکھے رخ نیکوئے مسیحا

ہر شان سے اک نور کا جلوہ نظر آیا　　ہر رنگ سے اک حسن مجلا نظر آیا

حیران ہوں کس سے کہوں میں کیا نظر آیا　　اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آیا

دیکھا جو کبھی آئینہ روئے مسیحا

چھٹے دیوان کے یہ شعر بھی ملاحظہ کے قابل ہیں ؎

دل گذرگاہِ جہاں میں نہیں شاداں میرا　　دم ہے مہمان، بدن خانہ مہماں میرا

جس میں سوزش نہ ہو وہ طرز ستانے کی نکال　　خوگر شعلہ غم ہے دل سوزاں میرا

خاک پیرِ چمن میں ہے نشیمن میرا　　باغباں میرا نہ گل میرا نہ گلشن میرا

انقلاب ایسا زمانہ میں ہوا ہے اب شورؔ　　کل جو تھا دوست ہوا آج وہ دشمن میرا

بگڑی شکلوں سے یہاں تک مرے گھر کی صورت　　نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

نظر آتا ہے ادھر سارے جہاں کا نقشہ　　پر دکھائی نہیں دیتی ہے اُدھر کی صورت

طولانی سخن سنتے نفرا نہیں دہاں　　یاں شوق یہ کہ بات کوئی مختصر نہ ہو
دل کی کشش غضب کا نالہ ہے پر اثر　　ممکن نہیں کہ دو میں کسی کا اثر نہ ہو

اپنی عادت میں تو تا مرگ وفا ہے داخل　　پر یہ ڈر ہے کہ جفا کی نہ تمہیں خو ہو جائے

کیا کام ہے صیاد اسیروں کا قفس میں　　یہ ظلم ہے ان کی تو سزا اور ہی کچھ ہے

غیر مناسب نہ ہوگا کہ آخر میں حضرت شور کا فارسی کلام بھی نمونۃً پیش کر دیا جائے۔ لہذا ایک غزل اور چند رباعیات ملاحظہ ہوں ؎

رخت مہر درخشانے است گویا　　لبت لعلِ بدخشانے است گویا
گل داغست از ہر چاک پیدا　　گریبانم خیابانے است گویا
زبس آشفتگی جمع است در روئے　　فغاں زلفِ پریشانے است گویا
زبس مضمون ابروئے تو بستم　　مرا ہر بیت دیوانے است گویا
ز جوشِ گریہ مژگانِ ترِ من　　رگِ ابرِ بہارانے است گویا
خلد بے روئے او در دیدۂ من　　نگہ خارِ مغیلانے است گویا
ز زلفش بر ندارم شورؔ دل را
مرا ایں کفر ایمانے ست گویا

ہر چند بدل صد ہوسِ خام گزشت　　در چشم زدن شورؔ مے و جام گزشت
زیں عمرِ دو روزہ کہ دادند افسوس　　کامے نہ گرفتیم و بنا کام گزشت

پیوست خدائے را اطاعت می کن　　جان و دلِ خویش صرفِ طاعت می کن
تا صاحبِ آبرو شوی چوں خورشید　　با نانِ جویں شورؔ قناعت می کن

شاد از عدم آمدیم و محزوں رفتیم　　با دیدۂ زار و دل پر خوں رفتیم
واضح نشدہ، شورؔا درین دار فنا　　از بہر چہ آمدیم و پس چوں رفتیم

در راہِ رضا خیال رہبر کفر است　　افزوں طلبیدن از مقدر کفر است
سنگِ ستم است و خواہ شمشیرِ جفا　　سر بازدن ز حکمِ داور کفر است

ہاں از روشِ خلق جدا می گریم　　گرید نہ کسے چناں کہ ما می گریم
یک بہر پدر گرید و یک بہرِ پسر　　بر غفلتِ ایں و آں بسا می گریم

دیدیم بسے بدیدۂ آخر بیں　　ہیچ است ہمہ چہ آسمان و چہ زمیں
اے شورؔ چہ پرسی ز ثباتِ عالم　　دنیا نفسے و اہلِ دنیا کم ازیں

حیرت زدہ از پنبہ بگوشاں مائیم　　در دہر ہم از خانہ بدوشاں مائیم
از شورؔ چہ پرسیم و چہ گوئیم اے وائے　　دانیم کہ در شہرِ خموشاں مائیم

(بجملہ حقوق محفوظ)

پیارے لال شاکر میرٹھی

رباعی

پھر شیشۂ کعبہ و صنمخانہ اٹھا
دینداری و کفر کا پھر افسانہ اٹھا
اٹھ اٹھ ساقی بساطِ ساغر جگ بنے
لب تشنۂ مے تشنۂ پیمانہ نہ اٹھا

سید محمد عسکری طباطبائی بی اے

غزل

ساقی کا منتہائے نظر پا کے پی گیا
مستی میں جھوم جھام کے لہرا کے پی گیا

وہ چشم پر عتاب وہ صہبا کی تلخیاں
پر اقتضائے شوق سے بل کھا کے پی گیا

میں جانتا ہوں فرق گناہ و ثواب کا
لیکن غم حیات کو بہلا کے پی گیا

وہ تیری چشم ناز کی مستانہ لغزشیں
میں جنت و طہور کو ٹھکرا کے پی گیا

اللہ رے سرورِ محبت کی وسعتیں
دونوں جہاں نگاہ میں سما کے پی گیا

میں اور تنگ ظرفیٔ پیرِ مغاں کا ڈر
ساقی کے التفات کی شہ پا کے پی گیا

کچھ عذر کم نگاہیٔ ساقی نہ تھا شمیم
میں ان کی بزمِ ناز میں پھر آ کے پی گیا

شمیم بھیروی

ہریش

ہریش نے اپنی زندگی میں دو ہمدرد پائے۔ ایک تو سرین بابو — اُس کے والد کے ایک ایسے دوست جنہوں نے اتنے امیر ہونے پر بھی اپنے غریب دوست کو کبھی دل سے فراموش نہ ہونے دیا۔ اور دوسرے ان کی لڑکی سرلا — جو ایک بہترین ہجولی کی طرح ہریش کے ہر دُکھ سُکھ میں شریک ہوتی رہی۔

والدہ کی یاد تو ہریش کے دل میں چند ایک دھندلے سے واقعات سے زیادہ نہ تھی مگر اپنے والد اُسے خوب یاد تھے۔ ان کی زندگی میں بھی سرین بابو اور سرلا کو ہی وہ صرف اپنا خیال کرتا تھا۔ باقی دنیا سے اُسے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کی دنیا بس اتنی ہی تھی۔ نہایت مختصر مگر بے حد پاک۔ جس میں صرف دو جذبات کا راج تھا۔ محبت اور ایثار۔ نفرت دشمنی۔ حسد۔ بیر کسی کا وہاں دخل نہ تھا۔ اس مختصر سی دنیا میں ہی وہ بے حد خوش تھا۔ رنج وغم کے وجود کا اُسے علم ہی نہ تھا۔ اس کی دنیا میں پہلا المناک واقعہ والد کی موت تھی۔ زندگی کے آخری لمحات میں انہوں نے سرین بابو سے کہا تھا "میرے بعد بھی ہریش کو ایسا ہی سمجھنا جیسا میری زندگی میں سمجھتے رہے۔" اور اس کے جواب میں سرین بابو نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں اُن کے سرد ہاتھ لے کر کہا تھا — "میری نظر میں ہریش ایسا ہی ہے جیسی سرلا۔"

اُس کے والد نے ایک دفعہ ممنون نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔ محبت سے ان کا ہاتھ ذرا دبایا اور آنکھیں بند لیں۔ ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

اُس دن کے بعد سے ہریش سرین بابو اور سرلا کے نزدیک تر ہو گیا۔ اُس کی زندگی کی ہر دلچسپی۔ اس کے دل کی ہر خواہش انہی دونوں کی زندگی سے وابستہ ہو گئی۔ اس کے لئے اگر وہ خوش تھے تو ساری دنیا خوش تھی۔ اگر وہ تکلیف میں تھے تو ساری دنیا غمزدہ تھی اور وہ دونوں بھی اُس کا خیال رکھتے تھے۔ اُسے ایک لمحہ کے لئے بھی محسوس نہ ہوتا تھا کہ اس کی پیدائش اور پرورش اس گھر میں نہیں ہوئی ہے یا اس کی بہ نسبت سرلا کو سرین بابو پر زیادہ حق ہے یا سرین بابو کو اُس سے کم محبت ہے۔ تینوں کی زندگی ایک دوسرے سے اس قدر وابستہ تھی کہ ایک کا غم تینوں کا غم تھا اور ایک کی خوشی تینوں کی خوشی۔

ان کے گھر کے نزدیک ہی سست رفتار گنگا اپنے صاف اور سرد پانی کو خاموشی سے بہائے لئے جاتی تھی۔ چاندنی راتوں میں گنگا کے کنارے کا نظارہ نہایت ہی دلفریب ہوتا۔ ہریش اور سرلا اکثر وہاں بیٹھ کر گھنٹوں بہتے ہوئے پانی سے کھیلا کرتے۔

ایسی ہی ایک رات تھی۔ گنگا کا پانی دھیمے دھیمے بہا جا رہا تھا چاند کی چاندنی اس پر حل ہو کر اُسے شفاف تر بنا رہی تھی۔ کنارے کے درختوں کی جھکی ہوئی شاخیں بہتے ہوئے پانی کو چوم رہی تھیں۔ ہوا کے سرد جھونکے جسم میں پھریری سی پیدا کر رہے تھے۔ نرم نرم ریت پر بیٹھا ہریش دھیمی آواز میں گنگنا رہا تھا "نہ آیا من کا میت۔ عمریا بیت گئی ساری"

کسی نے پکارا "ہریش بھائی!"

گردن پھیر کر ہریش نے دیکھا "تم ہو؟" اُس کے منہ سے نکل گیا۔

"ہاں" سرلا نے کسی قدر افسردگی سے کہا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"اس دلفریب نظارے سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ آؤ تم بھی اس میں شریک ہو جاؤ" سرلا خاموش کھڑی رہی۔

"کیوں؟" ہریش نے کہا "کیا اس چاندنی رات میں گنگا کے پانی کی دھیمی آواز۔ ہوا کے سرد جھونکے۔ درختوں کی جھکی ہوئی شاخیں۔ تمہارے دل میں مسرت کی ایک امنگ۔ ایک لہر پیدا نہیں کرتیں۔"

"نہیں" سرلا نے چاند کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے اس نظارے سے تکلیف ہوتی ہے چاند کی چاندنی گنگا کے پانی کی دھیمی آواز۔ ہوا کے سرد جھونکے درختوں کی جھکی ہوئی شاخیں۔ تمام میں مجھے

ایک مایوسی نظر آتی ہے۔ ایک ناامیدی کا احساس ہوتا ہے جو میرے دل کو مسلے ڈالتا ہے۔

ہریش نے سرلا کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی چاند کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کا اُس وقت کا اظہار ہریش کی نظر سے پہلے کبھی نہ گذرا تھا۔ اتنا غمگین اور مایوس اُس نے سرلا کو کبھی نہ پایا تھا۔ اس کی اس غیر معمولی مایوسی اور افسردگی کا مطلب وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا جس نے اس کے ساکت دل میں بھی ایک حرکت پیدا کر دی تھی۔ "سرلا" اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم کو آج ہو کیا گیا ہے۔ یہ آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

سرلا چونک پڑی جیسے بے ہوشی کی حالت سے ہوش میں آگئی ہو۔ خوابوں کی دنیا سے گناہوں کی دنیا میں لوٹ آئی ہو۔ خیالات کے سمندر سے باہر کھینچ لی گئی ہو۔ اپنی غیر معمولی مایوسی اور افسردگی کو ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔ "بابو جی تم کو تلاش کر رہے ہیں۔ تم کتنی دیر سے یہاں ہو؟"

"کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس دلکش نظارے سے لطف اندوز ہونے میں میں اتنا محو تھا کہ . . . ."

نہ جانے ہریش اور کیا کیا کہہ جاتا مگر ایک نظر سرلا پر ڈالتے ہی وہ سمجھ گیا کہ وہ کچھ اور ہی دیکھ رہی ہے۔ گویا ہریش کی بات اُس نے سنی ہی نہ تھی۔ اپنے شاعرانہ جذبات کا اظہار کرنے کا ارادہ ترک کر کے وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس واقعہ کو کئی روز گذر گئے۔ ہریش ایک روز کالج سے کسی قدر جلد واپس آگیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس کی نظر سرلا پر پڑی جو الماری کے سامنے کھڑی کوئی کتاب تلاش کر رہی تھی۔ ہریش کو دیکھ کر سرلا بولی "تم آج جلدی آگئے کیا؟"

"ہاں . . . اور تم؟" ہاتھ کی کتابیں میز پر رکھتا ہوا ہریش بولا۔

"میں تو آج کالج گئی ہی نہیں۔"

"کیوں؟"

"ایسے ہی"

"کیا طبیعت کچھ خراب ہے؟"

"نہیں نہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

"پھر؟"

"یوں ہی دل نہیں چاہتا تھا جانے کو۔"

ہریش نے دیکھا سرلا آج پھر غمگین ہے۔ بات بدلنے کے خیال سے اُس نے کہا۔ "کوئی کتاب تلاش کر رہی تھیں کیا؟ مل گئی یا میں تلاش کر دوں؟"

"نہیں مل گئی" سرلا نے ایک کتاب دکھاتے ہوئے کہا۔

"ذرا دیکھوں" کہہ کر ہریش نے ہاتھ بڑھایا اور سرلا کے ہاتھ سے کتاب لے کر ورق اُلٹنے لگا۔ کتاب تھی۔ ہال کین کی (Hallcaine) دی بانڈ مین (The Bond Man) کتاب واپس کرتے ہوئے ہریش بولا۔ "خوب کیا زبردست ٹریجیڈی آپ نے انتخاب کی ہے۔ کیا تم کو ٹریجیڈی بہت پسند ہے سرلا؟"

"ہاں"

"کیوں"

"اپنی اپنی پسند ہی تو ہے۔"

"مگر تم اتنی افسردہ کیوں رہنے لگی ہو سرلا۔ تم کو یاد ہے۔ اُس روز چاندنی رات کو تم نے گنگا کے کنارے کہا تھا" چاند کی چاندنی گنگا کے پانی کی دھیمی آواز۔ ہوا کے سرد جھونکے۔ درختوں کی جھکی ہوئی شاخیں۔ تمام میں مجھے ایک مایوسی نظر آتی ہے۔ ایک ناامیدی کا احساس ہوتا ہے جو میرے دل کو مسلے ڈالتا ہے" کیوں کہا تھا نا؟

سرلا نے اٹھ کر جانا چاہا۔ مگر ہریش نے اُسے روک کر کہا۔ "نہیں پہلے میری بات کا جواب دو۔ تم کو یہ ہو کیا گیا ہے۔ تم ایسی باتیں کیوں کہتی ہو؟"

تھوڑی دیر خاموش رہ کر سرلا نے آہستہ آہستہ کہا۔ "کیونکہ اس زندگی کا انجام مایوسی ہی ہے۔ ناامیدی ہی ہے۔ یہ زندگی بھی ایک "ٹریجیڈی" ہے اور زبردست "ٹریجیڈی" ہے اگرچہ انسان اس کو جانتے ہوئے بھی بھلا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس سادہ دل پڑھنے والے کی طرح جو کسی افسانے کو ٹریجیڈی کی طرف جاتا دیکھ کر بھی آخر دم تک اُس کے "کامیڈی" ہونے کی امید ترک نہیں کرتا۔"

کچھ دیر تک بالکل سناٹا رہا۔ سرلا کی باتوں نے گویا ہریش کو آسمان سے زمین پر پھینک دیا تھا۔ اس کی باتوں کا کوئی مطلب اس کی سمجھ میں نہ آسکا۔ کچھ سنبھل کر اس نے کہا۔ "آخر ان باتوں کا مطلب کیا ہے؟ تمہیں تمہیں ان خیالات سے واسطہ؟ یہ تو شاعروں اور

ادیبوں کی خیالی پرواز ہے۔ عام انسانوں کو اس میں کیا دخل؟ تم ایسی باتیں کیوں کرتی ہو سرلا۔ پہلے تو تم ایسی نہ تھیں۔ اس رات ... کیا ہو گیا ہے۔ آخر تم اتنی غمگین کیوں رہنے لگی ہو۔ کچھ بتاؤ بھی تو؟"

اس طویل تقریر کا اثر سرلا پر کچھ بھی نہ ہوا۔ اُس کے بہت اصرار کرنے پر بھی سرلا نے اپنی افسردگی کی کوئی وجہ نہ بتائی۔ آخر تنگ آ کر ہریش نے سب حال سُرین بابو سے کہہ دینے کا ارادہ کیا۔ اس امید سے کہ شاید وہ اس معمّے کا کوئی حل بتا سکیں۔

دوسرے روز اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے جب ہریش سرین بابو کے پاس گیا تو وہ بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے ہریش کو آتا دیکھ کر اخبار میز پر رکھتے ہوئے وہ بولے۔ "تم آ گئے بیٹا۔ میں خود ہی تم کو بلانے والا تھا۔ ایک نہایت ضروری کام کے لئے ہریش! تم ہمیشہ میری مشکل آسان کرتے رہے ہو۔ دیکھنا ہے اس دفعہ بھی تم کامیاب ہوتے ہو یا نہیں؟"

آنکھوں سے عینک اتار کر رومال سے صاف کرتے ہوئے سرین بابو بولے "سرلا نے بی۔ اے تو پاس کر ہی لیا ہے۔ اب میں اس کی شادی کر دینا چاہتا ہوں۔"

عینک پھر آنکھوں پر چڑھاتے ہوئے وہ کہنے لگے۔ "اور اس کے لئے ایک لڑکا بھی میں نے تلاش کر لیا ہے۔ لڑکا کلکتہ کے پریزیڈنسی کالج میں پروفیسر ہے۔ شکل صورت اچھی ہے۔ خاندان شریف ہے مگر . . . "

ہریش کو خاموش دیکھ کر وہ پھر کہنے لگے "مگر سرلا رضامند نہیں ہے اور کیوں نہیں۔ یہ بھی کچھ معلوم نہیں۔ وجہ بتانے کے لئے مجبور کرنے پر رونے لگی اور بولی "میں شادی کروں گی ہی نہیں"۔ اب تم ہی سوچو۔ بیٹا! یہ بھی کبھی ہو سکتا ہے۔ شادی تو ایک نہ ایک روز کرنی ہی ہو گی۔ پھر اِدھر اُدھر بھٹکنے سے کیا حاصل؟ میں اُس کا باپ ہوں جو کچھ کروں گا اس کی بہتری کے لئے ہی کروں گا۔ پھر ایسا اچھا موقع..."

"یہ سب درست ہے" ہریش نے کہا "مگر جب سرلا ہی رضامند نہیں تو . . . ؟"

"اُدھر ہوا وہ کوئی وجہ بھی تو نہیں بتاتی۔ وہ ابھی نادان ہے۔ اچھے اور بُرے میں تمیز نہیں کر سکتی۔ لیکن تم تو بیٹا سمجھدار ہو۔ تم ہی اُس کو سمجھاؤ۔ تمہارا کہنا وہ ضرور مانے گی تم کو وہ اپنا سچا ہمدرد سمجھتی ہے"

ہریش خاموش کھڑا رہا۔ کیا کرنا ہو گا۔ اس کا فیصلہ نہ کر سکا۔ ایک طرف والد کے ہم رتبہ سُرین بابو کا لحاظ تھا۔ ادب تھا۔ فرض تھا اور دوسری طرف . . . کیا تھا۔ ہریش کو خود معلوم نہ ہو سکا۔ شاید خود غرضی تھی۔ شاید انسانیت تھی۔ شاید . . . ایک اور طاقت تھی جس کو سمجھنے سے وہ قاصر تھا۔ لیکن جو اُسے اپنی طرف نامعلوم طور پر کھینچ رہی تھی۔ ہریش کو خاموش دیکھ کر سرین بابو اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ "کیا سوچتے ہو بیٹا! جیسے بھی ہو سرلا کو تمہیں سمجھانا ہی پڑے گا۔ اس کی بہتری چاہنا ہی تمہارا 'فرض' ہے۔ تمہارا کہنا وہ کبھی نہیں ٹالے گی"۔ ہریش لاجواب سا ہو کر اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

شام کو بیٹھا سوچ رہا تھا۔ سرین بابو کہتے ہیں۔ "سرلا تم کو اپنا سچا ہمدرد سمجھتی ہے . . . اس کی بہتری چاہنا ہی تمہارا 'فرض' ہے"۔ . . . مگر کیا اسی میں سرلا کی بہتری ہے . . . ہاں کم از کم سرین بابو تو یہی یقین کرتے ہیں . . . اور ان کی خواہش پر چلنا میرا 'فرض' ہے . . . 'فرض'! لیکن سرلا کے لئے میرا کوئی 'فرض' نہیں ہے! اُس کی اپنی مرضی کے خلاف اُس کو ایک بات پر اپنے ذاتی اثر سے راضی کر لینا۔ کیا بے انصافی نہ ہو گی . . . مگر سرین بابو کا خیال ہے کہ سرلا کی اس میں بہتری ہے . . . اور سرین بابو سرلا کے والد ہیں . . .

ہریش کچھ فیصلہ نہ کر سکتا تھا۔ یہ اُس کی زندگی کی پہلی مشکل تھی۔ جس میں وہ کسی سے صلاح نہ لے سکتا تھا۔ نہ سرین بابو سے۔ نہ سرلا سے اور اُس کے اپنے اندر دماغ اور دل کی جو کشمکش ہو رہی تھی اُس نے دونوں میں سے کسی کو کسی قابل نہ رکھا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھلا۔ سرلا اندر آ کر بولی۔ "کیا سوچ رہے ہو۔ ہریش بھائی؟"

"سرلا" ہریش نے سرلا کی بات کو ان سُنی کرتے ہوئے کہا "مجھے تم سے ایک بات پوچھنی ہے"۔

"کیا؟"

کچھ سوچ کر ہریش بولا۔ "اچھا کچھ نہیں۔ پھر کبھی پوچھوں گا"

"اچھا چائے پینے تو چلو"

"چلو"

سرین بابو۔ جب چائے پی کر میز سے اُٹھ گئے تو ہریش سرلا

کی طرف مخاطب ہوا "اچھا تم سے اب وہ بات پوچھوں؟"

"پوچھو"

"اچھا اس وقت نہیں"

سرلا ہنس پڑی ۔ "تم کرتے کیا ہو۔ آپ ہی سوال۔ آپ ہی جواب پوچھنا ہے تو پوچھتے کیوں نہیں؟"

"اچھا . . . سنو . . . لیکن . . . پھر . . . اچھا یہ بتاؤ . . ." اتنا کہہ کر ہرنیش پھر خاموش ہوگیا ۔ پھر ذرا اپنے کو قابو میں کر کے وہ بولا "باوجی نے تم سے کبھی شادی کے متعلق کچھ کہا تھا؟"

سرلا نے سر جھکا لیا۔ اس کا چہرہ پہلے سرخ اور پھر فوراً ہی زرد ہوگیا۔

"مذاق نہیں سرلا۔ ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ مجھے باوجی سے سب کچھ معلوم تو ہو ہی گیا ہے"۔

"معلوم ہوگیا ہے تو پوچھتے کیوں ہو؟"

"تمہارے اعتراض کی وجہ جاننے کو"

"تم چائے کی دوسری پیالی لوگے نا؟"

"ہاں ہاں ۔ مگر پہلے میری بات کا جواب دو"۔

سرلا کو خاموش دیکھ کر ہرنیش آہستہ آہستہ کہنے لگا "تم شاید نہیں سمجھ رہی ہو سرلا کہ تمہاری اس ضد سے باوجی کو کتنی تکلیف ہوگی۔ ان کا بڑھاپا ہے اور اس عمر میں زندگی کے آخری ایام میں ان کو تمہارا ہی بھروسہ ہے۔ تمہاری ہی فکر ہے اور تمہیں سے تمام امیدیں ہیں۔ اگر مرنے سے پہلے وہ تم کو سکھی دیکھ سکیں تو وہ کتنی شانتی سے مر سکیں گے برخلاف اس کے اگر آخری وقت ان کو یہی رنج رہا کہ ساری عمر تمہاری ہر بات ماننے پر بھی وہ تم کو اپنی ایک خواہش ماننے پر راضی نہ کر سکے تو ان کو کیسا محسوس ہوگا اور پھر مرتے مرتے بھی یہی خیال رہے گا۔ کہ نہ معلوم ان کے بعد تمہاری زندگی کیسے گذرے گی۔ تمہاری رہنمائی کے لئے بہترین ہاتھ ایک ایسا انسان جو تم جیسی اچھی لڑکی کی قدر کرنا جانتا ہو۔ ملے گا یا نہیں"۔

سرلا کو خاموش دیکھ کر ہرنیش نے کہا ۔ "آخر تم کو اعتراض کیا ہے؟ کم از کم مجھے تو بتا دو میں تمہاری پوری مدد کرنے کا وعدہ کرتا ہوں سرلا۔ کیا تم کو میرا بھی اعتبار نہیں ہے؟"

سرلا نے سر جھکائے ہوئے ہی جواب دیا ۔ "اعتبار مجھے سب کا ہے۔ مگر میں کیا کروں۔ میں خود فیصلہ نہیں کر سکتی کہ میں کیا کروں"۔

ہرنیش نے تسلی دیتے ہوئے کہا "تم مجھے وجہ بتاؤ۔ سرلا میں تم کو فیصلہ کرنے میں مدد دوں گا"۔ سرلا کسی سوچ میں پڑ گئی۔ کئی دفعہ اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ مگر پھر خاموش ہوگئی۔ گویا جو کچھ وہ کہنا چاہتی تھی۔ کہہ نہیں سکتی تھی۔ آخر ایک طویل خاموشی کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ "نہیں میں کچھ نہیں بتا سکتی کسی کو نہیں بتا سکتی مجھے جانے دو"

سرلا جانے لگی۔ ہرنیش نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھاتے ہوئے کہا "آخر ایسی کونسی بات ہے سرلا جو تم کسی کو بھی نہیں بتا سکتیں۔ تم ہی سوچو نہ بتانے سے کام کیسے چلے گا"۔ ہرنیش نے سرلا کو بہت طرح سمجھایا۔ مگر کوئی بات جان نہ سکا آخر اس نے کہا "اچھا۔ ابھی نہ سہی تم کل تک اس بات پر غور کر لو۔ کل اسی وقت مجھے بتا دینا۔ اچھا؟"

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ سرلا اس طرح کمرے سے چلی گئی کہ ہرنیش کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ ملا۔

دوسرے روز چائے پینے کے بعد سرلا نے اٹھ کر جانا چاہا کہ ہرنیش نے اسے روک کر کہا۔ "میری بات کا جواب؟ کیوں بھول گئیں کل کا وعدہ؟"

سرلا چند لمحوں تک خاموش کھڑی پاؤں کے انگوٹھے سے فرش پر لکیریں کھینچتی رہی پھر ایک سانس میں "مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے" کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

ہرنیش نے ایسا محسوس کیا گویا کسی نے اس کے منہ پر زور سے ایک طمانچہ مارا ہو۔ تھوڑی دیر تک وہ بے حس بیٹھا کھوئی ہوئی آنکھوں سے اس دروازے کی طرف دیکھتا رہا جس میں سے سرلا گئی تھی اور تب اٹھ کر اس نے پکارا "سرلا"۔ مگر کسی نے اس کی آواز کا جواب نہ دیا

اس بات کو بہت دن گذر گئے۔ ویسے ہی جیسے پہلے گذرتے تھے۔ اسی طرح سورج نکلتا تھا۔ غروب ہوتا تھا۔ سویرا ہوتا تھا۔ رات ہوتی تھی مگر ہرنیش کے لئے وہ دن پہلے سے دن نہ تھے۔ اس کی زندگی ہی بالکل بدل گئی تھی۔ اب بھی اکثر چاندنی رات میں گنگا کے کنارے جا کر بیٹھا کرتا مگر پہلے کا سا لطف۔ سکون۔ مسرت۔ اسے کبھی نصیب نہ ہوتا۔ چاند کی چاندنی میں گنگا کے پانی کی آوازیں۔ ہوا کے سرد

جھونکوں میں درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں میں اُسے ایک مایوسی نظر آتی تھی۔ ایک نا امیدی کا احساس ہوتا تھا جو اس کے دل کو مسلے ڈالتا تھا۔ ایک رات ایسے ہی وقت جب سرلا نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا تھا تو وہ کتنا حیران ہوا تھا۔ اُس نے سمجھا تھا سرلا پاگل ہو گئی ہے مگر آج اُسے خود ویسا ہی احساس ہو رہا تھا اس کے نزدیک زندگی سوز و غم سے معمور ایک "ٹریجیڈی" تھی جس میں جگہ جگہ پر مصنف نے جس کو "قسمت" کہا جاتا ہے۔ عارضی خوشی رکھ کر پڑھنے والے کو اس کے "کامیڈی" ہونے کی امید دلانے کی رائیگاں کوشش کی تھی تاکہ انسان زندگی سے بیزار نہ ہو جائے اور تب تک زندگی کی جد و جہد سے آزاد نہ ہو سکے۔ جب تک کہ "موت" اُس کی زندگی کا آخری ورق نہ الٹ دے۔

سرین بابو کے شب و روز البتہ روشن ہو گئے تھے۔ جب سے انہوں نے ہریش کی زبانی سُنا تھا کہ سرلا شادی کے لئے رضامند ہے تب سے ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ سرلا اور ہریش کی دل کی حالت کا کوئی علم اُن کو نہ تھا۔ یہ سب کے لئے باعثِ مسرت ہوگا۔ اسی یقین میں وہ بڑی امنگ سے شادی کی تیاری کر رہے تھے۔

سرلا کی حالت کا علم ہریش کو بھی نہ تھا۔ جس سرلا کے ساتھ ایک بہترین ہمجولی کی طرح وہ لڑکپن سے کھیلا تھا۔ اُسی سرلا کی کسی بھی حرکت کا مطلب وہ اب سمجھ نہ سکتا تھا۔ وہ ہی سرلا جو کبھی کتنی خوش۔ شوخ اور بھولی تھی۔ اب اتنی خاموش سنجیدہ اور محتاط ہو گئی تھی کہ ہریش کو یقین نہ آتا تھا کہ یہ وہی سرلا ہے جس کو وہ کبھی اپنے اتنا قریب محسوس کرتا تھا اور جو اب اُس سے اس قدر دور معلوم ہوتی تھی کہ اُس کی کوئی حرکت کوئی بات۔ ہریش کی سمجھ میں نہیں آتی تھی ہریش کو ایسا معلوم ہوتا گویا اس نے سرلا کو اپنے ہاتھوں سے دھکیل کر اپنے سے دور کر دیا ہو۔ اور اس فاصلے کا احساس ہریش کو اُسی دن سے ہونے لگا تھا جب سرلا نے اپنا "جواب" دیا تھا۔ اس کے بعد ہریش نے کئی دفعہ کوشش کی کہ وہ اس بارے میں سرلا سے ذکر چھیڑ کر اس "فاصلے" کو دور کرنے کی کوشش کرے مگر سرلا کا سنجیدہ چہرہ اور روکھا سلوک دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے دیتی آخر ایک دن اُس نے چائے کی میز پر سرلا سے ذکر کر ہی دیا۔

میرا خیال ہے۔ سرلا کہ جس روز سے تم نے میرے "سوال" کا "جواب" دیا ہے۔ اُس روز سے تم کچھ بدل سی گئی ہو میں محسوس کرتا ہوں گویا تم مجھ سے روز بروز دور دور ہوتی جا رہی ہو۔

"اب بھول جاؤ۔ ہریش بھائی گذری باتوں کو۔ میرے آگے اب اُن کا ذکر مت کیا کرو"۔

یہ کہہ کر سرلا کچھ اس طرح دوسرے موضوع پر باتیں کرنے لگی کہ ہریش اس بارے میں ایک لفظ بھی اور نہ کہہ سکا۔ مگر اس کے دل کا طوفان اور بھی زور پکڑ گیا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کی زندگی ایک ایسے تاریک راستے پر جا رہی تھی جہاں رہبری کے لئے روشنی کی ایک کرن تک نہ تھی۔

سرلا کی شادی سے کئی ماہ پہلے ہریش کو لکھنؤ جانا پڑا۔ وہیں میڈیکل کالج میں پڑھنے کا ارادہ تھا۔ سرین بابو سے رخصت ہو کر ہریش سرلا کے کمرے میں گیا۔ دھیرے سے دروازہ کھول کر اس نے اندر جھانکا۔ سرلا کھڑکی کی چوکھٹ کا سہارا لئے شام کے دھندلکے میں کھوئی کھوئی نظروں سے اس طرح باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گویا دور بہت دور کسی چیز کو دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

دروازہ کھلنے کی آہٹ پا کر اُس نے ہریش کی طرف دیکھا اور تب آگے آ کر خاموشی سے ہریش کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ گویا وہ اسی کا انتظار کر رہی تھی اور اب جو کچھ ہریش کہنے آیا تھا اُسے بھی سننے کو تیار تھی۔ کیا کہہ کر بات شروع کرے یہ سوچ نہ سکنے کے باعث ہریش خاموش ہی کھڑا رہا۔ اسے خاموش دیکھ کر آخر سرلا نے ہی اُس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ "تم جا رہے ہو ہریش بھائی!"

بھرے ہوئے گلے سے ہریش نے جواب دیا۔ "ہاں"

بہت دیر تک دونوں خاموشی سے سر جھکائے گذرے ہوئے دنوں کا مقابلہ آنے والے دنوں سے کرتے رہے۔

آخر اپنا منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سرلا نے آہستہ سے کہا۔ "جاؤ"۔

ہریش چلنے لگا۔ مگر سرلا نے روک کر پھر پوچھا۔ "اب کب آؤ گے؟"

اب وہ ہریش کے بالکل قریب کھڑی تھی۔ زمین کی طرف دیکھتے ہوئے ہریش نے جواب دیا۔ "شاید تمہاری شادی پر"۔ اُسی وقت پانی کے دو موٹے موٹے قطرے اُس کے پاؤں کے پاس زمین پر گر پڑے۔ نظر اٹھا کر اُس نے دیکھا۔ سرلا رو رہی تھی۔

کسی قدر گھبرا کر ہریش نے کہا "تم رو رہی ہو سرلا!"

ہریش بھائی . . . "! سرلا کچھ آگے نہ کہہ سکی۔ دروازے کی چوکھٹ سے سر لگا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ہریش نے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا "سرلا! سرلا!!" مگر اُس کے آنسو کسی طرح نہ رُک سکے۔ جیسے عرصے کا بندھا ہوا بند ایک دفعہ ہی ٹوٹ گیا ہو۔ طبیعت کچھ ہلکی ہونے پر سرلا نے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "تم کو دیر ہو جائے گی ہریش بھائی"۔

ہریش امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو روکتا ہوا باہر آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا گاڑی اسٹیشن کی طرف چل پڑی۔ ہریش نے گاڑی سے سر نکال کر دیکھا۔ سرلا کھڑکی کی چوکھٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے۔ جاتی ہوئی گاڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

جس امید سے ہریش لکھنؤ آیا تھا۔ وہ پوری ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ بہت کوشش کرنے پر بھی وہ اپنا دل پڑھائی میں نہ لگا سکا۔ اُس کے دل میں جو طوفان بپا تھا۔ وہ بجائے خاموش ہونے کے کبھی کبھی تو اتنا زور پکڑ جاتا کہ ہریش کو محسوس ہوتا کہ وہ پاگل ہو جائے گا۔ مگر آہستہ آہستہ اُسے اُس سکون اور خاموشی کا احساس ہونے لگا جس کی امید میں وہ یہاں آیا تھا۔ کئی ماہ کے عرصے میں وہ جو کچھ حاصل کر سکا تھا وہ سب کا سب ایک دن اُس سے پھر چھن گیا۔ سرین بابو نے لکھا تھا کہ "سرلا کی شادی اب نزدیک ہی ہے تم جس قدر جلد ہو سکے آ جاؤ"۔ جس طوفان کو وہ اتنی مشکلوں سے خاموش کرا سکا تھا۔ اس خبر سے وہ پھر ویسے ہی زور سے اُمڈ آیا۔ جہاں سے بھاگ کر اس نے یہ خاموشی حاصل کی تھی اُسے اب پھر وہیں جانا ہوگا۔ سرلا سے رخصت ہونے کا منظر — ایک المناک خواب کی طرح اس کی بند آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔

"تم جا رہے ہو . . . ہریش بھائی . . . جاؤ . . ."

سرلا کے الفاظ ہریش کو اب تک یاد تھے اور وہ "آنسو" جن کو بہتا ہوا وہ دیکھ رہا تھا مگر روک نہ سکتا تھا۔ کیا یہی سب کچھ اُسے پھر دیکھنا ہوگا؟ اس خیال سے ہی ہریش کا دل کانپ گیا۔ اُس نے سوچا۔ اسے شادی کون کہتا ہے! یہ تو سرلا کی تمناؤں کا مرثیہ ہوگا۔ تب اسے سرین بابو پر غصہ آیا۔ پھر اُسے اپنا خیال آیا اُس نے سوچا۔ مگر میں بھی تو بے قصور نہیں ہوں۔ کیا میں نے سرلا کو مجبور نہیں کیا تھا! کیا سرلا نے میرے اصرار پر ہی اپنی رضامندی نہیں دی؟ اُس نے سوچا سرلا کی تمناؤں کا خون تو کیا ہی ہے۔ کیا مرثیہ سننے کو بھی موجود رہنا ہوگا؟ مگر نہ جانا بھی ممکن نہیں ہے۔ سرین بابو کیا کہیں گے؟

ضمیر کی اس کھینچا تانی میں کئی روز گذر گئے۔ ایک دن ہریش نے سنا کہ "ڈاکٹر ماتھر کچھ طلبا کی پارٹی سی بنا کر ہندوستان کے چند بڑے بڑے ہسپتالوں کو دیکھنے جائیں گے۔ اُس کے دوستوں نے اس کا نام بھی لکھوا دیا۔ ہریش کو معلوم ہوا۔ باہر جانا انہیں دنوں میں ہے۔ جن دنوں میں شادی ہے اُس کو سہارا مل گیا۔ اُس نے سرین بابو کو خط لکھا۔ ڈاکٹر ماتھر اور اُن کے جانے کے بارے میں سب حال بتا کر اُس نے لکھا "ڈاکٹر ماتھر نے جن لڑکوں کو انتخاب کیا ہے۔ ان کو جانا لازمی ہے۔ ان میں میرا نام بھی ہے۔ شادی تک ہم لوگ ضرور واپس آ جائیں گے۔ مگر بہت پہلے میں نہ آ سکوں گا"۔ پھر اِدھر اُدھر کا حال لکھ کر اس نے اپنی دیر کے لئے معافی مانگی اور خط روانہ کر دیا۔

اگلے ہفتے ہریش اپنی پارٹی کے ساتھ لکھنؤ سے چل پڑا۔ مدراس آ کر معلوم ہوا کہ ابھی پندرہ روز سے پہلے وہ واپس لکھنؤ نہیں جا سکتا۔ اور شادی میں ایک ہی ہفتہ رہ گیا تھا۔ مجبوراً اُسے سرین بابو کو خط لکھنا پڑا جس میں اُس نے سب حال اور اپنی مجبوری کا ذکر کر کے دوبارہ معافی مانگی۔ لکھنؤ آ کر ہریش کو سرین بابو کا خط ملا جس میں لکھا تھا "شادی ہنسی خوشی ہو گئی۔ تمہاری غیر موجودگی سب نے بہت محسوس کی"۔ ہریش اس "سب" کے لفظ کو چند لمحوں تک دیکھتا رہا اور پھر خط جیب میں ڈال اُٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکپن کے گذرے ہوئے واقعات — شیریں خوابوں کی طرح اُس کے دل کو گدگدانے لگے۔

گرمی کی چھٹیوں میں ہریش لکھنؤ سے آیا تو سرین بابو گھر پر نہ تھے۔ ہریش کے لئے ایک رقعہ چھوڑ گئے تھے — "سرلا بہت بیمار ہے میں کلکتہ جا رہا ہوں"۔ کسی المناک انجام کے خوف سے ہریش کا دل دہل اُٹھا ایک خوفناک تنہائی کے احساس سے وہ پاگل سا ہو گیا۔ مکان کی دیواریں اُس کو ایسی مایوس اور افسردہ معلوم ہوتیں گویا وہ ایک قید خانے میں بند ہے۔ سرلا کے کمرے میں قدم رکھتے ہی اُسے محسوس ہوتا گویا کوئی کہہ رہا ہے — "تم جا رہے ہو۔ ہریش بھاؤ . . . جاؤ . . ." گنگا کے کنارے بیٹھا وہ گھنٹوں سوچا کرتا کہ اس کی زندگی ایک مختصر سے عرصے میں ہی کتنی تبدیل ہو گئی تھی۔ کہاں وہ روشن سڑک اور کہاں یہ تاریک پگ ڈنڈی جہاں روشنی اور امید کے خیال پر بھی ہنسی آتی تھی۔

سرین بابو کلکتہ سے آئے تو پہچانے نہ جاتے تھے۔ ڈرتے ڈرتے ہریش نے سرلا کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔ ایک لمبی سانس لے کر

وہ بولے ـــ مجھے اب معلوم ہوتا ہے ۔ بیٹا ۔ کہ سرلا کی مرضی کے خلاف اس کی شادی کر کے میں نے اپنی زندگی میں سب سے بڑی غلطی کی ہے جس کا انجام . . . " کچھ رک کر وہ بولے " . . . ویسے اب وہ اچھی ہے ۔ لیکن اس کی زندگی کا لمحہ بھر کے لئے بھی اعتبار نہیں تم بھی جا کر اُسے دیکھ آؤ "۔

کچھ رُکتے ہوئے ہریش نے کہا ـــ " لیکن میرے جانے سے ہی اب . . . کیا ہو گا " ؟

" ہو گا کیا ۔" سریش بابو نے جواب دیا " ہونے کو اب باقی ہی کیا رہ گیا ہے ۔ مگر تب بھی سرلا تم سے ملنا چاہتی ہے اس لئے کہتا تھا کہ تم بھی ہو آؤ "۔

دوسرے روز ہی ہریش کلکتہ روانہ ہو گیا ۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کئی سال میں وہ کلکتہ پہنچا ہو ۔ اُس کا سفر ختم ہی نہ ہونے میں آتا تھا ۔ اپنا نام بتاتے ہی وہ بڑی خاطر کے ساتھ سرلا کے کمرے میں لے جایا گیا ۔ دروازے پر رُک کر ایک نظر اُس نے کمرے میں ڈالی ۔ ایک طرف پلنگ پر سرلا لیٹی تھی ۔ آنکھیں بند کئے ۔ سرہانے ایک کرسی پر ایک صاحب بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے اور وہاں کوئی نہ تھا ۔ کمرے میں بالکل خاموشی تھی ہریش کے پاؤں کی آہٹ پا کر اخبار سامنے سے ہٹا وہ صاحب اٹھ کر بولے " آئیے " کچھ جھجکتا ہوا ہریش پلنگ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا ۔ " میں کان پور سے آیا ہوں " اُس نے آہستہ سے کہا " اب ان کی طبیعت کیسی ہے " ؟

" آگے سے تو اچھی ہے " کہہ کر وہ صاحب سرلا کی طرف دیکھنے لگے بولنے کی آواز سے سرلا نے آنکھیں کھول دیں ۔ چند لمحوں تک وہ غور سے ہریش کی طرف دیکھتی رہی اور تب بولی " تم آ گئے ہریش بھائی ۔ اچھا ہی کیا ۔ تم سے ملنے کو میرا بڑا جی چاہتا تھا "۔

پلنگ کے پاس بیٹھتا ہوا ہریش بولا " تم اچھی ہو جاؤ گی ۔ سرلا ۔ گھبراؤ نہیں "۔

" لیکن گھبراتی تو میں نہیں ہوں . . . مگر تب بھی تم آ گئے اس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی ۔ میں سمجھتی تھی . . . تم مجھ سے . . . ناراض ہو گئے ہو . . . مگر تم ہو تو نہیں ؟ . . . ہیں ۔ ہریش بھائی ! "

" نہیں ۔ نہیں ۔ ناراض میں تم سے کیوں ہوں گا " ہریش نے بھرے گلے سے کہا " میں تم سے ناراض ہو سکتا ہوں ؟ " ہاں ۔ ہاں ۔ یہی تو میں بھی سوچتی تھی " . . . پھر اُن صاحب کی طرف دیکھ کر . . . سرلا بولی ۔ " یہی میرے ہریش بھائی ہیں . . . جن کا ذکر میں تم سے کرتی تھی " ۔ پھر ہریش کی طرف دیکھ کر وہ بولی " یہ میرے پتی ہیں ۔ ہریش بھائی "۔

پھر بہت دیر تک سرلا سب حال ہریش سے پوچھتی رہی ۔ دو تین روز خوب تسلّی دے کر آخر ہریش واپس آ گیا ۔ سرلا اب پہلے سے اچھی تھی ۔ دو تین روز وہ خوب خوش رہی ۔ چلتے ہوئے وہ بولی ـــ " اب جا رہے ہو ۔ ہریش بھائی ۔ اچھا جاؤ ۔ مگر دیکھو مجھے بھول نہ جانا ۔ خط ضرور لکھتے رہنا ۔ اچھا "؟

سرلا کے خاوند ۔ سری بابو ـــ اسٹیشن تک ہریش کو چھوڑنے آئے راستے بھر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے وہ ہریش کی افسردگی مٹانے کی کوشش کرتے رہے ۔ ریل جب چلنے لگی تو ہاتھ ملاتے ہوئے وہ بولے " اچھا ہریش بابو دیکھئے ہمیں بھول نہ جائیے گا "۔

جواب میں " نہیں ۔ نہیں ۔ آپ کو بھی کہیں میں بھول سکتا ہوں " کہہ کر ہریش نے کھڑکی سے سر اندر کر اپنے آنسو پونچھ ڈالے ۔ ریل تیزی سے سرلا سے دور ہی دور بھاگنے لگی۔

کان پور آئے ابھی پندرہ روز بھی نہیں ہوئے تھے کہ ہریش کا دل بالکل اُکتا گیا ۔ اُسے کانپور سے نفرت سی ہو گئی ۔ اس کے لئے اب وہاں کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ وہی کان پور ، وہی مکان تھا ۔ وہی گنگا تھی اور وہی چاندنی رات ۔ ویسے ہی ہوا کے سرد جھونکے جسم میں پھریری سی پیدا کرتے تھے ۔ ویسے ہی درختوں کی شاخیں بہتے ہوئے پانی کو چومتی تھیں ۔ مگر ہریش کو اب کسی سے دلچسپی نہ تھی ۔ چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے ہی وہ لکھنؤ چلا گیا۔

ایک روز چھٹی کے دن وہ بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا کہ نوکر نے ایک خط لا کر دیا ۔ ہریش نے کھول کر پڑھا ـــ " ہریش بھائی ! اب میں اچھی ہوں بالکل اچھی ۔ آج کل ہم دارجیلنگ میں ہیں ۔ کتنی اچھی جگہ ہے ۔ یہ دارجیلنگ کیا بتاؤں ۔ ہریش بھائی ۔ تم بہت یاد آتے ہو ۔ تم بھی ہوتے تو دیکھتے ۔ تمہارے بنا کچھ اچھا نہیں لگتا . . . " خط ہاتھوں میں دبائے آنکھیں بند کئے ہریش سب کچھ بھول گیا ۔ وہ شاید اس وقت دوسری ہی دنیا میں تھا جو اس دنیا سے کتنی مختلف تھی ۔ کتنی اچھی تھی !!!

ایم ۔ ایم لقبایا

روحی فداک

ہوں خواب میں یا بیدار ہوں میں — محوِ جمالِ دلدار ہوں میں
دونوں جہاں سے دل بے خبر ہے — وہ دلنشیں اب پیشِ نظر ہے
دلدار بھی ہے خونخوار بھی ہے — نازک کمر میں تلوار بھی ہے
صورت پہ رعب اور دل میں ترحم — چتون میں غصہ لب پر تبسم
ہر آن، ہر شان اس کی عجب ہے — باطن کرم ہے ظاہر غضب ہے
نامِ خدا ہے کیا حسن دلخواہ — اللہ، اللہ، سبحان اللہ

دیکھا جو جلوہ اس مہ لقا کا — دل نے صدا دی "روحی فداک"
ہر اک ادا پر قربان ہوں میں — ہر اک نظر میں حیران ہوں میں
سینے کو دیکھوں گردن کو دیکھوں — عارض کو دیکھوں چتون کو دیکھوں
ابرو کو دیکھوں، مژگاں کو دیکھوں — خمدار زلفِ پیچاں کو دیکھوں
چشمِ سیہ کو دل میں جگہ دوں — ترچھی نظر کو آنکھوں میں رکھ لوں
ہو جاؤں صدقے سیبِ ذقن پر — یا جان دے دوں شیریں دہن پر
رفتار محشر، قامت قیامت — سر سے قدم تک حسن و نزاکت
میں ایک سب سے کیونکر بنا ہوں — کس کس کو چاہوں، کس کو نہ چاہوں

اے توبہ توبہ میں اور تری چاہ! — استغفر اللہ، استغفر اللہ
تیری محبت اور میرے دل میں! — یہ پاک جوہر اور آب و گل میں
تو میرا دلدار! اللہ اکبر — میں اور ترا پیار! اللہ اکبر

میں صرف تجھ سے ڈرتا رہوں گا — میں صرف تیری عزت کروں گا
گر اک اشارہ ہو، جان دے دوں — ہے جان کیا شے ایمان دے دوں
ہے آس میری ترے کرم پر — گرتا ہوں ڈر کر تیرے قدم پر

تمثیل

عالم کا منظر پیشِ نظر ہے — ہر ایک ذرہ شمس و قمر ہے
اشجار دیکھوں، انہار دیکھوں! — کہسار دیکھوں، گلزار دیکھوں!
ارض و سما کو مسجود سمجھوں! — شمس و قمر کو معبود سمجھوں!
ہے ایک جلوہ سارے جہاں میں — اور اک مکیں ہے سارے مکاں میں
اک پردے میں ہیں مسجود و ساجد!
واحد میں کل ہے اور کل میں واحد!

امجد حیدرآبادی

مجاہد

وہ جا رہا ہے ایک تنومند نوجواں — سینے میں شیرِ نرگال کا طوفاں لئے ہوئے

ظاہر جبینِ شوق سے رعب و جلالِ مہر — آنکھوں میں برقِ طور کا ساماں لئے ہوئے

نبضِ حیات میں تپشِ خونِ حرّیت — بازو میں عزم و شانِ کہستاں لئے ہوئے

بکھرے ہوئے ہیں دوش پر اس کے سیاہ بال — صورت میں رنگِ ابرِ بہاراں لئے ہوئے

ہونٹوں پہ ہیں تھرک رہے نغماتِ آتشیں — ہر سانس ہے دمِ شرر افشاں لئے ہوئے

ساری ہے عضو عضو میں اس کے وطن کا درد — رگ رگ میں جذبہ ہائے فراواں لئے ہوئے

ہوتا نہیں ہے جس پہ خزاں کا کوئی اثر — سینے میں وہ بہارِ گلستاں لئے ہوئے

نے خوفِ برق و رعد نہ تشویشِ ابر و باد — دل میں ہے اپنے عزم کا طوفاں لئے ہوئے

کس شوق سے رواں ہے وہ جادہ نوردِ شوق

دل میں شہید ہونے کا ارماں لئے ہوئے

ساغر جلیلی

انجام

گریمالڈی گینوآ کی سرحد کو پار کرکے پیسا میں جا آباد ہوا۔ اس وقت اس کی عمر کوئی بائیس سال تھی۔ غریب آدمی تھا اس لئے کرائے کے ایک معمولی مکان میں رہنے لگا۔ بڑا کفایت شعار تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اپنی قابلیت سے اس نے اپنی زبوں حالی دور کر لی اور چھوٹی چھوٹی رقمیں لوگوں کو سود پر قرض دینے لگا۔ اپنی ذات پر وہ بہت کم روپیہ خرچ کرتا تھا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند ہی سال میں وہ امیر کبیر بن گیا۔ جوں جوں اس کی دولت بڑھتی گئی اس کی ہوس زرگری میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ دنیا میں تن تنہا تھا۔ اسے تنہائی کی زندگی ہی مرغوب تھی اور یہ بھی وہ انتہائی رازداری میں بسر کرتا۔ اس کے سیم وزر کے پوشیدہ خزانوں میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی یہاں تک کہ اس کے خزانوں کے منہ بند ہو گئے۔ روپیہ اسے اس قدر عزیز تھا کہ وہ کسی دوست کی جان بچانے کے لئے بھی اس میں سے ایک پائی تک خرچ کرنے کو تیار نہ تھا۔ اگر تمام دنیا ابدی مصیبت میں مبتلا ہو جاتی اور اس سے کہا جاتا کہ تم چند روپوں کی قربانی کرو تو دنیا تباہی سے بچ سکتی ہے تو یقیناً وہ صاف انکار کر دیتا۔ اس کی زر پرستی کا شہرہ دور دور جا پہنچا تھا۔ لوگ اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا کرتے۔ بے چارے کو اسی کنجوسی کا خمیازہ بھی بہت بری طرح سے اٹھانا پڑا۔

ایک دن وہ اپنے ایک کنجوس دوست کے ہاں سے کھانا کھا کر واپس آ رہا تھا کہ شب کی تاریکی میں کسی نامعلوم آدمی نے اس پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ اس کے سینے میں چاقو کے گہرے زخم آ گئے اور وہ مدد کے لئے چلانے لگا۔ نامعلوم حملہ آور اپنا کام کر کے چلتا بنا۔

عین اسی وقت طوفان باد و باراں اور ژالہ باری نے قیامت برپا کر دی اور بادلوں سے مہیب گرج کی آواز سنائی دینے لگی۔ اب بے چارے گریمالڈی کو ایک نئی مصیبت سے دوچار ہونا پڑا اور وہ کسی اچھی جگہ پناہ لینے کے لئے بھاگنے لگا۔ زیادہ خون بہنے سے اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں اور طاقت جواب دے رہی تھی۔ اسے ایک مکان میں کچھ روشنی سی نظر آئی دوڑ کر اسی میں گھس گیا۔ یہ فیفیو نام ایک سنار کا مکان تھا۔ وہ اس وقت آگ روشن کر کے کیمیائی تجربات میں مصروف تھا۔ عرصے سے وہ ٹین اور سیسے کو پگھلا کر انہیں سونے یا چاندی میں تبدیل کرنے کا عمل سیکھ رہا تھا لیکن تاہنوز اسے اس میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا تمام سرمایہ انہیں تجربات پر صرف ہو چکا تھا۔ آج اس نے بھٹی میں اس قدر آگ جلائی تھی کہ اس کے لئے مکان کا دروازہ بند رکھنا دشوار ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گریمالڈی کو اس کے مکان میں اس آسانی سے پناہ مل گئی۔

سنار نے نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے کنجوس گریمالڈی کھڑا تھا۔ وہ اس سے کہنے لگا "کہو دوست اسی تیرہ و تار شب میں تم یہاں کیسے آئے ہو! رات تو بہت زیادہ گذر چکی ہے"۔

کنجوس گریمالڈی نے جواب دیا "آہ میرے بھائی میں بیمار ہوں مجھ پر کسی نے قاتلانہ حملہ کر کے مجھے بری طرح سے زخمی کر دیا ہے۔ میں نہیں جانتا مجھ پر کیوں حملہ کیا گیا ہے اور کس نے کیا ہے"! ابھی کنجوس گریمالڈی نے اپنا فقرہ پورا کیا ہی تھا کہ طاقت اسے جواب دے گئی وہ دھم سے زمین پر گرا اور اس کی روح پرواز کر گئی۔

فیفیو نے جب دیکھا کہ اس کے قدموں میں ایک لاش پڑی ہے تو فرط دہشت سے اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ ضرورت سے کم کھانا کھانے کی وجہ سے کنجوس کی طاقت زائل ہو چکی ہوگی اس پر کوئی قاتلانہ حملہ نہیں ہوا۔ لیکن جب اس کے قریب آ کر اُسنے غور سے دیکھا تو واقعی گریمالڈی کا سینہ چھلنی ہو چکا تھا۔ نبض دیکھی تو وہ بھی غائب تھی۔ فیفیو دوڑ کر دروازے سے باہر نکل آیا تاکہ شور مچا کر

ہمسایوں وغیرہ کو بیدار کرے لیکن باہر طوفان نے ایک خوفناک تباہ کاری مچا رکھی تھی۔ بے چارہ جلدی سے اپنے گھر میں واپس آگیا۔ اس کی بیوی پیپا اپنے ننھے لڑکوں کو ساتھ لے کر میکے چلی گئی تھی کیونکہ اطلاع آئی تھی کہ اس کا باپ بستر مرگ پر پڑا آخری ہچکیاں لے رہا ہے۔ پہلے اس نے سوچا کہ طوفان ذرا خاموش ہوتا ہے تو کسی ڈاکٹر کو بلاتا ہوں لیکن جلد ہی اس کا ارادہ بدل گیا۔ اس نے مرنے والے کی واسکٹ کی جیبیں ٹٹولیں۔ ان میں صرف چار آنے تھے ایک دوسری جیب اسے ذرا پھولی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس میں سے چیتھڑوں کی ایک ننھی سی گٹھری برآمد ہوئی۔ گٹھری کے اندر چابیوں کا ایک بڑا سا گچھا موجود تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ سونے چاندی کے خزانوں، بڑے بڑے آہنی صندوقوں اور تجوریوں کی چابیاں ہیں۔

فیضیو دل میں سوچنے لگا کہ "میں کیوں نہ یہ چابیاں لے کر جلدی سے اس کے گھر پہنچوں اور جو کچھ وہاں ہے اپنے گھر اٹھا لاؤں۔ ایک بھی متنفس میرے رستے میں حائل نہیں ہوگا۔ اس تیرہ و تار رات میں جبکہ بادل جنگل کے شیروں کی طرح گرج رہے ہیں کس کی جرأت ہے کہ باہر آئے۔ نصف سے زیادہ رات گذر چکی ہے تمام لوگ یا تو سو چکے ہیں یا مکانوں میں اس طوفان سے چھپے بیٹھے ہیں۔ میں بھی اپنے مکان میں تنہا ہوں۔ بے چارے گریمالڈی کا قاتل بھی سر پر پاؤں رکھ کر کہیں بھاگ گیا ہوگا سو اگر میں تھوڑی سی ہوشیاری کا ثبوت دوں تو کون جان سکتا ہے کہ گریمالڈی پر کسی نے قاتلانہ حملہ کیا اور وہ دوڑ کر فیضیو کے گھر جا داخل ہوا اور وہیں مرگیا اور جو کچھ میں کرنے والا ہوں وہ خلاف اخلاق بھی تو نہیں۔ اگر میں لوگوں کو اصل بات بتاتا پھروں تو بہت ممکن ہے وہ مجھ پر اعتبار نہ کریں اور میں ہی گریمالڈی کا قاتل تصور کیا جاؤں۔ میرے پاس ثبوت ہی کیا ہے کہ وہ خود زخم کھا کر میرے گھر آیا۔ اگر میں "قانون کے اجارہ داروں" کے چنگل میں پھنس گیا تو یقیناً وہ میری جان لئے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ ان تمام خطرات سے بچنے کی بہترین ترکیب کیا ہے۔ مثل مشہور ہے قسمت بہادر آدمی کا ساتھ دیتی ہے سو میں بھی بہادر بنوں گا اور اپنے آپ کو تباہی کے اس غار میں گرنے سے بچا لوں گا۔"

یہ کہہ کر فیضیو نے چابیاں اپنی جیب میں ڈال لیں سمور کا کوٹ پہنا سر پر کچھ اس انداز سے ٹوپی رکھی کہ وہ پہچانا نہ جائے ایک لالٹین ہاتھ میں لی اور جی کڑا کر کے کنجوس گریمالڈی کے گھر کی طرف چل دیا۔ برف سے لپٹی ہوئی سرد ہوا اس کے منہ پر طمانچے مار رہی تھی اور بادل کی مہیب گرج اس کے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتی تھی۔ کنجوس کے گھر کے سامنے پہنچ کر اس نے دو بڑی چابیوں سے اس کا دروازہ کھولا اور اندر جا داخل ہوا۔ سب سے پہلے وہ اس کمرے میں گیا جو مکان کے عقبی حصے میں تھا اور جسے دو بہت بڑے قفل لگے تھے۔ جلد ہی اس نے دونوں قفل کھول لئے اور اندر جا داخل ہوا۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ لوہے کا ایک بہت بڑا صندوق پڑا تھا۔ یہ کئی چابیوں کی مدد سے بمشکل کھل سکا۔ فیضیو نے اس کا ڈھکنا اٹھایا۔ سونے کی بیش بہا انگوٹھیوں زنجیروں موتیوں اور ہیرے جواہرات کے انباروں نے اس کی آنکھیں خیرہ کر دیں اس کے بعد اس نے ایک دوسرا صندوق کھولا۔ یہ ایسی تھیلیوں سے معمور تھا جن میں سونے اور چاندی کی ڈلیاں اٹا اٹ بھری تھیں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ ابھی پھٹ جائیں گی۔ فیضیو کا دل خوشی سے بلّیوں اچھلنے لگا۔ اس نے دل میں سوچا کہ انگوٹھیاں اور جواہرات کے ہار شاید پہچانے جائیں خالص سونے کی ڈلیاں بہتر رہیں گی۔ چنانچہ اس نے کنجوس کے بستر سے چادر اٹھائی اور اس میں سونے کی دس بارہ تھیلیاں باندھ کر گھر کی طرف چل دیا۔ گھر اس نے اسی طرح مقفل کر دیا اور چابیاں جیب میں رکھ لیں۔ راستے میں اسے ایک بھی آدمی سے دو چار نہ ہونا پڑا۔ بجلی کی ہیبت ناک روشنی بار بار فضائے تیرہ کی نقاب الٹ دیتی تھی اور رعد کڑک کڑک کر اس کے وحشت زدہ دل کو زیادہ مضطرب کر رہی تھی پھر بھی وہ ہمت نہ ہارا اور سر پر بے پناہ بوجھ اٹھا کر آخر گھر آہی پہنچا۔

فیضیو نے سب سے پہلے اپنا لباس تبدیل کیا پھر اپنے طاقتور آہنی بازوؤں میں کنجوس کی لاش اٹھا کر مکان کے سب سے پچھلے کمرے میں لے گیا۔ وہاں اس نے اپنی تمام تر قوت خرچ کر کے کوئی چھ فٹ گہرا گڑھا کھودا کنجوس کی واسکٹ کی جیب میں چابیوں کا گچھا رکھ دیا اور گڑھے میں لاش دفن کر دی۔ پھر کھدی ہوئی جگہ کی مٹی ہموار کر کے اس پر اینٹیں اور چونے کی بوریاں اس طریقے سے رکھ دیں کہ خود اس کی بیوی کو بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ اس جگہ کوئی گڑھا کھودا گیا ہے۔ جب وہ اس کام سے فراغت پا چکا تو اس نے اطمینان سے ایک جگہ بیٹھ کر سونے کی ڈلیاں گننی شروع کیں۔ سونے کی چمکتی ہوئی ڈلیوں کا نظارہ بہت صبر آزما تھا وہ انہیں گنتے گنتے خوشی سے اچھل پڑا۔ ہر تھیلی میں تقریباً

بیس بیس ہزار روپے کا سونا تھا اور کل بارہ تھیلیاں تھیں۔ اب تمام تھیلیاں وہ ایک تاریک کمرے میں لے گیا اور انہیں ایک صندوق میں رکھ کر کمرے کو باہر سے مقفل کر دیا۔ سب سے آخر میں اس نے وہ چادر جلا ڈالی جس میں وہ سونے کی تھیلیاں باندھ کر لایا تھا۔ یہ تمام کام ختم کر کے وہ اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

اب طوفان خاموش ہو چکا تھا۔ صبح ہونے والی تھی۔ فیفنیو کا بند بند شب بیداری اور تکان کی وجہ سے دکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسے نیند آنے لگی اور وہ غافل ہو کر سو گیا۔

جب وہ بیدار ہوا تو سورج نکل آیا تھا۔ اٹھتے ہی اس نے شہر میں گھومنا شروع کیا تاکہ معلوم ہو کہ گریمالڈی کے یکایک غائب ہو جانے کے متعلق شہر میں کوئی خبر مشہور ہوئی ہے یا نہیں لیکن نہ تو اس دن نہ دوسرے دن شہر میں گریمالڈی کے غائب ہونے کا کوئی چرچا ہوا جب متواتر تین دن تک لوگوں کو گریمالڈی اپنے کام پر جاتا ہوا دکھائی نہ دیا تو وہ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ وہ حیران تھے کہ تین دن سے اس کے مکان کا قفل کیوں نہیں کھلا اور وہ یکایک اس پراسرار طریقے سے کیوں غائب ہو گیا ہے۔ چند دن بعد اس کے دوستوں کی تشویش بڑھنے لگی اور ہوتے ہوتے یہ خبر حکام تک جا پہنچی۔ مختلف لوگوں کی شہادتیں لی گئیں لیکن گریمالڈی کی پراسرار گمشدگی کے مسئلے پر کوئی روشنی نہ پڑ سکی آخر عدالت نے فیصلہ کیا کہ کنجوس کے مکان کا قفل توڑ کر اس کا تمام خزانہ بحق سرکار محفوظ کر لیا جائے۔ جب سرکاری آدمیوں نے اس کے مکان کی تلاشی لی تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ ہر شے اپنی اپنی اصل جگہ موجود ہے چوری یا ڈاکے کی کوئی واردات رونما نہیں ہوئی تاہم حکومت کی طرف سے دور و نزدیک کے شہروں میں اشتہارات تقسیم کر دیئے گئے کہ جو شخص گریمالڈی کو زندہ یا مردہ پیش کرے گا اسے انعام دیا جائے گا۔ لیکن تمام تحقیق و تفتیش بے کار ثابت ہوئی۔ تین ماہ بعد حکومت کو جینوآ کے خلاف جنگ لڑنی پڑی چنانچہ اس مقصد کے لئے گریمالڈی کی تمام جائیداد بحق سرکار ضبط کر لی گئی۔

ان دنوں فیفنیو نہایت اطمینان و سکون کی زندگی بسر کرتا رہا وہ بہت خوش تھا کہ معاملہ بہ آسانی رفع دفع ہو گیا اور اس پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ اب اس کی بیوی بھی گھر واپس آ گئی تھی۔ اس نے بیوی کو اس کے متعلق ایک لفظ تک نہ کہا اور نہ کہنے کی ضرورت ہی سمجھی۔ اگر وہ اپنے اس ارادے پر قایم رہتا تو شاید اس کی اور اس کے کنبے کی زندگی اس بری طرح سے تباہ و برباد نہ ہوتی۔ کنجوس کی گمشدگی کا قصہ لوگ تقریباً بھلا چکے تھے ادھر فیفنیو نے مشہور کر دیا تھا کہ میں ایک کیمیائی عمل سے ٹین کی چاندی بنانے میں کامیاب ہو گیا ہوں اور چاندی کی ایک کثیر مقدار فروخت کرنے فرانس جانے والا ہوں۔ اور وہاں جا کر اپنے تجربات سے مزید فایدہ اٹھاؤں گا۔ فیفنیو کے دوست اس تجویز کے مخالف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ تم یہیں رہ کر اپنا کاروبار شروع کرو۔ لیکن اپنی برائی بھلائی کو فیفنیو خوب سمجھتا تھا اگرچہ اس کے گھر میں دولت کے انبار لگے تھے تاہم محض دکھاوے کے لئے اس نے اپنی کچھ زمین فروخت کر دی اور لوگوں سے کہا کہ میرے پاس کرایہ بھی نہیں تھا اس لئے زمین فروخت کر دی ہے چنانچہ نصف روپیہ اس نے بیوی کو گھر کے خرچ کے لئے دے دیا اور نصف خود کرائے کے لئے رکھ لیا۔ اس کی بیوی اسے اس نئے عزم سے بہتیرا روکتی رہی لیکن فیفنیو نے سنی ان سنی ایک کر دی۔

جب وہ فرانس جانے کے بالکل تیار بیٹھا تھا اس کی بیوی اس کے پاس آئی اور اس کے گلے میں باہیں ڈال کر اور اپنا خوبصورت سر اس کے سینے سے لگا کر زار و قطار رونے لگی۔ "دیکھو ہمیں یوں تنہا چھوڑ کر نہ جاؤ مجھے اس امیری سے غربت اچھی۔ کیا ہماری روزانہ ضروریات پوری نہیں ہو جاتیں۔ نہیں میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ جا کر تو دکھاؤ!"

فیفنیو نے بڑی محبت سے اسے تسلی دی اور کہا "کہ میں آتے ہی تمہارے گھر کو سونے سے بھر دوں گا اور تمہاری پچھلی تمام تکلیفات کا ازالہ ہو جائے گا" لیکن بیوی ایک نہ مانی اور کہنے لگی "اگر تمہارے پاس چاندی ہے تو وہ فرانس میں زیادہ مہنگے داموں تو نہیں بکے گی۔ اسے یہیں بیچ دو اور اتنی دور نہ جاؤ۔ تم شاید ہمیں ہمیشہ کے لئے تباہ کرنا چاہتے ہو جو روپیہ تم نے مجھے دیا ہے خرچ ہو جائے گا تو میں کیا کروں گی۔ میں کتنی بدقسمت ہوں۔ کیا میں ان چھوٹے چھوٹے بیکس بچوں کو ساتھ لے کر بھیک مانگتی پھروں گی؟ آہ کیا تم مجھے چھوڑے جا رہے ہو غم تنہائی اور آنسوؤں کا تحفہ دے کر!"

فیفنیو کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔ وہ اسے اس قدر مضطرب ہوتے نہ دیکھ سکا۔ اس نے اس کے خوبصورت ہونٹوں کو چوم لیا اور

اُسے اس کے نازک بازو سے پکڑ کر ایک بند کمرے میں لے گیا جہاں اس نے اپنی دولت کے انبار چھپا رکھے تھے۔ اس کے بعد اس نے اسے تمام واقعہ من و عن سنا دیا۔ سونے کی چمکتی ہوئی ڈلیوں کو دیکھ کر اس کی بیوی دیوانی سی ہوگئی اور شوہر سے لپٹ کر کہنے لگی "دیکھو مجھے معاف کر دو۔ میں تمہیں اتنا دق کرتی رہی۔ مجھے کیا معلوم تھا تم کوئی اتنا اچھا کام کرنے والے ہو۔"

فیضیو نے اپنی بیوی سے یہ قول لینے کے بعد کہ وہ اس کا کوئی راز افشا نہ کرے گی اسے اپنے مستقبل کے ارادوں سے آگاہ کیا اور بتایا کہ میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا اور جلد ہی دولت کے انبار ہماری زندگی کو رشک جنت بنانے والے ہیں۔ اب اس کی بیوی نے بخوشی اسے جانے کی اجازت دے دی۔ فیضیو نے بھی جاتی دفعہ اس کا منہ چومتے ہوئے کہا "دیکھو مجھے بھول نہ جانا میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔"

دوسرے دن خزانے کا بہت سا حصہ گھر چھوڑ کر سونے کی کچھ تھیلیاں لے کر وہ جہاز میں سوار ہوگیا۔ بندرگاہ پر اس کے تمام دوست اسے الوداع کہنے آئے تھے اور اس کے جانے پر افسوس کر رہے تھے۔ بیوی بھی جھوٹ موٹ اُن کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی اور بظاہر شوہر کو خوب کوس رہی تھی کہ وہ کیوں ایسی بوالعجبی کر رہا ہے۔ تمام شہر فیضیو کی تجویز کا مضحکہ اڑا رہا تھا اور بعض تو یہ کہتے تھے کہ فیضیو زیادہ محنت کی وجہ سے پاگل ہوگیا ہے۔ بعض کہتے تھے کہ بے چارے کے باپ دادا بھی نسخہ اکسیر بناتے بناتے تباہ حال اور دیوانے ہو گئے تھے۔ اب اس بے چارے کا بھی انجام آ پہنچا ہے۔ فیضیو نے ان نکتہ چینیوں کی کوئی پروا نہ کی اور اپنے سمندری سفر پر روانہ ہوگیا۔ جب جہاز مارسیلز پہنچا تو فیضیو نے علم کیمیا سے متعلق اپنا وہ تمام سامان جن کی مدد سے وہ نت نئے تجربات کیا کرتا تھا سمندر میں پھینک دیا۔

بندرگاہ پر اترتے ہی اس نے چند مزدوروں سے اپنا سامان اٹھوایا اور شہر لیوا دنز میں جا پہنچا۔ وہاں اس نے سونا فروخت کر کے اس سے حاصل شدہ تمام رقم ایک بنک میں جمع کرا دی اور یہاں کے بنک والوں نے اس کا حساب پیپلکے بنک کے نام منتقل کر دیا۔ یہ تمام کام ختم کر کے اس نے بیوی کو خط لکھ دیا کہ میں نے اپنی تمام چاندی فروخت کر لی ہے اور عنقریب پیسا واپس آنے والا ہوں۔

یہ خط فیضیو کی بیوی نے اپنے باپ اور فیضیو کے دوستوں اور رشتہ داروں کو دکھایا۔ بعض تو یہ خط پڑھ کر بہت ہی حیرت زدہ ہوئے اور بعضوں نے کہا کہ فیضیو تباہ ہو چکا ہے اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے اور وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے عنقریب سب لوگوں کو اس کا علم ہو جائے گا۔

چند دن بعد فیضیو واپس آگیا اور ایک دفعہ پھر اسے اپنے بچوں کا خوشی سے تمتمایا ہوا چہرہ دیکھنے کی مسرت حاصل ہوئی۔ اس کے دوست بھی اس کے خیر مقدم کے لئے آئے ہوئے تھے وہ ان میں سے ہر ایک کے گلے ملا اور انہیں بتایا کہ مجھے توقع سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

جلد ہی فیضیو نے بنک سے بہت سا روپیہ نکلوا لیا اور شہر کا امیر ترین آدمی بن گیا۔ اس نے نہایت شان و شوکت کی زندگی بسر کرنی شروع کی اور اپنی مسرت اور اپنے عیش میں دوستوں کو بھی شریک کرتا رہا۔ اس نے ایک شاندار مکان بھی بنایا اور اُسے سجانے کے لئے اچھی اچھی خوب صورت اور قیمتی چیزیں خریدیں اس کی شان و شوکت یہاں تک بڑھی کہ وہ اپنے شہر میں ایک شہزادے کی سی زندگی بسر کرنے لگا۔ اس نے کئی گھوڑے اور دوسرے پالتو جانور خریدے۔ اس کے بیٹے بیش قیمت لباس پہننے لگے غرضکہ دونوں میاں بیوی نے نہایت ہی مسرت کی زندگی بسر کرنی شروع کر دی۔ پیپا جس کے لئے یہ زندگی بالکل نئی اور اجنبی تھی کسی قدر مغرور ہوگئی۔ اپنا ساز و سامان اور پرشوکت مکان دکھانے کے لئے وہ اکثر اپنی سہیلیوں کو بلا لیا کرتی۔ ان میں ادھیڑ عمر کی ایک عورت اور اس کی خوبصورت لڑکی بھی شامل تھی پیپا نے دونوں کو کچھ دن اپنے ہاں ٹھیرنے کی دعوت دی۔ فیضیو کو بھی اس نے زبردستی رضامند کر لیا اور کہا کہ ہمیں یہ کئی طرح کی مدد دیا کریں گی۔ مجھے ان کی موجودگی کی سخت ضرورت ہے۔" غرضکہ یہ سب لوگ نہایت مسرت کی زندگی بسر کرنے لگے۔

لیکن قسمت جو ہمیشہ عیش و مسرت میں خلل ڈالنے کے لئے تاک لگائے بیٹھی رہتی ہے ان پر نامہربان ہوگئی اور مسرت افزا بہار کا زمانہ غم افزا خزاں کا دور بن گیا۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ حسین میڈ لینا (مہمان عورت کی بیٹی) کی شوخ اور دل نشین اداؤں نے فیضیو کا دل چھین لیا۔ اس ساحرہ نے فیضیو کو اس قدر مسحور کیا کہ وہ دن رات اس کے لئے بیتاب

رہنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ اسے معصومیت کی راہ سے پرے لے جانے میں کامیاب ہوگیا اور آخرکار دونوں میں میاں بیوی کے تعلقات قائم ہوگئے بےچاری فیفنیو کی بیوی کو ان واقعات کا کچھ علم نہ تھا لیکن جب عاشق اور محبوبہ نے پہلے سے کہیں زیادہ بےتکلفی کے ساتھ اور کسی قدر بےاحتیاطی سے محبت کرنی شروع کی تو پیا تمام معاملے سے باخبر ہوگئی۔ وہ ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح غصے میں آگئی اور اس نے انتہائی غیظ و غضب کے ساتھ اپنے خاوند اور میڈلینا کے آیندہ تعلقات کے متعلق ایسی شرائط پیش کیں جو کچھ ایسی معمولی نہیں تھیں۔ وہ اپنی حسین مہمان سے بھی نہایت درشتی سے پیش آئی اور ایک دن جب فیفنیو کہیں باہر گیا ہوا تھا اس نے نہایت بےعزتی سے اس حسینہ کو اس کی والدہ کے ہمراہ اپنے مکان سے باہر نکال دیا۔ فیفنیو واپس آیا تو گھر کی بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر آتش زیر پا ہوگیا۔ اس نے اپنی حسینہ کو گھر میں بلا لیا اور پہلے کی طرح اس کی پرستش کرنے لگا اسے گوارا نہیں تھا کہ ایک لمحے کے لئے بھی وہ اپنی محبوبہ کے چہرے سے نگاہ محبت ہٹائے اور دوسری طرف روز بروز میاں بیوی کے تعلقات بھی سخت کشیدہ ہوتے گئے۔ بیوی کے سر پہ رشک کا بھوت سوار ہوگیا تھا وہ بےچاری جل بھن کر کباب ہو رہی تھی۔ وہ گھر جو کبھی امن و مسرت کا گہوارہ تھا آج میدان جنگ و جدال بنا تھا۔ فیفنیو نے بہتیری کوشش کی کہ کسی طرح اس کی بیوی کا مزاج درست ہو جائے اس کی منت خوشامد بھی کی لیکن وہ تو شاید دیوانی ہوگئی تھی۔ کسی طرح اس کا بگڑا ہوا مزاج درست نہ ہوتا تھا۔ اس نے گھر میں ایک کہرام مچا رکھا تھا اسے ایک پل کے لئے بھی گوارا نہ تھا کہ فیفنیو اس سے بھی محبت کرے اور اس کی رقیب سے بھی۔

آئے دن کی خانہ جنگیوں سے تنگ آکر فیفنیو نے اپنی محبوبہ کے لئے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا خوبصورت مکان لے لیا اُسے وہیں لے گیا اور دونوں نے پھر سے اس چھوٹے سے مکان کو اپنی امنگوں اور آرزوؤں سے آباد کر لیا۔ فیفنیو نے اپنی بیوی کے گھر آنا بھی تقریباً ترک کر دیا وہ بےچاری وہیں تنہائی میں اپنی قسمت پر آنسو بہایا کرتی۔ یکایک اس کے احساسات جو شوہر کی مسلسل بےاعتنائی سے کچھ مردہ سے ہو گئے تھے، پھر سے زندہ ہوگئے۔ اب اس کے دل میں یاس کی جگہ غیظ و غضب اور حسد نے لے لی اور اس نے اپنے شوہر سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ جب پیا نے دیکھا کہ فیفنیو کو مجھ سے ملے تین ماہ ہو چکے ہیں اور وہ میڈلینا کی ہستی میں اپنے آپ کو اس قدر مستغرق کر چکا ہے کہ اسے خبر ہی نہیں کہ دنیا کدھر جا رہی ہے تو اس نے اس خوفناک صورت حالات کا تدارک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی زندگی ایک مسلسل دکھ کی زندگی بن گئی تھی۔ فرط غم سے وہ دیوانی ہوگئی۔ اس ناقابل برداشت صورت حالات کے سدباب کے لئے اس نے ایک خوفناک عزم کیا یعنی یہ کہ حکومت پر فیفنیو کے تمام راز افشا کر دیئے جائیں اور لوگوں کو بتا دیا جائے کہ اس نے یہ دولت کس طرح حاصل کی ہے: تاکہ حکومت اسے مناسب سزا دے۔ فیفنیو اور اس کی محبوبہ نے اسے جو ایذائیں پہنچائی تھیں ان کا انتقام لینے کی واحد صورت اسے یہی نظر آئی۔ اس نے انہیں کسی قسم کی تنبیہ کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور کسی سے مشورہ کئے بغیر کسی مجسٹریٹ سے مشورہ کرنے کے لئے چل دی۔ مجسٹریٹ اس کے بیانات سن کر چونک اٹھا اور اس نے یہ تمام باتیں سرکاری طور پر قلمبند کر لیں۔ اس کے بعد پیا اپنے بیانات کو سچا ثابت کرنے کے لئے حکام کو اپنے پہلے مکان کے اس کمرے میں لے آئی۔ جہاں گریالڈی کی نعش دفن تھی جب قانون کے ارباب بست و کشاد نے وہ جگہ کھدوائی تو وہاں سے سچ مچ گریالڈی کی نعش برآمد ہوگئی۔ مجسٹریٹ نے فیفنیو کی بیوی کو زیر حراست رکھا اور ایک افسر کو سپاہیوں کی ایک جماعت کے ہمراہ فیفنیو کے گھر بھیجا کہ اسے گرفتار کر لائیں۔ جب سپاہی فیفنیو کے مکان میں پہنچے وہ اپنی محبوبہ سے ہم آغوش ہو رہا تھا۔ افسر اعلیٰ نے اسے فوراً گرفتار کر لیا۔ جب اسے عدالت میں پیش کیا گیا تو اس نے کسی قسم کا کوئی بیان دینے سے صاف انکار کر دیا۔ لیکن اس کی بیوی جسے شوہر کے خلاف آکر بیان دینے کا حکم دیا گیا تھا۔ چلا کر کہنے لگی "اب اصلی انصاف ہوگا۔"

فیفنیو اُس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "میں نے تم سے حد سے زیادہ مہربانی کا سلوک کیا جس کا خمیازہ آج مجھے بھگتنا پڑا۔" اس کے بعد فیفنیو نے ایک مجسٹریٹ کو ایک طرف لے جاتے ہوئے ساری بات اس کے گوش گزار کر دی اور اصل واقعات سے من و عن آگاہ کر دیا۔ قانونی کونسل کے تمام ارکان نے اس کی بیان کردہ کہانی پر یقین کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ پورا پورا ثبوت موجود ہے کہ اس نے بےچارے گریالڈی کو لوٹ کر اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے فیفنیو کو دھمکی دی کہ اگر تم اقرار جرم نہ کرو گے تو تمہیں فوراً قتل کر دیا جائے گا

بیٹیوں کے بعد انہوں نے اس سے حسب دلخواہ بیانات لے لئے اور بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ اسے کوئی سخت عبرت ناک سزا دے کر ہلاک کر ڈالا جائے اور اس کی جائداد بحق سرکار ضبط کر لی جائے۔

کنجوس گریالڈی کی لاش زمین سے برآمد کر لی گئی اور اسے کسی مقدس زمین میں دفن کرا دیا گیا۔ خوبصورت میڈلینا اور اس کی ماں کو ان کے پہلے گھر میں واپس بھیج دیا گیا اور فیضیو کا شاندار مکان جس میں نہ اور اس کی محبوبہ رہتے تھے مسمار کر دیا گیا۔ اس کے بچوں کو اس مکان سے باہر نکال دیا گیا اور کہہ دیا گیا کہ تم جہاں چاہتے ہو رہو حکومت کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ پیتیا جو عدالت میں اپنے شوہر کے خلاف بیان دیتی رہی تھی ابھی تک حکام کی حراست میں تھی۔ اب چونکہ مقدمے کا فیصلہ ہو چکا تھا اس لئے اسے رہا کر دیا گیا۔

پیتیا جب واپس آئی تو صرف اس کے بچے پہلے مکان میں موجود تھے ہر سمت ایک بھیانک نقشہ نظر آتا تھا۔ نوکر غائب ہو چکے تھے مکان سونا پڑا اور اس کی شہیریں پہل پہل افسانہ بن کر رہ گئی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کا دل ٹوٹ گیا انسدت غم سے وہ زار زار رونے لگی وہ دیوانوں کی طرح بہکی بہکی باتیں کرنے لگی اور اس نے اپنے چمکتے ہوئے بال نوچ لئے۔ بہت دیر میں اسے احساس ہوا کہ وہ کس قدر خوفناک اور بھیانک غلطی کی مرتکب ہوئی ہے۔

شہر بھر میں میاں اور بیوی کی اس خوفناک جنگ کے چرچے ہو رہے تھے جس میں بیوی کا میاب ہو گئی تھی۔ فیضیو کی غلطیوں کا ذکر کسی کی زبان پر نہ تھا۔ ہر کوئی اس کی بیوی ہی کو غدار اور بے مہر کہتا تھا۔ ہر کسی کو حیرت تھی کہ کیا دنیا میں کوئی ایسی سنگ دل بیوی بھی ہو سکتی ہے جو شوہر کو قتل ہونے کے لئے نہایت سرد مہری سے حکومت کے حوالے کر دے۔ خود پیتیا کے رشتہ داروں اور واقفوں نے اس کے گھر آ کر اسے سو سو طرح سے کوسا اور برا بھلا کہا۔ اس کی سنگدلی کا ماتم کیا اور بدقسمت فیضیو کے افسوسناک حشر پر آٹھ آٹھ آنسو روتے ہوئے واپس چلے گئے۔ پیتیا شدت غم سے زار زار روتی رہی۔ اس کے لئے یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا۔

دوسرے دن بدقسمت فیضیو کو ایک گاڑی پر سوار کر کے شہر بھر میں پھرایا گیا تاکہ لوگ اسے اس حالت میں دیکھ کر اچھی طرح سے نصیحت پکڑ سکیں۔ اس ذلت و رسوائی کے بعد وہ لوگ اسے مقتل کی طرف لے گئے۔ پہلے اسے ایک تیز رفتار بھاری بھرکم گاڑی کے نیچے روندوایا گیا پھر مقتل میں اسے تمام لوگوں کے سامنے قتل کر دیا گیا۔ مجسٹریٹوں نے حکم دیا کہ اس کی لاش دن بھر وہیں پڑی رہے لوگ جوق در جوق آئیں اور اس کا عبرتناک انجام دیکھ کر نصیحت پکڑیں۔

جب ان لرزہ خیز مناظر کی تفصیل پیتیا نے سنی جسے اس کا شوہر قتل گاہ میں آخری دم تک گالیاں دیتا رہا تھا تو وہ فرط دہشت وغم سے جھلا گئی اور اس نے اپنی غلطی پر اپنے ہی سے انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا کھانا کھانے کے وقت جب اس کے گھر میں بہت کم لوگ رہ گئے اس نے اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لیا اور روتی ہوئی قتل گاہ کی طرف چل دی جو لوگ اسے راستے میں ملے انہوں نے اس پر طرح طرح کی پھبتیاں کسیں تاہم آگے نکلنے کا راستہ دے دیا۔ جب وہ اس چبوترے کے قریب پہنچی جہاں اس کے شوہر کی لاش نہایت ہی بری حالت میں پڑی تھی۔ وہاں بہت کم لوگ موجود تھے اکثر کھانا کھانے کے لئے وہاں سے چلے گئے تھے۔

وہ زار و قطار روتی ہوئی بین کرتی اپنے بچوں کو ساتھ لے کر چبوترے کی سیڑھیوں پر چڑھ گئی اردگرد کے ہجوم میں سے کسی نے مزاحمت نہ کی البتہ نہایت جوش و خروش اور درشتی سے اس کی سنگ دلی پر ماتم کیا اور طرح طرح کے آوازے کسے اور پکار پکار کر کہنے لگے "شوہر قتل ہو گیا ہے تو اب کس زور شور سے رو رہی ہے۔ اب اپنے کئے کی سزا بھگتے پہلے تو اسے قتل کیا اور اب ماتم کر رہی ہے"۔

یہ سن کر بدقسمت پیتیا نے اپنے بال نوچ لئے اپنے خوبصورت چہرے اور سینے کو اپنے ہاتھوں سے بری طرح پیٹنا شروع کیا اور بالآخر اپنے جلتے ہوئے مرتعش ہونٹ فیضیو کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر رکھ دئے۔ پھر اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو باپ کے سامنے گھٹنے ٹیک بٹھا دیا اور ان سے کہا "اپنے باپ کا چہرہ چوم لو"۔ تماشائی یہ رقت انگیز نظارہ دیکھ کر یکایک اپنے غصے کو بھول گئے اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پریشان حال دیوانی ماں نے اپنی جیب سے ایک چمکتا ہوا چاقو نکالا اور انتہائی وحشت اور تندی سے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اسے یکے بعد دیگرے اپنے معصوم بچوں کے سینوں میں گھونپ دیا اور اس سے پہلے کہ لوگ اس سے یہ خوفناک ہتھیار چھین لیں چمکتا ہوا چاقو اس نے اپنے ہاتھ میں لے کر اوپر اٹھایا اور اس زور سے اسے اپنے سینے میں گھونپ لیا کہ وہ دستے سمیت اس کے سینے میں چلا گیا۔ ایک ہی لمحے

میں وہ اپنے شوہر اور بیٹوں کی لاشوں پر گر گئی۔ لوگ چیختے ہوئے ان کے قریب پہنچے ماں اور اس کے دونوں بیٹے آخری سسکیاں لے رہے تھے اور ان کے جسم سے نکلتے ہوئے خون کے فواروں نے ان کا لباس بالکل سرخ کر دیا تھا۔

تمام شہر میں یہ افسوسناک خبر بجلی کی سی سرعت کے ساتھ پھیل گئی۔ ماتم کرتے ہوئے لوگ گروہ در گروہ یہ خوفناک منظر دیکھنے کے لئے آنے لگے۔ جہاں میاں بیوی اور بچوں کی لاشیں ایک ڈھیر کی صورت میں پڑی تھیں۔ انیتھنز، ٹرائے، روم کے لرزہ خیز خونیں واقعات کی تفصیل بھی ہم سن چکے ہیں۔ کون بے درد ایسا ہے جس کی روح ان واقعات کی تفصیل سن کر لرز نہیں جاتی لیکن ایک ہی دن میں اہل پیسا نے جو خونیں منظر دیکھ لیا وہ کہیں زیادہ دردناک تھا۔ اگرچہ ایتھنز، ٹرائے اور روم کے خوفناک واقعات میں ہزاروں لوگ موت کی نیند سو گئے تھے خون کی ندیاں بہ گئی تھیں لیکن یہاں صرف چار آدمیوں کے حسرت ناک انجام سے لوگوں کا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اور ان میں کئی ایسے تھے جو ان واقعات پر خون کے آنسو رو رہے تھے۔

جلد ہی یہ خبر اٹلی جا پہنچی اور دوسرے شہروں میں بھی یہ خبر ایسی سرعت سے پھیلی کہ دہشت زدہ لوگ متاثر ہو کر جوق در جوق پیسا آنے لگے تاکہ اس خونیں منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں ان میں سے کون ایسا تھا جو مسکراتے ہوئے چہروں والے معصوم بچوں کا نوحہ خواں نہ ہو اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کے تیار کردہ مرگھٹ میں گہری نیند سو رہے ہیں۔ کون ایسا بے درد تھا جس کی آنکھوں میں اس وقت آنسو نہیں چمک رہے تھے۔ آہ یہ نظارہ تو پتھر کو بھی موم بنا دینے کے لئے کافی تھا۔ قانون نے بھی اب اپنی لرزتی ہوئی تلوار ہاتھوں سے گرا دی تھی۔ ان کی لاشیں دفن کرنے کے لئے جلوس کی صورت میں لے جائی جا رہی تھیں۔ ہر چہرہ مغموم نظر آتا تھا اور ہر آنکھ آنسوؤں سے تر تھا۔

اطالوی سے

مہدی علی خاں

دامن گلچیں

دو آتشہ

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال — صد سال میتواں بہ تمنا گریستن!

(عرفی)

ہم وقتِ وداع ان سے ملنے میں ہوئے رخصت — رونا تھا بہت لیکن روتے بھی تو کیا ہوتا

(حالی)

ترجمہ

شادم کہ عاشقاں را سوزِ دوام دادی — درماں نہ آفریدی آزارِ جستجو را

(اقبال)

خوش ہوں کہ عاشقوں کو سوزِ دوام بخشا — درماں کیا نہ پیدا آزارِ جستجو کا

(حفیظ ہوشیار پوری)

شائستہ پاسخ

کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں — جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

(؟)

کبابِ سیخ ہیں لیکن پڑے ہیں ایک پہلو پر — مزا کیا گر بچا لیں جان کو ہم کروٹیں لے کر

(؟)

نغمۂ خودی

لوحِ فنا پہ نقش ہوں پھر بھی بقا نشاں ہوں میں
کب یہ کسی پہ کھل سکا کون ہوں میں کہاں ہوں میں

مجھ سے نہ چھپ سکا ہے کچھ مجھ سے نہ چھپ سکے گا کچھ
حسن کا ہوں ادا شناس عشق کا رازداں ہوں میں

گایا ہے جس کو عشق نے جس کو سنا ہے حسن نے
وجہِ قیامِ دہر وہ نغمۂ جاوداں ہوں میں

مری تلاش ہے فضول دشت بدشت بے خبر
اپنے ہی دل سے پوچھ تو میرا پتہ کہاں ہوں میں

ملتے ہیں جستجو سے ہی اہلِ تلاش کو گہر
ورنہ نہیں پکارتا آپ "گہر یہاں ہوں میں"

دیکھنے کو ہوں پا بہ گل ساحلِ عافیت سے دور
اہلِ نظر کے واسطے قلزمِ بے کراں ہوں میں

قدر مری عوام میں گر نہیں تاجورؔ نہ ہو
جانتے ہیں خواص تو شاعرِ خوش بیاں ہوں میں

تاجورؔ سامری

سحرِ حیات

کشاں کشاں

بلندیوں پہ لے گئی امنگ میری روح کو،
خیال دل میں آگیا!
میں چل پڑا،
نکل کے گھر سے کوہ و دشت و ریگ زار کی طرف!

افق کے پاس دیکھ کر وہ دھندلی دھندلی بستیاں،
جنون نے ہیچ کر دیا
مری نگاہِ شوق میں
نظام کائنات کو!
مری رگوں میں بھر دیا
جوان و گرم جوشِ خون!
فضا میں عزمِ آہنیں کے نغمہ ہائے آتشیں
بکھیر کر میں چل پڑا
نکل کے گھر سے کوہ و دشت و ریگ زار کی طرف!
مگر بھلا چکا تھا دل سے ضبط و عقل و ہوش کو
جنونِ جستجو نے اب
بدل کے میرے نغمہ ہائے آتشیں کو رکھ دیا
ملول، سرد آہ میں!

حیاتِ مختصر کا دور ہو چکا،
امنگ کے طلسم سے بدل کے اور ہو چکا
وہ نغمہ میرے خواب کا!

"میراجی"

بھاشا کے پھول

[ذیل میں چند ہندی طرز کے دوہے درج کئے جاتے ہیں۔ مصنف شاعر کی حیثیت سے منظرِ عام پر آنا پسند نہیں کرتا۔ اس کے اکثر مضامین اصلی نام کے ساتھ ان صفحات میں شائع ہوتے رہے ہیں اور ہم یہ ناظرین پر چھوڑتے ہیں کہ وہ اس بات کا اندازہ لگائیں کہ ادبی دنیا کے گلے میں بھاشا کے پھولوں کا یہ خوبصورت ہار کس نے ڈالا ہے! ح۔ ع]

(۱)

نینوں سے میں نیر بہاؤں تارے بن بن جائیں!
جی سے بھولوں جتنا اُن کو پیارے بن بن جائیں!

(۲)

چندر ما نے راگ الاپا روئے جس سے پھول!
پریت کے سارے سندر سپنے گئی جوانی بھول!

(۳)

جا ری کوئل میں نہ سنوں گی تیرے من کا گیت!
میرے من سے روٹھ گیا ہے میرے من کا میت!

(۴)

پیتم پیارے پاس نہیں، تو آ گئی مت برسا!
من سے لپٹ جا چندر ما، مت دور سے یوں ترسا!

(۵)

جا رے بھونرے باغ میں، چاند کی کرنیں لُٹ!
من کا اب وہ روپ کہاں، زخم گئے جب پھوٹ!

"راہو"

ہندوستانیوں کی زبانیں

نسل اور زبان کا چولی دامن کا ساتھ ہے جن لوگوں کی نسل ایک ہوگی۔ اُن کی زبان بھی ایک ہوگی اور زبان کی یکسانیت عموماً تہذیب وتمدن کی یکسانیت پر منتج ہوتی ہے۔ جس طرح ہندوستان میں بہ لحاظِ نسل ایک ہی قوم آباد نہیں بلکہ بہت سی قومیں آباد ہیں اسی طرح زبان کے لحاظ سے بھی ہندوستان کے باشندے مختلف گروہوں میں منقسم ہیں اور یہی امر واقعہ بالواسطہ طور پر اُن کے اختلافِ نسل کی بھی دلیل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوہِ یورال ایشیا اور یورپ کے مابین حائل ہوکر اُن کو دو مختلف براعظموں میں تقسیم کرسکتا ہے تو کوہ ہمالیہ بھی جو اس قدر بلند طویل اور عریض ہے۔ ہندوستان کو ایشیا سے الگ کرکے اسے بذاتہٖ ایک علیحدہ براعظم کی حیثیت بخش سکتا ہے اگر اس نظریے کو درست تسلیم کرلیا جائے تو ہندوستان کو براعظم اور اس کے مختلف صوبوں یا حصوں کو اس کے ملک تسلیم کرنا پڑے گا۔ نیز یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان ملکوں میں مختلف قومیں آباد ہیں جو نسل زبان اور تہذیب کے لحاظ سے ایک دوسری سے مختلف ہیں۔

زبان کے اختلافات کے پیشِ نظر ہندوستان کو اگر مینارِ بابل سے تشبیہہ دی جائے تو غلط نہیں۔ یہاں نسل کے لحاظ سے جتنے اختلافات موجود ہیں اتنے ہی بلکہ اُن سے بھی زیادہ اختلافات زبان کے لحاظ سے پائے جاتے ہیں۔ زبان کے لحاظ سے ہندوستان کی آبادی کی تقسیم سے متعلقہ اعداد وشمار حسب ذیل ہیں:۔

تئیس کروڑ تیس لاکھ آبادی یعنی ۴ر۷۳ فی صدی آبادی آریوں کی زبانیں استعمال کرتی ہے۔ چھ کروڑ تیس لاکھ آبادی یعنی ۲۰ فی صدی آبادی دراوڑی زبان بولتی ہے۔ ایک کروڑ تیس لاکھ آبادی یعنی ۴ فی صدی باشندے تبتی یا چینی زبانیں بولتے ہیں۔ باقی ایشیائی زبانیں تقریباً نصف کروڑ آبادی میں مروج ہیں زبان کے لحاظ سے آبادی کے ان گروہوں کی مزید تقسیم بھی ممکن ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک گروہ میں کئی اور ایسی زبانیں رائج ہیں جو آپس میں بہت ملتی جلتی ہیں اور اصل زبانوں کی شاخیں ہیں۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ بنگال کے سوا ہر ایک صوبے میں کئی زبانیں رائج ہیں۔ بنگال کی ۹۰ فی صدی آبادی بنگالی بولتی ہے۔ آسام میں ۵۰ فی صدی باشندے بنگالی بولتے ہیں ۲۰ فی صدی آسامی اور ان دو زبانوں کے علاوہ باقی باشندوں میں سو کے قریب اور زبانیں مستعمل ہیں۔ بہار اور اڑیسہ میں ۶۰ فی صدی باشندوں کی زبانیں ہندی اور بہاری ہیں۔ ۲۰ فی صدی کی زبان اڑیا ہے اور باقی ۱۵ فی صدی کی زبانیں مندری اور سنتھالی ہیں۔ صوبہ بمبئی میں سب سے زیادہ مروج زبان مرہٹی ہے اور اس کے بولنے والوں کی تعداد صرف ۴۶ فی صدی ہے۔ ۳۲ فی صدی باشندے گجراتی بولتے ہیں۔ باقی ۲۲ فی صدی آبادی دیگر زبانیں مثلاً انگریزی اُردو پارسی وغیرہ استعمال کرتی ہے۔ برما کی ۳/۴ آبادی کی زبان برمی ہے اور باقی آبادی میں کئی مختلف زبانیں رائج ہیں۔ صوبجات متوسط اور برار میں ۵۵ فی صدی باشندوں کی زبان ہندی یا پراکرت ہے۔ ۳۱ فی صدی کی مرہٹی اور باقی باشندے ان کے علاوہ اور زبانیں استعمال کرتے ہیں۔ صوبہ مدراس کا بھی یہی حال ہے۔ ۴۱ فی صدی کی زبان تامل ہے ۳۱ فی صدی کی تلگو اور باقی باشندے ملیالم، اُڑیا کناری اور ہندی ایسی زبانیں بولتے ہیں۔ صوبہ پنجاب اور صوبجات متحدہ میں ۴۵ فی صدی تو مغربی ہندی اردو اور پنجابی بولتے ہیں اور ۳۲ فی صدی مشرقی ہندی (ہندی اور اردو وغیرہ) ۲۰ فی صدی بہاری اور ۳ فی صدی مرکزی پہاڑی۔

ہندوستان کی زبانوں میں سے کئی زبانیں ایسی ہیں جو لکھنے میں نہیں آتیں صرف بولی جاتی ہیں۔ ایسی زبانیں اکثر بہت جلد مٹ جاتی ہیں جو زبانیں لکھی بھی جائیں اور ادبی حیثیت سے بھی انہوں نے کچھ ترقی کی ہو ان کا غیر مستعمل ہونا تو درکنار وہ اکثر ایسی زبانوں کی جگہہ لے لیا کرتی ہیں جن کا کوئی رسم الخط نہیں ہوتا۔ مغربی نیپال میں کسی وقت کچھ ہندو پناہ گزیں ہوئے۔ وہاں کی مروجہ زبان "خاص" تھی لیکن آہستہ آہستہ ان پناہ گزیں ہندوؤں

کی زبان ایسی ہردلعزیز ہوئی کہ یہ وہاں کے باشندوں کی اصل زبان کی بجائے استعمال ہونے لگی اور اب یہ زبان نیپال میں مروجہ پہاڑی زبان کی جگہہ بھی لے رہی ہے۔ شمالی بنگال کے باشندے کوچی اپنی زبان کو کافی حد تک بھول چکے ہیں اور اب ملی جلی بنگالی بولتے ہیں۔ اسی طرح قوم چکما نے اراکانی زبان کو چھوڑ کر بنگالی کو اپنی زبان بنالیا ہے لیکن وہ بنگالی لکھتے وقت برمی حروف تہجی استعمال کرتے ہیں۔ گریرسن صاحب کی پنجابی اور موجودہ زمانے کی پنجابی میں زمین و آسمان کا فرق ہے زبانیں چونکہ بدلتی رہتی ہیں اس لئے ہندوستان کی مشترکہ زبان کے متعلق کوئی آخری فیصلہ کرنا آئندہ نصف یا ربع صدی میں عوام کے رجحانات پر منحصر ہوگا۔

مرقومہ صدر اعداد و شمار ۱۹۱۱ء کی رپورٹ، مردم شماری میں درج ہیں اور ان کے مطابق ہندوستان کے باشندے بہ لحاظ زبان بھی متفق و متحد نہیں ہو سکتے۔ چونکہ جذبۂ ملیت کی تخلیق کے لئے ضروری ہے کہ ملک میں ایک مشترکہ زبان جاری ہو اس لئے اس وقت ایک مشترکہ زبان کا مسئلہ ملک بھر کے زیر غور ہے۔ تین زبانوں یعنی اردو، ہندی اور انگریزی کے متعلق یہ دعوے کیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان بھر کی مشترکہ زبانیں ہونے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ اردو کے حامی یہ دعوے کرتے ہیں کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جسے ہندوستان میں ہر جگہہ سمجھا جاتا ہے برخلاف اس کے حامیان ہندی کا یہ دعوے ہے کہ اردو نہیں بلکہ ہندی ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے اور ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو انگریزی کے متعلق یہی دعوے پیش کرتا ہے۔ اب ہم ان مختلف دعاوی پر غور کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

جہاں تک سلیس اردو یا سلیس ہندی کا تعلق ہے ہندوستان کے اور خاص کر شمالی ہندوستان کے اکثر باشندے انہیں سمجھ سکتے ہیں اور ان زبانوں میں کچھ زیادہ فرق بھی نہیں۔ فرق صرف اس وقت نظر آتا ہے جب اردو کے حامی اس میں عربی اور فارسی الفاظ کی بھرمار کر کے اسے مغلق اور مشکل بنا دیتے ہیں اور ہندی کے حامی اس میں سنسکرت کے الفاظ استعمال کر کے اسے غیر مانوس اور ناقابل فہم کر دیتے ہیں۔ جہاں تک لفظوں فقروں کی ساخت اور گرامر کا تعلق ہے یہ دونوں زبانیں اس قدر ملتی جلتی ہیں کہ ان کو ایک ہی زبان کہہ دینا غلط نہ ہوگا۔ صرف ان کے حروف تہجی اور رسم الخط میں فرق ہے گویا کہ ہندی اور اردو کا جھگڑا بہت بڑی حد تک رسم الخط کا جھگڑا ہے اور اگر اس بات کا فیصلہ ہو جائے تو یہ جھگڑا مٹ جاتا ہے اور اردو یا ہندی تمام ملک کی یا کم از کم شمالی ہندوستان کی مشترکہ اور ملکی زبان تسلیم کی جا سکتی ہے لیکن اس وقت لوگوں میں ایک اور رجحان بھی پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ ہر صوبے کے باشندے اپنے صوبے کی زبان کو ترجیح دینا چاہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر صوبہ کی یہ خواہش ہے کہ جو زبان اس میں مروج ہے اس کو ترقی دی جائے اور جہاں تک صوبجاتی معاملات کا تعلق ہے وہی زبان عام تعلیمی اور سیاسی اغراض کے لئے استعمال ہو۔ اگر شمالی اور خاص کر شمال مغربی ہندوستان کا جس میں شمال مغربی سرحدی صوبہ پنجاب صوبجات متحدہ وغیرہ شامل ہیں یہ دعوے تسلیم کر لیا جائے کہ شمالی ہندوستان کی زبان اردو یا ہندی ہے تو بنگال کب اس کو گوارا کرے گا کہ وہ بنگالی کو جو وہاں اس قدر زیادہ ہردلعزیز اور رائج ہے چھوڑ کر اس کی بجائے اردو یا ہندی کو رواج دے۔ اس کے علاوہ سلیس اردو یا ہندی کی ترقی ابھی تک اتنی نہیں ہوئی کہ ان میں سے کسی ایک کے ذریعے مختلف علوم کی تعلیم دی جا سکے۔ تعلیمی اغراض کے لئے ہندی یا اردو کی ترقی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ یا تو اس میں عربی اور فارسی کے الفاظ ٹھونسے جائیں یا سنسکرت کے متروک الفاظ کو ڈھونڈھ نکالا جائے۔ اور پھر ان کی بے معنی طور پر اس میں بھرمار کر دی جائے۔ اگر مسلمانوں کی قابل تعظیم زبانوں عربی اور فارسی اور ہندوؤں کی چہیتی زبان سنسکرت کے الفاظ کو تصفیہ کی خاطر اس بنا پر جگہہ نہ دی جائے کہ وہ فرقہ داری کی محرک ہیں تو پھر اردو یا ہندی کی ترقی کے لئے انگریزی زبان کا سہارا ڈھونڈھنا پڑتا ہے اور جدید علوم چونکہ زبان انگریزی کے ذریعے سے ہم تک پہنچے ہیں اس لئے انگریزی سے ہی اردو یا ہندی میں تراجم کئے جائیں گے۔ لہذا انگریزی الفاظ کے مترادف عربی یا سنسکرت کے الفاظ ڈھونڈنے پر وقت اور محنت صرف کرنے کی بجائے کیوں نہ انگریزی الفاظ کو ہی استعمال کیا جائے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو یا ہندی کو ترقی دینے کے لئے کافی وقت درکار ہے۔ تمام صوبوں میں بالخصوص بنگال۔ مدراس، بمبئی، سندھ، صوبجات متوسط وغیرہ میں اس مشترکہ زبان کی ترویج کی اس قدر ضرورت ہوگی کہ یہ وہاں کے لوگوں کی مادری زبان بن جائے۔ معلوم نہیں کہ اس پر کتنا عرصہ لگے اور عین ممکن ہے کہ اس بارہ میں کوشش شروع کرنے کے کچھ عرصہ بعد یہ نتیجہ چلے کہ یہ مقصد ناممکن الحصول ہے یا اس سے اور کئی جھگڑے اٹھنے کا اندیشہ ہے مثلاً اگر بنگال میں اردو کو رواج دینے کی کوشش شروع کی جائے تو اغلب ہے کہ

اس بارے میں کامیابی نہ ہو کیونکہ بنگال کی ۹۰ فی صدی بنگالی بولنے والی آبادی اپنی زبان کو چھوڑنے پر مجبور نہیں کی جاسکتی۔ پھر اگر اسے ایسا کرنے کے لئے مجبور بھی کیا جائے تو بنگالی کے مقابلے میں چونکہ وہاں اردو ابھی جاری ہوئی ہوگی اس لئے اسے چنداں فروغ حاصل نہیں ہوگا۔ عین ممکن ہے کہ اس سے بیشتر کہ بنگال میں اردو کو مروج کرنے کی ٹھانی جائے بنگالی اس قدر زیادہ ترقی کر جائے کہ یہ خیال ہی مضحکہ خیز نظر آنے لگے۔ یہی حال مدراس میں مروجہ زبانوں کا ہے۔ وہ کافی ترقی کر چکی ہیں اور ان کو چھوڑنا یا ترک کرنا مدراسیوں کے لئے ناممکن ہو گیا ہے۔ لہٰذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہندوستان کی کونسی مشترکہ زبان ہوگی۔

لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے مختلف صوبوں کو آزادی دینا بھی درست نہیں۔ کیونکہ ایسی آزادی بالآخر ہندوستان کے اتحاد و اتفاق کے منافی ہوگی اور جذبۂ ملیت پیدا کرنے کی بجائے صوبائی تنگ دلی پیدا کر دے گی جس سے ملک کی سیاسی متحدہ حیثیت قائم نہیں رہ سکے گی۔ زبان کے اختلافات اکثر سیاسی تفرقوں پر منتج ہوا کرتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ان تفرقات کی بنا پر ہر صوبہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ تیار کرنے کی ٹھان لے اور مضر مرکزیت تحریکات شروع ہو جائیں۔ لہٰذا زبان کا مسئلہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے اور اس کے متعلق بغیر سوچے سمجھے جلد بازی سے کام لینا قرین دانش نہیں کسی مروجہ ہندوستانی زبان کو بتدریج ترقی دے کر اس میں تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان ہونے کی خصوصیات پیدا کرنے کا کام خود مرکزی حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے۔ صوبوں کو اس بارے میں کلی اختیار دینا نقصان کا باعث ہوگا۔

بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ملک بھر کے سکولوں میں اردو اور ہندی کو لازمی قرار دیا جائے اور تمام بچوں کو یہ دونوں زبانیں اور اُن کے رسم الخط بھی سکھائے جائیں۔ نیز ہندو علم الاصنام اور اسلامی روایات قدیمہ کی بھی تعلیم دی جائے۔ کیونکہ اس طریقے سے کچھ عرصہ کے بعد اردو ہندی ملک کی مشترکہ زبان بن جائے گی یعنی اُن کی تعلیم و تدریس کے جاری رہنے کے کچھ عرصہ بعد ایک ایسا وقت آئے گا کہ عام لوگوں کے پاس اردو اور ہندی الفاظ کا ذخیرہ اتنا کافی ہوگا کہ وہ بلا تامل ہر موضوع پر اظہارِ خیال کر سکیں گے اور چونکہ ان کو ہندی رسم الخط سے بھی واقفیت ہوگی اس لئے ان کے پڑھنے پڑھانے میں دقت نہیں ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ طبعی امیال ایسے ہو جائیں کہ ان دونوں میں سے ایک رسم الخط بالکل ترک کر دیا جائے۔ یہ تجویز معقول معلوم ہوتی ہے لیکن صرف شمالی ہندوستان میں اس کی کامیابی کے امکان ہیں۔ باقی ہندوستان میں اس سے دقتیں پیدا ہو جائیں گی۔ اس کے علاوہ ہم اس قسم کی کسی تجویز پر یک دم عمل نہیں کر سکتے یہ مشترکہ زبان بنانے کا ایک تعمیری پروگرام ہے جس کی کامیابی اور تکمیل کے لئے ہمیں کافی عرصہ انتظار کرنا پڑے گا اور پھر اس کے بعد بھی یہ ہندوستان بھر کی نہیں بلکہ صرف شمالی ہندوستان کی مشترکہ زبان کہلا سکے گی۔

اس اعتراض نیز اس محنت اور وقت کے پیش نظر جو انگریزی کی ترویج پر صرف کیا جا چکا ہے بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ انگریزی کو ملک بھر کی مشترکہ زبان قرار دیا جائے۔ میکالے کے زمانے سے لے کر انگریزی ملک کی مشترکہ زبان چلی آتی ہے۔ تمام اعلیٰ تعلیم خواہ وہ ادبی ہو یا اصطلاحی انگریزی میں دی جاتی ہے اور پنجابیوں، بنگالیوں اور مدراسیوں کے مابین جن کی مقامی زبانیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور جو ایک دوسرے کی زبان کو سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں۔ انگریزی زبان ہی اظہار خیال یا تبادلۂ خیالات کا ذریعہ بنتی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر اردو یا ہندی کے مقابلے میں مختلف صوبوں کے لوگ سیاسی و اجتماعی اغراض کے لئے انگریزی ہی کا زیادہ تر استعمال کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے انگریزی کو باقی زبانوں پر ترجیح دینی پڑتی ہے لیکن یہ بات جذبۂ ملی کے خلاف ہے اور جذبۂ ملی کی بنا پر جو دلیل پیش کی جائے اس کی اہمیت میں نہ تو شک و شبہ کی گنجائش ہے اور نہ ہی اسے فلسفیانہ معقولیت اور مناسبت کی کسوٹی پر پرکھنا درست ہے کیونکہ ملیت ایک جذبہ ہے۔ ایسی حالت میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کوئی ایسی مشترکہ زبان تلاش کی جائے یا بنائی جائے جسے ہندوستان سے براہِ راست علاقہ ہو اور چونکہ انگریزی کے بغیر فی الحال گذارہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس وقت تک جب تک کہ مشترکہ زبان کے متعلق کوئی آخری فیصلہ نہیں ہوتا انگریزی قائم مقام حیثیت میں مشترکہ زبان کی خدمات سرانجام دیتی رہے۔ ملیت کے مفاد سیاسی اور اقتصادی ہوتے ہیں اس لئے اس کے جذباتی پہلو کا احترام اسی طور پر ہو سکتا ہے کہ اس بارہ میں ضبط سے کام لیا جائے اور قیامِ ملت کے اصل مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے حصول کے کسی خاص ذریعہ یا آلۂ کار کے بارے میں اصرار نہ کیا جائے بلکہ وہ بات کی جائے جس میں آسانی اور سہولت ہو۔

اس کے علاوہ ایک اور بات جو قابلِ غور ہے یہ ہے کہ جدید ہندوستان کی عام سیاسی فضا اور کسی حد تک مجلسی فضا بھی مغربی خیالات کے زیر اثر

ایک خاص مرحلہ تک پہنچ چکی ہے نمایندگی جمہوریت ملیت حقوق انسانی ایسے خیالاتِ جدیدہ نیز علوم جدیدہ کی اشاعت انگریزی زبان کی وساطت سے عمل میں آئی ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جدید ہندوستان مغربی اصولوں کے مطابق شاہ راہِ ترقی پر گام زن ہے اور آئندہ بھی وہ انہیں اصولوں پر عمل پیرا ہونا چاہتا ہے تو انگریزی زبان کو چھوڑنے سے اس کے مغربی ممالک سے تعلقات منقطع ہو جائیں گے اور اس انقطاع سے عین ممکن ہے کہ سیاسی نشو ونما اور اجتماعی ترقی کی لہر جو اس وقت پیدا ہو چکی ہے ہمیشہ کے لئے رُک جائے اور امرا کے اثر و اقتدار سے پھر ملوکیت کا دور دورہ شروع ہو جائے اور اس کے زہر آلود اثرات رونما ہو کر بنا بنایا کام بگاڑ دیں۔ نیز انگریزی زبان چونکہ دنیا بھر کی اور زبانوں کے مقابلے میں زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے اس لئے دیگر ممالک سے تعلقات قایم رکھنے کے لئے اس کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ لہٰذا انگریزی کو بالکل ترک کر دینے میں نقصان ہے انگریزی زبان کے ذریعہ باقی ممالک سے تعلقات قایم رہ سکتے ہیں۔ ہندوستان کا باقی دنیا کے ساتھ پہلو بہ پہلو آگے بڑھنا، ترقی کرنا اور اس ہم دوش کھڑا ہونا انہی تعلقات کے قایم رہنے پر منحصر ہے۔ یہ زمانہ بین الملی تعلقات کا زمانہ ہے ایک ملک کے اندرونی اور بیرونی حالات پر دنیا کے باقی ممالک کا اثر پڑتا ہے اور اسی لئے دورِ جدید میں پروپیگنڈا کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ لہٰذا اس نقطۂ نظر سے بھی زبان ایسی ہونی چاہئے جو دنیا بھر میں سمجھی جاتی ہو اور جس کے ذریعہ اگر ضرورت پڑے تو تمام دنیا کو اپنے حالات سے آگاہ کرنا ممکن ہو۔ اگر ہندوستان کو باقی دنیا سے علیحدہ کر دیا جائے اور اُس کا دیگر ممالک سے کوئی تعلق نہ رہے تو عوام میں ترقی کرنے کی جو خواہش اس وقت موجود ہے بہت جلد مفقود ہو جائے گی اور ان کی وہی پست حالی پھر عود کر آئے گی جو اب سے ایک صدی پہلے ملک پر مسلط تھی۔ ہندوستان کی ترقی کے سلسلہ کو جاری رکھنے کے لئے اس کا باقی دنیا سے تعلق قایم رکھنا بے حد ضروری ہے اور اسی لئے ہمیں انگریزی زبان کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔

"بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پہ تم خشتِ کلیسا ابھی"

اقبال

اس بارے میں ۱۹۱۵ء میں امپیریل کونسل کے مباحثات میں سے چند ایک اقتباسات خالی از دلچسپی نہ ہوں گے۔

(۱)

"اگر تمام ہندوستان کی کوئی مشترکہ زبان ہوتی تو کسی ہندوستانی کی طرف سے نہ صرف میٹرکیولیشن بلکہ اعلےٰ سے اعلےٰ تعلیم بھی اس زبان میں دئے جانے کی کبھی مخالفت نہ کی جاتی۔ تمام محبانِ وطن کی یہ مخلصانہ کوشش ہے کہ انگریزی کی وسیع پیمانے پر تعلیم دی جائے۔ کیونکہ یہی ایک زبان ہے جسے فرزندانِ وطن مشترکہ طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے مابین اظہار خیال کا واحد ذریعہ ہے بلکہ خود ہندوستانیوں میں بھی اسی زبان کے ذریعے تبادلہ خیالات کیا جاتا ہے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارموں پر بھی یہی استعمال کی جاتی ہے۔ ملک کے مختلف حصوں کے باشندوں کا جب کبھی کوئی جلسہ ہوتا ہے تو وہ بھی آپس میں اسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ لہٰذا انگریزی کو پس پشت ڈالنے کے لئے جو بھی کارروائی کی جائے گی وہ بلا شبہ رجعت پسندانہ ہوگی۔"

مسٹر غزنوی

(۲)

"مغربی تہذیب کے اثرات سے ہندوستان کا معیارِ زندگی بہت بلند ہو گیا ہے اور یہ تمام نتائج اس لئے مرتب ہوئے ہیں کہ ہمیں تعلیم میکالے اور برک کی زبان میں دی گئی ہے۔"

مسٹر سریندر ناتھ بینرجی

(۳)

"ہمارے ملک کو انگریزی کی تعلیم سے جو فایدہ ہوا ہے جب ہم اس کا تہ دل سے اعتراف کرتے ہیں تو ہمیں یا کم از کم ہم میں سے اُن کو جو اس قرارداد کے اتنے مخالف نہیں جتنے کہ وہ اس کے حامی ہیں۔ اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس غرض سے کہ ہمارے نوجوان انگریزی زبان اور ادب میں اعلیٰ استعداد حاصل کر سکیں جس حکمتِ عملی پر عمل کیا جا رہا ہے وہ باشندوں کی تعلیم و تربیت کے لئے دیسی زبانوں کے قدرتی یا مناسب استعمال سے متعلقہ حکمتِ عملی کی حوصلہ افزائی کے منافی نہیں ہے۔"

پنڈت مدن موہن مالویہ

(۴)

ہم لارڈ میکالے کے مشکور ہیں کہ انہوں نے استقلال اور جرأت

سے یہ کوشش کی اور اس بات پر اصرار کیا کہ ملک میں تعلیم انگریزی اور صرف انگریزی ہی میں دی جانی چاہئے۔ اگر انگریزی زبان کے ذریعہ ہم اعلیٰ قابلیت حاصل نہ کرتے تو ہماری کیا حالت ہوتی؟ یہ اصلاح یافتہ کونسل جس پر اس وقت ہم اس قدر نازاں ہیں کہاں ہوتی؟ کیا میرے دوست جانتے ہیں کہ سائنس، ریاضی، انجینئرنگ طب، قانون اور دیگر مغربی علوم کے پڑھنے کے لئے جن کی تعلیم صرف انگریزی زبان کے ذریعہ عمل میں آسکتی ہے ہندوستان میں مروجہ بیسیوں زبانوں کو استعمال کیا جائے؟ کیا میرے دوست مینار بابل ایسی ابتری پیدا کرنے کے متمنی ہیں؟

رائے بہادر رائے سیتا ناتھ

لیکن ملت کی تشکیل کے لئے زبان کے ایک ہونے پر اصرار کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ برطانیہ کے مختلف حصوں کی مقامی زبانیں ایک دوسری سے جدا ہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں بھی یہی حال ہے اور یورپ کے دیگر ممالک میں بھی زبان کے اختلاف موجود ہیں۔ اور ان کے باوجود ان ملکوں کی اپنی اپنی ملتیں قائم ہیں اور بدستور قائم رہیں گی۔ جب کسی ملک میں اپنی ملت کے قائم کرنے کا خیال پیدا ہو جاتا ہے تو ایسی دقتوں سے عہدہ برآ ہونا اس کے لئے مشکل نہیں ہوتا۔ امریکہ میں نسل اور زبان کے لحاظ سے اتنے شدید اختلافات موجود تھے کہ شاذ ہی کسی اور ملک میں ایسے اختلافات پیدا ہوئے ہوں گے۔ لیکن امریکہ نے احساس ملی کے زیر اثر اپنی نسل کو بھی ایک بنالیا اور زبان کی یکسانیت بھی پیدا کر لی۔ اگر کوئی خاص رکاوٹ پیدا نہ کی جائے تو کیا ہندوستان جہاں لوگوں میں اپنے ہم نسل ہونے کا یقین پہلے ہی سے موجود ہے اور جو ایک دوسرے کی بات کسی نہ کسی طرح سمجھ لینے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اس بارے میں امریکی اور دیگر یورپی ممالک کے مقابلے میں کم اہلیت کا ثبوت دے سکتا ہے؟ جو بات سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ آزاد ملکوں اور آزاد ملتوں کی مثال ہمیشہ اہل ملک کے پیش نظر رہنی چاہئے۔ خواہ اس کا انتظام انگریزی کے وسیلہ سے کیا جائے خواہ ہندی یا اردو کے ذریعے سے تاکہ اُن میں جذبات رشک پیدا ہوتے رہیں اور متحد و متفق ہو کر شاہراہ ترقی پر گامزن ہونے کی خواہش ٹھنڈی نہ ہونے پائے اس احساس ملی کو جو اس وقت پیدا ہو چکا ہے برقرار رکھنے کی ضرورت ہے یہ ترقی و تربیت کی راہیں خود نکال لے گا۔ اس کے متعلق فکر کی ضرورت نہیں۔ جذبہ ملیت جن کو ایک دفعہ متحد کر دے وہ اپنی فلاح کی راہیں خود ڈھونڈھ لیتے ہیں۔ اسی سلسلے میں ایک اور نکتہ جس کی تشریح لازمی ہے یہ ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی مثال اگرچہ ہمارے لئے شمع ہدایت ہے اور اس امر سے ہماری حوصلہ افزائی بھی ہوتی ہے کہ وہاں کے باشندوں نے باوجود ایسے شدید باہمی اختلافات کے اپنی ملت قائم کر لی تھی لیکن ہم اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کر سکتے کہ موجودہ امریکی ملت کے آباؤ اجداد یورپی ممالک سے ترک وطن کر کے آئے تھے۔ اس لئے نہ صرف وہ جمہوریت پسند واقع ہوئے تھے بلکہ ملی خیالات سے بھی کافی حد تک متعارف تھے۔ لہذا اُن کے لئے باہم مل کر اپنے تمام اختلافات کو مٹا دینا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔ ہندوستان تو درکنار کوئی مشرقی ملک بھی جمہوریت پسند واقع نہیں ہوا کیونکہ یہاں ملوکیت کا غلبہ رہا ہے۔ ہماری ذہنیت امارت پسند اور حاکم پرست واقع ہوئی ہے جمہوریت کی روح ابھی اتنی نہیں پھیلی کہ ہم دعوے سے کہہ سکیں کہ ملوکیت کے زہرآلود اثرات اب زائل ہو چکے ہیں اور ہم حقیقی معنوں میں آزادی کے طلبگار ہیں اور وہ سب قربانیاں بھی کرنے کے لئے تیار ہیں جو اس ایک حق کو حاصل کرنے کی خاطر اکثر کرنی پڑتی ہیں۔ لہذا جمہوریت کی روح کو اور زیادہ پھیلانے کے لئے ہمیں کچھ عرصہ تک اور انگریزی زبان کی ضرورت ہے۔

صوبجاتی مجالس قانون ساز میں سے سرکاری ممبران کے اخراج کے بعد صوبوں میں انگریزی کی اہمیت میں کسی حد تک کمی آجائے گی۔ کیونکہ اگر ان مجالس میں اس وقت انگریزی ضرورت سے زیادہ رائج ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سرکاری افسران جو اکثر انگریز ہوتے تھے صوبائی زبانوں کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اس لئے دیسی ارکان کو اُن کی سہولت کے پیش نظر انگریزی میں اظہار خیال کرنا پڑتا تھا۔ نیز دیسی قابل ارکان کو بڑے بڑے عہدوں مثلاً وزارتوں کے حصول کے لئے اپنی قابلیت کا سکہ ہندوستانی ممبروں پر نہیں بلکہ انگریز ممبران پر بٹھلانے کی ضرورت ہوتی تھی۔

. . . . .

قانون ساز مجلسوں میں سے سرکاری ممبران کے نکل جانے کے بعد یہ بات نہیں رہے گی۔ اب وزیر اپنے محکموں کے انتظامات کے لئے ایوان کے سامنے ذمہ دار ہیں نہ کہ گورنر کے سامنے۔ اس کا نتیجہ بھی ہوگا کہ وزرا کو انگریزی چھوڑ کر کسی ایسی صوبائی زبان کو استعمال کرنا پڑے گا جسے ممبران کی اکثریت سمجھتی اور پسند کرتی ہو لیکن کچھ عرصہ تک تقریروں کی تیاری کے لئے نیز مختلف موضوعات کے بارے میں مختلف اعداد و شمار حاصل کرنے کے لئے بھی انہیں انگریزی کتب کا مطالعہ کرنا پڑے گا جس

سے انگریزی زبان یک دم غیر مستعمل نہیں ہوگی بلکہ آہستہ آہستہ کسی دیسی زبان کو اپنی جگہ دیتی جائے گی حتےٰ کہ وہ دیسی زبان مکمل نشو و نما کے بعد مستعمل عام ہو جائے اور لوگوں کو انگریزی زبان کی ضرورت نہ رہے۔ لیکن یہ عمل صرف صوبوں تک محدود ہوگا۔ مرکزی مجلس مقننہ میں انگریزی کے بغیر گذارہ نہیں ہو سکے گا اور اگر موجودہ حالات کی بنا پر استنباط کیا جائے تو ہمیں ہمیشہ انگریزی کے محتاج رہیں گے۔ مختلف صوبوں کے لوگوں کو آپس میں تبادلۂ خیالات کرنے کے لئے اور ہندوستان کو باقی ممالک دنیا کے ساتھ تعلقات قایم رکھنے کے لئے انگریزی زبان کی بدستور حوصلہ افزائی کرنی پڑے گی۔

اس ضمن میں ایک تقریر کا ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا جو مجھے ۲۸ فروری ۱۹۳۵ء کو لاہور میں سننے کا اتفاق ہوا۔ مقرر کسی مقامی کالج کے پروفیسر تھے۔ موضوع یہ تھا۔ صوبۂ پنجاب میں اردو کا مستقبل اور اس سے وابستہ چند دیگر مسائل"۔ فاضل پروفیسر کی تقریر نہ صرف پر مغز اور پُر معنی تھی بلکہ فکر یہ کے لئے باعث انگیخت تھی۔ دوران تقریر میں آپ نے یہ مشورہ پیش کیا کہ اگر ہندوستانی زبان کے ناگری اور فارسی رسم الخطوں کو متروک قرار دے کر اُن کی بجائے انگریزی حروف تہجی یعنی رومن رسم الخط کو استعمال کیا جائے تو اس سے کم از کم شمالی ہندوستان کے چند صوبوں میں زبان کے بارے میں یگانگت اور یکسانیت پیدا ہو سکتی ہے نہ صرف یہ بلکہ رسم الخط کی بنا پر زبان کے بارے میں فرقہ دارانہ اختلاف کی ایک خلیج کو بھی جو ایک مدت سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان حائل ہے پاٹا جا سکتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی لیکن اس کے پس پردہ متحدہ ملت ہندیہ کی قابل احترام خواہش ضرور موجود تھی۔ ہر سمجھدار شخص کی یہ خواہش ہے کہ اختلافات کی خلیجیں جو اس وقت ہندوستان کی ہمسایہ اقوام کو ایک دوسروں سے جدا کئے ہوئے ہیں پاٹی جائیں۔ رومن رسم الخط کو مروج کرنے کا مشورہ جہاں تک نظریہ اور قیاس کا تعلق ہے۔ نظر زیب اور دلکش ہے لیکن جہاں تک عملی زندگی عملی سیاسیات اور واقعات کا تعلق ہے اس مشورہ کو جامۂ عمل پہنانا آسان کام نہیں۔ کئی دفعہ رومن رسم الخط کو اپنانے کی کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ افواج میں بھی کوشش کی گئی کہ رومن حروف کو مروج کیا جائے لیکن یہ کوشش بھی بے سود ثابت ہوئی۔ اس کے علاوہ انگریزی اخبارات نے رومن رسم الخط کو ہر دلعزیز بنانے کی کوشش کی اور اپنے کچھ کالم رومن رسم الخط میں لکھی ہوئی اردو کے لئے وقف کئے لیکن کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ پریس لاہور

سے ۱۸۹۷ء میں ایک ماہوار رسالہ "رومن اردو جرنل" نکلا کرتا تھا اور اس کے سرورق پر لکھا ہوتا "مشرقی زبانوں کی تحریر رومن حروف میں مروج کرنے کے لئے" لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اسی طرح کئی اردو کی کتب کو رومن رسم الخط میں چھاپا گیا لیکن عوام نے توجہ تک نہ کی اور یہ تحریک خود بخود بند ہو گئی۔ سیاسیات میں اور خاص کر جمہوریت پسند ممالک کی سیاسیات میں ہمیشہ وہی بات اختیار کرنی پڑتی ہے جس کے راستے میں کم از کم رکاوٹیں اور دقتیں حائل ہوں۔ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے سب سے بڑی رکاوٹ جو اس مشورے کے قبول کرنے کے راستے میں حائل ہے وہ ذہنیت ہے جو فارسی عربی یعنی اسلامی تہذیب کے زیر اثر معرض وجود میں آ کر ایک مستحکم و مکمل صورت اختیار کر چکی ہے۔ اگر یہ کہا جائے جیسا کہ قابل احترام پروفیسر کی تقریر کے دوران میں کہا گیا تھا کہ اس مسئلے پر مقامی زبان کے ادب سے وابستہ جذبات سے بالاتر ہو کر غور کرنا چاہیے تو یہ ایک ایسی توقع کرنے کے مترادف ہے جو نہ صرف انسانی فطرت کے خلاف بلکہ اس کے عین متضاد ہے۔ تمام سیاسی خیال اپنی قیاسی حیثیت میں محض جذبات ہوتے ہیں اور سیاسی تعقل و تفکر کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ کسی سہل اور آسان طریقے سے ان سے وابستہ تقاضات کی تسکین و تشفی کرے۔ ملیت کسی ملک کے باشندوں کے اس مشترکہ جذبے کا نام ہے جو انہیں زمانۂ ماسبق کے تاریخی واقعات، حال کے مفاد اور مستقبل کی خواہشات برتری کی زنجیروں سے آپس میں جکڑ دیتا ہے۔ اسی طرح جمہوریت بھی ایک فطری جذبہ ہے جس کی بنا پر ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ اسے دوسرے انسانوں کے مساوی حیثیت دی جائے۔ اسی طرح اشتراکیت بھی جمہوریت سے متعلقہ اس قدرتی جذبے کی ایک شدید اور انتہائی صورت ہے۔ صوبائی داخلی آزادی کا مطلب ہی یہ ہے کہ جہاں تک صوبجات کے اندرونی معاملات کا تعلق ہے ان کو پوری پوری آزادی دی جائے کیونکہ ان کی منازل مختلف ہیں اور ان کے ان تک پہنچنے کے راستے بھی مختلف ہیں اگر صوبجات میں نسل مذہب تہذیب و تمدن اور زبان کے اختلافات موجود نہ ہوتے تو اس وقت ہندوستان کی طرف سے فیڈرل نظام حکومت کا مطالبہ نہ کیا جاتا اور نہ ہی پارلیمنٹ فیڈریشن کو قرین مصلحت سمجھتی۔ اگر یہ اختلافات اور تضاد جو مختلف صوبوں کے باشندوں کے درمیان موجود ہے آسانی سے دور ہو سکتا تو سیاسیین وحدانی نظام حکومت کے قایم کرنے پر اپنا زور صرف کرتے۔ جہاں تک ملیت کا تعلق ہے ریاست ہائے متحدہ

امریکہ کی سی ملت قائم کرنا ہمارا نصب العین ہے۔ فیڈریشن قائم کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ صوبجات صرف خارجی معاملات اور غیرملکی خطرات سے تحفظ کے لیے مائل بہ مرکز رہیں اور دیگر داخلی امور کے بارے میں اپنے اپنے مقامی حالات کے مطابق عمل پیرا ہو کر شاہراہِ ترقی پر گامزن ہوں ہندوستان میں ایسی ملت قایم کرنا جیسی کہ انگلستان جرمنی یا کسی اور یورپی ملک میں ہے خیال است و محال است و جنوں۔ کیونکہ مختلف امور کے متعلق باہمی یک جہتی یگانگت اور یکسانیت جو ان ممالک کے باشندوں کو حاصل ہے ہمیں نصیب نہیں۔ ایسی یک جہتی کے قیام کی کوشش بسا اوقات ملک کی اقتصادی، سیاسی، مجلسی اور دیگر ایسی سرگرمیوں کے راستے میں حائل ہو جایا کرتی ہے۔ اگر ہم ان قیاسی اور خوابی ناممکنات کے حصول کی کوشش میں لگ گئے تو اس سے سوائے تضیع اوقات کے اور کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ اگر ان اعداد و شمار کی طرف توجہ کی جائے جو اس باب کے آغاز میں رقم کئے گئے ہیں تو یہ بات ظاہر ہے کہ ہندوستان میں زبان کے اختلافات اس قدر گہرے اور شدید ہیں کہ ایک دو یا زیادہ سے زیادہ تین صوبوں کے درمیان زبان کے بارے میں یکسانیت پیدا کر دینا کوئی بڑی اور مفید مطلب کامیابی نہیں ہوگا۔ مزید براں اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ رومن رسم الخط کو مروج کرنے کا جہاں تک تعلق ہے اعراب اور مشتقات کی۔ نیز اس وقت تک جس قدر اردو ادب فارسی رسم الخط میں چھپ چکا ہے اس کو رومن رسم الخط میں بدلنے کی مشکلات محنت اور سرمایہ کے آگے کچھ بڑی مشکلات نہیں ہیں تو بھی رسم الخط کے متعلق اس بدعت کو پنجاب یا دیگر ایسے مسلم صوبجات کی ذہنیت میں ٹھونسنا جو صدیوں سے سامی الاصل ہو چکی ہے ایک کار دشوار ہے۔ اس کے علاوہ اگر فارسی رسم الخط کو غیر مستعمل کر کے اس کی بجائے رومن رسم الخط کو فروغ دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے جس قدر روپیہ اور محنت گذشتہ ۸۰ برس کے دوران میں لوگوں کے عام طبقوں کو اور خاص کر دیہاتی طبقوں کو خواندہ بنانے پر صرف کی ہے وہ سب اکارت گئی۔ عنقریب آنے والے تمام انقلابات کے پیش نظر یہ امر قرینِ دانش نہیں کہ ہم اس رسم الخط کو چھوڑ کر جسے ایک بڑی حد تک صوبے کے باشندے اس وقت پڑھنے کے قابل ہو چکے ہیں کسی اور رسم الخط کو رواج دینا شروع کر دیں۔ لہٰذا اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں کہ زبان کے بارے میں صوبے کے موجودہ حالات کو برقرار رکھا جائے۔ تجربات کرنے کے لئے یہ وقت موزوں نہیں ہے۔ ہماری موجودہ فضا ایسی ہے کہ ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ہر صوبے کی اپنی اپنی علیحدہ صوبائی زبان ہوگی اور ان کے باہمی تعلقات کو برقرار رکھنے کے لئے انگریزی کا مرہونِ منت رہنا پڑے گا۔

مفکر مذکور کے اس مشورے کے ساتھ میں کلی طور پر متفق ہوں کہ انگریزی کو سکولوں میں غیر لازمی مضمون قرار دے دیا جائے اور ان طلبا کو جو اعلیٰ یونیورسٹی تعلیم حاصل کرنے کے متمنی ہوں اور جو اپنی اعلیٰ ذاتی استعداد کا ثبوت دے کر اپنے حق کو ثابت کریں یا انگریزی کے پڑھنے کے لئے خاص زائد فیس ادا کرنے کے لئے تیار ہوں اس بارے میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کافی تعداد میں ایسے اشخاص پیدا ہوتے رہیں گے جو مرکزی حکومت کے سامنے نیز دنیا کے سامنے مختلف صوبوں کی نمائندگی کر سکیں گے۔

اس کے بعد ایک بڑا اعتراض جو فارسی رسم الخط کے خلاف پیش کیا جاتا ہے یہ ہے کہ اس میں ٹائپ کی لکھائی اور سانچہ کی چھپائی بہت مشکل ہے حال ہی میں حیدرآباد میں سانچہ کی چھپائی کا ایک طریقہ ایجاد ہوا ہے اس کے خلاف یہ اعتراض پیش کئے جاتے ہیں کہ اس میں اکثر حروف کے بہت سے حصے کر کے ان کے سانچے تیار کئے گئے ہیں اور ایک ایک حرف کے ان کئی کئی حصوں کو ترتیب دینے کا کام سخت محنت طلب ہوتا ہے نہ صرف یہ بلکہ پروف کی کاپیاں درست کرنا اور بھی زیادہ باعثِ زحمت ہوتا ہے۔ ان تمام دقتوں کا علاج یہ ہے کہ چھاپے کی ضرورتوں کے مطابق فارسی رسم الخط کے حروف کی شکلوں کو بدل دیا جائے۔ دستی لکھائی تو بدستور بطریق موجودہ مروج رہے لیکن چھاپے میں تبدیل شدہ حروف کا استعمال کیا جائے اور ان کو آپس میں ملانے کی بھی ضرورت نہیں۔ اسی طرح جس طرح رومن حروف علیحدہ علیحدہ چھپتے ہیں ان کو بھی لفظ میں علیحدہ علیحدہ ترتیب دی جائے اور دو لفظوں کے درمیان کچھ فاصلہ چھوڑ دیا جائے اس طرح جس طرح انگریزی لکھی جاتی ہے۔ اس مشورے کے مطابق فارسی رسم الخط کے حروف تہجی کی نئی شکل یہ بھی ہو سکتی ہے۔

ا ب ح د ر س ص ط ع ف ک ل م ن و ہ ی ے

مثال کے طور پر عبارت کی شکل اس قسم کی ہوگی۔

ەندی ەیں دم وطن ەے ەندوستان دمارا

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اس شکل میں یا اس سے ملتی جلتی کسی اور شکل میں فارسی حروفِ تہجی۔

کا ٹائپ رائٹر بھی تیار ہو سکتا ہے اور اس کا کی بورڈ "انگریزی ٹائپ رائٹر کے کی بورڈ" کے مقابلے میں بہت سادہ ہوگا اور مشق بھی آسانی سے ہو سکے گی۔ مرقومہ صدر حروف اعراب اور گنتی کے ۹ تک کے اعداد کے علاوہ جن اور علامات کی ضرورت ہوگی وہ حسب ذیل ہیں۔

، ـ ، ؟ ، ، ر ، ( ) ، ر ، ، ٭ ، پ ، ـ ، ۃ ، ـ ، ، ، ۰ ، ۰

انگریزی کے ٹائپ رائٹر کے کی بورڈ پر حروف اور علامات کی کل تعداد ۷۵ ہوتی ہے۔ لیکن اردو کے اس ٹائپ رائٹر کے کی بورڈ پر اگر یہ تیار کیا جائے تو صرف ۴۲ حروف بمع علامات کافی ہوں گے۔ اس کے علاوہ انگریزی حروف میں صغیر اور کبیر کا بھی امتیاز ہے۔ اس امتیاز سے بھی جہاں تک اردو ٹائپ رائٹر کا تعلق ہے فایدہ اٹھایا جا سکتا ہے

تقلید برا شیوہ نہیں لیکن سمجھ سوچ کر مقلد بننا بہتر ہوتا ہے۔ اگر ترکی نے ترکی رسم الخط چھوڑ کر رومن رسم الخط کو اختیار کیا ہے تو ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ ترکی رسم الخط میں کوئی ایسے نقائص موجود ہوں کہ جن سے عہدہ برآ ہونا ناممکن یا کم از کم بے حد مشکل ہو۔ ترکی میں ایک ہی قوم آباد ہے اور اس کے افراد میں نسل مذہب تہذیب وغیرہ کے بارے میں مکمل یکسانیت موجود ہے۔ وہ کسی بات کو متفقہ طور پر رائج کر سکتے ہیں کیونکہ ان کو کسی ایسے فریق کی طرف سے مخالفت کا اندیشہ نہیں ہو سکتا جو ان سے ہر بات میں مختلف ہو۔ ترکوں نے اگر رومن رسم الخط کو اختیار کر لیا ہے تو سہولت کے پیش نظر ایسا کیا ہے نہ کہ ملت کے مختلف عناصر کے باہمی اختلافات کو مٹانے کے لئے۔ اگر ترکی میں اس قسم کے کسی تضاد کو مٹانے کے لئے ایسا کیا گیا ہوتا تو اس کی پیروی کرنا پر مصلحت ہوتا۔ موجودہ صورت میں تقلید نقصان دہ ہے۔

"ایک پنجابی"

عشق

عشق شعلوں کا اک خزانہ ہے　　زندگی کا چراغ خانہ ہے

متحرک ہے اس سے نبض جہاں!　　رگِ ہستی میں مثلِ خوں ہے رواں!

یہ کہیں "آہ" اور کہیں ہے "واہ"!　　اس کی نیرنگیاں خدا کی پناہ!

دیدۂ کوہکن میں ہے آنسو!　　قصرِ خسرو میں رنگ و رامش و بُو

عشق ہر رنگ میں ہے جلوہ ریز

غمِ فرہاد، عشرتِ پرویز!

رشید احمد درویش میرٹھی

شکر پارے

گو عیسیٰ و گو خضر کہ تعبیر پرسم!　　در خواب نہادست کسے لب بہ لبِ من

(؟)

ز عشق زادم و عشقم بکشت زار و دریغ!　　خبر نداد برستم کسے کہ شہرا بم

(؟)

در حیرتم کہ بانگِ جرس را چہ آرزوست؟　　آرامِ جاں بہ محمل و بر لب شکایتے!

(؟)

غزل

مٹے ہوؤں کے نشاں تک مٹائے جاتے ہیں
چراغِ گورِ غریباں بجھائے جاتے ہیں

وہ حسن بن کے نظر میں سمائے جاتے ہیں
اس آئینے کو بھی روشن بنائے جاتے ہیں

چمن میں آکے وہ یوں گل کھلائے جاتے ہیں
نظر ہے غنچوں پہ اور مسکرائے جاتے ہیں

الٰہی خیر سے گذرے بہار اب کے برس
ابھی سے ہاتھ گریباں تک آئے جاتے ہیں

یہ لطف ہے کہ ہمیں دل بھی دیں نشانے کو
ہمیں پہ تیرِ نظر آزمائے جاتے ہیں

بڑھائی جاتی ہے، میدانِ حشر کی وسعت
کسی کی زلف کے وحشی بلائے جاتے ہیں

پھر اُس کی بزم میں، تقدیر کھینچ لائی ہے
برنگِ شمع جہاں دل جلائے جاتے ہیں

کہا یہ شمع نے ہو بزمِ غم، کہ بزمِ طرب
کوئی جگہ ہو ہم آنسو بہائے جاتے ہیں

ادھر جو بڑھتی ہے مائلؔ کے دل کی بے تابی
اُدھر وہ رسمِ محبت گھٹائے جاتے ہیں

محمد اسمٰعیل مائلؔ

تلخابہ

قسم ہے تجھے،
اپنے اُن آنسوؤں کی،
تبسّم سے،
دلکش تبسّم سے جن کے،
بہلتی ہیں،
میری جوانی کی شامیں!

محبّت کی تلخی ہے یا زہرِ قاتل؟
محبت کی تلخی نے
معصوم دل کو
سلایا ہے،
آغوشِ رنج و الم میں،
میری بے بسی ہو گئی ہے فزوں تر!!

گذشتہ مسرّت کے،
درہائے رنگیں
میری التجاؤں سے پھر باز کر دے!
میرے عشقِ رسوا کو اک راز کر دے!

"شہپر"

نیرنگِ انتقام

چند احباب نشست گاہ میں بیٹھے ایک حیرت انگیز خون کے مقدمے پر گفتگو کر رہے تھے۔ مسٹر مولرو جو کبھی سرکاری وکیل رہ چکے تھے۔ بولے مجھے ایک اور اسی قسم کا مقدمہ یاد ہے میں ان دنوں پیرس میں سرکاری وکیل تھا۔ والد چونکہ پیرس میں ایک مشہور جج تھے اس وجہ سے میں نے ترقی کے زینے بہ سرعت طے کئے اور ان ہی کی سفارش سے مجھے موردن کا مقدمہ ملا تھا۔

ایک شخص نے قطع کلام کر کے کہا ——— میں نے سنا ہے وہ بڑا ہی حیرت خیز مقدمہ تھا"

جی ہاں ——— " میں نے جواب دیا موردن کمسن بچوں کا اتالیق تھا کیونکہ وہ ہر ایک زبان کا ماہر و منتہی تھا نیز وہ چھوٹے بچوں کو بڑی محبت اور توجہ سے تعلیم دیتا تھا اس لئے خواص و عوام دونوں کی نظر میں اس کی بہت قدر و منزلت تھی۔

اس نے مکتب کی بنا کیوں ڈالی؟ یہ تو کوئی وثوق سے نہیں کہہ سکتا البتہ یہ مشہور بات تھی کہ اس کے تین لڑکے یکے بعد دیگرے اس دار فانی سے کوچ کر گئے جن کا اس کو انتہائی صدمہ تھا چنانچہ اس نے اپنا غم غلط کرنے کے لئے ایک مکتب کی بنیاد ڈالی اور اپنا تمام وقت درس و تدریس میں صرف کرنے لگا اس کا ذوق تدریس اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وہ طلبا کو تعلیم کا شوق دلانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا حتی کہ اپنی جیب سے ان کے لئے کھلونے اور مٹھائیاں خریدتا اس کے اس برتاؤ اور توجہ سے مدرسے میں طلبا کی ایک معقول تعداد جمع ہو گئی تھی۔ موردن کے طرز تعلیم پر ہر شخص اس کا مداح تھا، چونکہ وہ طلبا سے اپنے بچوں کی طرح محبت کرتا تھا اس لئے والدین اپنے بچوں کو اس کے سپرد کر کے بے فکر ہو جاتے تھے۔

لیکن مکتب کے پانچ طلبا کا یکایک مرجانا دلوں میں کھٹکنے لگا کوئی کہتا کہ پانی خراب ہو گیا ہے کوئی کہتا گرمی کی وجہ سے بیماری پھیل گئی ہے جتنے منہ اتنی باتیں تھیں لیکن سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ بخار کسی کو نہیں آیا صرف وہ کمزور ہو جاتے اور پیٹ کے درد کی تکلیف سے دم توڑ دیتے۔

ان میں سے ایک بچے کا پوسٹ مارٹم ہوا لیکن جب اس کی موت کی وجہ سمجھ میں نہ آسکی تو اس کی آنتیں پیرس معائنہ کے لئے بھیج دی گئیں مگر وہاں سے بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ آیا۔

اس کے ایک سال بعد تک نہ کوئی طالب علم بیمار ہوا اور نہ کوئی مرا پھر یکایک دو تندرست و توانا طالب علم جن سے موردن بہت محبت کرتا تھا چند روز بیمار رہ کر چلتے ہوئے ان کا پوسٹ مارٹم ہوا تو ان کی آنتوں میں سے کانچ کے ذرے اور سوئیوں کے ٹکڑے ملے۔

عام طور پر گمان تھا کہ ان کے کھانے میں غلطی سے کوئی ایسی چیز مل گئی ہے جس میں کانچ کے ذرے تھے حالانکہ بورڈنگ ہاؤس میں کھانے کا معقول انتظام تھا بالخصوص کھانے کے معاملے میں وہ بہت سخت تھا کبھی طلبا کو خراب کھانا کھانے نہیں دیتا تھا۔

معاملہ زیادہ طول نہ کھینچتا اگر ان ہی دنوں میں بورڈنگ ہاؤس کی ملازمہ بیمار نہ ہو جاتی وہ بھی اسی عارضے میں مبتلا ہوئی جو طلبا کو لاحق ہوا تھا۔ ڈاکٹر کی مزید تشخیص پر ملازمہ نے کہا موردن نے طلبا کے لئے جو مٹھائی رکھی تھی وہ میں نے چوری سے کھالی۔

عدالت کے حکم سے بورڈنگ ہاؤس کی تلاشی لی گئی تو ایک الماری سے بچوں کے لئے رکھی ہوئی مٹھائی برآمد ہوئی مٹھائی کا ڈاکٹری امتحان ہوا تو پتہ چلا کہ اس میں کانچ کے سفوف کی آمیزش ہے۔

موردن گرفتار کر لیا گیا لیکن اسے اپنی گرفتاری پر کچھ رنج یا افسوس نہ تھا ثبوت اس قدر صاف تھا کہ مزید شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی لیکن ملزم

کی نیک مزاجی اور پارسائی کی وجہ کسی طرح یہ بات قیاس میں نہ آتی تھی کہ اُس نے
طلباء سے ایسی دشمنی کیوں کی۔ وہ ان سے بے انتہا محبت کرتا تھا اور اپنی
آمدنی کا نصف حصہ اُن پر خرچ کر دیتا تھا۔ پھر اگر اس نے قصداً ایسی حرکت
کی تو وہ یقینی پاگل ہوگا لیکن ایک ذہین اور عقل مند استاد جس کا برتاؤ
طلباء سے باپ جیسا رہا ہو اُسے کیوں کر پاگل کہا جاسکتا ہے۔

وہ جس دکان سے مٹھائی خریدا کرتا تھا اس دکان کی بھی تلاشی
لی گئی لیکن دکان سے کوئی ضرر رساں شے دستیاب نہ ہوئی معاملہ
صاف ہوگیا۔

سننے والوں میں سے ایک نے دریافت کیا "موردن نے اپنے
بچاؤ کے لئے کیا کیا؟"

اُس نے اپنا بیان دیا کہ یہ حرکت اس کے کسی دشمن کی معلوم ہوتی
ہے یا ممکن ہے کسی کو اُن طلباء سے دشمنی ہو اور اس نے کسی موذی کو
روپے کا لالچ دے کر ابھارا ہو کہ ان کے کھانے میں کوئی ایسی مہلک چیز
ملا دے جس سے وہ جانبر نہ ہوسکیں چنانچہ اُس ظالم نے مٹھائی میں ایسی
آمیزش کر دی اور اتفاق سے وہ مٹھائی ان طلباء کے کھانے میں آگئی۔

اُس کا بیان حقیقت پر مبنی معلوم ہوتا تھا اور بیان دیتے وقت
اُس نے ایسی شکل بنائی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بالکل بے گناہ ہے
بہت ممکن تھا ہم اُس کے بیان پر اُسے رہا کر دیتے لیکن ناگہاں اُس
کے خلاف ایسا سنگین ثبوت ملا جس نے اُسے صحیح معنوں میں مجرم قرار دے
دیا اور وہ ثبوت یہ تھا کہ اُس کے کمرے میں ایک ہلاس کی ڈبیا ملی جس میں
کانچ کا چورا بھرا تھا اور وہ ڈبیا ایسی جگہ سے ملی جہاں وہ اپنا روپیہ رکھتا تھا
تاہم اس نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے کہا یہ بھی اس کے
دشمن کی کارستانی ہے کیونکہ وہ خفیہ طریقے سے اسکول میں آجاتا تھا۔

ایک دن ایک بساطی نے آکر گواہی دی کہ موردن نے اُس کی
دکان سے باریک سوئیاں خریدی تھیں اور امتحاناً ایک سوئی کو توڑ کر دیکھا
تھا کہ وہ اس کے کام کی ہے یا نہیں بساطی نے ایک درجن گواہ پیش کئے
جنہوں نے موردن کو پہچانا اور پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ موردن طلباء کو اپنی نگرانی
میں مٹھائی کھلاتا تھا۔

اس کو پھانسی کا حکم ہوا اُس نے اپیل کی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا تاہم اُس
نے درخواست دی کہ اس کی پھانسی کا حکم چند روز کے لئے ملتوی کر دیا
جائے میں جانتا تھا کہ اس کی درخواست کبھی منظور نہ ہوگی کیونکہ اس کا جرم
بہت سنگین تھا۔

ایک دن میں آفس میں بیٹھا تھا کہ جیل کے پادری مجھ سے ملنے
آئے انہوں نے اپنی تمام زندگی قیدیوں میں گذاری تھی۔ وہ بہت تجربہ کار
آدمی معلوم ہوتے تھے لیکن ان کی صورت کسی اندرونی انتشار کا پتہ دے
رہی تھی۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی بات چیت کے بعد جب وہ جانے لگے تو
مجھ سے کہہ گئے " آپ بے گناہ موردن کو پھانسی دے رہے ہیں "
اُن کے اِن الفاظ نے مجھ پر بہت اثر کیا چنانچہ میں اُسی وقت صدر
جمہوریہ کی خدمت میں مقدمے کی تفصیلات بیان کرنے روانہ ہوگیا۔

جب میں حضور کے سامنے بیٹھا تفصیل بیان کر رہا تھا تو کمرے
کا دروازہ کھلا اور بیگم صاحبہ کمرے میں داخل ہوئیں انہیں میری موجودگی
کا علم نہ تھا وہ مجھے دیکھ کر واپس ہونے لگیں تو حضور نے انہیں بیٹھ
جانے کو کہا جب وہ بیٹھ گئیں تو حضور نے انہیں موردن کا مقدمہ سمجھایا
وہ سن کر کہنے لگیں " اس شخص کو معاف کر دیا جائے وہ بے گناہ معلوم
ہوتا ہے"۔

حضور پس و پیش کرنے لگے کیونکہ وہ اس واقعے سے سخت برافروختہ
تھے تاہم وہ انصاف کرنا چاہتے تھے ملکہ نے کہا " ایک بے گناہ کو قتل
کر کے گناہ گار کو چھوڑ دینا قرین انصاف نہیں"۔

حضور نے ان کی بات مان لی اور موردن کی پھانسی کا حکم
منسوخ کر دیا۔

. . . . . .

اس کے کئی سال بعد گرمی کے موسم میں اپنے چچازاد بھائی کے
ہاں بیٹھا تھا کہ ایک پادری آیا اور اس نے مجھ سے کہا " ایک شخص مر رہا
ہے اور وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے"۔

میں اس کے ساتھ ایک شکستہ مکان میں گیا ایک تنگ و تاریک
کمرے میں ایک آدمی بستر پر پڑا تھا اس کا جسم بالکل لاغر ہوچکا تھا اور شکل
سخت خوفناک ہو رہی تھی مجھے دیکھتے ہی اس نے پوچھا " آپ مجھے
پہچانتے ہیں۔؟

میں نے اپنے حافظے پر زور دے کر کہا —— "نہیں"۔
اُس نے کہا " میرا نام موردن ہے —— میں وہی اسکول ماسٹر
ہوں"۔

میں اُسے پہچان کر کانپ گیا میں نے دریافت کیا " تم یہاں

کیسے آئے؟

اُس نے کہا "یہ قصہ بہت طویل ہے اور اب میرا آخری وقت آپہنچا ہے۔ میں نے آپ کو اس لئے تکلیف دی کہ میں آپ کا شکریہ ادا کرلوں کیونکہ آپ ہی نے مجھے پھانسی سے بچایا تھا۔

ایک لمبی سی سانس لے کر اُس نے سلسلہ کلام جاری رکھا میں آپ سے جو کچھ عرض کرنے والا ہوں آپ اُسے بالکل سچ تصور کیجئے اسی صورت میں اطمینان کی موت مرسکتا ہوں۔ اس میں کلام نہیں کہ میں ان معصوم بچوں کا قاتل تھا لیکن میں نے ایسا کیوں کیا؟ محض قدرت سے انتقام لینے کے لئے۔ دنیا جانتی تھی کہ میں ایک نیک اور متقی شخص ہوں اور میں بھی اُس کی قدرت پر اعتقاد رکھتا تھا اور اُس کے رحم وانصاف کا قائل تھا لیکن میرا اعتقاد غلط ثابت ہوا۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ خدا دھوکا باز ہے۔ اس نے میرے پیارے بچوں کو مجھ سے چھین لیا۔

میں اُن بچوں سے دیوانہ وار محبت کرتا تھا۔ اس میں مطلق مبالغہ نہیں کہ میں اُن سے اتنی محبت کرتا تھا کہ آج تک دنیا میں کسی باپ نے اپنے بچوں سے نہ کی ہوگی میں دنیا میں صرف اُن ہی کے لئے زندہ تھا لیکن افسوس وہ سب رخصت ہوگئے۔

میں نے ایسا کیوں کیا؟ ان معصوم بچوں نے میرا کیا بگاڑا تھا کہ میں نے اُن کے خون میں اپنے ہاتھ رنگے؟

مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ زندگی کچھ نہیں ——— اس کی کوئی قیمت نہیں زندگی صرف ضائع ہونے کے لئے ہے انسان قدرت کے خلاف جنگ کر رہا ہے۔ چنانچہ میں نے بھی اس کے خلاف جنگ کی لیکن شکست ہونے پر میں نے اُس سے انتقام لینے کی ٹھانی میں خدا سے نفرت کرنے لگا۔

میں نے عہدِ مصمم کر لیا تھا کہ جس طرح اس نے میرے بچوں کو مجھ سے چھین لیا تھا اس طرح میں بھی اُس کے بنائے ہوئے ہنستے کھیلتے کھلونوں کو توڑ ڈالوں گا چنانچہ طلبا کو ایک ایک کر کے ختم کرنے لگا اگر میں گرفتار نہ ہوتا تو اور بچوں کو بھی موت کی نیند سلا دیتا۔ مجھے پھانسی کا حکم ہوا لیکن میں مرنا نہیں چاہتا تھا میں مرجاتا تو خدا مجھ پر ہنستا میرا مذاق اڑاتا اس لئے پادری سے قسم کھا کر میں نے جھوٹ کہا اور اس جھوٹ نے مجھے بچا لیا لیکن اب میں اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔ مجھے اب اس کی پروا بھی نہیں۔

یہ کہہ کر وہ چپ ہوگیا اس کا جسم پتے کی طرح کانپنے لگا۔ انگلیاں سکڑنے لگیں۔

میں نے دریافت کیا "کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟"

"نہیں ——— صاحب" اُس نے جواب دیا۔

میں نے پادری کی طرف دیکھا اس کا کالا لباس دیوار پر موت کا سیاہ عکس ڈال رہا تھا۔

موروں نے کہا "آپ یہاں ٹھہریئے"۔

موروں نے مجھ سے کہا "——— پادری خدا کا نام بار بار لے کر مجھے چڑاتا ہے چڑائے مجھے کوئی فکر نہیں"۔

میں کمرے سے نکل کر سڑک پر آگیا۔

(فرانسیسی)

تقی علی ہاشمی

رباعی

ناکامی سے جانِ کامیابی ہو جا
آزادِ مے و صراحی و گلابی ہو جا
ہو ولولۂ عمل سے آشنائے شباب
بے منتِ جام و مے شرابی ہو جا

سید محمد عسکری بی اے

تعبیرِ جنوں

تُو، ترے ہونٹوں کی شیرینی، ترا رنگیں شباب،
وہ ترے جلووں کی رعنائی کی بے پروائیاں
وہ ترے شیریں تبسم کی نمودِ بے حجاب
وہ ترے حُسنِ جنوں زا کی جنوں آرائیاں
خوابِ رنگیں تھا یہ، رنگیں تر مگر تعبیر تھی

آہ! تو نے کچھ مرے جذبات کی پروا نہ کی
میرے دل کے نازک آئینے کی قدر اصلا نہ کی
آہ! یہ دنیا تھی عشقِ باہمی کا اک فسوں
وہ تری پُر کیف رنگینی، مرا جوشِ جنوں!

تھا مرے چاروں طرف گویا ترا اپنا خیال!
اور مری تخلیق تیرا پیکرِ حسن و جمال!
میں تری تصویر تھا اور تو مری تصویر تھی

خواجہ حمید عرفانی ایم اے

غزل

جنوں نے کر دیا ہے مجھ کو بیگانہ گلستاں سے
بہار اٹھکیلیاں کرتی ہے کیوں چاکِ گریباں سے

تو کیا تم پرسشِ دل کے لئے اب بھی نہ آؤ گے
کہ آنسو خون کے بہنے لگے ہیں چشم گریاں سے

جو آزادی میں میرے آشیاں پر رقص کرتی تھیں
کبھی وہ بجلیاں ٹکرائیں آ کر بابِ زنداں سے!

سلامت رہ سکے گی زندگی اس کا بھروسہ کیا؟
کہ اب دستِ جنوں آگے ہے کچھ چاکِ گریباں سے

ہماری جستجو ہے عالمِ حیرت میں دنیا کو
کہ اُس کی جستجو میں بڑھ چلے ہیں حدِ امکاں سے

نہ جانے کس قدر ہیں تشنہ لب اس خاک میں پنہاں
صدائے العطش آتی ہے ذراتِ بیاباں سے

بتا اے ناخدا کیونکر ہو وہ آسودۂ ساحل
ابھرنا ہی جسے آتا نہ ہو موجوں کے طوفاں سے

یہ نالے یہ فغاں بیکار ہیں ان کی محبت میں
ظفر آسودگی پاؤ گے ضبطِ دردِ پنہاں سے

نذیر احمد ظفر

غزل

تیرگیٔ فراق سے ہے صبح سے بے نیاز کیوں؟ عشق ہے جانگداز کیوں؟ حسن ہے محوِ ناز کیوں؟

اب نہ وہ بزمِ ناز ہے اور نہ جلوہ سازیاں کر دیا میرے عشق نے حسن کو بے نیاز کیوں؟

نالۂ دل ہے بے اثر، دل نہیں سنگ ہی سہی! کون یہ کہہ سکے مگر سنگ ہے بے گداز کیوں؟

میرا جہان اور ہے تیرے خیال سے پرے پوچھ رہی ہے تو صبا میرے جنوں کا راز کیوں

سینۂ جوئبار میں کیوں ہے یہ جوشِ اضطراب؟ دامنِ ابر جل نہ جائے برق ہے شعلہ ساز کیوں

محو تھی ایک کائنات، جھوم رہے تھے بحر و بر
خونِ جگر کی داستاں ہو نہ سکی دراز کیوں؟

مسعودِ حفیظ

دنیائے ادب

اُردو کی شُستگی و نفاست میں آگرے کا حصہ

مغربی تمدن کی ترقی کے ساتھ علوم و فنون نے جو ارتقائی مدارج طے کئے ہیں وہ آج ہمارے سامنے ہیں۔ محض روایت کو ناکافی و غیر مفید دیکھ کر تاریخ نویسی کا دستور قدیم مسترد ہوا اور اس کی بنا درایت پر مستحکم کی گئی۔ ہمارے مورخوں نے بھی قدیم طرز واقعہ نگاری کی شکایتیں کیں اور جدید اسلوب اختیار کیا۔ مگر جب ہم زبان اردو کے جدید مورخین کی تالیفات پڑھتے ہیں تو سخت حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔ قدیم تذکرہ نویسوں سے اگر کچھ فروگذاشتیں ہوئیں تو ان کی طرف سے متعدد و معقول عذر لائے جا سکتے، لیکن عہدِ حاضر کا واقفِ فن لسانی مورخ اپنی تنگ نظری و فقدان درایت کی کیا توجیہہ پیش کر سکتا ہے!

اس مقالے میں ہم اس فروگذاشت کی تصریح اور ازالے کی کوشش کریں گے کہ اردو کے ارتقاء، شستگی و صفائی میں آگرے کی ارباب علم و ہنر نے ہر دور میں نہایت معقول حصہ لیا ہے، اور اس ذیل میں آگرے کی خدمات نہایت وزنی ہیں؛ لیکن ایک صفیر بلگرامی کے ماسوائے ہمارے مورخوں نے ارتقائے اردو کی تاریخ قلمبند کرتے وقت آگرے کی ان خدمات کو نظرانداز کیا ہے؛ اور اگر کہیں یہ ذکر ناگزیر طور پر آگیا ہے تو اس طرح بیان کیا ہے کہ آگرے کا نام نہ آنے پائے۔ متقدمین میں سے ہم مثال کے طور پر میر امن دہلوی کے دیباچہ، باغ وبہار سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

> "جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی و فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدا جدا تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرنے کے لئے ایک زبان اردو مقرر ہوئی۔"

ہر چند میر امن نے یہ عبارت مورخ کی حیثیت سے نہیں لکھی۔ لیکن ایک تاریخی بیان ضرور ہے۔ مگر ہمیں ان سے تعرض نہیں کہ انہوں نے اکبر کے پایہ تخت کا نام لینا کیوں روا نہ رکھا۔ وہ فی الحقیقت کوئی تاریخ مرتب نہیں کر رہے تھے اور کہا جا سکتا ہے کہ وہ جدید فن تاریخ نویسی سے واقف بھی نہ تھے لیکن اگر عہد حاضر کا کوئی مورخ اس فروگذاشت کا اعادہ کرے تو بازپرس لازمی ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال ہم شعر الہند سے دیتے ہیں:۔

> "۔۔ تیمور کے بعد شمالی ہند میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے قدرتی اختلاط کے علاوہ اکبر کے زمانے میں مختلف قوموں کے اختلاط کا ایک مصنوعی سبب اور پیدا ہو گیا یعنی اکبر نے قلعے میں ایک زنانہ بازار قایم کیا ۔ ۔ ۔"

ہمیں تسلیم ہے کہ صاحب شعر الہند کی نیت بخیر تھی، لیکن اس عبارت کے پڑھنے سے یہ سوال از خود پیدا ہوتا ہے کہ اکبر کا یہ قلعہ جہاں وہ بازار قایم ہوتا تھا کس مقام پر واقع تھا؟ اور جب یہ ظاہر ہے کہ وہ مقام آگرے کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تو ہمارے مورخ کو آگرے کا نام لیتے کیا قباحت محسوس ہوتی تھی؟

ہمارے اس بیان سے یہ خیال نہ ہونا چاہئے کہ ہمارا مدعا آگرے کا تفوق قائم کرنا یا اس کی مرکزیت تسلیم کرانا ہے۔ ہمارا مقصود صرف ایک تاریخی فروگذاشت کا ازالہ کرنا ہے

اردو کی تاریخوں کے مطالعے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ شمالی ہند میں زبان کا وہ دور تو متعین ہے جب مختلف زبانوں کے الفاظ مخلوط ہو رہے تھے اور نصف ہندی و نصف فارسی اشعار کی مثالیں بھی بہم ہو گئی ہیں۔ لیکن اس کے بعد ڈھلی ڈھلائی اور صاف شستہ زبان میں اساتذۂ متقدمین کے دیوان ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ امیر خسرو کی مثالوں کے بعد مخلوط زبان کے دس پانچ شعر ملتے ہیں اور پھر دفعتاً دکنی شعرا کا کلام پیش ہو جاتا ہے۔ شمالی ہند میں زبان کے بننے اور اس کے سدھرنے کی کڑی غائب نظر آتی ہے جس کو ہمارے مورخین زبان نے دکنی شعرا کے کلام سے مرتب کر کے دکھا دیا ہے لیکن ہم اس کڑی کو شمالی ہند میں ڈھونڈھنا چاہتے ہیں؛ اور معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مخلوط زبان، زبان کی حیثیت پا کر صاف و شستہ کہاں ہوئی؟ اور وہ کونسا مرکز تھا جہاں یہ عمل ہوتا رہا کہ جس نے دور اول کے اساتذہ مہیا کر دئے؟

اگر بعض فلاسفہ کی اس رائے کو پیش نظر رکھا جائے کہ واقعات کے اخذ و التقاط میں ایک مورخ اپنے رجحان طبع و پسند کو ترک نہیں کر سکتا اور اس لئے تاریخ ایک فرد واحد کی رائے اور مذاق طبیعت کا آئینہ ہونے سے زیادہ نہیں، تو ہماری سمجھ میں آجاتا ہے کہ آگرے کو نظر انداز کر دینے کا سبب سوا اس کے دوسرا نہیں ہو سکتا کہ دہلی و لکھنو کی مرکزیت کا خیال ہمارے مورخین زبان و ادب کے دماغوں میں عصبیت کی حد تک راسخ ہو گیا ہے اور ان کو اس ذیل میں کسی تیسرے مقام کا نام لینا بھی گوارا نہیں۔

تاریخی مباحث سے گفتگو کرتے وقت "پسند و رجحان" کے کلئے سے ہم اپنے آپ کو بھی محفوظ نہیں سمجھتے لیکن بایں ہمہ یہ حق ہم کو ضرور حاصل رہتا ہے کہ ہم ایک مورخ کے کسی واقعے کو قلمبند کرنے یا قلم انداز کر دینے پر جرح و تعدیل کر سکیں۔

یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ اردو کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور اس کی جنم بھومی بننے کا فخر دکن کو حاصل ہے یا پنجاب کو۔ لیکن اس کے آغاز کے متعلق چند اشارات ناگزیر ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مسلمانوں کے تداخل ہند کے ساتھ جس مخلوط زبان کی بنا پڑی اس نے علمی صورت اختیار کرنا کب سے شروع کیا؟ اگر غور کی نظر ڈالی جائے گی تو اردو کے علمی جامہ پہننے کی ابتدا اس وقت سے نظر آئے گی

جب سکندر لودھی نے آگرے کو پایۂ تخت بنایا اور ہندوؤں نے فارسی زبان سیکھنا شروع کیا۔ منتخب التواریخ سے اس عہد کے بیان میں ہیں۔ پنڈت ڈونگرمل کا نام ایک فارسی کے شاعر کی حیثیت سے ملتا بھی ہے جو غالباً فارسی کا یہ پہلا ہندو شاعر تھا۔

بہر حال اس امر کے ثبوت میں کافی و وافی شہادت ملتی ہے کہ اس مخلوط زبان نے عہد اکبری میں ایک شکل اختیار کرنا شروع کر دیا تھا جس میں اکبر کا مینا بازار معقول حد تک ممد و معاون ثابت ہوا۔ یہ حقیقت ہمارے پیش نظر ہے کہ قریب قریب اس عہد میں یہی کام دکن میں بھی جاری تھا؛ اور کہا جا سکتا ہے کہ اردو کی تشکیل میں مغلیہ و قطب شاہی درباروں کو برابر کا درجہ حاصل ہے۔ لیکن دقت نظر کے ساتھ دیکھنے پر یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اردو جس زبان کا نام ہے۔ وہ برج بھاشا کی ترقی یافتہ صورت ہے اور اس کی تشکیل آگرے ہی میں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ آگرہ خود برج میں داخل ہے۔ دکن میں جو زبان بن رہی تھی اس کی بنا برج بھاشا نہیں بلکہ دکنی بولی ہو سکتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ مولف آب حیات کو اس معاملے میں مغالطہ ہوا اور مورخین مابعد آنکھ بند کر کے انکار کرتے رہے۔ نہ سپہر میں امیر خسرو کے بیان سے یہ بات مصدق ہے کہ دکنی ایک جداگانہ بولی تھی۔ یہ ایک دوسری بحث ہو گی کہ آیا دکنی اور بھاشا میں کوئی تعلق تھا یا نہیں اور دکنی شاعری اردو شاعری میں کب اور کیسے مدغم ہو گئی۔؟

تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ بات مخفی نہ ہونا چاہئے کہ شاہجہاں نے دہلی آباد کر کے جب اپنا پایۂ تخت آگرے سے وہاں منتقل کر لیا تو اس کے بعد بھی بہت عرصے تک آگرہ نہ صرف علمی و ادبی مرکز بنا رہا بلکہ سیاسی چالوں اور ریشہ دوانیوں کا تماشا بھی آگرے ہی کے اسٹیج پر کھیلا جاتا رہا اور اس امر کی شہادت بھی تلاش کرنا نہ پڑے گی کہ دکن میں اورنگ زیب کی وفات تک دہلی برائے نام پایۂ تخت تھا ورنہ تمام سیاسی واقعات و امور آگرے ہی میں رونما ہوتے اور طے پاتے رہے اور ارباب فضل و کمال کی جو محفل عہد اکبری سے قایم تھی۔ وہ اس وقت تک آگرے ہی میں جمی رہی۔ اس لئے ناگزیر طور پر یہ مستنبط ہوتا ہے کہ شمالی ہند میں تشکیل اردو کا عمل اسی مجلس کے ہاتھوں سر انجام پاتا رہا۔ یہ ہمارے محقق مورخوں کا کام تھا کہ ان تاریخی واقعات پر نظر کرتے شواہد کی جستجو کرتے اور اس کڑی کو شمالی ہند ہی کے اندر مرتب کرتے۔

اگر آگرے کے ساتھ یہ بے اعتنائی نہ برتی گئی ہوتی تو ہمارا خیال ہے کہ ارتقائے زبان کی یکم شدہ کڑی منطقی نتائج کی صورت میں از خود مل گئی ہوتی۔ بہر حال ایک لسانی محقق کے لئے یہ میدان آج بھی کھلا ہوا ہے۔

اردو زبان کے ارتقاء کا مختصر خاکہ ذیل کے اقتباس میں پیش کیا جاتا ہے۔ صفیر بلگرامی جلوۂ خضر میں لکھتے ہیں:۔

"امیر خسرو نے اس طفل نو خیز کو نظر توجہ سے دیکھا مگر اکبر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور چاہا کہ اس کو سرفرازی کا خلعت بخشا جائے اور اس خلعت کی تیاری میں مصروف ہوا۔ راجاؤں کی بیٹیاں گھر میں لایا۔ ہزاروں سہیلیوں سے اپنا محل بھر دیا۔ علما سے ہندی کتابوں کا فارسی ترجمہ کرایا، ہندو کو دربار میں دخل دیا اور ان سے بات چیت کا موقع ہر طرح رکھا۔ بیربل کی شوخیاں مشہور عام ہیں۔ مکانات اوقات اور اشیاء کے نام ہندی یا ہندی فارسی آمیز رکھے، اور محل میں رہنا، بازار بنوایا۔ یہ سب خلعت اردو کے سامان ہیں۔ مگر اس کو بھی زندگی نے مہلت نہ دی کہ ابھی خلعت ناتیار تھا کہ اکبر تمام ہوا۔ حقیقت میں جیسی توجہ بدل اکبر نے ہندیوں کی طرف کی تھی اگر وہ اور زندہ رہتا تو اردو کی صورت اسی وقت میں سب کو نظر آتی، اور دربار میں یہی زبان شائع ہو جاتی۔ مگر یہ بھی واضح رہے کہ اکبر نے اپنا پایۂ تخت اکبر آباد میں مقرر کیا تھا اور ہمیشہ وہیں رہتا تھا۔ دہلی کو اس نقش اکبری سے چنداں حصہ نہ ملا۔"

جلوۂ خضر کے صفحہ نمبر ۵۵ پر درج ہے:۔

"جہانگیر کے وقت میں بھی یہیں بازار قایم رہا۔ شاہ جہاں کے دور میں اور ترقی ہوئی کہ یکایک اکبر آباد سے شاہ جہاں کا دل اچاٹ ہوا اور دہلی جا بسایا۔ آگرے میں شاہجہاں کے وقت میں اردو کی صورت قایم ہونا اچھی طرح ثابت ہوتا ہے۔ بادشاہ کے دربار و دفتروں کی زبان فارسی تھی مگر اردو اس کے عہد میں زبانوں پر آ چلی تھی ․․․․ میں نے شاہ جہاں کی ایک تحریر اردو دارا شکوہ کے نام دیکھی ہے جو اس وقت یاد نہیں"

اب ہم مختلف زبان کے چند ایسے اشعار پیش کرنا چاہتے ہیں جو اردو کی تشکیل کو صدق کرنے کے ساتھ اس کا بھی ثبوت ہیں کہ آگرے میں مغلیہ دربار قایم ہونے تک زبان میں روانی آ چلی تھی اور اس منزل میں تھی جس کے بعد دور اول کے شعراء کا کلام رونما ہونا مستبعد نہیں رہتا، اور یہ کہ شمالی ہند میں اردو کا استحکام بلاواسطہ ہوا اور اس میں دکنی شعراء کا کوئی حصہ نہ تھا۔

صاحب جلوۂ خضر نے تزک جہانگیری کے حوالے سے اکبر کی ایک رباعی نقل کی ہے جو اس نے جہانگیر کی درخواست معذرت پر لکھی تھی۔

پوچھی جو گھڑی مجھ سے براہ عادت
تو وصل کو ساعت کی نہیں کچھ حاجت
ہو جاتی ہے ملنے سے مبارک ساعت
ساعت کا بہانہ نہیں، خوش ہر ساعت

خندۂ گل کے مولف نے ملا ابوالحسن دوپیازہ کا ذیل کا شعر نقل کیا ہے۔

وہ گورا گورا لڑکا باہمن کا شوخ گھونا
ایسا لگے ہے مجھ کو جوں کھانڈ کا کھلونا

مغل اور اردو میں جلوۂ خضر کے حوالے سے نور جہاں کے دو شعر منقول ہیں۔

دیں جگہ زخم وفا کو دل صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا اس بت بے باک میں ہم
نقش پا کی طرح اے راحت جان عاشق
تیرے قدموں سے جدا ہو کے ملے خاک میں ہم

خمخانۂ جاوید میں پنڈت چندربھان برہمن اکبرآبادی کے جو دارا شکوہ کے میر منشی تھے کچھ شعر نقل کئے گئے ہیں۔ ایک شعر یہاں درج کیا جاتا ہے:۔

خدا نے کس شہر اندر ہمیں کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے، نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

مغل اور اردو میں جلوۂ خضر کے حوالے سے زیب النساء سے منسوب تین شعر درج ہیں۔ ایک شعر پیش کیا جاتا ہے۔

جدا ہو مجھ سے مرا یار یہ خدا نہ کرے
خدا کسی کے تئیں دوست سے جدا نہ کرے

اسی سلسلے میں کہ دکن کی شاعری کے دہلی میں متعارف ہونے سے قبل شمالی ہند میں شعر کس درجے پر تھا، اور بھی چند مثالیں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

میر حسن نے اپنے تذکرے میں ایک شاعر تخلص بہ خاکی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ دہلی میں درویشانہ زندگی گزارتا تھا۔ صاحب گل رعنا کا قول ہے کہ "اس وقت تک دلی میں اردو شاعری کا سراغ نہیں ملتا" لیکن بقول صاحب گل رعنا سید محمد بن جمال الدین قادری متخلص بہ خاکی کا ایک ردیف وار مکمل دیوان مولانا حبیب الرحمان شروانی کے کتب خانے میں ملتا ہے اور دیوان کے علاوہ خاکی کی ایک مثنوی موسوم بہ فیض عام مورخہ ۱۱۴۷ھ بھی ہے۔ صاحب گل رعنا کا خیال ہے کہ میر حسن نے جس خاکی کا ذکر کیا ہے وہ یہی خاکی ہے۔ جس کے تین شعر ہم گل رعنا سے یہاں نقل کرتے ہیں:۔

جائز نہیں تھیں ہجر کے شب کی شکائتیں
مجھ کوں خصوص آج تو للّٰہ وصال تھا

اپنے معشوق سنگ ہور ہنا، ایک دل ایک رنگ ہور ہنا
خوش یہی حال ہے فقیری کا نفس و دل بیچ جنگ ہور ہنا

مرزا عبد القادر بیدل کے دو شعر اکثر تذکروں میں آئے ہیں ایک شعر یہ ہے:۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم ہیں۔
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں

قزلباش خاں امید کے دو شعر ملاحظہ ہوں:۔

در و دیوار سے اب صحبت ہے یار بن گھر میں عجب صحبت ہے
تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں الحفیظ الحفیظ کہتا ہوں

مذکورہ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہند میں عہد عالمگیری ہی میں اردو زبان شعرائے دکن کی محمد شاہی عہد کی زبان سے کہیں زیادہ صاف و شستہ تھی ولی کی اس زبان سے بھی جب تک کہ اس نے دہلی کا اثر قبول نہ کیا تھا۔ یہاں یہ فراموش نہ ہونا چاہئے کہ اگر شاعری اس وقت دکن ہی میں تھی تو دہلی میں وہ کونسی خصوصیت تھی جس کی طرف شاہ گلشن نے ولی کو توجہ دلائی؛ اور جس کے اختیار نہ کرنے سے بھی زبان اس قدر نکھر کس طرح گئی؟

اب ہمیں اس بات کو دیکھنا ہے کہ زبان میں یہ سلاست و روانی پیدا ہو جانے کا مرکز کہاں تھا؟ جس قدر تلاش و جستجو کی جائے گی جتنی شہادت فراہم ہو سکے گی، اس سے یہی نتیجہ نکلے گا کہ وہ مرکز آگرے کے سوا دوسرا نہیں تھا۔ ورنہ پھر سوال یہ پیدا ہوگا کہ آبرو، مضمون، آرزو اور مظہر نے زبان کہاں حاصل کی اور ان کے مذاق شعری نے کہاں تربیت پائی کہ دہلی پہنچ کر صدر بزم شعر و ادب بن سکے۔

محمد شاہ کے عہد سلطنت میں ظاہر ہے کہ آگرے کا اجتماع قائم نہ رہ سکتا تھا۔ کچھ لوگ شاہ جہاں کے ساتھ گئے، کچھ اورنگ آباد کے دربار میں جا پہنچے، رہے سہے اب دہلی پہنچنے لگے۔ کیوں کہ آگرہ درباری سرپرستی سے محروم، اور وہاں کے ارباب فن قدر دانی سے مایوس ہو گئے تھے۔ جن لوگوں کو کس مپرسی ناپسند اور وطن کی گوشہ گیری نامطبوع تھی۔ وہ رفتہ رفتہ دہلی کو آباد کرنے لگے۔

شاہ مبارک آبرو عالمگیری عہد کے لوگوں میں سے تھے۔ شعر و ادب کے پرستاروں میں یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے نقل وطن کیا۔ اسی زمانے میں میاں شرف الدین مضمون، مولوی عبد الرب، نواب اسدیار خاں وغیرہ باری باری سے دہلی جا پہنچے۔ اس وقت دہلی میں زبان و شعر کی حیثیت جعفر زٹل کے کلام سے متحقق ہو سکتی ہے۔ لیکن جب آبرو و مضمون نے وہاں پہنچ کر شعر و سخن کی بساط بچھائی تو دہلی میں زبان اردو نے تشخص حاصل کیا؛ اور بلاریب دہلی کی بزم زبان و ادب کے بانی یہی تھے اور شعرا اردو کا دور اول انہیں سے عبارت ہے۔ یہ بتانے کے لئے کہ اس دور میں ان بزرگوں کو کیا مرتبہ حاصل تھا، اردو کے مستند تذکرہ نویسوں کے چند اقتباس پیش ہیں۔ آبرو کے ذکر میں میر تقی نکات الشعرا میں فرماتے ہیں:۔

"شاعرے نادرہ گوے ریختہ۔ مے گویند کہ طبع شوخے داشت؛ غرض ستنی وقت خود بود۔"

میر حسن لکھتے ہیں:۔

"از ابتدائے جوانی مشق سخن می کرد۔ شاعرے خوش گوئے در وقت خود بود۔"

آب حیات میں ہے:۔

"یہ اپنے زمانے میں مسلم الثبوت شاعر زبان ریختہ کے اور صاحب ایجاد نظم اردو کے شمار ہوتے تھے۔"

گل رعنا کی عبارت ہے:۔

"اور حق تو یہ ہے کہ دہلی میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز انہیں سے ہوا۔"

میاں شرف الدین مضمون کے متعلق نکات الشعرا کا بیان ہے:۔

"حریف ظریف، بشاش بشاش، ہنگامہ گرم کن مجلسہا ہرچند کم گو بود لیکن بسیار خوش فکر و تلاش لفظ تازہ زیادہ"

میر حسن فرماتے ہیں:۔

"از اکبرآباد آمدہ بشاہجہان آباد و در زینت المساجد استقامت ورزید، ہرچند کم گو لیکن خوش گو"

جب ان باکمالوں نے دہلی میں شعر و ادب کی محفل ترتیب دی تو وہاں کے جوہر قابل کو بھی ابھرنے کا موقع ملا۔ دور اول میں جن دہلوی شعرا کے نام چمکے ان میں ناجی، یک رنگ و احسن نمایاں ہیں ان حضرات کے تعلق اردو کے متعلق مستند تذکرہ نویسوں کی رائیں پیش کی جاتی ہیں۔

ناجی کے ذکر میں میر حسن کا خیال یہ ہے:۔

"مردے ظریف بود اکثر لطائف و ظرائف آں مرد ہاں را بخندہ می آورد خود نمی خندید۔ تبسمے کرد، تلاش صنعت ایہام بسیار داشت"

نکات الشعرا میں ہے:۔

"مزاجش بہ ہزل مائل بود"

شعرالہند کا بیان ہے:۔

"اُن کی حیثیت جعفر زٹل سے زیادہ نہ تھی"

تذکرۂ قدرت کے الفاظ ہیں:۔

"ہرچند پرگو فاتا بسیار پوچ گوست"

گل رعنا کی عبارت ہے

"کہن سال و کہنہ مشق تھے، مگر باوجود اس کے حضرت مظہر رحمۃ اللہ علیہ کو کلام دکھانے آتے مشورہ سخن کرتے تھے مصحفی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ ایک قول کے مطابق وہ خان آرزو اور ایک قول کی بنا پر شاہ مبارک آبرو کے شاگرد سمجھے جاتے ہیں"

آبرو مضمون کے زمانے ہی میں آگرے سے نقل وطن کرنے والوں میں خان آرزو و مرزا مظہر جان جاناں کے نام بھی ہیں۔ اردو کے استحکام و شستگی میں، دور متقدمین میں جو درجہ سراج الدین علی خاں آرزو کو حاصل ہے وہ ذیل کے اقتباسات سے ظاہر ہے،

"سراج الدین علی خاں آرزو بعد امیر خسرو دہلوی چنیں صاحب کمال پرگو و خوش گو، بمسامع عالمیان نہ رسیدہ، ہفت دیوان دارد کہ ہر یکے پہلو بہ نظیری و فغانی می زند۔ فکر صائب از تزلزل در دکان مضامین بتنزل انداختہ شاعر فارسی۔ عالم فاضل شہرۂ آفاق در سخن فہمی طاق، استادان ریختہ شاگرد او بند"

(تذکرہ میر حسن)

"ہمہ استادان مضبوط فن ریختہ ہم شاگردان آں بزرگوار اند"

(نکات الشعرا)

"خان آرزو کو زبان اردو پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے جو کہ ارسطو کو فلسفۂ منطق پر ہے۔ جب تک کہ کل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے تب تک اہل اردو خان آرزو کے عیال کہلاتے رہیں گے۔ . . . خان آرزو وہی شخص ہیں جن کے دامن تربیت سے ایسے شائستہ فرزند پرورش پاکر اُٹھے جو زبان اردو کے اصلاح دینے والے کہلائے اور جس شاعری کی بنیاد جگت اور ذو معنی لفظوں پر تھی اسے کھینچ کر فارسی یا دائے مطلب پر لے آئے یعنی مرزا جان جاناں، مرزا رفیع، میر تقی، خواجہ میر درد" (آب حیات)

مرزا مظہر جان جاناں کے متعلق میر حسن کی رائے یہ ہے:۔

"مرزا مظہر از فصحائے زمان و بلغائے دوران شاعریست مقدس و بزرگ، خوش تقریر بمرتبہ ایست کہ در تحریر نمی گنجد۔ یقین و حزیں شاگردان اویند"

مولف آب حیات کی عبارت ہے:۔

". . . زبان کی اصلاح و انداز سخن اور تحریر کی ایجاد میں انہیں ایسا ہی حق ہے جیسا کہ سودا و میر کو"

تذکرۂ قدرت کے الفاظ ہیں:۔

"می گویند کہ اول کسے کہ طرز ایہام گوئے را ترک نمودہ ریختہ را در زبان اردوئے معلیٰ شاہ جہان آباد کہ الحال پسند خاطر عوام و خواص گردیدہ مروج ساختہ، مرزا مظہر جان جاناں متخلص بہ مظہر مردیست فرشتہ صفت . . ."

گل رعنا کی رائے ہے:۔

"مرزا جان جاناں مظہر نے اس خارزار کو ایسا چھانٹا کہ شاعری ساحری بن گئی۔ پھر اپنی زور طبع و خداداد قابلیت سے اچھوتے مضمون اور فارسی ترکیبوں اور اردو کے دلکش محاوروں کو اس طرح پر ترتیب دیا اور وہ خوبی پیدا کی کہ ایہام اور تجنیس وغیرہ صنائع لفظی جو ہندی دوہروں کی بنیاد تھے اسے سب بھول گئے۔ حزیں، بیان حسرت، فقیہہ، درد مند نے ان کے سامنے زانوئے

تلمذ نہ کیا اور میر و مرزا وغیرہ نے ان کا تتبع کر کے اردو شاعری کو معراج
کمال پر پہنچا دیا۔ یہ اردو شاعری کے مورخ کی سخت بے انصافی ہے
کہ اس نے مرزا صاحب کے اس احسان کا اعتراف نہیں کیا
بلکہ ان کی کمال شاعری کو دبانے کی ہر جگہ بے سود کوشش کی ہے۔"

ان باکمالوں کے بعد میر تقی کا نام آتا ہے۔ اس خدائے سخن کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ میر نے اردو شعر میں وہ شے شامل کر دی جس کے بغیر شعر، شعر نہیں ہو سکتا تھا۔

اس موقع پر مرزا رفیع سودا کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جن کو آبحیات میں شاہ حاتم کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ لیکن آبحیات کے اس بیان کی تائید کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہوتی۔ البتہ اس بات کو متعدد مورخوں نے لکھا ہے کہ مرزا سودا نے خان آرزو سے استفادہ کیا۔ ہر چند اس وقت تک سودا فارسی میں مشق سخن کرتے تھے، لیکن اردو میں شعر کہنے کا مشورہ ان کو خان آرزو ہی سے ملا تھا۔

سودا نے اپنے کلام میں شاہ حاتم کی شاگردی یا تقلید کی طرف کہیں اشارہ نہیں کیا ہے، البتہ آبرو مضمون کے طرز کے معترف نظر آتے ہیں:۔

اسلوب شعر کہنے کا تیرے نہیں ہے یہ
مضمون و آبرو کا ہے سودا یہ سلسلہ

میر کے ذکر کے بعد ہی مرزا غالب کا نام لینا پڑتا ہے کہ پیغمبر سخن تھے۔ غالب کے ذکر میں ہم صرف ایک اشارہ کریں گے؛ اور وہ یہ ہے کہ ان کے رنگ شاعری کی آج پرستش ہوتی ہے اور امتداد وقت کے ساتھ اس پرستش میں خشوع و خضوع بڑھتا جائے گا۔ غالب کی شاعری کے بغیر اردو شاعری جس مرتبے کی ہوتی اس کا اندازہ بآسانی ہو سکتا ہے۔ اردو نثر میں مرزا غالب نے جو انقلابی بنیاد رکھی۔ وہی اس تعمیر کی تکمیل بھی تھی کہ آج تک اس سے زیادہ سلیس زبان کا تصور نہیں بندھ سکا ہے۔ اس ذکر میں یہ بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ غالب کے رقعات کی تاریخ ۱۸۵۰ء ہے، لیکن غالب کے رقعات مرتب ہونے سے چار سال پہلے خان بہادر ذوالقدر خواجہ غلام غوث اکبر آبادی کے خطوط جو ویسی ہی سادہ و سلیس زبان میں ہیں مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن ان کی اشاعت ۱۸۹۵ء سے قبل نہ ہو سکی؛ اور خواجہ غلام غوث ہی وہ بزرگ ہیں جنہوں نے اصل میں عود ہندی کو جمع و مرتب کیا ہے۔

مولوی عبدالرب صاحب اکبر آبادی

عہد محمد شاہی میں آگرے سے دہلی پہنچے اور ۱۱۳۶ھ میں شاہی رصدگاہ میں بیٹھ کر علم مساحت پر ایک کتاب اردو میں لکھی۔ مگر اس سے بھی قبل وہ ایک رسالہ ریاضی پر لکھ چکے تھے اور اس طرح اردو نثر کے اولین مصنف ہونے کا استحقاق مولوی عبدالرب کو پہنچتا ہے۔

شیخ قلندر بخش جرات بھی ان ہنرمندانِ آگرہ میں سے ایک ہیں جنھوں نے ترک وطن کر کے شعر و سخن میں اپنا درجہ قائم کیا ہے۔ جرأت کے متعلق مولانا آزاد نے آبحیات میں لکھا ہے کہ وہ صاحب طرز و ایجاد تھے اور آج تک ان کا طرز بیان انہی سے مخصوص ہے۔

ہم نے بخیال طوالت متقدمین و متوسطین شعرائے اکبر آباد کے تلامذہ کے ذکر کو قلم انداز کر دیا ہے، لیکن ایک جستجو کرنے والے کو تذکروں کے مطالعے سے بآسانی پتہ چل سکتا ہے کہ ان باکمالوں کے دریائے فیض سخن نے کتنی ندیاں اور نہریں جاری کر دیں اور ان ندیوں اور نہروں نے کتنے بڑے رقبے کو سیراب کیا۔ یہاں ہم میر تقی کے ہم عصر اساتذہ و ادبائے اکبر آباد کے چند نام لیں گے جو آگرے سے باہر نہیں گئے۔

میر امجد علی اصغر ... صاحب دیوان تھے۔ صاحب گلشن بیخار نے تذکرہ کیا ہے۔

میاں نظیر اکبر آبادی

قاضی واجد علی خاں واجد ... نغمۂ عندلیب میں ذکر ہے

میاں محمدی بیدار ... صاحب دیوان تھے۔ اکثر تذکروں میں ذکر آیا ہے۔

مرزا اکبر قلی ... تذکرہ میر حسن۔

شرف الدین علی پیام ... "

جنون ... "

میر محمد سجاد سجاد ... " میر تقی ان کی شاعری کے بڑے مداح تھے۔

محمد محسن محسن ... "

محمد عارف عارف ... "

محرم ... گلشن بے خار

سید حسن خاں محو ... نغمۂ عندلیب۔

بقاء اللہ بقا ... تذکرۂ سرخوش۔

میاں نظیر اکبرآبادی کی خصوصیات شاعری پر اس عہد میں کچھ توجہ ہوئی ہے مگر ان کے متعلق ہنوز بہت کچھ کام ہونا ہے۔ اس مضمون میں یہ اشارہ کر دینا کافی ہوگا کہ آج سے کم وبیش سو سال قبل میاں نظیر نے اس صنف کلام کی بناڈالی جو اس زمانے میں باوجود اس قدر مقبول ہونے کے اتنی مکمل صورت اختیار نہیں کر سکی ہے۔ فطرت نگاری کو ابھی اتنا حقیقی اور سچا ہونے میں دیر لگے گی جس مقام پر اس کو نظیر پہنچا گئے ہیں۔ ہماری آنکھیں اس زمانے کو دیکھ رہی ہیں جب اردو زبان کے بولنے والے تنہا ایک نظیر کو اردو کا فطری وحقیقی شاعر مانیں گے۔ نظیر کے متعلق ایک مزید اشارہ شاید بے محل نہ ہو اور وہ ان کی فرہنگ سے متعلق ہے۔ نظیر کے یہاں ہمارے خیال میں الفاظ کی اتنی کثرت اور بہتات ہے جو کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہ ملے گی۔ نظیر کا مطالعہ کرنے والے کے لئے ان کی فرہنگ ایک مفید موضوع تحقیق ہو سکتا ہے۔ اس ذیل میں ہم ایک نکتہ اور پیش کریں گے۔ آج لکھنوی زبان کی خصوصیات میں زری بہ معنی ذرا ٹھیٹ لکھنو کا لفظ باور کیا جاتا ہے، مگر یہ لفظ نظیر کے یہاں بار بار استعمال ہوا ہے۔

عہدِ غالب میں جن کے ہم عصر اساتذۂ اکبرآباد میں سے بعض کے نام یہ ہیں:-

خلیفہ اسیر خلف میاں نظیر اکبرآبادی ... صاحب دیوان تھے۔

مرزا اعظم علی بیگ اعظم ... صاحبِ دیوان ہونے کے علاوہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

انعام اللہ انعام وساحر ... خمخانۂ جاوید میں تذکرہ ہے۔

شیخ نیاز علی پریشان ... مصنف مثنوی سرمایۂ عشق دو اسوخت وتذکرہ شعر وسخن۔

سید مددعلی تپش ... مصنف خزینۃ القواعد وجغرافیۂ منظوم۔

مولوی نبی بخش حقیر ... صاحب دیوان تھے اور سخن فہمی کے لئے غالب کے ممدوح ہیں۔

مہاراجہ بلوان سنگھ ... صاحبِ دیوان تھے۔

مرزا خانی رنج ... واسوخت ومثنویاں یادگار ہیں۔

غلام محمد رہا ... صاحب دیوان۔

سید بلاقی زر ... دو دیوان دو واسوخت اور مثنوی موسیٰ وفرعون یادگار ہے۔

قطب الدین خاں باطن ... صاحب دیوان ہونے کے علاوہ تذکرہ گلستان بےخزاں، نسخہ تقویم مراۃ خیال، مثنوی غم دل ربا اور خمسہ مثنوی میرحسن کے مصنف ہیں۔

احمد خاں شیفتہ ... مثنوی یادگار ہے نغمۂ عندلیب میں ذکر ہے۔

منشی جواہرلال جواہر ... مثنوی جواہرالبیان یادگار ہے اور زبدۃ التاریخ کے نام سیرالمتاخرین کا خلاصہ بھی لکھا ہے۔

میر سعادت علی سعید ... صاحب دیوان تھے۔

مولوی اصغر علی اصغر ... مصنف مثنوی شورش عشق، مثنوی بہار خرد، وقائع منصورالزمان، نیرنگ فرنگ، مفتاح العزائف، لغات اصغر علی وغیرہ۔

اس مقالے میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم اساتذہ اکبرآباد یا صرف میرو غالب کے ہم عمر شعرا وادبا کے کلام نظم ونثر کا دوسرے مرکزوں کے اساتذہ سے مقابلہ کر سکیں۔ اس کے لئے ایک پورے دفتر کی ضرورت ہے۔ یہاں ہم دو چار بزرگوں کے متعلق چند اشارات کافی سمجھتے ہیں۔ ان میں ایک ہستی میر اعظم علی اعظم کی ہے۔ یہ میرامن کے ہم عصر ہیں اور جس زمانے میں باغ وبہار چھپی اس سے آٹھ سال قبل اعظم اسی قسم کا ایک افسانہ موسوم بہ فسانۂ سرور افزا لکھ چکے تھے۔ لیکن افسوس کہ یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکی۔ لیکن اعظم کا کارنامہ ایک دوسری کتاب ہے جس میں انہوں نے اس وقت تک کی فارسی واردو کتابوں پر تبصرہ کیا تھا مگر حیف کہ وہ کتاب بھی مسودے کی ہی صورت میں رہی۔

دوسرا نام قطب الدین خاں باطن کا ہے جو صاحب دیوان ہونے کے علاوہ تذکرہ گلستان بےخزاں (یا نغمۂ عندلیب) کے مؤلف ہیں۔ یہ تذکرہ نواب شیفتہ کے تذکرے کے جواب میں لکھا گیا تھا کیونکہ شیفتہ نے میاں نظیر کا ذکر اہانت آمیز الفاظ میں کیا تھا۔ اس تذکرے کی قدر وقیمت مطالعے کے بعد معلوم ہو سکتی ہے۔ باطن نے اس کے علاوہ بھی کئی تصنیفیں چھوڑی ہیں۔

پھر مولوی اصغر علی اصغر کا نام آتا ہے جو کم و بیش ستر کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں نصف کے قریب غیر مطبوعہ رہیں۔ وقائع منصور الزمان سات جلدوں میں بجواب بوستان خیال لکھی تھی۔ لیکن اس کی صرف پہلی جلد شائع ہو سکی۔ غالباً یہ کتاب پہلی نہیں تو چند پہلی کتابوں میں سے ہے جو سادہ غیر مقفیٰ زبان میں تصنیف ہوئیں ورنہ اس وقت تک اردو نثر مقفیٰ و مسجع عبارت ہی میں لکھی جاتی تھی۔

یہاں تک کے بیان سے یہ بات واضح ہو جانی چاہئے کہ آغاز اردو سے لے کر اس وقت تک جب کہ شعر اردو مضمون و تخیل کے اعتبار سے شعر بنا، آگرے کے ہنرمند و اہل کمال نہ صرف پیش پیش رہے بلکہ ہر عہد میں اردو کا پرچم انہیں کے ہاتھوں میں لہراتا رہا ہے لیکن مورخوں نے آگرے کی ان خدمات کو ایسی ہٹ دھرمی کے ساتھ پامال کیا کہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سا بزرگ بھی بے تاب ہو گیا۔ مقدمہ نکات الشعرا میں مولانا شروانی لکھتے ہیں:۔

"دہلی و لکھنو کی ہنگامہ آرائیوں میں آگرہ گرد درگم ہے۔ مگر اس کی بے زبانی صاف کہہ رہی ہے کہ تیسرے دور تک جو بلاکشان محبت بزم سخن میں آئے ان میں سے اکثر کے دماغ اسی کے بادۂ کہن سے پرکیف تھے۔ شاہ مبارک آبرو، شرف الدین مضمون، سراج الدین علی خاں آرزو، مرزا مظہر قدس سرہٗ، میر تقی کی ذات پر اول اکبرآباد کو ناز ہے اس کے بعد دہلی و لکھنو کو۔ جب مرزا غالب بھی بزم آرا ہو جائیں پھر آنکھ ملانا آسان نہیں رہتا۔"

اب ہم ایک اقتباس مولانا نشتر مرحوم کے مضمون سے دیتے ہیں جو نقاد مئی ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا تھا:۔

"واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان آگرہ و دہلی میں پیدا ہوئی۔ اردوئے معلیٰ میں نشو و نما پا کے اس نے اپنی موجودہ صورت پیدا کر لی۔ شجاع الدولہ، آصف الدولہ، اور سعادت علی خاں کے زمانوں میں دربار دہلی کی کمزوری و بے استطاعتی اور لکھنو کے نوابی دربار کی دولت مندی و قدر دانی کی وجہ سے تمام صاحبان کمال لکھنو پہنچ گئے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور اکبرآباد میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما پایا، ناشر بے ہمتا بننے کے بعد لکھنو میں آئے"۔

صفیر بلگرامی کی رائے بھی سن لیجئے۔ جلوۂ خضر میں لکھتے ہیں:۔

"نثر میں لکھنو نے بہت کم محنت کی سرور کے بعد کوئی ایسی تحریر نظر میں نہیں آتی جس کی مثال دی جائے۔ ہاں قبل غدر ایک رسالہ حدیقۂ شہدا مولوی امیر علی شہید کے واقعہ کا بطور نمونہ فسانہ عجائب لکھا گیا اور ایک نورتن جہجور نے لکھا"۔

فسانہ عجائب کا قبول عام اس سے ظاہر ہے کہ بہت مدت تک تالیف و تصنیف میں وہی طرز انشا داخل کی جاتی رہی اور جس طرح ابرو مضمون، آرزو و مظہر وغیرہ نے دہلی پہنچ کر زبان کو زبان اور شعر کو شعر کے درجے پر پہنچا دیا اسی طرح سرور نے آگرے سے کانپور پہنچ کر فسانہ عجائب لکھی اور اس کے ذریعے سے لکھنوی زبان کی اساس قایم کر دی۔

جاٹوں کی ترکتازنے آگرے کی جو خانہ ویرانی کی وہ تاریخوں سے ظاہر ہے، اور اس کے بعد علمی و ادبی مشاغل کا پتا آگرے میں ڈھونڈھنا فضول ہے۔ متاخرین کے زمانے میں آگرے کی مجلس و ہنر قطعاً برہم ہو گئی تھی، لیکن صدر نظامت کے باعث ایک اجڑی اجڑی محفل ضرور تھی۔ جب ہائی کورٹ بھی آگرے سے الہ آباد کو منتقل ہو گیا تو عدم سرپرستی و ناقدر دانی نے آگرے کی مخلوق کو ہر قسم کے علمی و ادبی مشغلے سے بے پروا کر دیا۔ لیکن اس ہمت شکن و حوصلہ فرسا زمانے میں بھی آگرے میں شعر و سخن اور علم و فن کی پرستش موقوف نہ ہوئی۔ اس عہد کے بعض بزرگوں کے نام یہ ہیں جن کو زمانے نے ابھرنے کا موقع نہ دیا۔

مولوی احمد علی خاں صوفی صاحب مینا بازار

مولوی جمیل الدین نیّر ... صاحب آرسی مصحف

مرزا نثار علی بیگ ... مصنف قواعد فارسی و اردو و سفرنامہ حجاز و یورپ

مرزا خادم حسین رئیس ... صاحب دیوان

ماسٹر توصیف حسین واصف ... صاحب دیوان

مولوی احسن اللہ خاں ثاقب ... صاحب قند پارسی

کالے خاں سفلی وغیرہ

رئیس، واصف اور نثار اپنے وقت کے اساتذہ میں سے تھے۔ قلت وقت ہمیں ان کے کلام پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی باز رکھتی ہے لیکن ان کا مرتبہ شاعری اس سے ثابت ہے کہ مولوی نجم الغنی رام پوری جو متعدد کتابوں کے مصنف اور مشہور بزرگ ہیں اپنی تصنیف بحر الفصاحت میں ان بزرگوں کو داغ سے بہتر شاعر مانتے ہیں۔ ان کی یہ تصنیف فن عروض

پر ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ رعایت لفظی جو کسی زمانے میں اردو شعراء اس طرح لکھنو اسکول کا طرہ امتیاز تھی، اور جو امانت و ناسخ کے عہد میں بد مذاقی کی حد کو جا پہنچی، دراصل شعرائے اکبرآبادی ہی کی ایجاد و اختراع تھی۔ اس کی تائید میں صاحب تصنیف نے اکبرآبادی اساتذہ کے کلام کی مثالیں بھی پیش کی ہیں جن کی اس زمانے کے دہلوی و لکھنوی شعرا تقلید کرتے تھے۔

فن صحافت کے ذریعے سے زبان کی جو خدمت ہو سکتی ہے۔ اس میں بھی اہل آگرہ بہت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم صرف میر اکبر علی حیدرآبادی ایڈیٹر ادیب اور خواجہ یوسف علی اکبرآبادی کے نام پیش کریں گے۔ ادیب، اردو کے اولین رسالوں میں سے ہے جس کے مضمون نگاروں میں مولوی چراغ علی اور مولوی ذکاء اللہ کے نام نظر آتے ہیں۔ اسی زمانے کے بزرگوں میں مولوی عبدالرزاق صاحب البرامکہ و نظام الملک طوسی، مرزا عرفان علی بیگ مصنف الخاتون، مولوی سید احمد مصنف مرقع اکبرآباد امرائے ہنود و ہندوستان اخبار کے نام ہیں۔

عہد حاضر میں جو آگرے کا تاریک ترین دور ہے شاہ نظام الدین دلگیر مرحوم ایڈیٹر نقاد کی خدمات ادب مخفی نہیں۔ مولانا سیماب اکبرآبادی کی قدرت و کمال شاعری سے کون واقف نہیں؟ حضرت عاشق حسین بزم اکبرآبادی اس وقت محاورات زبان کے ماہر اور مرثیہ گوئی میں اعلیٰ مرتبے کے مالک ہیں۔ مرزا نجم آفندی کے قصیدے اس زمانے میں ان کو برتریں منصب کا سزاوار بناتے ہیں۔ مفتی انتظام اللہ پچاس سے زیادہ کتابوں کے مولف و مصنف وسیع المطالعہ بزرگ ہیں۔ محمد محمود مخمور اکبرآبادی کی ادبیت مسلم ہے اور خادم علی خاں احقر اکبرآبادی، شوخ اکبرآبادی رعنا اکبرآبادی و حضرت محمد علی شاہ میکش کہنہ مشق و مخصوص شعرا میں سے ہیں۔

ضرورت اختصار نے اس مضمون کو نہایت تشنہ رکھا ہے لیکن اگر زمانے نے فرصت دی تو مکمل صورت دے کر اسے ایک کتاب کی شکل میں پیش کریں گے، اگر جن حضرات کو تحقیق و جستجو کا ذوق ہے، ان اشارات کی مدد سے مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے تک بآسانی پہنچ سکیں گے کہ آگرے کے ارباب فن نے اردو زبان کی نہایت قابل قدر خدمت کی ہے اور اس کا اعتراف نہ کیا جانا سخت ناانصافی ہے!

"ہندوستانی" سہ ماہی

لطیف الدین احمد اکبرآبادی

انقلاب

شاداب و پر بہار مسرتوں کا زمانہ ختم ہو چکا۔ وہ محبت جو گلاب کے تازہ کھلے ہوئے پھول سے زیادہ خوشبودار اور شگفتہ تھی، اب خزاں کے بے درد ہاتھوں تباہ ہو چکی ہے ——

ہمارے راگ مٹ چکے ہیں۔ زمانے کی بے اعتنائی نے اُن کا نشان بھی باقی نہیں رکھا ——

میں نے خواب دیکھا تھا کہ محبت خود رو پھولوں کی طرح انگڑائیاں لیتی ہوئی بیدار ہو رہی ہے اور دلفریب نغمے خوبصورت ساز پر بج رہے ہیں۔

جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایک شکستہ ساز سامنے رکھا ہے اور ٹوٹا ہوا مضراب ہاتھ میں ہے ——

میرا دل ایک افسانہ تھا۔ جب میں ہوش میں آیا تو وہ حقیقت کی تلخیوں سے معمور زندگی کا پُرسوز نوحہ بن چکا تھا ——

خواب سے پہلے سکون تھا —— خواب کے بعد تلاطم ——

دونوں میں غم کی کسک تھی، لیکن مختلف —— میں تخیل کی اس روانی میں بڑھتا گیا۔ بہتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ شکستہ ساحل آ پہنچا۔ جہاں خالی گھونگے ریت کے ذروں پر پڑے چمک رہے تھے۔

آمنہ تمیم

نقد و نظر

"قیدِ یاغستان" (طبع ثانی)

(مصنفہ محمد اکرم صاحب پنشل کمشنر و آنریری مجسٹریٹ لاہور چھاؤنی)

(درسی کتب کے سائز کے چار سو صفحات کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، آرٹ پیپر پر متعدد تصاویر، نفیس سنہری جلد، قیمت ایک روپیہ بارہ آنے ر ۱۲/ ملنے کا پتہ: مصنف سے مل سکتی ہے)

"قیدِ یاغستان" سب سے پہلے سنہ ۱۹۱۲ء میں چھپی۔ حال ہی میں مصنف نے نظرِ ثانی کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا ہے جو اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے یہ اُن صعوبتوں اور مصیبتوں کی دردناک داستان ہے جن سے اوائلِ شباب ہی میں مصنف کو دوچار ہونا پڑا۔ اپریل سنہ ۱۹۱۰ء میں محمد اکرم صاحب کو جب کہ آپ اوورسیر کی حیثیت میں وادیٔ ٹوچی میں متعین تھے۔ سرحدی فراریوں نے گرفتار کر لیا اور آپ دو ماہ تک قید و بند کی مشقتیں جھیلتے رہے۔

مصنف کوئی پیشہ ور ادیب نہیں یہ کتاب اس کی پہلی اور آخری تصنیف ہے لیکن اس کے قلم نے اس آپ بیتی کو ایک ایسا حقیقی افسانے کا رنگ دے دیا ہے جو بہت سے مشاق ادیبوں کو بھی میسر نہیں آتا۔ فطرتِ انسانی کا کوئی پہلو نہیں جو نظر انداز کیا گیا ہو۔ بعض مقامات پر شدتِ جذبات کی وجہ سے مصنف ایسا اندازِ بیان اختیار کرتا ہے کہ پڑھنے والے کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور یہ بات مصنف کی قدرتِ اظہار کی دلیل ہے۔ واقعات کی تصویر کشی، نفسیاتی کیفیات کا تجزیہ، مناظرِ قدرت کا والہانہ ذکر کتاب کی وہ خصوصیات ہیں جو ہمارے سامنے مصنف کو اوورسیر کی بجائے مصور، ماہرِ نفسیات اور شاعر کی حیثیت میں پیش کرتی ہیں۔ یہ باتیں تلخی کے اُس احساس کو جو ہولناک مصائب کے تاثر انگیز ذکر سے ہمارے دل پر طاری ہو جاتا ہے کسی قدر کم کر دیتی ہیں۔

کتاب اس لحاظ سے بھی قابلِ مطالعہ ہے کہ اس میں سرحدِ آزاد کے غیور قبائل کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے ہمارے دلوں میں ان قبائل کا ایسا تصور بٹھایا گیا ہے کہ ہم انہیں مجموعی حیثیت سے ڈاکو، رہزنوں، قتل و غارت کے دلدادہ اور مذہبی رواداری سے ناآشنا سمجھتے ہیں۔ یہ بات کسی حد تک درست ہے لیکن ان وحشیانہ مظالم کے ساتھ ساتھ اُن کی مہمان نوازی، قیدیوں سے حسنِ سلوک صداقت، صاف گوئی اور غیرت کے حالات معلوم کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں مصنف نے بڑی بھاری خدمت سرانجام دی ہے۔

ان مصائب میں محمد اکرم صاحب کے شریک ایک اور صاحب لالہ سندر لال ٹھیکیدار بھی تھے۔ جہاں لالہ سندر لال سے پٹھانوں کا سلوک مذہبی رواداری کا ثبوت پیش کرتا ہے، وہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ایک ہندو اور ایک مسلمان نے اس خوفناک مشترکہ مصیبت کو کس ہمدردی اور باہمی اعتماد کے ساتھ طے کیا۔ جیسا کہ کتاب کے بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے دونوں میں سے اگر ایک چاہتا تو موقع پا کر کتنی رات کو بھاگ نکلتا۔ لیکن اس بات کے باوجود کہ بھاگ نکلنے کے بیشتر مواقع میسر ہوئے انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس لئے قومی جذبہ رکھنے والے حضرات بھی کتاب کو پسند کریں گے

یہ کتاب مردوں اور عورتوں خصوصاً لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ کیونکہ نابالغ بچوں کے لئے عموماً دلچسپ کتابیں جن میں شہوانی مضامین کو دخل نہ ہو بہت کم ملتی ہیں۔

ناتجربہ کار نوجوانوں کے لئے یہ کتاب بے حد سبق آموز ہے مصنف کے ذاتی تجربات اس بارے میں اُن کی رہنمائی کر سکتے ہیں کہ فلاں قسم کی تکلیف یا مصیبت کے وقت انسان کو کیا کرنا چاہئے۔

ممکن ہے بعض نکتہ چیں اور دوررس نگاہوں کو اس دلچسپ آپ بیتی میں کچھ ادبی یا لسانی خامیاں نظر آئیں۔ ان کا جواز مصنف نے اپنے الفاظ میں یوں پیش کیا ہے جسے قبول کرنے میں کسی کو تامل نہیں ہونا چاہئے:۔

"یہ ایک ادبی افسانہ نہیں ہے۔ اگر میں کسی کامل ادیب سے اصلاح لیتا تو شاید یہ کمی بھی پوری ہو جاتی لیکن ایک اندرونی آواز نے مجھے اس طریقِ کار سے یہ کہہ کر باز رکھا کہ ادبی اصلاح سے قصے کے قدرتی خدوخال میں فرق آ جانے کا اندیشہ ہے"۔

حفیظ ہوشیارپوری



ملکہ نورجہاں

اپنی رنگت کا گلاب کے پھولوں کے ساتھ مقابلہ کرتی تھی

مغلیہ خاندان کی مشہور و معروف ملکہ نورجہان کو حسین بننے کا اسقدر شوق تھا کہ وہ اپنے حسن کے لئے خاص خوشبویات تیار کراتی تھی۔

ملکہ نورجہاں کی خوشبویات میں جو اجزا ملتے تھے۔ وہ افغان کے ٹائلٹ میں شامل ہیں جن سے وہی خوشبو حاصل ہوسکتی ہے اگر آپ بھی اپنی رنگت کی قدر کرتے ہیں جسطرح نورجہاں اور مغلیہ خاندان کی دیگر بیگمات کرتی تھیں تو

افغان سنو کا باقاعدہ استعمال کیجئے۔ یہ جلد کیلئے نہایت مقوی ہے۔ یہ جلد کے مساموں کو نہایت تقویت دیتی ہے جسقدر خرابیاں ہوں ان کو دور کرتی ہے اور جلد کی قدرتی خوبصورتی کو بحال رکھتی ہے ؛

(تمام سٹوروں سے مل سکتی ہے)



افغان سنو

(تمام سٹوروں اور کمیسٹوں سے ملسکتی ہے) (ایشا بھر میں فروخت ہوتی ہے)

ای ایس پاٹن والا ۱۸۴-۱۸۲ عبدالرحمٰن سٹریٹ بمبئی نمبر ۳

(کارخانہ کناٹ روڈ بمبئی نمبر ۳)



کمزور بچوں کی طاقت کے لئے

اور

ان کے جسم کی خوبصورتی بڑھانے کے لئے

ڈونگرے کا بال امرت

دینا چاہیئے۔

کیونکہ اس میں بچوں کی صحت۔ تندرستی و جسمانی نشوونما کیلئے بہت قیمتی

اور

نایاب ادویات شامل ہیں

لاہور ایجنٹ:-

بھگت رام لوہی اینڈ سنز سوتر منڈی لاہور

ڈاک کے ڈاکو ہر ماہ ہمیں خریداروں کی طرف سے شکایتیں موصول ہوتی ہیں کہ انہیں پرچہ نہیں ملتا اور بیسیوں خریدار ایسے بھی ہیں جو شکایت نہیں کرتے لیکن یہ فرض کر لیتے ہیں کہ پرچہ دفتر سے نہیں بھیجا حالانکہ پرچہ چھاپا اور ہر خریدار کو نہ بھیجنا پاگل پن اور تجارتی خودکشی سے کم نہیں۔ "ادبی دنیا" ہر ماہ کی ۱۶ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے اگر ۲۰ تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو سمجھ لیجئے کہ کسی ڈاک کے ڈاکو کی نذر ہوا۔ بس ایک شکایتی کارڈ اپنے حلقہ کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک کارڈ ہمیں لکھئے تاکہ آپ کو پرچہ دوبارہ بھیجا جائے اور محکمہ ڈاک کے دروازے پر ایک اور دستک دی جائے۔ (مینیجر)

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ نومبر ۱۹۳۷ء

جلد (۱۶) — نمبر ۱۲

تصاویر: ۱۔ بڑی اماں ۲۔ بڑی اماں کا بچپن

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے (۵) ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا کمرشیل بلڈنگ مال روڈ لاہور سے شائع ہوا۔

بزمِ ادب

سالنامہ کی ایک جھلک

نہایت مسرت کا مقام ہے کہ ادبی دنیا کا آئندہ سالنامہ جو آج سے ایک ماہ کے بعد آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ بڑی خوش اسلوبی سے مرتب ہو رہا ہے۔ ادبی دنیا کے قدیم کرمفرماؤں کے علاوہ بہت سے جدید مضمون نگاروں کے بہترین افکار اس میں شامل ہو رہے ہیں اور اگر اسے خودستائی نہ سمجھا جائے تو ہمیں یہ کہنے میں ذرہ بھر تامل نہیں کہ ۳۹ء کا سالنامہ ادبی دنیا کے گزشتہ سالناموں کا سچا جانشین ثابت ہوگا۔

اس دفعہ جو علمی و ادبی مضامین اب تک موصول ہوئے ہیں۔ وہ غیر معمولی طور پر بلند پایہ اور ہمارے محترم مضمون نگاروں کی دقتِ نظر اور وسعت علم کے شاہد ہیں

پروفیسر حمید احمد خاں ادیب اور العصر مرحوم کے ممتاز ایڈیٹر ماسٹر پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی۔ شاہد احمد صاحب مدیر ساقی۔ جناب میراجی حضرتِ خلیل۔ پروفیسر نور الحسن برلاس مقیم جاپان۔ سید شہنشاہ حسین صاحب رضوی۔ مشہور محقق شبیر علی خاں صاحب سرخوش اور علی حسن خاں صاحب کے گرانقدر مضامین زیرِ طبع ہیں اور ملک عطاء اللہ صاحب کلیم آنریبل سر عبد القادر۔ پروفیسر قاضی محمد اسلم۔ پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب دہلوی۔ مولانا چراغ حسن صاحب حسرت۔ پروفیسر فیض احمد۔ پروفیسر غلام مصطفےٰ تبسم اور سید بادشاہ حسن حیدر آبادی کے عالی پایہ مضامین امروز فردا میں زیرِ طبع آجائیں گے۔

افسانوں اور ڈراموں میں مندرجہ ذیل حضرات کے نتائجِ فکر زیرِ طبع ہیں۔

کرشن چندر۔ طاہر قریشی۔ پروفیسر حمید الدین حسن عزیز جاوید۔ عاشق بٹالوی۔ ضیاء فتح آبادی۔ سیفی نوگانوی۔ راجندر سنگھ بیدی۔ اندر لال داس قمر۔ پروفیسر قاضی فضل حق۔ مرزا مقبول بیگ بدخشانی۔ غلام عباس مولوی۔ آسی رام نگری۔ وقار انبالوی۔ پیرزادہ احمد ندیم قاسمی اور مظفر احمد۔

ان کے علاوہ حضرات سالک بٹالوی۔ سید امتیاز علی تاج۔ محترمہ حجاب امتیاز۔ حکیم احمد شجاع۔ مولوی حامد علی خاں اور بہزاد لکھنوی کے دلآویز افسانے اور ڈرامے دو ایک روز میں موصول ہونے والے ہیں۔

شعرائے نامدار میں سے مندرجہ ذیل حضرات اپنا دلآویز اور کیف آور کلام ارسال فرما چکے ہیں:۔

جوش ملیح آبادی۔ فراق گورکھپوری۔ امجد حیدر آبادی۔ اسد ملتانی۔ عبد الحمید عدم۔ بہزاد لکھنوی۔ کیفی چریاکوٹی۔ احسان بن دانش ضیاء فتح آبادی۔ جلیل قدوائی۔ تاجور سامری۔ مسعود شاہد۔ مسعود۔ حفیظ۔ میراجی۔ سعید احمد اعجاز۔ عرشی امرتسری۔ اندرجیت شرما۔ نجم ندوی۔ آسی رام نگری۔ حبیب عرفانی۔ لطیف انور۔ احمد ندیم قاسمی۔ سراج الدین ظفر المنتز انصاری۔ اصغر حسین خاں نظیر۔ ماہر القادری۔ سید علی منظور۔ تابش صدیقی۔ بزمی انصاری۔ ساغر جلیلی۔ فطرت کاشمیری۔ پروفیسر تبسم قیوم نظر۔ مہدی علی خاں۔ مراتب علی خاں تائب۔ عاصی امرتسری غلام رسول نازکی۔ نذیر احمد ظفر۔ عباس بیگ محشر۔ تخت سنگھ اور پروفیسر فیض احمد۔

حضرات مذکور کے علاوہ سالنامہ کی محفل ادب میں جن اربابِ فکر کی شمولیت کی پوری توقع ہے۔ ان میں سے چند کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں

علامہ برج موہن دتا تریہ کیفی۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری۔ ساغر نظامی۔ اختر شیرانی۔ اثر صہبائی علامہ تاجور نجیب آبادی۔ پنڈت ہریچند اختر۔ پروفیسر ایس ایم اختر۔ پنڈت رام سروپ شاستری۔ سید تسکین عابدی۔ سید تمکین کاظمی۔ سید محمد جعفری۔ مولانا ابوالعلا چشتی۔ محترمہ ح۔ ب ایڈیٹر نسوانی دنیا اور مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔

تصاویر کے لحاظ سے بھی اس دفعہ کا سالنامہ نہایت جاذبِ نظر ہو گا۔ لاہور کے ممتاز آرٹسٹ سید سرفراز ایک نہایت دل کش ٹائٹل تیار کر رہے ہیں۔

مشرقی آرٹ اور مغربی مصوری کے سات رنگین شاہ کار ناظرین کے لئے جنتِ نگاہ کا سامان بہم پہنچائیں گے اور قریباً ساٹھ یک رنگ تصاویر ان کے علاوہ ہوں گی۔

ادبی دنیا کے ان مخلص کرم فرماؤں سے جن کے رشحاتِ قلم ہمیشہ اس کے صفحات کی زینت رہے ہیں اور جنہوں نے ابھی تک سالنامے کے لئے اپنے گراں پایہ مضامین یا نظمیں ارسال نہیں فرمائیں مجھے صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ ہماری محفل ادب کی زینت آپ ہی لوگوں سے ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کی نشستیں خالی رہیں اور آنکھیں آپ کو ڈھونڈتی رہیں اگرچہ اب کافی دیر ہو چکی ہے لیکن اگر آپ اب بھی تشریف لائیں تو ہمارے دیدہ و دل فرش راہ ہیں۔ آپ کے لئے ہر وقت جگہ نکالی جا سکتی ہے۔

منصور گولڈ میڈل

اکتوبر کی اشاعت میں انعامی مضامین کے ایک سلسلہ کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ کی اہم ترین کڑی منصور گولڈ میڈل ہے۔ ہم اپنے اہل قلم احباب کی توجہ ایک بار پھر ان عنوانات کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جو منصور گولڈ میڈل سے متعلق مضامین کے لئے مخصوص ہیں۔ ہم اہلِ قلم حضرات کے علاوہ یونیورسٹی کے طلباء کو خصوصیت سے اس انعام کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں اور ان کی سہولت کے لئے یہ عنوانات دوبارہ درج کر رہے ہیں۔

۱۔ اردو کے مندرجہ ذیل شعراء میں سے کسی ایک کی شاعری کا سیر حاصل تجزیہ: میر۔ آتش۔ مومن۔ درد۔ غالب۔ اکبر۔ حالی۔ اقبال۔ حسرت موہانی۔ جوش۔

۲۔ اردو کے موجودہ صاحب طرز انشا پرداز۔

۳۔ اردو کے ہندو، عیسائی یا یورپین شعراء (انتخابِ کلام اور حالات)

۴۔ دہلی۔ لکھنؤ۔ حیدرآباد۔ بہار اور پنجاب میں سے کسی ایک مرکز کی خدمات اردو۔

۵۔ اردو کی درسی کتب میں اصلاح و ترقی کی ضرورت اور اس کے اصول

۶۔ زبان اور کلچر یا زبان اور سیاست

۷۔ اردو کی ڈرامائی تاریخ کا خاکہ۔

۸۔ اردو کی ادبی و سیاسی صحافت پر ایک اجمالی نگاہ۔

۹۔ اردو کی ترقی میں ترجمے کا حصّہ

۱۰۔ شمالی ہندوستان کی آئندہ زبان اور اس کی علمی و ادبی ممکنات

صلاح الدّین احمد

آئینۂ عالم

جاپان یورپین نقاب کے نیچے

مارکوئیس ویسیکا نا برآمدہ کا دروازہ کھول کر تواضعاً جھک گیا۔ اور بولا "سبقت فرمائیے۔ . . . اس جگہ آپ یوں محسوس کرینگے جیسے یورپ میں بیٹھے ہوں"

مارکوئیس خود دہلیز میں کھڑا رہا۔ اور اس کمرے کے متعلق میرے تاثرات کو میرے چہرے سے بھانپنے کی کوشش کرتا رہا۔ جو اس نے مشرقی ہال میں مغربی طرز پر آراستہ کر رکھا تھا۔ ٹوکیو میں مارکوئیس کا محل تیس کمروں پر مشتمل ہے۔ جن میں سے چار کمرے یورپین طرز کے ہیں۔

"عزیز دوست یقین کیجیے کہ مجھے ان کمروں میں بالکل اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن بدقسمتی سے میں اپنے اہل خانہ کو ان کے استعمال کی طرف راغب نہیں کر سکا۔ میرے گھرانے کے تمام افراد نرم نرم گدیلوں اور چٹائیوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ . . . لیکن آپ نے بتایا نہیں۔ کہ ان کمروں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے"۔

حق تو یہ ہے کہ یورپ کی اس نقل نے مجھ پر کچھ اثر نہ ڈالا تھا۔ اور اسی لئے میں نے اپنے تاثرات کو اپنے معزز مہمان پر ظاہر نہ کیا۔ مارکوئیس یورپین گھروں کی آرائنگی کے اصول اولیں سے بے خبر تھا۔ ایک سرخ چوبی پیانو ایک امریکن ڈیسک کے ساتھ کندھا جوڑے کھڑا تھا۔ کمرے کے وسط میں انیسویں صدی کی طرز کا ایک میز پڑا تھا۔ جس کی طرز باقی سامان کے ساتھ کوئی مناسبت نہ رکھتی تھی۔ اور ان سب پر مستزاد نفاست طرز کی برتن رکھنے والی خانہ دار میز تھی۔ جو دیوار کے ساتھ پڑی تھی۔

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس ماحول میں ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے ہمیشہ سے ان کا عادی ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ میرا گھرانہ اس معاملہ میں میرا ہمنوا نہیں ہے۔" مارکوئیس نے دوبارہ یقین دلاتے ہوئے کہا۔

لیکن جب چائے پینے کا موقع آیا تو ان یورپین کمروں کے بجائے ہم جاپانی ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ جہاں چائے کے ساتھ تیز مسالے والی مٹھائی کھائی گئی۔

میزبان نے باصرار چائے اپنے ہاتھ سے تیار کی کیونکہ جاپانی تہذیب کے مطابق یہ اعزاز کسی اور کو نہیں پہنچتا۔

باوجود اپنے مغربی لباس کے مارکوئیس اپنی کہنیاں ایک چھوٹی سی چوکی پر ٹکا کر آرام سے زمین پر بیٹھ گیا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ خواہ کوئی جاپانی اپنی نصف زندگی لندن اور پیرس میں گذار آئے۔ اور خواہ ظاہرا طور پر کتنا ہی مغربیت کے رنگ میں رنگا ہوا نظر آئے۔ لیکن زندگی کا حقیقی لطف اور اطمینان اُسے اسی وقت نصیب ہوتا ہے۔ جب وہ ان کمروں میں خالص مشرقی انداز سے بیٹھتا ہے۔ وہ کمرے جو سدہا سال پرانے طرز بود و ماند کے مطابق آراستہ کئے گئے ہوں۔

تھوڑی دیر کے بعد تین اور مہمان آگئے۔ جن میں دو مرد تھے اور ایک عورت مرد کمرے کے ایک کونے میں بیٹھے رہے۔ لیکن مہمان عورت اور میزبان کی بیوی کمرے کے سامنے والے کونے میں جا بیٹھیں سب کے سامنے آبنوس کی ایک ایک چوکی پڑی تھی۔ اور سوائے میزبانہ کے جس نے جاپانی طرز کا سیاہ کمونو پہنا ہوا تھا۔ باقی تمام افراد یورپین لباس میں ملبوس تھے۔

ان دنوں میں نیا نیا جاپان آیا تھا۔ اس طرز سے بیٹھے ہوئے ابھی دس منٹ بھی نہ گذرے ہوں گے کہ میری ٹانگیں سونے لگیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ہزارہا سوئیاں میری ٹانگوں میں چبھوئی جا رہی ہیں۔ اس وقت میں کتنا حیران ہوتا۔ اگر کوئی شخص مجھے بتاتا کہ آج سے دو ماہ بعد جب میں جاپان سے رخصت ہو رہا ہوں گا۔ تو جہاز کے

افسر کی پیش کردہ کرسی کی بجائے جاپانی گدیلوں کی خواہش مجھے بیتاب کردے گی "۔

چائے کے بعد مارکوئیس مجھے رخصت کرنے کے لئے باہر تک آیا۔ اور جب میں اپنی موٹر میں بیٹھ گیا۔ تو ایک چھوٹا سا پیکٹ میرے ہاتھ میں دے کر رخصت ہوگیا۔ اس کے پیٹھ موڑتے ہی میں نے پیکٹ کھول ڈالا۔ اس میں تیز مسالے والی مٹھائی تھی۔ وہی جو چائے کے ساتھ پیش کی گئی تھی "۔

میرے ترجمان نے کہا "شاید مارکوئیس کو معلوم ہوگیا ہوگا۔ کہ آپ نے مٹھائی کو پسند کیا ہے۔ چنانچہ وہ بھولے نہیں "۔

مارکوئیس نے کہا تھا "اگر تم اصلی جاپان دیکھنا چاہتے ہو۔ تو ہوٹل میں نہ ٹھہرو "۔

میں اس تجویز پر عمل کرنے کے لئے پہلے ہی سے تیار تھا۔ کیونکہ چند ہی گھنٹے پہلے میں نے وزارت حربیہ سے چند فلمیں لینے کی درخواست کی تھی اور وہاں سے مجھے ناگاساکے حوالی میں سوکنیا کی چھوٹی سی بندرگاہ میں تصویر لینے کی اجازت مل گئی تھی۔

سوکنیا میں صرف ایک ہی ہوٹل ہے۔ اور اگلی شب میں وہاں پہنچ چکا تھا۔ میرا کمرا چارپائی، میز اور کرسیوں سے بکسر خالی تھا۔ خوش قسمتی سے میں ان کے بغیر گذارہ کرنے کا عادی ہوگیا تھا۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد میں کھانے کے کمرے میں آگیا۔ جو عمارت کی پہلی منزل میں تھا۔ قریباً ۲۰ مہمان پہلے سے وہاں موجود تھے۔ ہر ایک کے سامنے ایک چوکی پر مچھلی کا قورمہ رکھا تھا۔ جس سے تیز خوشبو نکل کر کمرے میں پھیل رہی تھی۔

ہوٹل کے مالک کی پرخلوص توجہ کے جواب میں دوستانہ طریق پر مسکراتے ہوئے میں ایک چوکی کے پاس بیٹھ گیا۔ تیز مسالہ والے قورمے کی ایک پلیٹ میرے سامنے بھی رکھ دی گئی؟

جاپانی مینیجر نے کہا "آپ کو یہاں گوشت بھی مل سکتا ہے۔ حالانکہ حقیقی جاپانی کبھی گوشت نہیں کھاتا۔ صدہا سال سے ہم گوشت کو بطور خوراک استعمال کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ لیکن جنگ عظیم کے زمانے سے یورپین عادات و رسوم کی ترویج نے ہمارے ملکوں میں بھی گوشت کھانے کی عادت ڈالدی ہے "۔

کھانا پیش کرنے پر نوعمر ملازم مامور تھے۔ جو بالکل بچے معلوم ہوتے تھے۔ یہاں رواج یہ ہے کہ جب پلیٹ کا کھانا بالکل ختم کر دیا جائے۔ تو بغیر اس کے کہ مہمان کی رائے لی جائے۔ پلیٹ اسی کھانے سے دوبارہ بھر دی جاتی ہے۔ اگر اس کی مرضی دوسری قسم کا کھانا منگانے کی ہو تو اسے پہلی پلیٹ میں ذرا سا کھانا چھوڑ دینا چاہیے۔

"آپ شراب کیوں نہیں پیتے؟" مالک نے دریافت کیا "میں چاہتا ہوں کہ آپ ہماری ساکی کے متعلق اپنی رائے کا اظہار فرمائیں "۔

ساکی وہ شراب ہے جو چاولوں سے تیار کی جاتی ہے۔ میں نے اپنے میزبان کے پاس خاطر کے لئے ایک گھونٹ نگلا تو سہی لیکن اس طرح جیسے کوئی مریض بدمزہ دوا پیتا ہے۔

دوران طعام میں میں نے ایک عجیب معاملہ دیکھا۔ تمام مہمان برابر کے ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ لیکن یکایک ان میں سے ایک اُٹھا اور ہوٹل کے مالک سے کہنے لگا۔

" دوست میرے پیالے میں شراب پیو گے؟"

"آپ حد سے زیادہ میری عزت افزائی فرما رہے ہیں "۔ یہ کہتے ہوئے ہوٹل کے مالک نے شراب کا پیالہ خالی کرکے اپنے مہمان کو واپس کر دیا۔

حاضرین کے لئے یہ ایک اشارہ تھا۔ چنانچہ یکدم تمام مہمانوں نے شراب کے پینے میں اپنے اپنے پیالے ایک دوسرے سے تبدیل کرنے شروع کر دیئے۔ ہوٹل کے مالک کے پاس ایک ہجوم اکٹھا ہوگیا۔ لیکن اب وہ پیالے کو بمشکل تمام لبوں تک لے جا کر پاس رکھی ہوئی گرم پانی کی بالٹی میں ڈالتا جاتا تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ تہذیب و رسوم کی سخت ترین قیود کے باوجود اس ملک میں بھی بعض اوقات تمام پابندیوں کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔

میرے نزدیک ترین مہمان نے ایک ملازمہ سے کہا "مہربانی کرکے مجھے تھوڑے سے چاول دیجئے "۔

"کیا آپ سیر ہو لئے "؟ ملازمہ نے حیرت سے پوچھا؟ یہاں اس بات کی توضیح کر دینی ضروری ہے کہ جاپان میں چاولوں کی فرمائش کھانے سے سیر ہو چکنے کے اعلان کے مترادف ہے۔

جاپانی کھانا کیسا ہوتا ہے؟

باریک دانوں والی سڑکی پھلیاں (جن میں نمک بہت تیز ہوتا ہے)

اسے کھانے کے لئے چھوٹی چھوٹی لکڑیاں استعمال کرتے ہیں۔ جن کے ذریعے جاپانی دانے نکال لیتا ہے۔ اور پھلی کو پلیٹ میں چھوڑ دیتا ہے۔

جو یورپین ان لکڑیوں کا استعمال نہیں جانتے۔ انہیں ہاتھوں سے کھانا پڑتا ہے۔

اسے ختم کرنے کے بعد ساکی کا دور چلتا ہے۔ اور اگر کوئی چاہے تو ساکی کی بجائے بیر پی سکتا ہے۔

آپ کے سامنے ساکی کا پیالہ رکھنے کے بعد خادمہ مسکراتی ہوئی منتظرانہ انداز میں رکی رہے گی۔ اس موقع پر ہر مہذب اور تعلیم یافتہ جاپانی یہ کہنے سے نہ چوکے گا:۔

"مجھے مسرت ہوگی اگر آپ میرے پیالے سے ساکی پئیں گی"

وہ ساکی کا پیالہ پی جائے گی اور پھر گرم پانی سے پیالہ دھو کر اور دوبارہ پُر کر کے آپ کے سامنے رکھ دے گی۔

میں جلد ہی جاپانی ماحول سے مانوس ہوگیا۔ اور جلد ہی مجھے معلوم ہوگیا۔ کہ میں ایک دوسری دنیا میں ہوں جس کے باشندوں کا زاویہ نگاہ زندگی کے متعلق ہماری دنیا سے بالکل مختلف ہے۔

مثلاً دل کے لفظ کا مفہوم جاپان میں وہ نہیں ہے۔ جو ہم لوگ لیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ چیز احساسات اور تاثرات کا سرچشمہ نہیں ہے۔ "میرا دل تمہاری محبت سے مملو ہے" اس فقرے کا ترجمہ کرنے میں جاپانی مترجم کو کتنی مشکل پیش آئے گی؟ اس کا اندازہ ناممکن ہے۔ یا "تم نے میرے دل کے ٹکڑے کر دیئے"۔ ہمارے ملکوں کی طرح جاپان میں بھی عاشق اپنے محبوب کے کوچے میں گھومتے ہوئے دن سے رات کر دیتا ہے۔ لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں کسی طرح نہیں آتی۔ کہ گوشت کے اس مرکزی لوتھڑے کو جو جسم میں دوران خون کرتا رہتا ہے محبت سے کیا تعلق ہے۔ چنانچہ ان فقروں کے بجائے جاپانی کہے گا "تم نے میرے پاؤں تھکا دیئے"۔

اکثر یورپین سیاح اس بات کو واضح کر چکے ہیں کہ جاپان میں بوسہ لینے یا دینے کے عمل یا مفہوم کو کوئی نہیں جانتا۔ یہ بات بالکل صحیح ہے۔ حالانکہ یہ تسلیم شدہ امر ہے لیکن ہر یورپین کو جو جاپان میں آئے اس کی تصدیق حیران کر دیتی ہے

ایک روز میں ایک رجمنٹ کو دیکھ رہا تھا۔ جو ابھی ابھی مانچوریا کے میدان جنگ سے واپس آئی تھی۔ شہر کے اکثر گلی کوچوں میں چکر لگانے کے بعد سپاہی اپنی بارکوں میں واپس پہنچ چکے تھے۔ جہاں ان کے عزیز و اقربا اُن سے ملنے کے لئے بے تاب کھڑے تھے۔ افسر نے اجازت دی کہ سپاہی صف بندی توڑ کر تھوڑی دیر کے لئے اپنے عزیزوں سے مل سکتے ہیں۔ میرے پاس ہی ایک سپاہی کے عزیز کھڑے تھے۔ ماں بہن اور دو چھوٹے بھائی سپاہی ماں کے سامنے آ کر کھڑا ہوگیا۔ اور ذرا سا جھک کر بولا:۔

"اماں میں آگیا ہوں"

اور بس اس کے بعد دونوں ساکت و صامت کھڑے تھے۔ جاپانی بڑھیا دیر تک اپنے بیٹے کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے بیٹے کو چھاتی سے لگانے کا خیال تک نہ آیا۔ اسکی آنکھیں اس جوشِ محبت کا پتہ دے رہی تھیں۔ جو اس کے سینے میں امنڈ رہا تھا۔ اس کے بعد سپاہی وہاں سے ہٹ کر بہن کے سامنے آکھڑا ہوا اور بولا "میں آگیا ہوں"، خوشی سے چمکتی ہوئی آنکھوں کے دو جوڑے اس کے چہرے پر گڑے ہوئے تھے۔ اور اپنی تشنگی مٹا رہے تھے۔ میں کبھی نہ بھولوں گا اس خاموش ملاقات کو جس میں ایک سحر تھا۔ جو قلب و جگر کو پگھلا رہا تھا۔

میری میزبانہ کے دو بچے تھے۔ دونہایت پیارے بچے جاپانی کھلونوں کی طرح۔ ایک روز بارش کی وجہ سے میں فلم لینے کے لئے باہر نہ جا سکا۔ اور چند گھنٹوں کے لئے گھر پر ہی ٹھہرا رہا۔ یکایک ان میں سے ایک بچہ دوڑتا ہوا میرے کمرے کے سامنے سے گذرا۔ میں نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اور فرطِ محبت سے اس کا منہ چوم لیا۔ اسکی ماں اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی دیدے پھاڑ پھاڑ کر میری طرف گھور رہی تھی اس کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا۔ کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ بوسہ لینا یورپینوں کے نزدیک محبت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ بوسے کی توضیح و تفسیر میں دفتروں کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں۔ اور یہ کہ بوسے کے عنایت کرنے یا انکار کرنے پر دنیا میں حقیقی اور عملی ڈراموں کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ بوسے کی کئی قسمیں ہیں۔ اپنی تقریر کو مختصر کرتے ہوئے میں نے کہا کہ سب سے زیادہ متبرک اور قابلِ تعظیم ماں کا بوسہ اپنے بچے کے لئے ہے۔ یہ بات تو میری سمجھ میں آسکتی ہے کہ عاشق اور محبوب بوسے کے بغیر بھی گذار سکتے ہیں لیکن میرا دماغ اس بات کے سمجھنے سے یکسر عاجز ہے کہ جاپانی مائیں اپنے بچوں کو چومنے کی کیسے ضرورت محسوس نہیں کرتیں۔

میری میزبانہ خاموشی سے میری باتیں سنتی رہی اور پھر ایک لفظ کہے بغیر

بچے کو گود میں اٹھا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے چند ہی منٹ بعد برآمدے کو عبور کرتے ہوئے میں نے اس کے نیم وا دروازے سے اندر کی طرف نگاہ کی نیک دل عورت بچے پر جھکے ہوئے اس کا بوسہ لے رہی تھی . . . . اور پھر ایک منٹ کے لئے خاموشی سے اس کا منہ تکتی رہی۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ بچے پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔
کچھ عجیب ہی پر اسرار اور ناقابل فہم قسم کا ملک . . . . .

راتھچائیلڈ

کی امارت کے راز

آپ میں سے ہزاروں اصحاب نے دنیائے سینما کی غیرفانی اور مشہور فلم "ہاؤس آف راتھ چائیلڈ" ملاحظہ فرما کر لطف اٹھایا ہوگا۔ اس سبق آموز فلم میں جارج آرلس جیسے نامور ایکٹر نے بیرن راتھ چائیلڈ کا کردار خوب ادا کیا ہے۔

تعلیم یافتہ طبقے میں سے کون ایسا شخص ہے جس نے راتھ چائیلڈ کے مشہور زمانہ کاروبار کی نسبت کچھ سنا یا پڑھا نہ ہو، جسے یہ معلوم نہ ہو کہ فرانس کے عظیم الشان شہنشاہ نپولین اول کے وقت میں تاریخ یورپ میں اس گھرانے کو کتنی اہمیت حاصل رہی۔ کسے معلوم نہیں کہ اس نے برطانیہ کی قسمت کو پلٹ دیا اور برطانیہ اور یورپ کی تاریخ بدل کر رکھ دی۔ ڈیوک آف ولنگٹن کے ہاتھوں شہنشاہ کی شکست کی اصلی توجیہہ صرف وہ بے شمار دولت ہے اور اس کیثر زر کی قاضی حاجات طاقت ہے جس کی ڈوریاں اس گھرانے نے برطانیہ کے ہاتھ میں پکڑا دی تھیں۔

اس گھرانے کی ترقی کا اصلی راز جس نے اس کو کامیابی کے اولیں زینے سے اٹھا کر آفتاب نصف النہار کی طرح چمکا یا ان غیرفانی اصولوں میں مضمر ہے جن پر یہ ہمیشہ کاربند رہا اور جنہیں تعلقات کی صورت میں لکھوا کر اہل خاندان نے اپنے بنک کی دیواروں پر لٹکا رکھا تھا۔

یہ زریں اصول اس قابل ہیں کہ ہندوستانی تاجر انہیں آب زر سے لکھوا کر اپنے دفاتر میں رکھیں اور ان پر حرف بحرف عمل کر کے اپنے ملک اور باشندگان ملک کے لئے بھلائی کا موجب ہوں:۔

یہ غیرفانی اصول مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ اپنے کاروبار کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات میں خود دلچسپی لو۔
۲۔ ہر بات کے لئے مستعد اور تیار رہو۔
۳۔ معاملات پر اچھی طرح غور کر لو اور پھر قطعی فیصلے پر پہنچ جاؤ۔
۴۔ نیکی کرنے کی جرات پیدا کرو اور عمل بد سے ڈرو۔
۵۔ آزمائشوں میں صابر رہو۔
۶۔ زندگی کی جنگ بہادری اور مردانگی سے لڑو۔
۷۔ نااہلوں کی صحبت سے بچو۔
۸۔ دیانتداری کو اپنا سب سے بڑا فرض سمجھو۔
۹۔ دوسروں کے کاروبار یا نیک نامی کو نقصان نہ پہنچاؤ۔
۱۰۔ صرف نکو کار لوگوں سے رشتہ جوڑو۔
۱۱۔ اپنے دل کو برے خیالات سے پاک رکھو۔
۱۲۔ کسی مصلحت کی خاطر بھی جھوٹ نہ بولو۔
۱۳۔ اپنی دوستی کے لئے بہت کم لوگ منتخب کرو۔
۱۴۔ جو کچھ تم نہیں ہو اس کے ہونے کا ادعا کبھی نہ کرو۔
۱۵۔ لوگوں سے اچھا برتاؤ کرو۔
۱۶۔ اپنے قرض بروقت اور مستعدی سے ادا کرو۔
۱۷۔ اپنے دوست کی صداقت پر شبہ نہ کرو۔
۱۸۔ اپنے والدین کی پند و نصائح پر عمل کرو۔
۱۹۔ اپنے اصول کی پابندی کے لئے دولت کو قربان کر دو۔
۲۰۔ شراب کو چھونا یا چکھنا حرام ہے۔
۲۱۔ اپنے فرصت کے اوقات کو ترقی کی راہیں سوچنے پر صرف کرو۔
۲۲۔ بدی سے ہمیشہ بچتے رہو۔
۲۳۔ نفسانی خواہشات کو ہمیشہ قابو میں رکھو۔
۲۴۔ ہر شخص کی سلامتی چاہو۔
۲۵۔ اپنی ہمت کو کبھی پست نہ ہونے دو۔
۲۶۔ نیکی کے راستے پر مستقل مزاجی سے گامزن رہو تو کامیابی کی منزل پر پہنچنا یقینی ہے۔

مظفر احمد

منصور کی یاد میں

کس طرح اس کا یقیں آئے کہ منصور گیا
اپنے پہلو میں لئے خاطر مجبور گیا

مشکلیں اتنی پڑیں اُس پہ کہ آسان ہوئیں
خوگرِ رنج والم دھر سے مجبور گیا

کام اس کا ہے یہیں، نام بھی اس کا ہے یہیں
گرچہ نظروں سے ہمیشہ کے لئے دور گیا

اب نہیں ساقیٔ میخانۂ ادبی باقی
لطفِ میخوار گیا جذبۂ مخمور گیا

پختگی، طرزِ ادا، شُستگی، کہنہ مشقی،
اب زمانے سے صحافت کا وہ دستور گیا

محمد ثناءاللہ

رسم الخط کا مسئلہ

آج کل اردو ہندی رسم الخط کا مسئلہ اخبارات و رسائل میں بار بار زیر بحث آرہا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس پر اپنی رائے کا اظہار فرمانے والے یا تو ان میں سے ایک ہی رسم الخط سے واقف ہوتے ہیں یا پھر توجہ کے ساتھ غور فرمانے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے۔ اکثر اخبارات و رسائل میں یہ بھی دیکھا ہے کہ اس مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار فرمانے والے بعض وہ قابلِ احترام حضرات ہیں جو اگرچہ اپنی دوسری خصوصیات اور صلاحیتوں کے اعتبار سے ہمارے واجب الاحترام رہنما ہیں۔ مگر علم الاصوات و علم الحروف سے بالکل ناواقف ہونے کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ دقیع رائے دینے کے اہل نہیں ہیں۔ اس سے انکار نہیں کہ سیاسیات پر اچھی نظر کے مالک ہیں یا اقتصادی معلومات کے بڑے گراں بہا خزانے اپنے دماغوں میں محفوظ رکھتے ہیں۔ مگر یہ بھی عجیب بات ہوگی کہ کسی مریض کی دوا اور غذا کے متعلق کسی ماہر فن انجنیئر یا کسی عمارت کی تعمیر کے متعلق کسی تجربہ کار طبیب سے مشورہ کیا جائے۔

تیسری قسم اس مسئلہ پر رائے دینے والوں کی وہ ہے جو خود سوچنے یا سمجھنے کی مطلق صلاحیت نہیں رکھتی بلکہ کسی دوسرے شخص کے خیالات صرف اس لئے دہراتی رہتی ہے۔ کہ ان کا رعب کسی وجہ سے اس پر طاری ہے۔ یہ حضرات اپنی طرف سے اس مسئلہ پر دوسروں کی رائے اس طرح پیش فرماتے ہیں جیسے یہ آپ کی ساری عمر کے فکر و توجہ کا نتیجہ ہو۔ حالانکہ وہ مسئلہ سے اسی قدر ناواقف ہوتے ہیں جیسے ایک عامی انسان۔

مولانا عبدالحق صاحب بی اے سیکرٹری انجمن ترقی اردو اور پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے ابھی حال میں جو گفتگو بابو راجندر پرشاد سے پٹنہ میں کی ہے۔ اس کے نتائج اخبارات میں شائع ہوئے ہیں ان پر رائے زنی فرماتے ہوئے ہمارے ایک مدیر نے ناگری رسم الخط کی مدح اور اردو رسم الخط کی مذمت اپنے اس خاص انداز میں فرمائی ہے جو صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو تخریبی دماغ رکھتے ہیں اور جانتے کم کہتے زیادہ ہیں۔

رسم الخط ہر ملک میں اس ملک کی مروجہ زبان کی ضرورت کے لحاظ سے ہوا کرتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ چینی اور جاپانی رسم الخط میں بعض الفاظ و نقوش کچھ خاص آوازوں کے ادا کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ جن کے مقابل دوسری زبانوں میں کوئی نقش آپ کو نہیں ملے گا۔ بظاہر وہ غیر ضروری معلوم ہوں تو ہوا کریں حقیقتاً ان زبانوں کو ان کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی انگریزی زبان کو D ۔ B وغیرہ کی۔ انگریزی میں ملاحظہ فرمائیے حرف X بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ K اور S کی مرکب آواز دیتا ہے اور K و S سے اس حرف کا کام لیا جا سکتا تھا اور یہ حرف انگریزی رسم الخط میں بے ضرورت اور زائد ہے لیکن ذرا غور سے توجہ فرمائیں تو معلوم ہوگا ایسا نہیں ہے کیونکہ S اور K کی مرکب آواز سے کسی حد تک مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ نقوش یا حروف کسی رسم الخط میں نہیں پائے جاتے جن کی اس ملک کو ضرورت نہ ہو۔ مثلاً عربی میں ڈ۔ ڈ۔ ٹ۔ پ۔ چ۔ گ وغیرہ کی تلاش عبث ہے۔ عربی زبان کو ان حروف کی ضرورت نہیں۔ ایسے ز۔ ذ۔ ظ وغیرہ حروف سنسکرت میں نہیں مل سکتے۔

یہ ہے وہ فطری وجہ جس سے تمام دنیا کے رسم الخط بنے اور جاری ہوئے ہیں۔ تمدن کی روز افزوں ضروریات نے لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کیا اور آہستہ آہستہ وقتاً فوقتاً اس میں اصلاح و ترمیم بھی ہوتی رہی اور برابر دنیا کے مختلف رسم الخط میں یہ سلسلہ جاری ہے اور شاید ہمیشہ جاری رہے گا۔

میں برسوں سے اردو اور ناگری رسم الخط پر غور کر رہا ہوں میں نے بہت سے مضامین بھی ہندی میں لکھے ہیں۔ ناگری خط سے مجھے کوئی عناد نہیں۔ لیکن پھر بھی میں یقین کرتا ہوں کہ ناگری خط ایک ناکمل اور تکلیف دہ رسم الخط ہے۔

میری رائے میں زبان اور خط کے مسئلہ پر جس نقطۂ نظر سے مسٹر گاندھی اور آنریبل سی گوپال اچاریہ غور کرتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے۔ زبان ہندوؤں یا مسلمانوں کی نہیں ہوا کرتی بلکہ کسی ملک یا دیس کی ہوتی ہے آپ نے کبھی نہیں سنا ہوگا کہ عراق کے مسلمان عربی اور عیسائی عبرانی یا کلدانی زبان بولتے ہیں اور نہ آپ کے تصور میں یہ بات آسکتی ہے کہ بنارس کے مسلمان عربی اور ہندو سنسکرت بولتے ہوں گے۔ کیونکہ ایسا ہونا عقل کے خلاف اور فطرت انسانی کی

اقتضا کے بالکل منافی ہے ۔ ہر ملک کی زبان وہ ہوتی ہے جس میں اس ملک کے رہنے والے چاہے وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں بات چیت کیا کرتے ہیں ۔ اور وہی زبان ان کے لکھنے پڑھنے اور تمام ضروریات میں استعمال کی جاتی ہے پھر یہ کیسا صاف جھوٹ اور کتنی غیر حقیقی بات ہے کہ اردو کو مسلمانوں کی اور بھاشا کو ہندوؤں کی زبان قرار دیا جائے ۔ کیا آج کہیں ہندوستان کے کسی حصہ میں تلسی داس کی رامائن والی یا خان خانان کے دوہوں والی زبان بولی جاتی ہے ۔ ہندی کے رسالوں میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے وہ ہندوستان کے کسی حصہ بلکہ کسی ایک گھرانے میں کہیں بولی نہیں جاتی صدیاں گذریں کہ وہ زبان ہندوستان سے رخصت ہو گئی ۔ بالکل اسی طرح جیسے سرکاری دفاتر سے فارسی ختم ہو گئی ۔ اب جو زبان ہندوستان میں رائج ہے اس کے لئے کسی تشریح یا توضیح کی ضرورت نہیں سب جانتے ہیں کہ وہ وہی زبان ہے جو ہندوستان کے تمام شہروں میں اور شمالی ہندوستان کے شہروں اور دیہات میں عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی ہے ۔ کلکتہ ۔ بمبئی ۔ یوپی ۔ بہار ۔ پنجاب ۔ ناگپور ۔ جہاں جی چاہے بول کر پوچھ کر دیکھ لیجئے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ایک زبان رائج ہے ۔ لب و لہجہ کا معمولی فرق تو پایا جائے گا مگر زبان میں کوئی بنیادی فرق نہ ہوگا ۔

ان علاقوں میں جہاں اُردو یا ہندوستانی زبان بولی جاتی ہے آپ جانتے ہیں کہ ہندو ۔ مسلمان ۔ عیسائی ۔ پارسی ۔ بدھ اور لامذہب سب ہی بستے ہیں لیکن سب کی الگ الگ زبانیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی زبان ہے جس سے اپنے دکھ دوسرے کو سناتے اور دوسرے کی بھی خود سنتے ہیں اگر ایسا نہ ہو تو شاید آقا اور نوکر باپ بیٹے اور دو پڑوسیوں میں بھی تبادلہ خیالات ممکن نہ ہو سکے ۔

ظاہر ہے ان حالات میں کوئی زبان یا رسم الخط کسی مذہب کے ساتھ مخصوص نہیں ہو سکتا بلکہ ہر زبان اور ہر رسم الخط کسی دیس یا ملک سے مخصوص ہوتا ہے ہمارے کسی لیڈر کا یہ کہنا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور قرآن مجید کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اگر تعصب اور تنگ ظرفی نہیں تو جہل اور ناسمجھی کی بات ضرور ہے ۔

یہ بھی غلط ہے کہ کوئی زبان کسی دوسری زبان سے رسم الخط لے کر کام چلائے ۔ ایسا نہیں ہو سکتا دوسری زبان کے رسم الخط میں بہت سی اصلاحات اور اضافے کر کے اپنا بنانا پڑے گا ۔ تیسری صدی ہجری میں جب فارسی نے عربی کا رسم الخط اپنی زبان کے لئے لیا تو اس میں کئی حروف کے اضافے کئے گئے ۔ فارسی کے لئے پہلے سے جو رسم الخط رائج تھا وہ پیدا ہونے والی زبان کا ساتھ نہ دے سکا اس لئے مجبوراً اس کو چھوڑ کر دوسری زبان کے رسم الخط میں اپنی ضرورت کے مطابق اضافے کر کے اپنا بنانا پڑا ۔ اسی طرح ترکی نے اپنا رسم الخط بدلا تو لاطینی رسم الخط میں ۹ - ۱۰ حروف ۔ نقطوں اور نشانوں سے بنانے پڑے ۔

آج جو رسم الخط دُنیا کے مختلف ممالک میں رائج ہیں وہ سب کے سب اپنی اصل کے اعتبار سے کسی نہ کسی مردہ زبان کے رسم الخط کی اصلاح یافتہ شکلیں ہیں دنیا میں جس قدر زبانیں پیدا ہوئیں اتنے رسم الخط نئے پیدا نہ ہوئے بلکہ ایک رسم الخط دس زبانوں کے لئے تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ کارآمد بنایا گیا ۔ لیکن یہ تھوڑا بہت تغیر اس قدر اہم ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ اصلاح شدہ رسم الخط اسی زبان کا مخصوص رسم الخط ہو جاتا ہے ۔ اور ہم کہہ سکتے کہ دو زبانیں بعینہ ایک رسم الخط میں نہیں لکھی جاتی ہیں ۔ بلکہ ہر زبان کسی قدیم رسم الخط کو اصلاح و ترمیم کر کے اپنی ضرورت کے موافق بنا لیتی ہے ۔

ہندوستان میں بھی یہی ہوا ۔ سنسکرت آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان کی بولی کبھی نہ تھی مقدس اشلوکوں کی خاص علمی زبان تھی ۔ عوام سے اس کا کبھی تعلق نہیں تھا ۔ شمالی ہندوستان میں عوام اس وقت ایک ملی جلی سی زبان بولا کرتے تھے جس کے پاس کوئی رسم الخط نہ تھا ۔ مقدس نوشتوں کے لئے جو سنسکرت میں تھے ایک رسم الخط رائج تھا اس کی اصلاح شدہ شکل موجودہ دیوناگری ۔ اور سادہ شکل بہار میں کیتھی رسم الخط ہے ۔ جب پالی نے رواج پایا ۔ پالی رسم الخط بھی ساتھ آیا جیسے سنسکرت کا رسم الخط قدیم سامری رسم الخط سے ماخوذ تھا ۔ اسی طرح پالی کا رسم الخط ہندوستان کے بعض قدیم رسوم الخط کے اقتران سے پیدا کیا گیا ۔ جب پالی رخصت ہوئی برج بھاشا نے اپنا بستر بچھایا ۔ پالی رسم الخط سے کام نہ چل سکا ۔ رسم الخط بھی ساتھ ساتھ رخصت ہو گیا قدیم رسم الخط کی شکلیں درست کی گئیں ۔ اصلاح و ترمیم ہوئی دیوناگری کے نام سے ایک رسم الخط بنا یہ بولی جب تک بولی جاتی رہی رسم الخط اس کے لئے کام آتا رہا ۔ شیخ محمد جائسی اور عبدالجلیل بلگرامی کے دور تک چلے آئیے آپ دیکھیں گے کہ فارسی رسم الخط کے متعارف اور دفتری رسم الخط ہونے کے باوجود بھاشا کا سرمایہ ادب سب کا سب ناگری میں لکھا جاتا رہا ۔

اردو یا کھڑی بولی جب دکن سے نکل کر شمالی ہندوستان میں پھیلی تو اس کے لکھنے کے لئے رسم الخط کا مسئلہ سامنے آیا ۔ اور ٹھیک وہی سوال پیدا ہوا جو برج بھاشا کے ابتدائی دور میں پیدا ہوا تھا ۔ پالی رسم الخط جیسے برج کے لئے کارآمد ثابت نہ ہو سکا ۔ اُردو کے لئے بھی بھاشا کے رسم الخط سے کام چلتا نظر نہ آیا ۔ گرد و پیش نظر کی گئی تو سب سے زیادہ آسان اور متعارف رسم الخط فارسی کا نظر

آیا۔ ٹ۔ ڈ۔ ڑ وغیرہ بڑھا کر اپنا بنا یا اور کام لیا اور جیسے بھاشا کے شاعروں تلسی داس اور سورداس نے اپنے دواوین کو فارسی رسم الخط میں لکھنے کی کوشش نہ کی اسی طرح لعل چند رنگین اورنگ آبادی اور دیاشنکر نسیم لکھنوی نے اپنے کلام کا مجموعہ ناگری میں نہ لکھا اگر خدانخواستہ ایسا کرتے تو ان کے پڑھنے کیلئے کچھ دنوں کے بعد شاید کسی ماہرِ فن خطوط کی ضرورت ہوتی۔ اور جس زبان کے وہ شاعر تھے اس زبان کے لکھے پڑھے آدمی کے بس کی بات نہ رہتی۔

اُردو رسم الخط اگرچہ فارسی رسم الخط سے لے کر بنایا گیا ہے لیکن اسے بعینہٖ فارسی کا رسم الخط نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اگر نسبت اصل کی طرف ہی منظور ہے تو ہندی رسم الخط کو سنسکرت بلکہ اور قدیم سامری رسم الخط کہا کیجئے کیونکہ تاریخ کا وسیع علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ ناگری میں اپنا اس سے زیادہ نہیں جتنا اردو رسم الخط میں اپنا اردو کا حصہ ہے۔

جب اردو کے لئے فارسی رسم الخط میں تغیر و تبدل کیا جا رہا تھا تو اس وقت کے لوگوں نے بھی ان ہی خیالات کے ماتحت جو تجدد پسند مصلحین کے سامنے ہیں اس کام کو شروع کیا تھا۔ اور فارسی رسم میں ضروری تغیرات کے بعد اس کی صلاحیت پیدا کر دی کہ ہماری زبان کے تمام مروجہ الفاظ اور ان دوسری زبانوں کے الفاظ کو جن سے ہمیں اپنے فرہنگ کی تکمیل کے لئے الفاظ لینے پڑتے ہیں نہایت آسانی کے ساتھ ادا کر سکے۔ ہمیں اس وقت دیکھنا یہ ہے کہ پچھلی صدیوں کے ہندوستانیوں کی یہ تجویز کس قدر کامیاب رہی اگر واقعتاً وہ کامیاب رہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی نادانی اور کج فہمی سے یہ صدیوں کا سرمایہ اور ہندوؤں اور مسلمانوں اور کسی تک انگریزوں کا بھی یہ قرنوں کا نتیجۂ عمل برباد کر دیں اگر ہم نے اپنی نادانی سے کوئی انقلاب خط میں کر دیا تو اب تک کا سارا کارنامہ آئندہ نسلوں کے لئے سرمایہ ادب نہیں بلکہ آثارِ قدیمہ کا مخزن نشانات ہو جائے گا۔ اور کتابیں کتب خانوں سے نکل کر عجائب خانوں میں جگہ پائیں گی۔ آئندہ صفحات سے آپ انشاء اللہ بہ آسانی سمجھ سکیں گے کہ یہ لوگ اس تجویز میں ناکام نہیں رہے اور جو زبان ہندوستان کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس کے لئے موجودہ اردو رسم الخط سے زیادہ آسان مفید اور کارآمد کوئی دوسرا اردو رسم الخط نہیں ہو سکتا۔

ہاں اگر مردہ زبان سنسکرت یا مردہ بھاشا کو ہندوستان میں زندہ کر کے تاریخ کا سب سے پہلا تجربہ کرنا ہے اور آہستہ آہستہ ہندوستان کی روزمرہ کی زبان سنسکرت زبان کو بنانا چاہتے ہیں جو کبھی کسی زمانے میں روزمرہ کی زبان نہ تھی تو یہ ایک الگ مسئلہ ہے جس پر کسی اور فرصت میں عرض کیا جا سکے گا لیکن اگر اسی زبان کو زندہ رکھنا ہے جسے ہم آپ سب بولتے ہیں اور جسے گاندھی جی "ہندوستانی" کے مہمل مرکب سے یاد فرماتے ہیں تو آپ یقین فرمائیں کہ اس کے لئے ناگری یا لاطینی رسم الخط کامیاب نہیں ہو سکتا۔ क پر نقطہ لگا کر क़ اور ज پر نقطہ لگا کر ज़ تو بنا لیا جا سکتا ہے مگر ع کی آواز اور ن۔ ہ۔ ل۔ و کی مرکب آوازوں کے لئے کیا سبیل نکالی جائے گی۔

فرض کیجئے کہ ان آوازوں کے لئے کچھ نقوش وضع کر لئے گئے بھی تو کسی رسم الخط میں جو آسانیاں مدنظر رکھی جاتی ہیں وہ صرف نقوش اور آوازوں کی مطابقت ہی تو نہیں ہوتی بلکہ رسم الخط میں اور کئی چیزیں غور طلب ہوتی ہیں اور ایک رسم الخط پر کئی حیثیتوں سے غور کیا جاتا ہے۔

تعلیم کی آسانیوں کے اعتبار سے۔

طباعت کی سہولت کے اعتبار سے۔

جگہ، محنت اور وقت کے اعتبار سے۔

ضرورت ہے کہ ہم اُردو اور ناگری دونوں رسم الخط پر ان تمام حیثیات سے غور کریں پھر دیکھیں کہ کونسا رسم الخط ہماری زبان اور ہمارے ملک کے لئے مفید، آسان اور کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ ورنہ ضد اور بال ہٹ میں پڑ کر ہم اپنے ملک کو نقصان پہنچانے کے سوا کیا پائیں گے۔ آج ہندی کے رسالوں کی جو روش ہے وہ اگر ایک اور نسل تک جاری رہی تو یقین فرمائیں کہ انگریزی زبان و خط کو ہندوستان میں ضروری بنانے میں ان کا سب سے بڑا حصہ ہوگا۔ اور دو صوبوں میں نہیں بلکہ ایک ہی شہر کے دو آدمیوں میں خط و کتابت کے لئے انگریزی کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہے گا۔ کیونکہ وہ زبان جو ان رسالوں کے ذریعہ پیدا کی جا رہی ہے وہ ہندوستان کی عمومی زبان انشاء اللہ کبھی نہ ہو سکے گی۔ اور اردو سے دشمنی بجو بیلن کے حمیلوں نے پیدا کی ہے وہ رسم الخط کو عوام سے چھڑانے میں اگر کامیاب ہو گئی تو بتائیے کہ ایک ہی شہر کے دو آدمی انگریزی کے سوا کس خط و زبان میں مراسلت کریں گے۔

دنیا میں اگر زندہ رہنا ہے اور زندوں کی طرح اپنی زبان و قلم سے کچھ کام لینا ہے تو ٹھنڈے دل سے بغیر ضد اور غصہ کے جذبات کی آمیزش کے سوچئے اور غور فرمائیے ہٹ اور تنگ ظرفی سے تعصب اور کینہ سے بلند و بالا رہ کر سوچئے کہ اس قسم کی تحریکیں اور کوششیں بال ہٹ اور نقصان وہ ضد سے زیادہ کوئی حیثیت رکھتی ہیں؟

اُردو اور ناگری دونوں خطوں پر مختلف حیثیتوں سے غور فرمائیے۔ تفصیل بڑی فرصت اور وسعت چاہتی ہے اس لئے صرف بعض حیثیتوں

سے اور وہ بھی بہت غیر تفصیلی طور پر اس صحبت میں کچھ عرض کرتا ہوں ملاحظہ فرمائیے۔ ان میں بہت ہی تھوڑے نمونے پیش کئے گئے ہیں اس سے زیادہ کے لئے نہ تو مجھے فرصت تھی اور نہ گنجائش۔

آواز و حروف: سب سے پہلے نقوش اور آوازوں کی مطابقت کو لیجئے۔ لاطینی رسم الخط کا تو کوئی سوال نہیں کہ وہ ہماری زبان کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ ناگری رسم الخط کو لیجئے۔ یہ رسم الخط بھی باوجود ترمیم و اضافہ کے ہماری زبان کی تمام آوازوں کو ادا نہیں کر سکتا۔ بلاشبہ تلسی داس جی کی رامائن اور عبدالرحیم خانخاناں کی ست سئی کی آوازیں کسی حد تک ادا کر سکتا ہے مگر سوچئے تو آج ہندوستان کی وہی زبان ہے جو اس وقت تھی آج اس باغ میں کیتکی اور کدم کے پھولوں کے ساتھ ساتھ گلاب اور یاسمین بلکہ کہیں کہیں ولایتی کروٹن بھی موجود ہے انہیں نکال کر الگ پھینک دینے کا خیال نادانی ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں میں ضرورت اور حالات کے مطابق دوسری زبانوں کے الفاظ ملتے رہتے ہیں کوئی زبان انہیں یک دم نکال نہیں سکتی ترکی میں جس کے بارے میں عربی اور فارسی کے الفاظ نکال دینے کی بڑی کوشش کی گئی ہزاروں اس کے اپنے ہو کر رہ گئے کوئی ترکی اخبار پڑھ کر دیکھ لیجئے سینکڑوں الفاظ دوسری زبانوں کے ملیں گے عربی جس پر دوسری زبانوں کا اثر نسبتاً کم پڑا ہے۔ فارسی اور دوسری زبانوں کے بیسیوں الفاظ اپنے ذخیرہ لغات میں رکھتی ہے۔

غرض کہ اردو سے بھی وہ اجنبی الفاظ جو اب اجنبی نہیں رہے بلکہ اس کے اپنے ہو چکے ہیں نکالے نہیں جا سکتے تو ضرورت ہے ایسے رسم الخط کی جو ان تمام آوازوں کو جو اندرونی اور بیرونی الفاظ کے اس مجموعہ کے لئے ملک میں رائج ہیں آسانی سے ادا کر سکے اس ضرورت کے لئے ناگری رسم الخط کافی نہیں ہے۔

ناگری میں ۳۷ حروف صحیح (وینجن) ۱۶ حروف علت (سور) اور ۱۲ ماترائیں یعنی اعراب ہوتے ہیں یہ کل ۶۵ نقوش ہوئے۔ ان پر ۵ ان حروف کا اضافہ کیجئے ج خ۔ ز غ۔ ف۔ ق کی آوازوں کے لئے نقطے لگا کر بنائے گئے ہیں کل (۴۷) حروف تہجی ہوئے۔ اس اتنے بڑے مجموعہ میں ل۔ ہ اور ن۔ ہ کی مرکب آواز کے لئے کونسی ترکیب ہے مثلاً لفظ ننھا اور لفظ کولھو میں ل کے ساتھ ہ کی اور ن کے ساتھ ہ کی مرکب آواز پیدا ہوتی ہے ناگری میں باوجود اس قدر کثیر حروف تہجی کے اس کے لئے کوئی سامان نہیں ہے۔ آج کل جس طرح لکھتے ہیں وہ چترویدی دوارکا پرشاد شرما کی ڈکشنری ہندی شبدارتھ پاریجات سے نقل کرتا ہوں کولھو कोल्हू اور ننھا नन्हा لیکن ان سے جو آواز پیدا ہونا چاہیئے وہ کولْ ہُو اور نَنْ ھا ہے مرکب آواز نہیں ہو سکتی کیونکہ اس لغت میں हिन्दी ہندی اور تلپ तल्प بمعنی بستر کے لئے وہی ٹکڑے استعمال کئے گئے ہیں۔ اصل میں ناگری حروف کے ٹکڑے صرف ان حروف کے ساکن ہونے کو بتلاتے ہیں مرکب آوازوں کے لئے الگ الگ حروف ہوتے ہیں جیسے کھ ख گھ घ وغیرہ مگر لام اور نون کے اس طرح ہ سے مرکب آواز کے لئے کوئی حرف موجود نہیں ہے۔

اسی طرح دکھاؤ بلاؤ یعنی اردو میں جو آواز ہمزہ اور واؤ سے ادا کی جاتی ہے اس کے لئے ناگری میں کوئی نقش موجود نہیں ہے۔ ہمزہ اور واؤ سے جو آواز پیدا ہوتی ہے۔ وہ یقیناً الف اور واؤ کے مرکب سے مختلف ہے لیکن ناگری رسم الخط میں کوئی سبیل اس کے ادا کرنے کو موجود نہیں یا دِکھَوْ یا دِکھا اُ لکھنا پڑیگا۔

س۔ ص۔ ث کی آوازیں اردو میں اگرچہ مختلف نہیں ہیں مگر ان میں معانی کے اعتبار سے بڑا فرق ہے اگر اس فرق کو ختم کر کے ناگری حرف स سے کام لیا گیا تو ہم اثیر اور اسیر کے باہمی فرق معانی سے محروم ہو جائیں گے۔ اردو رسم الخط میں ض۔ ث۔ ص وغیرہ کے موجود ہونے کی وجہ سے ہمارے لئے ابتداء سے اب تک بڑی آسانیاں رہی ہیں اور ہمارے فرہنگ میں بہت سے الفاظ دوسری زبانوں سے اس آسانی کے ساتھ منتقل ہو گئے کہ آج ہزار ہا اردو دان جو فارسی اور عربی سے بالکل ناواقف ہو وہ بھی ان الفاظ کی وجہ سے اپنے خیالات خوبصورت سلیس اور سلجھی ہوئی عبارت میں ادا کرنے پر قادر ہے۔ بظاہر اگرچہ یہ ہم آواز حروف غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں مگر معانی کی وسعت اور الفاظ کی فراوانی کا جو صلہ ہمیں ان کی وجہ سے ملتا ہے وہ رسم الخط میں ان حروف کے بوجھ کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔

یہ اردو زبان میں انوکھا عیب نہیں ہے بلکہ دنیا کی اکثر و بیشتر زبانوں میں یہ چیز پائی جاتی ہے ہمارے ایک فاضل انشا پرداز نے ابھی کچھ دن ہوئے لکھا تھا کہ وہ اب تک بعض الفاظ کی املا صحیح نہیں لکھ سکتے اور ص کی جگہ س لکھتے ہیں۔ شاید ان کو یاد نہیں رہا کہ دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں الفاظ کے لئے مخصوص املا ہوا کرتی ہے۔ انگریزی میں تو یہ بہت زیادہ ہے کہیں TURE CHAF کی آواز دیتا ہے اور کہیں CH - KH کی۔ ناگری میں بھی یہ بات اردو سے کچھ زیادہ پائی جاتی ہے श - ष - स - न وغیرہ حروف ایک دوسرے کی جگہ نہیں استعمال کئے جا سکتے اور جیسے صندوق کی بجائے صندق اردو میں غلط سمجھا جاتا ہے۔ ناگری میں بھی कृष्ण کی بجائے करिश्न غلط سمجھا جائے گا۔ اور انگریزی میں بھی STATION کی بجائے STESHAN

غلط سمجھا جائے گا۔ یہ کسی زبان کا عیب نہیں ہے بلکہ اس کی خوبی ہے۔ ان آوازوں کے علاوہ اور بھی بہت سی آوازیں ہیں جو ادا نہیں ہو سکتی ہیں مگر ان کی فہرست طویل اور شاید پڑھنے والوں کے لئے بار ہو جائے گی۔ اس لئے میں نے انہیں چھوڑ دیا ہے غور کرنے سے ہر اس شخص کو معلوم ہو سکتی ہیں جو دونوں رسم الخط سے واقف ہے۔

تعلیم:۔ ہمارے سامنے دوسرا مسئلہ تعلیم کا مسئلہ ہے۔ ناگری رسم الخط پر اس حیثیت سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے میں نے اپنے بعض احباب سے جو ناگری رسم الخط سے ناواقف ہیں بارہا یہ سنا ہے کہ ناگری دو دن میں سیکھی جا سکتی ہے۔ لیکن ان کا یہ فرمانا بطور واقعہ نہیں بلکہ محض لطیفہ کی طرح ہوتا ہے ان میں سے بعض نے دس بیس دن تک محنت کی لیکن لکھنے پڑھنے پر قادر نہ ہو سکے۔ اس وقت انہیں معلوم ہوا کہ وہ جو سمجھ رہے تھے وہ ناواقفیت اور غلط فہمی تھی ابھی کچھ دنوں کی بات ہے کہ میرے ایک دوست کے ساتھ یہی قصہ ہوا اور ان کو تقریباً تین ماہ تک محنت کرنے کے بعد یہ اقرار کرنا پڑا کہ ناگری خط کے سیکھنے کے بارے میں وہ غلط فہمی میں مبتلا تھے۔

اصل بات یہ ہے کہ اردو رسم الخط جب ہم نے سیکھا تھا ہم بچے تھے اور ظاہر ہے کہ اس وقت ہماری قوت ادراک اور سمجھنے کی صلاحیت پختہ عمر سے بہت کم تھی اب جوان ہونے کے بعد دو چار حروف ناگری کے جب ہم جلدی سے سیکھتے ہیں اور نام لکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو اس مدت کا مقابلہ بچپن کی مدت تعلیم سے کرتے ہیں اور فیصلہ صادر فرماتے ہیں کہ اردو رسم الخط سیکھنے میں زیادہ دقت اور محنت صرف ہوتی ہے۔ حالانکہ اس وقت جب کہ ہم نے اردو سیکھا تھا نہ تو آج اتنی ہمیں سمجھ تھی اور نہ اتنا دھیان سیکھنے پر دیتے تھے۔

ابھی کچھ دنوں کی بات ہے کہ ایک صاحب نے اردو کے لئے لاطینی رسم الخط تجویز کرتے ہوئے بڑا سخت اعتراض اردو رسم الخط پر کیا تھا کہ وہ اب تک کبھی کبھی س کی جگہ ص لکھ دیا کرتے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ یہ اعتراض اردو رسم الخط پر عائد ہوتا ہے یا ان کے علم و فضل پر۔ ان حضرت کو یاد نہ رہا کہ ابتدا تعلیم میں انہوں نے انگریزی الفاظ کی املا کتنی بار غلط لکھی تھی اور آج تک کتنی بار ڈکشنری کی مدد لئے بغیر ان کو صحیح املا لکھنا نصیب ہوتا ہے۔ افسوس کہ شاید وہ بیچارے ناگری سے حرف شناس نہیں ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ ناگری میں اردو سے بھی زیادہ پابندی کے ساتھ श - ष - स - का فرق قائم رکھنا پڑتا ہے۔ اور جب تک صحیح املا معلوم نہ ہو کوئی شخص ایک سطر صحیح عبارت نہیں لکھ سکتا۔ اور لکھنا تو الگ رہا اگر صحیح املا معلوم نہ ہو تو ایک سطر پڑھ بھی نہیں سکتا۔ اگر خدانخواستہ اس میں مبالغہ معلوم ہو تو ناگری حروف صحیح ۳۳، حروف علت ۱۲ ماترا ۱۲ اور پانچ خ غ وغیرہ والے منقوط حروف کل ۶۴ نقوش جو ناگری کے پورے حروف ہجا ہیں کسی سے ایک بڑے تختہ کاغذ پر لکھوا لیجئے پھر ان کی مدد سے کسی ہندی رسالہ کی صرف سرخیاں ہی پڑھنے کی کوشش فرمائیے۔ معلوم ہو جائے گا کہ حروف ترکیب کے وقت اتنی طرح طرح کی شکلیں بدلتے ہیں کہ سینکڑوں جگہ ان کی اصلی شکلوں کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ اردو میں قاعدہ ہے کہ کوئی حرف جب کسی دوسرے حرف سے ملتا ہے تو ملنے والے حرف کا ابتدائی حصہ آخری کشش کو نکال کر قائم رکھا جاتا ہے جو پڑھنے والے کو اپنی اصلی شکل یاد دلاتا ہے۔ مثلاً جسم میں ج کا اور اس کا ابتدائی اور میم کامل موجود ہے۔ لیکن ناگری میں یہ ضروری نہیں ہے ज رجب مرزا मिर्ज़ा میں لکھا جائے اپنی اصلی شکل اس طرح بدل دے گا کہ لفظ کے آخری حصہ پر اوپر کو ایک قوس نما نشان بن جائے گا۔ ملاحظہ فرمائیے کہ حرف ज سے ر اس نشان کو کیا نسبت ہے اور جب کوئی شخص صحیح املا نہ جانے کیسے پڑھ سکتا ہے۔

اردو میں انجمن حمایت اسلام لاہور کا قاعدہ۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی کا قاعدہ اور ہندی میں ہندی پہلی پستک رام نرائن لال الہ آباد ہندی پرائمر اور ہندی اردو مالا مصنفہ فاضل پنڈت ہری ہر شاستری پروفیسر انچارج جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن اس وقت میرے سامنے ہے۔ تعلیمی نقطہ نظر سے غور کرنے پر جو نتائج ناگری اور اردو رسم الخط کے متعلق نکلتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں میں کوئی ماہر فن تعلیم نہیں ہوں اور نہ مجھے بچوں کی تعلیم کا کوئی علمی تجربہ ہے مگر ظاہری نظر سے جو معلوم ہو سکا ہے وہ پیش ہے۔ آپ خود غور فرما کر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ دونوں رسم الخط میں سے کونسا رسم الخط آسانی سے سیکھا سکھایا جا سکتا ہے۔

اردو رسم الخط کے سکھانے کا یہ طریقہ عام طور سے مقبول ہے کہ سب سے پہلے اردو کے ۳۴ حروف تہجی کی شکلیں ذہن نشین کرائی جاتی ہیں۔ یہ شکلیں بہت ہی آسان اور سادی ہندسی خطوط سے بنی ہوئی ہیں کسی تختی یا کاغذ کے چار رخ ہو سکتے ہیں۔ (۱) | (۲) — (۳) / (۴) \ اور نقطے کی تین شکلیں ە ہوتی ہیں۔ اردو کے سارے حروف تہجی ان ہی چار قسم کی لکیروں اور نقطوں سے مرکب ہیں۔ اس لئے بڑی آسانی سے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ میں نے بعض ننھے بچوں کو بھی جو ذرا ذہین تھے دو ایک گھنٹوں میں یاد کرتے دیکھا ہے اسکے بعد ان تو حروف کو جوڑ کر جو

کبھی کسی دوسرے حرف سے نہیں ملتے بلکہ دوسرے حروف ان سے ملتے ہیں بقیہ ۲۵ حروف کو ۸ گروپ میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور ہر گروپ میں سے دو ایک حرف کو تمام حروف سے ملا کر ٹکڑوں کی شکلیں ذہن نشین کرا دی جاتی ہیں ان ۳۴ حروف میں سے ۱۴ حروف تو وہ ہیں جن کی شکلیں الگ نہیں ہوتی ہیں بلکہ صرف نقطوں کے فرق سے بنتی ہیں۔ اس یکسانیت کی وجہ سے شکلوں کے یاد رکھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے اس کے بعد دو حرفی سہ حرفی چہار حرفی الفاظ اور جملے پڑھا کر مشق کرا دی جاتی ہے اور چھوٹی تقطیع کے ۲ صفحات کا ایک قاعدہ ختم کر لینے کے بعد جو ایک جوان آدمی کے لئے دو تین اور بچے کے لئے دس بیس دن کی محنت چاہتا ہے۔ ایک طالب علم اردو کی تمام صاف لکھی ہوئی عبارتیں پڑھنے لگتا ہے اب اس کے آگے مشق اور روانی کا درجہ ہے جو عادت اور کام پر منحصر ہے۔

دوسری طرف ناگری رسم الخط کو لیجئے۔ سب سے پہلے ۱۶ حروف علت سکھائے جاتے ہیں جن کی شکلیں نہایت غیر مناسب اور الجھی ہوئی ہیں بچہ تو بچہ کسی جوان آدمی کو بھی جلدی یاد نہیں ہو سکتی ہیں شاید آپ اسے مبالغہ سمجھیں اس لئے یہ حرف لکھے جاتے ہیں۔

अ आ इ ई उ ऊ ऋ ॠ ऌ ॡ

ए ऐ ओ औ अं अः

یہ ہیں ناگری حروف میں سو یعنی حروف علت ان شکلوں کو یاد رکھنا ایک بچہ کے لئے ا ب ج د کی نسبت کس قدر مشکل ہے۔ اس کے لئے خود ان شکلوں سے قوی کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد حروف صحیح یاد کرائے جاتے ہیں جو ۳۰ اور ۵ منقوط جدید حروف کل ۳۸ ہیں یہ حروف ایک دوسرے سے اسقدر مختلف شکل و صورت کے ہیں کہ یادداشت کے لئے ان کی گروپ وار تقسیم ممکن نہیں شکلیں ان کی بھی حروف علت کی شکلوں کی طرح الجھی سی ہیں نمونہ کے لئے دو تین حروف لکھے جاتے ہیں۔

چھ کش گین

ज्ञ क्ष छ

اس کے بعد ۱۶ ماترائیں یعنی اعراب بتائے جاتے ہیں پھر ان کے حروف کے ساتھ استعمال کرنے کے طریقے بتائے جاتے ہیں لیکن چونکہ یہ اعراب تمام حروف صحیح کے ساتھ ایک ہی طرح نہیں لگائے جاتے بلکہ بعض کے ساتھ لگانے کے خاص طریقے ہیں اس لئے ان کو ہر ہر حرف کے ساتھ لگا کر مشق کرایا جاتا ہے۔ مثلاً धूप دھوپ میں پیش کا نشان حرف ध کے نیچے لگایا گیا ہے۔ مگر रूप روپ میں یہی نشان حرف र کے

وسط میں ایک چھوٹی لکیر کے ذریعہ جوڑا گیا ہے۔ اس کے بعد حروف کے ٹکڑے اور ان کے ایک دوسرے سے ملنے کا مرحلہ آتا ہے ایسے حروف کو ہندی میں سنجگت اکھشر کہتے ہیں یہ مرحلہ طالب علم کے لئے بہت ہی مشکل اور نہایت ہی پریشان کن ہے اور سنجگت اکھشر کا وجود ناگری رسم الخط کے عیوب میں سب سے بڑا عیب ہے اکثر اساتذہ نے صرف اس کے لئے سو سو صفحات کی الگ مستقل ریڈریں لکھی ہیں اور کم از کم میں نے تو آج تک بیسیوں ریڈریں ہندی کی دیکھیں مگر کسی میں یہ نہ پایا کہ پہلی ریڈر میں اسے بتا دیا گیا ہو۔ سب سے اچھی شکل ان ٹکڑوں کے مشق کرانے کی فاضل پروفیسر ہری ہر شاستری عثمانیہ یونیورسٹی نے اختیار کی ہے مگر ظاہر ہے کہ رسم الخط کی بنیادی خرابی کو رفع کر دینا پروفیسر موصوف کے بس کی بات نہ تھی اس لئے پروفیسر صاحب کو بھی اس کے لئے اپنی کتاب کا پورا دوسرا حصہ وقف کر دینا پڑا۔ اس میں فاضل مصنف نے تقریباً پونے دو سو شکلیں مختلف حروف کے ان ٹکڑوں کی بنائی ہیں جو ان کے کسی دوسرے حرف سے ملنے یا کسی دوسرے حرف کے ان سے ملنے سے پیدا ہوتی ہیں میں بھی فاضل پروفیسر کے اس بیان کی تصدیق کرتا ہوں کہ ہندی کی پوری لیاقت صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب انسان حروف صحیح کے ملاپ سے اچھی طرح واقف ہو جائے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ جب تک یہ تمام شکلیں اچھی طرح یاد ہوں نہ ایک سطر عبارت لکھ سکتا ہے اور نہ پڑھ سکتا ہے۔

نظر ثانی کرنے میں غالباً فاضل پروفیسر کو بھی اقرار کرنا پڑے گا کہ بعض شکلیں سنجگت حروف کی اتنی لمبی فہرست میں بھی درج ہونے سے رہ گئی ہیں مثلاً ابتدا بہ سکون اور ساکنین کی جو شکلیں سنجگت حروف میں ہوتی ہیں وہ اس میں درج نہیں ہو سکی ہیں مثلاً धृष्ट دھرشٹ [illegible] وغیرہ

اس کے بعد نون کی آواز اور غنہ کی آواز مشق کرائی جاتی ہے کیونکہ ناگری میں یہ دونوں آوازیں کس جگہ کس طرح سے ادا کی جاتی ہیں اور اس کے بہت مخصوص قسم کے قاعدے مقرر ہیں اگرچہ وہ قاعدے بھی کلیات نہیں ہیں ان آوازوں کے لئے جو مخصوص طریقہ کسی لفظ کے لئے مقرر ہے دوسرے لفظ میں مت سے غلط سمجھا جائے گا مثلاً चांद چاند पतङ्ग پتنگ हिन्दी ہندی डण्डा ڈنڈا व्यञ्जन ویجن وغیرہ وغیرہ ان سب مرحلوں کے بعد بھی اردو کے ص۔ س۔ ض۔ ظ کی طرح ष श स न ड وغیرہ کے استعمال کا فرق باقی ہی رہ جاتا ہے جو الفاظ کے صحیح معنی کی یاد اور صحیح املا کی مشق پر منحصر ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ مجھے کوئی رائے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ اردو اور دیوناگری رسم الخط میں سے کونسا رسم الخط ہماری تعلیمی ضرورت کیلئے مفید اور سہل ہے۔ میں جس زمانہ میں پاٹ شالہ میں پڑھتا تھا میں نے دیکھا ہے کہ ابتدائی عمر کا بڑا حصہ صرف کرنے کے باوجود طلبا آسانی سے لکھنے پڑھنے پر قادر نہ تھے اور خود گرو جی بھی غالباً اپنی یہ کمزوری چھپانے کے لئے ہر عبارت کو لحن سے گا گا کر پڑھا کرتے تھے۔

طباعت:۔ دوسرا اہم سوال طباعت کی آسانیوں کا ہے جدید دُنیا میں مطابع کی اہمیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور آج ہر ملک اپنے مطابع کو قوی سے قوی تر بنانے پر تلا ہوا ہے۔ ہندوستان میں جب پہلے پہل مطابع کا رواج ہوا تو ہماری ساری کوششیں متداول درسی کتابوں تک محدود تھیں۔ مانوس اور متعارف خط نستعلیق خط تھا اس خط میں لیتھو کی طباعت نے رواج پکڑا حتیٰ کہ عربی کتابیں بھی خط نسخ کی بجائے نستعلیق میں چھپنے لگیں اور ہم نے اس پر اتنا زور دیا کہ پچھلی صدی کے نصف آخر میں جبکہ مصر کا مشہور مطبع امیری بولاق ٹائپ میں عربی کتابیں چھاپ رہا تھا ہم نسخ اور نستعلیق دونوں خطوں میں لیتھو سے کتابیں چھاپا کرتے رہے۔ اور اردو تو اردو عربی کے لئے بھی ہندوستان میں ابتک لیتھوگرافی رائج ہے اور ٹائپ کا کام بہت تھوڑا ہوا کرتا ہے۔

لیتھوگرافی کو بعض وجوہ کی بنا پر ترجیح دی جا سکتی ہے لیکن بحیثیت مجموعی یہ ٹائپ کی بہ نسبت دقت طلب ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اردو کو ٹائپ کی طباعت اختیار کر لینا چاہیئے۔ لیتھوگرافی کو فائن آرٹ پرنٹنگس تک محدود رکھا جائے تو حرج نہیں مگر عام مطبوعات کے لئے رائج رکھنا نقصان دہ ثابت ہوگا۔

نسخ و نستعلیق کا قصہ ایک ہی رسم الخط کے مختلف نمونوں کا قصہ ہے۔ ہمیں اس جگہ دیکھنا صرف یہ ہے کہ دیوناگری اور اردو رسم الخط میں سے کس کی طباعت زیادہ آسان ہے۔ اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے ہمارے سامنے کئی سوال آتے ہیں جن میں سب سے زیادہ ٹائپ رائٹر مشین کی کامیابی اور ٹائپ کے مطبعی حروف کی کامیابی کا مسئلہ ہے ناگری حروف میں چونکہ ماترائیں یعنی اعراب حروف کے اوپر نیچے اور بغل میں تینوں جگہ لگائے جاتے ہیں اور ٹائپ رائٹر مشین میں اوپر نیچے نشان لگانے کی کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی اس لئے ٹائپ رائٹر مشین ناگری رسم الخط کے لئے کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس کیلئے بڑی کوششیں کی گئیں مگر جو مشین بن کر تیار ہوئی وہ ایسی ہے کہ خط ٹائپ کرنے کے بعد ماترائیں قلم سے لگانا پڑتی ہیں۔ میرے پاس متعدد دوستوں کے خطوط کبھی کبھی ہندی ٹائپ رائٹر سے ٹائپ کئے ہوئے آتے ہیں ان سب کا یہی حال ہے کئی سال ہوئے کہ ایک مرتبہ میں نے ٹائپ رائٹر خریدنے کا ارادہ کیا اس سے پہلے ہندی ٹائپ رائٹر کے دیکھنے بلکہ کچھ ٹائپ کرنے کا اتفاق مجھے بارہا ہو چکا تھا میں نے سوچا کہ ایسے ٹائپ رائٹر سے زیادہ آسان قلم سے ہی لکھ لینا ہے پھر بھی میں نے متعدد اداروں سے خط و کتابت کی کہ شاید کوئی صورت اصلاح کی نکل آئی ہو مگر مجھے جو جوابات ملے وہ حد درجہ مایوس کن تھے معلوم ہوا کہ اس میں کامیابی کی کوئی امید نہیں کیونکہ اس کی راہ میں ماتراؤں سے بھی بڑی رکاوٹ سنجگت حروف کی ہے چونکہ یہ ٹکڑے حروف سے اوپر نیچے بیچ میں اور بغل میں طرح طرح سے ملتے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ اتنے تمام ٹکڑے ٹائپ رائٹر میں لگائے جائیں اور ظاہر ہے کہ اس قدر کثیر التعداد ٹکڑوں کی گنجائش ٹائپ رائٹر مشین میں نہیں ہو سکتی اس لئے کارآمد اور صحیح ٹائپ رائٹر مشین ناگری رسم الخط کی نہیں بن سکتی۔ اس وقت جو ناکام مشین موجود ہے وہ صرف بڑے بڑے اداروں میں صرف ایک مشین بطور دلچسپی موجود ہے نہ تو اس سے کام لیا جاتا ہے اور نہ کام دے سکتی ہے۔

اردو کی ٹائپ رائٹر مشین ہر جگہ صحیح کام دے رہی ہے اس کے متعلق کسی بیان کی ضرورت نہیں ہر شخص جانتا ہے کہ بڑے بڑے دفتری اور نجی کام بے تکلف لئے جاتے ہیں۔

ٹائپ کے مطبعی حروف کی کامیابی کا دارومدار ان کے ٹکڑوں کی کمی تعداد کمپوز کی آسانی اور کاغذ کی کفایت پر ہے۔ اردو حروف ناگری سے بہت ہی کم جگہ لیتے ہیں ان کی باہمی نسبت تقریباً ۶۳ اور ۱۵۰ کی پڑتی ہے یعنی ایک عبارت جو اردو حروف میں ۶۳ سطروں میں آسکتی ہے وہ ناگری حروف میں ۱۵۰ سطروں میں آتی ہے۔ کمپوز کی آسانی کے لئے ٹکڑوں کا کم سے کم ہونا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ تمام ٹکڑے یکساں ایک طرح کے ہوں ایک دوسرے کے نیچے اوپر لگائے جانے والے نہ ہوں ورنہ کمپوزیٹر کی دقتیں بڑھ جانے کے علاوہ غلطیوں کا احتمال بھی بڑھ جاتا ہے اور پروف ریڈر کی محنت بھی بڑھ جاتی ہے دقت زیادہ صرف ہوتا ہے

اور کام کی رفتار سست ہو کر مطبوعات کی لاگت میں اضافہ ہوجاتا ہے

اردو میں بشمول ہمزہ و لا کل ۴۳ حروف تہجی ہوتے ہیں جن میں سے ا۔ و۔ ڈ۔ ذ۔ ر۔ ڑ۔ ز۔ ژ۔ لا۔ ۹ حروف کبھی کسی حرف سے نہیں مل سکتے اس لئے ان کی صرف دو شکلیں ہوتی ہیں۔ (۱) جب وہ مفرد استعمال ہوں (۲) جب ان میں کوئی دوسرا حرف ملے۔ بقیہ ۳۴ حروف کی چار چار شکلیں ہوتی ہیں۔

(۱) جب وہ کسی حرف سے ملیں۔

(۲) جب وہ کسی لفظ کے بیچ میں واقع ہوں۔

(۳) جب وہ کسی لفظ کے آخر میں واقع ہوں۔

(۴) جب وہ مفرد استعمال کئے جائیں۔

یہ سب کل ۸۰ ٹکڑے ہوئے کچھ ٹکڑے حسن و خوبصورتی قائم رکھنے کے لئے بنا لئے جاتے ہیں کچھ مرکب ٹکڑے سہولت کے لئے تیار کر لیتے ہیں۔ غرض ۸۰ ٹکڑوں میں پورا ٹائپ ہوجاتا ہے اس وقت تک جدید ترین صورت جو تیار ہو سکی ہے وہ ۸۰ ٹکڑوں میں ہے اور بہت ہی خوبصورت اور ضرورت کے لحاظ سے مکمل ہے۔ اس میں جوڑوں کی مختلف شکلیں جو جابری اور حسن خط کے لئے ضروری ہیں سب موجود ہیں۔

اب ذرا ناگری ٹائپ کو دیکھئے اس کے مندرجہ ذیل ٹکڑے ہوتے ہیں:-

۳۷ حروف صحیح

۱۵ حروف علت

۱۷ ماترائیں

۲۳۰ سنگت کے ٹکڑے یعنی حروف کی وہ شکلیں جو مختلف جوڑوں میں استعمال کی جاتی ہیں۔

۲۹۹

یہ ۲۹۹ ٹکڑے تو حروف کے ضروری ٹکڑے ہوئے۔ مگر چونکہ کمپوزیٹر کی آسانی کے لئے زیادہ استعمال ہونے والے مرکب ٹکڑے بھی ضروری ہیں اس لئے اکھنڈ یعنی مرکب شکلیں جنہیں انگریزی میں لیگچر کہا جاتا ہے ناگری ٹائپ کے لئے بہت سی رکھی جاتی ہیں اس طرح پورا سٹ تقریباً ۶۰۰ ٹکڑوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

پھر ایک دقت ناگری رسم الخط میں یہ بھی ہے کہ اگر ماترائیں حروف کے نیچے یا اوپر لگائی جاتی ہیں اور کمپوزنگ میں یہ صورت ممکن نہیں ہوتی اس لئے بیشتر حروف مع حرکات کے ڈھال لئے جاتے ہیں اگرچہ کیکا بھائی ٹائپ فونڈری بمبئی اور گجراتی ٹائپ فاونڈری بمبئی کے رائج ٹائپوں میں اس کا حل نکالا گیا ہے۔ اور تقریباً ہر ٹائپ فونڈری نے اپنے ٹائپوں میں اسے اختیار بھی کر لیا ہے۔ مگر اس سے کمپوزیٹر کی محنت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اور وقت کا خون ہوتا ہے۔ وہ حل یہ ہے کہ ایک ٹائپ کو ۳ غیر متساوی ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے مثلاً اگر پریم प्रेम لکھنا ہو تو اس کے حرف प میں کئی ٹکڑے جوڑے جائیں گے اور اگر ۱۲ پوائنٹ کے حروف کمپوز کئے جارہے ہوں تو ۹ پوائنٹ کا ٹکڑا ۳ پوائنٹ کا سادہ نیچا ٹکڑا ملا کر مرکب حرف اور اس کے اوپر ۹ پوائنٹ کا ٹکڑا حرکت کا اور اس کے بغل میں ۳ پوائنٹ کا سادہ نیچا ٹکڑا لگایا جائے گا اس سے کمپوزیٹر کا کام تقریباً پانچ گنا بڑھ جاتا ہے اور رفتار کارگذاری کم و بیش ۴/۵ کم ہو جاتی ہے۔ ان دقتوں کی وجہ سے عموماً حروف مع حرکات استعمال کئے جاتے ہیں۔ جن کی تعداد سینکڑوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اگر یہ حروف مرکب صورت میں استعمال نہ کئے جائیں تو جن الفاظ میں تین تین ٹکڑے جوڑے جاتے ہیں عموماً غلط کمپوزنگ ہوجاتی ہے مجھے خود بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے اور صرف دو دو صفحوں کے مضامین اصلاح کرتے کرتے پریشان ہوگیا ہوں۔

ان کثیر التعداد ٹکڑوں اور کمپوزنگ کی ان دقتوں کی وجہ سے کمپوزنگ پر لاگت بھی زیادہ آتی ہے اور کارگذاری بھی کم ہوتی ہے۔

سہولت:- تیسرا سوال ہماری روزمرہ کی دفتری اور نجی ضروریات کا ہے۔ ناگری رسم الخط پر اس حیثیت سے بھی غور کیا جانا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ اگر ہم ناگری رسم الخط اختیار کریں تو ہماری دقتیں کچھ زیادہ تو نہیں ہو جاتی ہیں۔

جو حرف آسانی سے صحیح لکھا جا سکتا ہو اور تیزی سے صحیح پڑھا جا سکتا ہو وہ کامیاب خط سمجھا جائے گا۔ اردو رسم الخط ایک قسم کی مختصر نویسی ہے ناگری سے بہت جلد لکھا جا سکتا ہے۔ اور ناگری سے دوگنی تیزی کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔ لکھنے کا قاعدہ نہایت مکمل طور سے مرتب ہے۔ ہر طرح کی خط و کتابت اور تحریر عبارت میں کم وقت اور کم محنت سے کام لیا جا سکتا ہے۔ بخلاف اس کے ناگری رسم الخط میں خود سنسکرت اور بھاشا کے الفاظ لکھنے کا قاعدہ تک پوری طرح مرتب نہیں ہے اس وقت میرے سامنے ایک بہت فاضل سنسکرت داں کی مطبوعہ کتاب موجود ہے اس میں ایک لفظ پنڈت کو تین طرح سے لکھا گیا ہے (۱) पन्डीत (۲) पंडित (۳) पण्डित

اسی طرح اس کتاب میں لفظ دکن کو کہیں दकन کہیں दक्खिन اور کہیں दक्षिण لکھا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ املا کا یہ فرق صرف ایک مصنف کی ایک ہی کتاب سے لیا گیا ہے۔ اس رسم الخط کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ جو کچھ اس نے لکھا ہے وہ صحیح ہے اور جو دہ پڑھ رہا ہے وہ غلط نہیں ہے۔

آپ یقین فرمائیں کہ فاضل مصنف کے فضل و کمال کا انکار آفتاب کے نور اور شب کی سیاہی کا انکار ہوگا۔ چوٹی کے سنسکرت دانوں میں یہ مصنف بھی ہے۔ سنسکرت میں ایم۔ اے پاس کیا ہے اور جو لکھا ہے بالکل صحیح لکھا ہے مگر اس کو کیا کیجئے کہ اس رسم الخط میں لکھنے اور پڑھنے کا قاعدہ صحیح طور سے مرتب نہیں ہے۔

دوسری دقت جس کی وجہ سے لکھی تو لکھی ناگری میں چھپی ہوئی تحریر بھی تیزی سے صحیح طور پر پڑھی نہیں جا سکتی یہ ہے کہ حروف کے ٹکڑے جہاں پر لکھے جاتے ہیں وہاں پر پڑھے نہیں جا سکتے مثلاً سپردھا स्पर्धा کہ اس میں ترتیب حروف س۔ پ۔ و۔ ھ۔ ا۔ ر۔ ہے اور ترتیب صوتی س۔ پ۔ ر۔ د۔ ھ۔ ا ہوتی ہے۔ اسی طرح اعراب جب مرکب حروف پر لگائے جاتے ہیں تو لگائے کسی کے ساتھ جاتے ہیں اور پڑھے کسی اور کے ساتھ مثلاً क्लेश کلیش کہ اس میں زیر کا نشان جو بظاہر क پر لگا ہوا ہے ल پر پڑھا جائے جس کا ایک ٹکڑا क کے نیچے جوڑ دیا گیا ہے۔

کسی عبارت کے پڑھنے میں آنکھیں اپنا کام زبان سے کچھ پہلے انجام دیتی ہیں اور جب پڑھنے والا کسی عبارت کے پہلے لفظ کو پڑھتا ہے تو اس اثنا میں کہ وہ لفظ اس کی زبان سے ادا ہو آنکھ دو تین لفظ آگے کے دیکھ کر دماغ کو پہنچا دیتی ہے۔ اور دماغ انہیں زبان سے جاری کراتا ہے نقوش اور اصوات کے اختلاف ترتیب کی وجہ سے یہ بات ناگری رسم الخط میں نہیں ہو سکتی اس لئے ناگری میں لکھی ہوئی عبارت تیزی سے نہیں پڑھی جاتی ہے۔

کسی عبارت کو جلد سے لکھ لینے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے الفاظ کے لئے کم سے کم نقوش بنائے جائیں۔ ورنہ جتنی زیادہ خدمت قلم کو انجام دینی پڑے گی اتنی ہی کم رفتار کتابت کی ہوگی۔ اب ذرا یہ دکن ناگری میں لکھئے रहरे दोहावा مقابلہ فرمائیے کہ قلم کو اردو کی بہ نسبت کتنا زیادہ کام کرنا پڑا اور کاغذ کا کتنا زیادہ حصہ صرف ہوا کتنی بڑی نادانی ہوگی کہ ہم اپنی روزمرہ کی ضروریات میں یہ رسم الخط استعمال کریں۔

یہ ہے ناگری رسم الخط کی دقتوں کا مختصر بیان۔ زیادہ تفصیل کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ موقع۔ خدانخواستہ اس بیان سے میرا مقصد صرف عیوب گنوانا نہیں ورنہ فہرست اس سے بہت زیادہ طویل ہوتی۔ بلکہ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ بعض اردو داں احباب جو یہ سمجھتے ہیں کہ ناگری رسم الخط آسان ہے یہ صحیح نہیں ہے ان پر واضح ہو جانا چاہیئے کہ ناگری رسم الخط ہرگز اس قابل نہیں کہ اسے ہندوستان کی عام زبان کا رسم الخط قرار دیا جا سکے مجھے معلوم ہے کہ اردو رسم الخط میں باوجود بیش بہا خوبیوں کے کچھ عیوب بھی ہیں۔ جن کی اصلاح کی طرف ہمیں توجہ کرنی چاہیئے۔ مگر اس کا یہ حل کسی طرح نہیں ہے کہ اس سے زیادہ مشکل اور ناکام رسم الخط اختیار کر کے اپنی دقتوں میں اضافہ کریں۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی رائے ہے کہ ہندی اور اردو دونوں کو پھولنے پھلنے کا موقع دیا جائے اور جو شخص ان میں سے تنہا ایک رسم الخط کی حمایت کرتا ہے وہ فرقہ پرست ہے مجھے اس بیان کے دوسرے جز سے اتفاق نہیں کیونکہ اگر یہ کلیۃً صحیح تسلیم کر لیا جائے تو مہاتما گاندھی جی مہاراج کی ہندی ساہتیہ سمیلن کے متعلق مساعی جمیلہ کو کیا کہا جائے۔

میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ زبان اور اس کے رسم الخط پر محض رسم الخط کے حسن و قبح کی بنا پر لکھا ہے۔ میرے نزدیک اس وقت قوموں کی روایات اور ان کے رجحانات کا کوئی سوال نہیں ہے اگرچہ میں ان سوالوں کو جواہر لال جی کی طرح نامحمود اور غیر ضروری نہیں سمجھتا کہ واقعات اور حقائق کی دنیا تصورات اور لکچروں کی دنیا سے بہت مختلف واقع ہوئی ہے۔ چند افراد کو روایات و رجحانات سے الگ کر کے دوسری جگہ کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ مگر پوری قوم کو اس کی روایات اور رجحانات سے نہیں ہٹایا جا سکتا لیکن پھر بھی کم از کم اس وقت میرے پیش نظر صرف آسانی اور خوبی کا سوال ہے۔ حمایت اور مخالفت دونوں میری حد نظر سے اس وقت باہر ہیں میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ ہندوستان کے تمام ہندی اداروں اس رسم الخط کو سنسکرت کا مخصوص رسم الخط قرار دیں۔ اور مذہبی تعلیم کا لازمی جزو سمجھیں جیسا کہ ہمیشہ سے ہندوستان میں رہا ہے۔ میں اس رسم الخط کو ہندوؤں کے لئے اتنا ہی ضروری سمجھتا ہوں جتنا ان کے لئے سنسکرت اور مسلمانوں کے لئے عربی زبان کو کہ مذہب مشرق کے لئے چھوڑ دینے کی چیز نہیں باقی رہی ہندوستان کی عام بول چال تو اس کے لئے اردو رسم الخط سب سے اچھا رسم الخط ہے۔

عبدالقدوس ہاشمی

پیاری زبان

چُپ سے کیوں بدگمان ہے پیارے — بے زبانی زبان ہے پیارے

آبسی جانِ زار آنکھوں میں — اب کہیں اور دھیان ہے پیارے

میرا نام و نشاں نہیں کوئی — بے نشانی نشان ہے پیارے

دشمن اپنی سی کر ہی گذرے تھے — تو بڑا مہربان ہے پیارے

تو کوئی مجھ سے اِتنا دُور نہیں — زندگی درمیان ہے پیارے

نت نئی زندگی ہماری ہے — نت نیا امتحان ہے پیارے

کتنی پیاری زبان ہے اُردو

"یہ ہماری زبان ہے پیارے"

حفیظ ہوشیارپوری

ایک فرانسیسی نژاد اردو شاعر کا منظوم سفرنامہ

اکتوبر کے ادبی دنیا میں شور بیرمٹی کی اُس مثنوی کا ذکر ہو چکا ہے جس میں انہوں نے اپنے ذاتی حالات نظم کئے ہیں۔ اس مثنوی کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں انہوں نے بعض مشہور مقامات کی سیاحت کا حال قلم بند کیا ہے۔ یہ سفر انہوں نے کب کیا؟ اس کے متعلق صحت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن یہ ظاہر ہے کہ فتنۂ غدر کے فرو ہونے کے بعد وہ گھر سے نکلے تھے۔ قیاس چاہتا ہے کہ اپنی اہلیۂ اول کے زمانۂ علالت میں نیز ان کی اور اپنے والدین کی وفات کے بعد شور نے یہ سیاحت کی ہوگی۔ اُن کی اس سیاحت کو حقیقی معنوں میں "تفریحی" کہا جا سکتا ہے۔ ورنہ علی گڈھ، آگرہ، گوالیار وغیرہ مقامات ایسے تھے جہاں وہ ہمیشہ آتے جاتے رہتے تھے۔ جے پور اور گوالیار کی سیاحت کے متعلق وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان مقامات میں وہ بلائے ہوئے گئے تھے جیسا کہ مثنوی کے مندرجات سے واضح ہوتا ہے۔

شور کے اس سیاحت نامے سے اُس عہد کے حالات پر کافی روشنی پڑنے کے علاوہ بعض مقتدر ہستیوں سے بھی واقفیت ہو جاتی ہے، نیز بعض یورپین شعرائے اردو کے کوائف و مشاغل بھی آئینہ ہو جاتے ہیں۔

سب سے پہلے شور علی گڈھ گئے اور وہاں کی تباہی و بربادی دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے۔ ان کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتا ہے ؏

علی گڈھ رئیسوں سے خالی ہوا

مصائب غدر کی داستان گویا اسی ایک مصرعے میں بند ہے۔

لکھتے ہیں:۔

کبھی مثل جہاں کے جاتے ہیں ہم — تو حسرت لئے واں سے آتے ہیں ہم

مگر ہاں کبھی دل کو بہلاتے ہیں — جو دو چار شاعر وہاں پاتے ہیں

شعرائے علی گڈھ میں چھوٹے خاں متین، عبدالرحمٰن مائل، اور بنواری لال شعلہ کو شور اپنے "یاروں" میں شمار کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ عبدالمجید، نبی داد خاں، اور فدا حسین فدا سے بھی خاص مراسم تھے۔ موخرالذکر کے اُسی زمانے میں دو دیوان اور تصوف میں ایک مثنوی شائع ہو چکی تھی۔

آگرہ کی سیر کے حالات میں وہاں کی مشہور عمارات کا تذکرہ ہے پھر چند مخصوص روساء سے متعارف کیا ہے جو دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلے خاندان لائن کا ذکر ہے جس کے بعض افراد بڑے بڑے جلیل عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ ازاں جملہ ایک پال لائن تھے جو "قطب" کہلاتے تھے اور کچہری لگی رہتی تھی اُن کے گھر۔ ان کا ایک بھائی ہنری لائن تھا۔ انہیں پرندوں کا بہت شوق تھا۔ لال، تیتر، بٹیرا مرغ ہر سال لڑایا کرتے تھے۔ بہت سی اقسام کے کبوتر بھی پال رکھے تھے ان کا ایک بھتیجا تھا جس کا نام جان لائن تھا۔ اس کو مرغ بازی کا شوق تھا۔ اس کو فارسی اور انگریزی زبان پر اچھا عبور تھا۔ فرانسس ایس نامی ایک مشہور تاجر کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کے متعلق فرماتے ہیں۔

. . . . — بڑے خوش مزاج اور ظرفہ بشر

کہ ہر شخص سے ان کی تھی چھیڑ چھاڑ — تمسخر طبیعت میں تھا لے شمار

فرانسس ایس اگرچہ بے علم شخص تھا لیکن بڑی خوبیوں کا آدمی تھا۔ زمانۂ غدر میں شور انہیں کے ہاں مقیم تھے۔ ان کی شیریں زبانی ان کے ایسی آڑے آئی کہ خود بھی بچ گئے اور بہتوں کو بچا لیا، اور اس کے صلے میں خود بھی نہال ہوئے اور اولاد بھی مالا مال ہو گئی۔

مارٹین نامی دو بھائی بھی اس زمانے کے روساء میں شمار ہوتے

تھے۔ یہ لوگ "پرانے فیشن" کے آدمی تھے اور بہت ہر دلعزیز تھے۔ پرانے لوگوں میں ہڑفیلڈ نامی خاندان بھی مشہور تھا۔ اب اس خاندان میں جان اور ایڈورڈ دو بھائی رہ گئے تھے۔ ایڈورڈ کو ستار بجانے میں استادانہ مہارت تھی اور ہر شخص اس کے کمالِ فن کا معترف تھا۔ جان کو پتنگ بازی کی لت تھی، مگر اسی میں وہ نام پیدا کیا تھا کہ باید و شاید۔ جان بیل نامی ایک اور شخص کی تعریف کی ہے کہ "شرابی کبابی رہے عمر بھر"

غیر مسیحی رؤسا میں مرزا الف بیگ، نظام علی خاں، حکیم نصیر الدین اور متھرا پرشاد وکیل کی دائمی جدائی پر غم کے آنسو بہائے ہیں۔

اس کے بعد "زندوں کا حال" نظم کیا ہے۔ سب سے پہلے گاسٹین کا ذکر ہے جو "جہاں دیدہ ہیں اور بڑے نکتہ بیں"۔ وہ صیغۂ مال میں ملازم تھے۔

ضعیفی کا جب ان کو آیا پیام   تو پنشن ملی اور ہوا گھر قیام

لیکن زمانہ ان کے موافق نہ رہا۔ تنگ دستی نے سارا مزا کر کرا کر دیا۔ رؤسا کیمپ میں نکلسن بھی ایک مشہور تاجر تھے۔

عجب صاحبِ خلق و اخلاق ہیں   مروت میں وہ شہرۂ آفاق ہیں

ان کا بڑا بیٹا نہایت ذی شعور تھا اور لندن سے شادی کر کے لایا تھا۔ محکمہ پولیس میں ایک شخص اپنے ذکراس نامی تھے جن سے ہر خاص و عام خوش تھا۔ ایک دفعہ وہ گھوڑے پر سے گر گئے اور ایسی چوٹ آئی کہ کام سے معذور ہو گئے۔ پنشن لے کر خانہ نشین ہو گئے۔

فرانسس ہیس کا ذکر ہو چکا ہے ان کے تین بیٹے تھے۔ مگر وہ اپنے باپ کے کام اور نام کو نہ سنبھال سکے۔ باہمی نفاق اور پھوٹ نے سب کچھ خاک میں ملا دیا۔ نپولین بیل بھی شور کے احباب میں تھے اور نہایت زندہ دل اور رنگین طبع تھے۔ مگر شراب کی بہت بری لت لگی تھی۔ "اسی سے کہیں جم کے رہتے نہیں!" آگرہ میں شور کے ایک اور دوست تھے جن کا نام مسٹر فارنن تھا وہ سر دفتر مال کے عہدے پر فائز تھے۔ نہایت قابل شخص تھے۔ حکام کو بھی ان کی دیانت داری کا اعتراف تھا۔ عوام میں بھی اچھی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ شور نے "الکو صاحب" نامی ایک اور "مشفق با وفا" کا ذکر کیا ہے جو "بڑے کار داں اور بڑے ہوشیار" اور تحصیل میں پیشکاری کی خدمت پر مامور تھے۔ جیمس ہڑفیلڈ تو شور کے رشتہ دار ہی تھے تاہم ان کو بھی "کرم فرما" اور "باوقار" ظاہر کیا ہے۔ چونکہ وہ ریاست گوالیار کے "قدیم نمک خوار" تھے، اس لئے مستقل سکونت وہیں تھی۔ مارٹین برادران کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان کی اولاد کے بارے میں لکھا ہے کہ "اپنے اپنے گھر خوش ہیں" مگر سب کے چھوٹے جدا ہو گئے"۔

اس کے بعد شور نے اپنے ہم زلف نواب کانسٹین کی تعریفوں کے پل باندھے ہیں۔ انہوں نے چالیس برس تک سرکاری خدمت انجام دی اور پنشن لے کر خانہ نشین ہو گئے۔ کلکٹر ضلع نے متعدد بار انہیں ڈپٹی کلکٹری کے لئے نامزد کرنا چاہا مگر انہوں نے ہمیشہ انکار کر دیا کہ نیت میں فتور آ جائے گا۔ پنشن لینے کے بعد اپنا دل چرندوں اور پرندوں سے بہلانے لگے کاغذ کے پھول پتے کترنے میں انہیں بے حد کمال حاصل تھا" وہ اب "زمانے سے دل تنگ ہے"۔ آخری زمانے میں طبیعت تصوف کی طرف مائل ہوئی اور اس موضوع پر صدہا کتب کا مطالعہ کیا

ڈاکٹر جان نامی ایک "نامور" کا بھی ذکر ہے جو "بہت خوش مزاج اور عمدہ بشر" ہونے کے علاوہ "کیا کرتے ہیں بیشتر چیر پھاڑ"۔ انہوں نے علم الابدان پر ایک لاجواب کتاب تالیف کی تھی جس کو سرکار نے بہت پسند کیا اور انہیں انعام و خطاب سے عزت بخشی۔ پنشن یاب ہونے کے بعد وہ کانپور چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

غیر مسیحی احباب میں سب سے پہلے لالہ شیو نرائن، سیکرٹری چونگی کا ذکر ہے۔ یہ صاحب علم تسخیر کے ماہر تھے اور ہر شخص ان سے خوش تھا۔ دوسرے ڈاکٹر مکند لعل کو سراہا ہے جو اپنے احباب سے فیس نہیں لیتے تھے اور نہ دوا کے دام ہی لیتے تھے۔ غرباء کا بھی مفت علاج کرتے تھے۔ ان کے لئے شور نے دعا کی ہے۔

خدا تا قیامت سلامت رکھے

بیانِ آگرہ کے خاتمہ پر شور نے آگرہ کی تعریف میں ایک مختصر نظم بھی درج کی ہے۔ تین شعر یہ ہیں:۔

اب کے نشاطِ عیش کی کچھ دھوم اور ہے   دیکھا ہے ہم نے یوں تو کئی بار آگرہ

اللہ رے عیش بل بے خوشی اُف رے تازگی   شاداب ہے بہار سے بسیار آگرہ

جلسے یہاں کے دیکھو کوئی دن تو اور شور
دکھلایا ہے خدا نے بہ دشوار آگرہ

دہلی کی سیر کے بیان میں سب سے پہلے "حالِ پر ملال شہر شاہجہان آباد خلد آباد" کا بیان کیا ہے اور اس کی تباہی پر آنسو بہائے ہیں۔ اسی ضمن میں قلعہ کی بربادی کا بھی نقشہ کھینچا ہے، اور آخر میں "نہ رونق نہ وہ لطف ہے سیر کا" کہہ کر اس بیان کو ختم کیا ہے۔ اس کے بعد بیان مکانات باقی ماندہ" مذکور ہے

اس کے ذیل میں دریبہ کلاں، دُکان گلاب عطر فروش، چاوڑی بازار، بازار کلاں، چاندنی چوک، گھنٹہ گھر، عجائب گھر، کمپنی باغ، منڈی غلہ، سبزی منڈی، قطب کی لاٹ اور ایلیلے میلے رپھول والوں کی سیر) کی ثنا و صفت نظم کی ہے۔ بعد ازاں بعض عمایدین شہر کی جدائی پر آنسو بہائے ہیں۔

عمایدین شہر میں سب سے پہلے مولوی آزردہ کا ذکر ہے جو

ہر اک فن میں کامل تھے اور نامور

وہ مفتی عدالت تھے اور لاجواب شعر کہتے تھے۔ غدر میں اُن کی جان مفت گئی، اور اُن کے ساتھ ہی اُن کے دونوں فرزند بھی ہلاک ہوئے۔ مشہور خوشنویس امیر علی پنجہ کش، شاہ عبدالعزیز، بدرالدین مہرکن، کالے صاحب طبیب، میر تقی میر، میر حسن، شاہ نصیر، خواجہ میر درد، شاہ ظفر، مرزا غالب، مومن اور ذوق کا بھی ذکر کیا ہے جنہوں نے دہلی کی شہرت و عظمت کو چار چاند لگائے۔

پرانے لوگوں کے تذکرے کے بعد موجودالوقت "رئیسان و شاعران" کا ذکر ہے۔ نواب ضیاءالدین خاں آف لوہارو کے بارے میں فرماتے ہیں کہ انہیں فارسی میں کامل دستگاہ ہے اور اردو میں بھی خوب کہتے ہیں۔ ان کی شاعری پر شور نے کیا خوب مرصع مصرعہ کہا ہے۔

زباں ہے سلیس اور بیاں ہے نفیس

اس سلسلے میں آپ کے صاحبزادگان نواب احمد سعید خاں اور حسام الدین خاں کا ذکر کیا ہے جنہیں "شعر گوئی سے بھی شوق ہے"۔ پھر جناب مبین کا نام لیا ہے اور انہیں "اُستاد" اور "فن شعر میں قابل صاد" کہا ہے۔ شور نے لکھا ہے کہ شہر کی تمام طوائفیں محفلوں میں مبین کی غزلیں گاتی ہیں۔ نواب مرزا داغ کو "عالی دماغ" اور مرزا ارشد گورگانی کے کلام کو "مرغوب" کہا ہے حسن اور رعالی کو "اختر و نور" سے تشبیہہ دی ہے۔ پھر کسی نابینا شاعر المتخلص بہ "ویراں" کا ذکر ہے۔

جو نازک گوئی میں ہے لاجواب

شعرا کے بعد شور نے فضل مصور، حکیم محمود خاں، حکیم بدرالدین خاں اور حکیم قیام الدین کے کمال فن کی داد دی ہے۔ اخیر میں جیمس اسکنر کے بیان کے ساتھ اس خاندان کے دیگر دو افراد نواب مرزا الاسٹوارٹ اسکنر) اور چھوٹے مرزا کا ذکر کیا ہے جن کو شور نے اپنا یار غار بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ

بڑے خانداں کے ہیں یہ آدمی ۔۔۔ کہ جرنیل تھا باپ ان کا کبھی

دہلی کی سیر کے خاتمہ پر پہلے تو یہ دعا ہے "جو قائم ہیں یارب وہ قائم رہیں"۔ بعد ازاں مرحومین کے لئے دعا کی ہے "وہ جنت میں داخل ہوں جو مر گئے"۔ سب سے آخر میں یہ شعر لکھ کر دہلی کی سیر ختم کی ہے۔

کرو شکر حاکم کہ دل شاد ہے ۔۔۔ نئے سر سے دلی پھر آباد ہے

جے پور کی سیر کے حال میں ساقی نامہ کے بعد پہلا شعر ہے

گئے سیر کو ہم جے پور کی ۔۔۔ اُسے دیکھ کر دل کو فرحت ہوئی

اس کے بعد شور نے "جے پور دارالسرور" کی آرائش و زیبائش کی تعریف کی ہے۔ اس سلسلہ میں تمام قابل دید چیزوں کا ذکر آگیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ جے پور جانے کا اتفاق ایسے وقت ہوا کہ

جے پور تھا جلوۂ نور میں

یعنی شہزادہ (پرنس آف ویلز) نے ورود اجلال فرمایا تھا اور بہ تقریب عوت تمام شہر بقعۂ نور بنا ہوا تھا ؂

شب قدر وہ شب بنی تھی وہاں ۔۔۔ تجلی تھی اک نور کی سب عیاں
وہ کنولوں کی اور قمقموں کی بہا ۔۔۔ چراغوں کی وہ روشنی بے شمار
کہ اختر فلک پر خجل ہو گئے ۔۔۔ مہ و خور بھی عاشق ہوئے دیکھ کے

جے پور میں شور کی ملاقات کپتان الظونی سے ہوئی جن کو انہوں نے بڑی خوبیوں کا انسان کہا ہے، "اور جو سراسر محبت کی بنیاد ہیں"۔ اسی طرح کپتان طامس کو سراپا مجسمہ "اخلاق اور مروت میں شہرۂ آفاق" کہا ہے۔ میتنل نامی ایک کمیدان کی بھی تعریف کی ہے اور مسٹر مارٹن کی طبابت کو سراہا ہے۔ ان چاروں حضرات کو شور نے اپنا "شفیق" بیان کیا ہے۔

جے پور میں ایک روز راجہ صاحب کے سررشتہ دار نے شور کی دعوت کی اور ایسے عمدہ اور لذیذ طعام دسترخوان پر چنے

کہ جنت کی نعمت خجل اُس سے تھی!

شور جب الور گئے ہیں اُس وقت راجہ شیودان سنگھ کا دور دورہ تھا۔ اُن کے دورِ حکومت کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ

کوئی عہد میں اس کے مفلس نہ تھا

والی الور کو جس چیز کا شوق ہوا اُس کو حدِ کمال تک پہنچا کر ہی چھوڑا مثلاً اسلحہ خانے کی طرف توجہ منعطف ہوئی تو وہ لاجواب اسلحہ بہم پہنچائے

جن کا جواب نہیں گھوڑوں کا شوق ہوا تو

بھرے اصطبل روز ہی جاتے تھے — کہ عربی و ترکی چلے آتے تھے
وہ مشکی نہ رنگ ایسا دیکھا کوئی — یہی زلفِ مشکیں کو حسرت رہی
وہ سبزہ کہ فیروزہ شرما گیا — وہ گلدار، لالہ بھی گل کھا گیا
وہ سرخہ کہ سرخی جب اس سے نپٹے — تو رنگِ حنا رشک سے کٹ ہی جائے
وہ نقرہ کہ زیبے اس پہ مدام — سراپا ہے وہ نقرئی لا کلام
وہ گرہ کہ جوبن پہ غرّہ کرے — وہ رنگ اس کا ہر رنگ دکھا کرے
سیہ ناز ایک ایک ایسے سمند — سمند صبا کا ہو دم جن سے بند

اس کے بعد پری خانہ کا تذکرہ ہے جس میں ایک ایک پری وش انتخابِ لاجواب ہے۔

ہزاروں کی تنخواہ وہ پاتی تھیں — ہزاروں ہی اوپر اڑا جاتی تھیں
خزانہ انہوں نے ہی خالی کیا — بھرا تھا جو قلعہ میں دو پشت کا

بعد ازاں راجہ صاحب کو پتنگ بازی کا شوق ہوا۔ اس کے لئے بھی بہتر سے بہتر سامان بہم پہنچایا گیا اور ہزاروں پر پانی پھر گیا۔

اسی طرح لعلوں سے جب دل لگا — ہزاروں ہوئے لعل اُن پر فدا
. . . . . — لڑائی رہا کرتی تھی صبح و شام

اور محض لڑائی ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ ہزاروں کی بازیاں بدی جاتی تھیں۔ اس شوق سے طبیعت سیر ہوئی تو شیر کے شکار کی سوجھی اور اتنے شیر شکار کئے کہ جنگل خالی ہو گئے ۔ ؎

شکار ہو کے الور کو جب جاتے تھے — تو گھر میں ہزاروں ہی نقد آتے تھے
کہ نذریں دیا کرتے سب اہلِ کار — کیا راجہ صاحب نے ہے یہ شعار

الغرض — اسی طرح جو شوق پیدا ہوا
اسے حد تلک خوب پہنچا دیا

اس دوران میں راجہ صاحب کے مشکوئے معلّی میں ایک فرزند نرینہ پیدا ہوا۔

. . . . — خوش اقبال و خوش روز فرخندہ فال
ہوئی اس خوشی کی بڑی دھوم دھام — شب و روز جلسوں کا تھا اژدہام
خزانے کا دروازہ کھولا گیا — مہینوں تلک وہ لٹایا گیا
غرض چھ مہینے یہ نقشہ رہا — کہ دعوت سے کوئی نہ خالی بچا
کری پھر چھٹی بھی بڑی شان سے — عجب ٹھاٹھ اور ارمان سے

چھٹی کے سلسلے میں جنرل نسلی صاحب کا بھی خوب نام ہوا کیونکہ

. . . . — چھٹی کی انہوں نے جو کی دھوم دھام
چلے کرتے ٹوپی ملائک کے ہاتھ — جلو میں مہ و خور بھی تھے ساتھ ساتھ

ان انتظامات میں جنرل صاحب کے برادرِ کپتان مینوئل نسلی نے بھی کافی حصہ لیا تھا۔ شورؔ نے ان کی "خدمات" کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ شورؔ اسی زمانۂ جشن میں الور پہنچے تھے ان کی بھی چند دعوتیں ہوئیں اور ایک ماہ تک یہ کیفیت رہی کہ

چلا خوب دن رات دورِ شراب — کہ جس کی نہ حد تھی نہ کچھ تھا حساب

جوزف نسلی صاحب فوج کے جنرل تھے۔ شعر گوئی سے انہیں خاص شغف تھا۔ فناؔ تخلص کرتے تھے۔ خوشنویس بھی اعلیٰ درجہ کے تھے۔ اور ستار بھی خوب بجاتے تھے۔ شورؔ سے ان کا بہت قریبی رشتہ تھا، اس لئے انہیں کے یہاں قیام تھا لیکن مہمان راجہ صاحب کے تھے چنانچہ فرماتے ہیں ۔ ؎

شب و روز جلسوں میں حاضر تھے ہم — عنایات راجہ نہ ہوتی تھیں کم
ہمیں پھر تکلف سے خلعت ملا — ادا شکر بھی دل سے ہم نے کیا

شورؔ نے اس موقعہ پر "تہنیت نامہ" راجہ صاحب کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ چند شعر دیکھئے ؎

یہ فرزند دلدار پیدا ہوا ہے — نصیبے کا بیدار پیدا ہوا ہے
نہ دولت کی ہوگی کمی راج کو اب — یہ ایسا گہربار پیدا ہوا ہے
مہ و خور سے کیا اس کو تشبیہ دوں میں — سراسر پُر انوار پیدا ہوا ہے
لبالب مے عیش سے جام ہوگا — خوشی کا طلبگار پیدا ہوا ہے

یہ سب کچھ تو ہوا لیکن ریاست بیس لاکھ کے قرضے میں دب گئی اور اس کی ساکھ جاتی رہی۔ حکومت نے دو ایک بار تنبیہہ کی، لیکن جب کوئی اثر نہ ہوا تو ایک ایجنٹ کی تعیناتی عمل میں آئی۔ راجہ صاحب معزول کردئے گئے، اور ان کے مصارف کے لئے ایک رقم بطور وظیفہ مقرر ہو گئی۔ اسی اثنا میں جنرل نسلی مرضِ سل میں گرفتار ہو گئے۔ راجہ صاحب کو ان سے

حد درجہ محبت تھی۔ بظاہر ملازم تھے باطن میں یار۔ ازبس علاج کیا
مگر اس مرض سے نہ جانبر ہوئے — اسی سل کے آخر کو تھپڑ پڑے

۴۲ سال کی عمر تھی کہ دنیا سے منہ موڑ لیا (۱۸۷۱ء)، تمام الور میں شورِ ماتم بپا ہوا۔ ہزارہا لوگ جنازے کے ساتھ تھے۔ راجہ صاحب کو جوزف نسلی کی جدائی کا بے حد صدمہ ہوا۔ ہم سن ہونے کے علاوہ دونوں نے ایک ہی مدرسے میں تعلیم پائی تھی۔ اسی زمانے میں وہ نونہال بھی رخصت ہو گیا

جس کے جشنِ ولادت میں خزانہ کا منہ کھول دیا گیا تھا۔ اولاد کے غم میں رانی صاحبہ بھی سدھار گئیں۔ ان پے در پے صدمات نے راجہ صاحب کی کمر توڑ دی۔ جیسے تیسے ایک دو برس گزارے،

بالآخر گئے وہ بھی ملک بقا

راجہ صاحب کی وفات پر ریاست کا نظم و نسق کپتان کیبڈل کے تفویض ہوا۔ ان کی خوبیٔ انتظام سے ریاست کی کایا پلٹ ہو گئی۔ ڈپٹی طامس ہیڈرلی کو صیغہ مال کا نگراں مقرر کیا گیا۔ اسی سلسلے میں ان کے صاحبزادے بھی کام میں لگ گئے۔ ان تینوں باپ بیٹوں سے شور کے اچھے مراسم تھے۔ ہیڈرلی کا ایک نہایت نفیس مکان میرٹھ میں بھی موجود تھا۔

کئی سال تک الور میں ایجنٹی کا دور دورہ رہا۔ بالآخر، دور کا ایک رشتہ دار نکل آیا اور

دیا اس کو سرکار نے راج پاٹ

ان کا نام نامی منگل سنگھ تھا۔ یہ وہ مہاراجہ الور ہیں جن کا سالِ رواں میں ولایت میں انتقال ہوا ہے۔

گوالیار کسی زمانے میں ہندوستان میں سب سے بڑی حکومت تھی، بلکہ کہنا چاہیئے کہ سارا ہندوستان اس کے قبضۂ اقتدار میں تھا۔ شور فرماتے ہیں ؎

کسی وقت میں ہند قبضہ میں تھا   یہی راج مالک تھا اس ملک کا
علی گڈھ میں افواج تھیں بے حساب   وہ جرار و کرار اور انتخاب
علی گڈھ میں شامل تھے باون محال   مرہٹہ کا اقبال تھا بے مثال
وے پلٹا جب چرخ نیلی نے رنگ   نظر آیا پھر وقت کا اور ڈھنگ
یکایک جو انگریز یہاں آ گئے   تو بادل سے اس ملک پر چھا گئے
خدا کو جو منظور تھا وہ ہوا   مرہٹہ کا لشکر ہوا ہو گیا

اسی سلسلے میں شور نے اشارۃً غدر کا بھی ذکر کیا ہے ؎

. . .   کہ راجہ کی بھی فوج کا سر پھرا
کہ راجہ کی بے جا وہ درپے ہوئی   خزانہ لٹا، جاں بہ مشکل بچی
ہوئے راجہ لشکر سے اپنے فرار   لیا آگرہ آ کے دم اور قرار
پسند اس کو سرکار نے بھی کیا   انہیں پاس اپنے ہی رہنے دیا

نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی قدر و منزلت بدستور قایم رہی اور ان کو ریاست گوالیار کا فرمانروا تسلیم کر لیا گیا۔

اس کے بعد شور نے گوالیار کے مختلف محلات و عمارات کی صفات بیان کی ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے پھول باغ، کوٹھی، موتی محل کیفیت بازار لشکر وغیرہ کی تصویر نظم میں کھینچی ہے۔ موتی محل کے بیان میں ضمناً مسٹر ائکل کا بھی ذکر آ گیا ہے جو فن انجنیری میں "انتخاب" تھے۔ انہیں کی نگرانی میں موتی محل تعمیر ہوا تھا۔ مسٹر ائکل مشہور فرانسیسی کرنل بلینس کے پوتے تھے۔ تعمیر محل کے اختتام پر وہ کلاں صوبہ کے عہدہ پر فائز ہوئے اور اجین میں تعیناتی ہوئی۔ ان کے ایک بڑے بھائی بھی تھے جو عام طور سے منا صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ شاعری کا انہیں بہت شوق تھا۔

مرہٹہ حکومت کے زمانۂ عروج میں تین مشہور کیمپ تھے۔ ایک کیمپ کرنل بینس کی ماتحتی میں تھا۔ دوسرا سوائی سکندر کی ماتحتی میں تھا اور تیسرا کیمپ کرنل جیکب کی ماتحتی میں تھا۔ اپنے زمانے میں ان تینوں نے بڑے بڑے کارنمایاں انجام دیئے ہیں۔

شور نے گوالیار کی بے مثال رنگ سازی کو نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے ؎

رنگا ہو جو ہر رنگ میں کچھ بشر   وہی قدرداں اس کا ہے سربسر
وہ رنگین کپڑا رنگا کرتے ہیں   کہ ہر رنگ سے دل لیا کرتے ہیں
اگر چرخ نیلی انہیں دیکھ پائے   تو ہو رنگ فق اور منہ کو چھپائے
وہ سوہا کہ سب رنگ سے ہے سوا   اُسے دیکھ سوہا بھی سرسبز ہوا
وہ ماشے کہ تھوڑی ہو جس کی معاش   اسے جان و دل سے کرے وہ تلاش
وہ سردی کہ ہے خوشنما بالضرور   کہ ہے گرم رویوں کو اس سے سرور
وہ لاکھی کہ لاکھ اس کو دھویا کرے   نہ رنگ جائے، دھوبی کو دھبہ لگے
وہ خاکی کہ لے اس کو ہر خاکسار   ملے خاکساروں میں اس کو وقار
وہ فیروزی ہے کہ اگر دیکھ پائے   تو فیروزہ بھی رشک سے ہیرا کھائے
وہ ہے شربتی دل کو ٹھنڈا رکھے   اثر اس کا شربت سے بڑھ کے رہے
وہ کافوری، دل جس سے مسرور ہو   جو گھر میں بلا ہو وہ کافور ہو

غرض رنگ سب نامی ہیں شہر میں
کہ ایسے نہیں ہیں کہیں دہر میں

اس کے بعد شور نے چندار اکین دولت سے متعارف کیا ہے سید کفایت حسین، جمعدار رسالہ کے باب میں لکھتے ہیں "بڑے وضعدار اور یاروں کے یار"۔ اسی سلسلے میں آگے چل کر کہا ہے۔

ہے ان کے رسالے میں اک دفعدار — وہ اپنا برادر ہے اور دوستدار

اس کا نام انہوں نے "گشتین" ظاہر کیا ہے اور اس کو "بڑی خوبیوں کا آدمی" بیان کیا ہے۔ ایک اور صاحب بنام جان آلطونی "جواں عمر، خوش سیرت و خوش جمال" تھے وہ محکمہ ٹھگی ڈکیتی سے منسلک تھے۔ انہوں نے صدہا ٹھگوں اور ڈاکوؤں کو گرفتار کر کے انعام پایا تھا۔

اپنے بارے میں شور فرماتے ہیں ؎

مجھے بھی تعلق ہے سرکار سے — اسی راج سے اور دربار سے
قدیمی نمک خوار ہوں راج کا — یہ مدت کا ذکر ہے نہیں آج کا
بزرگان میرے ملازم تھے یہاں — بڑے عہدوں پر وہ رہے کامراں

علاوہ ازیں ع — یہاں پر ہوئیں میری دو شادیاں

مراد آباد کو "عجب شہر اور قابل لطف و سیر" بتا کر کہا ہے کہ "اٹھتی ہے دل میں ہر اک وقت لہر" رام گنگا اور گانگن ندی کی بھی خوب خوب تعریف کی ہے اور بے حد غلو سے کام لیا ہے۔ بازار کو "بحر طویل" اور "شہر و دل لگی کی سبیل" بتایا ہے اور چھتے کی تعریف کی ہے کہ "ہر شے میسر ہے ہر دم وہاں"۔ اس کے بعد ظروف اور صنعت پارچہ کا ذکر ہے اور ان دونوں صنعتوں کی نہایت کشادہ دلی سے داد دی ہے۔

رؤسائے شہر میں نواب سعید الدین احمد کے باب میں تحریر کیا ہے ؎

جہاں دیدہ ہیں اور پسندیدہ ہیں — حمیدہ خصائل ہیں سنجیدہ ہیں
رفیع المکاں اور عالی ہمم — بلند حوصلہ اور مجسم کرم
و لے اب ضعیفی سے معذور ہیں — قناعت گزیں اور مجبور ہیں

مرزا اسد علی بیگ ایک مشہور زمیندار اور نہایت باوضع آدمی تھے۔ ان کے بارے میں لکھا ہے ؎

ہمیشہ سے ان کو ہے شوقِ شکار — پسند اس کے آگے نہیں کوئی کار
نہ چھوڑا کوئی صید یہ تھا کمال — بچا مرغ قبلہ نما بال بال
غرض عمر کھوئی اسی ذوق میں — توجہ نہ کی اور کسی شوق میں
بڑی خوبیوں کے ہیں وہ آدمی — ہمارے بھی مشفق و اشفق ولی

اپنے سبھی احباب کو شور بالعموم "برادر" کہا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے مراد آباد میں بھی اُن کے تین چار برادر تھے۔ ڈاکٹر ولیم فانتوم کے بارے میں کہا ہے ؎

نہیں ہوتی ہے جب کسی سے شفا — مریض ان سے کرتا ہے پھر التجا
بفضل خدا وہ شفا پاتا ہے — دوا اور دعا سے مرض جاتا ہے

ایک صاحب افسر پولیس تھے، ہیتھیوز نام تھا۔ اُن سے شور کی بڑی رسم و راہ تھی۔ ان کے متعلق کہا ہے۔

حمیدہ خصال اور کثیر العیال — خدا باغ دنیا میں رکھے نہال

پھر گریبن خاندان کا ذکر ہے جس میں ایک بڑے میاں اور اُن کے پانچ صاحب زادے شامل ہیں۔ پہلے اُن کا تعلق سردھنہ سے تھا۔ مگر

پڑا اُن پہ جب انقلاب زمن — معیشت کے باعث سے چھوڑا وطن

ایک ڈپٹی صاحب تھے۔ چارلس نام تھا۔ ان کے لئے کہا ہے۔

. . . . . — رہے مدتوں یہاں بعد احترام
ہماری بھی اُن سے ملاقات ہے — کہ ذات اُن کی مجموعہ حسنات ہے

اپنے ایک دوست، شیو راج سنگھ کا ذکر کیا ہے کہ

. . . . . — زمیندار و راجہ وہ مشہور تھے
بعمرِ جوانی ہوا انتقال — ہوا دوستوں کو تاسف کمال
گئے تھے نہانے کو وہ سردوار — کہ میلہ تھا وہاں کمبھ کا بے شمار
پیامِ اجل اُن کو وہاں آگیا — کہ گھر تک پہنچنا بھی دشوار ہوا

ولی محمد جراح کے لئے لکھا ہے ع

بڑا سچا، سیدھا، مسلمان ہے!

کان پور کی سیر کے حال میں اوّلاً سامان چرمی، نیل گھروں اور کمپنی باغ کی ثنا و صفت کی ہے بعد ازاں "چاہ گنج شہیداں" کا ذکر کر کے نانا راؤ کے مظالم بیان کئے ہیں جو اُس نے زمانہ غدر میں انگریزوں پر توڑے تھے۔ آخر میں کسی زیر تعمیر گرجہ گھر کی "خوش نمائی" کے ذکر پر اس بیان کو ختم کیا ہے۔

الہ آباد کے بیان میں سنگم، پل آہنی، قلعہ، چوک و سبزی منڈی، کمپنی باغ، میوہال، تھارن ہل لائبریری، میور سنٹرل کالج، اور کتھیڈرل کا تذکرہ ہے۔ کالج کے ذکر میں جہاں علم و ہنر کی خوبیاں بیان کی ہیں وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوستانی جوان لکھ پڑھ کے ہوشیار تو ہو گئے مگر اُن میں یہ خرابی بھی پیدا ہو گئی کہ

گئے اپنی موروثی پوشاک بھول،

"احباب الہ آباد" میں سب سے پہلے مسٹر جی وارڈن، ہیڈ کلرک ہائی کورٹ کا ذکر ہے۔

خدا نے دیا ان کو سب اقتدار مگر وضعداری ہے ان کا شعار

شوق جب کبھی الہ آباد آتے تھے تو مسٹر فرانسس لائن کے یہاں مقیم ہوتے تھے۔ وہ "رئیس آگرہ" کہلاتے تھے اور ہائی کورٹ میں مترجم تھے ؎

چلا جاتا ہے وضعداری سے کام توکل خدا پر ہے ان کو مدام

ان کے ایک اور بھی بھائی الہ آباد میں تھے جن کا نام چارلی لائن تھا۔ ان کا بھی ہائی کورٹ سے تعلق تھا۔ مرغ بازی کا انہیں بہت شوق تھا۔ لکھنؤ سے کئی بازیاں جیت چکے تھے۔ انہیں حضرات کے ایک عمو زاد بھائی تھے جن کا نام ہیری لائن تھا۔ صیغۂ دیوانی سے منسلک تھے۔ اخیر میں پنڈت اجودھیا ناتھ، وکیل ہائی کورٹ کا ذکر کیا ہے ؎

طبیعت میں ہے شعر خوانی کا شوق کلام مکلّف سے ہے ان کو ذوق
اگرچہ وکیلوں کا ہے اور طور بڑا خلاق کا ان کے برتاؤ اور
ہے بے تکلف وہ ہم سے مدام مزے شعر خوانی کے تھے صبح و شام

لکھنؤ کے بیان میں لکھتے ہیں کہ

اسے شہر لکھوں یا جنت کہوں کہ جنت کو ہے رشک اس پر فزوں
نہ تھا ہند میں کوئی ایسا دیار برستا تھا مینہ زر کا لیل و نہار

اس کے بعد غیاث الدین حیدر، نصیر الدین حیدر، آصف الدولہ، سعادت علی خاں وغیرہ کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ پھر واجد علی شاہ کا ذکر ہے۔ ان کے متعلق لکھتے ہیں اور بالکل ٹھیک لکھتے ہیں کہ

لٹایا تمام عمر وہ سیم و زر گیا سر سے پدموں کا پانی اتر
جواہر کو پتھر سے بدتر کیا کروڑوں کا یوں گھر برابر کیا
نہ کچھ خوفِ عقبیٰ نہ دنیا رہا خوشی کا شب و روز چرچا رہا
برس بھر بھی نوکر جو کوئی رہا تمام عمر کی روٹیاں لے گیا

ان اذکار کے بعد مشہور عمارات کا تذکرہ ہے۔ اس ضمن میں تمام قابلِ دید یادگاروں کا بیان آگیا ہے، اور بعض بیانات میں خوب خوب دادِ سخن دی ہے۔ اسی سلسلے میں مطبع منشی نول کشور کا بھی ذکر کیا ہے ؎

زبس مہتمم بھی ہیں اس کے خلیق زمانہ کے ہیں وہ سراسر شفیق
اسی طرح اچھے ہیں سب اہلِ کار زمانہ ثنا خواں ہے لیل و نہار

ازانجملہ اک ہیں ہمارے بھی یار وہ پنڈت رتن ناتھ ہیں باوقار

"فسانۂ آزاد" کے متعلق:-

دیا اس میں دریا سخن کا بہا کہ پانی ہے بات اس کی مشکل ذرا

اخبار "اودھ پنچ" کے متعلق لکھتے ہیں ؎

ایڈیٹر بھی اس کے ہیں باغ و بہار وہ گلزار خوبی کے ہیں گلعذار
سناتے ہیں اکثر وہ سرکار کو نہاں کچھ نہیں رکھتے اسرار کو
غرض وہ کسی سے بھی ڈرتے نہیں ظرافت سوا بات کرتے نہیں
جو رد تا کوئی ہو تو ہنس جاتا ہے یہ لطف اُن کی تحریر میں آتا ہے
بڑے عمدہ ناظم و ناثر ہیں وہ ہر اک علم کے خوب ماہر ہیں وہ
ہماری بھی اُن سے ملاقات ہے کہ ذات اُن کی مجموعۂ حسنات ہے

اس کے بعد لکھنؤ کی مخصوص اشیاء مثلاً پارچہ چکن، عطر حنا، تمباکو خمیرہ، خربزہ وغیرہ کی تعریف کی ہے، اور اس بیان کو اس شعر پر ختم کیا ہے:-

غرض لکھنؤ ہے وہ خلدِ بریں کہ ایک ایک شے پر ہے صد آفریں

اخیر میں لکھنؤ کی تباہی کی الم ناک داستان بیان کی ہے اور نواب واجد علی شاہ کے واقعۂ معزولی کو نظم کیا ہے۔ انتخاب ملاحظہ ہو ؎

گلستانِ خوبی ملا خاک میں کیا اس کو برباد افلاک نے
لیا دم میں سرکار نے لکھنؤ ہوا قبضہ انگریز کا چار سو
اسی دم چراغِ خوشی گل ہوا ہنسا گل نہ وہ شورِ بلبل ہوا
ہوا ایک سکتے کا عالم تمام کیا گردشِ چرخ نے اپنا کام
پھر آخر کو وہ کھلبلی پڑ گئی کسی کو کسی کی نہ سُدھ بُدھ رہی
گئے شاہ کلکتہ بادل فگار الم دوش پر، آہ لب پر ہزار
غرض ایک دم کا تھا سارا ظہور
اُٹھا اُس کے جاتے ہی شور و نشور

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی مسودہ کی صورت میں موجود نہ تھی بلکہ اشعار موزوں کر کے ساتھ کے ساتھ وہ کاتب کو دیتے جاتے تھے۔ سردھنہ کا ذکر شروع ہی کیا تھا کہ پیامِ اجل آگیا اور مثنوی نامکمل رہ گئی۔ سردھنہ کے نامکمل بیان کے بعد اگلے صفحے پر ان کی موت کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد قطعاتِ تاریخِ وفات وغیرہ درج ہیں

اگر مسودہ موجود ہوتا تو یہ نقص ہرگز واقع نہ ہوتا تعجب نہیں کہ آخر میں شوز میرٹھ کا بھی ذکر خیر کرتے۔ میرٹھ میں ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔

سردھنہ میں بیگم شمرو کا دربار مرجع ہر خاص و عام تھا۔ بہت سے یورپین اس دربار سے وابستہ اور ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ شوز کے نانا فراسوکوئن اسی دربار کے متوسلین میں تھے اور ایک اعلیٰ رتبہ پر متمکن تھے۔ اختر لونی صاحب یہاں کے مشہور جنرل تھے۔

غرض چھاؤنی وہاں کی گلزار تھی بہار اُس پہ قربان بسیار تھی

یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ یورپین شعرائے اردو میں اکثر و بیشتر بیگم شمرو کے دربار کو رونق بخشتے رہے۔ چنانچہ جن شعرا کا ذکر اس مضمون میں آیا ہے ان میں زیادہ تر وہی لوگ شامل ہیں جن کا بالواسطہ یا بلاواسطہ دربار سردھنہ سے تعلق رہ چکا ہے۔ خود بیگم بھی نہایت باکمال عورت تھی حکمرانی کی اہلیت رکھنے کے علاوہ شعروسخن کی بھی اچھی قابلیت رکھتی تھی فارسی و اردو لکھنے پڑھنے میں پوری مشاق تھی۔ اُس کے فارسی مکتوبات ملتے ہیں۔ اس کا آخری وصیت نامہ بھی فارسی ہی میں تحریر تھا۔

پیارے لال شاکر (میرٹھی)

رباعی

اے کاشتِ شاخِ طرب اے نغمہ نواز!
اے مطربِ پُر عشوہ و تازہ و ناز!
جس چیز نے سب کر ڈالا ہے دل کو پامال
اُس چیز کی مضراب سے چھیڑ اپنا ساز!

سعید احمد اعجاز

تجلیات

سفینے تتلیوں کے قلزم ضو میں خراماں ہیں
کہ ہر رنگ کے تاباں ہیں رنگیں بادبانوں پر
عیاں ہوں جیسے ہنگام شب انجم آسمانوں پر
سمن کے پھول ہیں یا نور کی موجیں کف افشاں ہیں

شفق لالہ کی ہے زیر شجر لرزاں فضاؤں میں
سواد شام میں پرّاں ہیں کچھ چنگاریاں گویا
دھندلکے ہیں حسیں لعلوں کی ہیں ضو باریاں گویا
کہ لہراتی ہیں مضطر بجلیاں کالی گھٹاؤں میں

یہ نرگس ہے کہ مستِ حیا ہے نازنیں کوئی
تجلّی ریز ہیں شبنم کی بوندیں سبزۂ تر پہ
کہ تارے جھلملاتے ہیں زمرّد فام چادر پہ
یہ سب جلوے ہیں کس کے گر پسِ پردہ نہیں کوئی

تخت سنگھ
(گورنمنٹ کالج لائل پور)

سجدۂ نیاز

آرہا ہوں تیری بزمِ ناز میں کس شان سے — دل میں بے پایاں امنگیں روح میں طوفان سے
عشقِ وحشت آفریں کو رہنما مانے ہوئے — جان کو اک ہدیۂ ناچیز گردانے ہوئے
ایک سیلابِ جنوں، رگ رگ کو برماتا ہوا!!! — ذہن میں مے، مے میں تیرا عکس لہراتا ہوا
دو جہاں کی عشرتیں محجوب سی ہوتی ہوئیں — تیری نظریں دو جہاں کی وسعتیں کھوتی ہوئیں
ہر مصیبت سجدۂ تعظیم کو جھکتی ہوئی — گردشِ ایام کی کچھ سانس سی رکتی ہوئی
اختیاراتِ محبت کے بھنور بپھرے ہوئے — اور چہرے ہمت و توفیق کے نکھرے ہوئے
حادثاتِ دل شکن کے حوصلے چھوٹے ہوئے — رنج و غم کے روح فرسا ضابطے ٹوٹے ہوئے
آرہا ہوں اور جبیں میں ہے نہاں اک آفتاب — یعنی وہ سجدہ کیا ہے تیری خاطر انتخاب

ہے نظر خلّاق کی بھی جس پہ للچائی ہوئی
ہائے اک بت کی خدائی جوش میں آئی ہوئی

عدمؔ

جستجو

صبحدم تھی فضائے چرخ کبود — یا کہ تھی رہگذار موجِ سرود
شورِ ناقوسِ دیر و بانگِ اذاں — ہر زباں پر درود و سر بہ سجود
نغمہ زن قمریاں صنوبر پر — عالمِ کیفِ نغمۂ داؤد
بے حجابانہ غنچے جلوہ ریز — سرخیٔ رُخ کہ آتشِ نمرود
روح پرور خرامِ نازِ صبا — جاں فزا نکہتِ چمن کی نمود
اس طرح دل سے کلفتیں غائب — جیسے ظلمت جہان سے مفقود

لطف اندوز حسِّ دیدہ و گوش
فرحتیں تھیں دلوں سے دوش بدوش

بے قراری تھی دل کو تھا میں خموش — مائلِ سجدہ تھی جبینِ نیاز
اک کلی نے چٹک کے مجھ سے کہا — اے کہ گریہ ترا طریقِ نماز
اے کہ تیری نوائے سوزاں سے — گلستاں کی کلی کلی ہے گداز
اے کہ سینہ ترا تجلی زار — ہے حقیقت جہاں کی تیرا مجاز
نغمہ ہے سازدارِ سوزِ دروں — یا حجابِ سکوتِ پردۂ ساز

چہ شنیدی کہ تو خموش استی
چوں جمادی سکوں فروش استی

شاعر کا جواب

مجھ کو اس کا خیال رہتا ہے — جو ہے عنقا مثال میرے لئے
کوئی نادیدہ گم شدہ شے ہے — کہ ہے جس کی تلاش دل کو مرے
کبھی پایا نہیں نواؤں میں — میں نے ہستی کی راگنی میں جسے

دور غوغا سے ڈھونڈتا ہوں اب
روح کے دشتِ خامشی میں اُسے

سعید احمد اعجاز

ایک شام

ہم لڑکوں کو سال بھر کے پھلوں میں سے "پکّے" سرخ بیر سب سے زیادہ مرغوب تھے۔ ہم اس سُرخ سُرخ، زرد زرد، اور سبز سبز پھل سے لدی ہوئی بیریوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتے اور انہیں دیکھتے ہی ہمارے منہ میں پانی بھر آتا۔ بستی کے اردگرد پھلوں کے اور بھی کئی درخت تھے لیکن انہیں دیکھ کر کم از کم دامن صبر ہمارے ہاتھ سے کبھی نہ چھوٹتا بیروں کی بات ہی کچھ اور تھی۔

جب ہماری نظر رنگ رنگ کے بیروں سے لدی پھندی بیریوں پر پڑتی تو ہمیں یوں محسوس ہوتا، جیسے سرسبز ٹہنیوں سے ہزارہا سُرخ، زرد اور سبز آنکھیں ہماری طرف گھور رہی ہیں۔ یہ آنکھیں کچھ اس انداز محبت سے ہمیں دیکھتیں کہ ہمارا دل بے قابو ہو جاتا۔ اور ہمیں ماں باپ اور استادوں کا پڑھایا ہوا سبق کہ "بیٹیا دیکھو کسی کی ملکیت کو "بری نظر" سے نہیں دیکھنا چاہیئے" بالکل بھول جاتا۔

ہمارے راستے میں اگر کوئی چیز حائل تھی تو وہ کمبخت رکھوالے تھے جو طوطوں کے علاوہ بیر چرا کر بھاگنے والے لڑکوں کی پیٹھ پر بھی بلا تکلّف اپنی غلیل سے غلّہ چھوڑ دیا کرتے۔ لڑکا بیچارہ "ہائے میری اماں میں مر گیا" کہہ کر رونے لگتا یا اگر اس کی قسمت اچھی ہوتی تو بھاگ نکلتا۔ دوسری مشکل ہمارے لئے یہ تھی کہ بیریوں کے تنوں پر جھڑبیریوں کی خاردار ٹہنیاں کس کر باندھ دی جاتی تھیں تاکہ کوئی لڑکا چپکے سے بیری پر چڑھ کر بیر نہ کھا آئے اکثر ایسا اتفاق ہوتا کہ ہم لوگ رکھوالے کی نظر بچا کر درخت پر چڑھ جاتے۔ خوب پیٹ بھر کر موٹے موٹے "پکّے" بیر کھاتے اور جب دیکھتے کہ رکھوالا آوازیں لگاتا چیختا چلاتا دوسری طرف چلا گیا ہے تو ٹہنیوں سے تنے کی طرف آتے۔ نیچے اترتے اترتے دھم سے چھلانگ لگا کر غائب ہو جاتے۔

بڑی دیر تک حسین اور شیریں نظرت بیروں کو محبت کی نظروں سے دیکھتے رہنے کے بعد ہم جنگل میں نکل جاتے۔ وہاں جھڑبیریوں اور جنگلی بیریوں سے کھٹے اور میٹھے بیر توڑ کر کھایا کرتے۔ لیکن انہیں حاصل کرنے میں کئی کانٹے اس انداز سے ہمارے ہاتھوں کو چوم لیتے کہ ان سے خون بہنے لگتا صبح جا کر کہیں دوپہر کو کھانا کھانے کے وقت واپس آتے۔

جب رکھوالا کھانا کھانے کے لئے ایک آدھ گھنٹہ کو باغ سے غائب ہوتا تو ہم بڑے لڑکے سب کے سب ایک بیری پر چڑھ جاتے وہاں ہماری انگلیاں بجلی کی طرح کام کرتیں۔ چھوٹے لڑکے جو درخت پر نہیں چڑھ سکتے تھے آسمان کی طرف منہ اٹھائے ہوئے نیچے کھڑے رہتے اور ہمیں پکار پکار کر کہتے "بھائی کچھ ہماری طرف بھی پھینکو نا" ہم کسی موٹے سے بیر کی گٹھلی ان کے سر پر دے مارتے اور کہتے "یہ لو موٹا سا بیر"! یا ان پر کوئی خشک ٹہنی پھینک دیتے لیکن ہمیں اس جسارت کا موقع بہت ہی کم ملتا تھا۔

آخر ایک دن ایسا بھی آیا جب جنگل کی تمام جھڑبیریوں اور جنگلی بیریوں کی گودیں کھٹے میٹھے بیروں سے خالی ہو گئیں۔ اب ان سے کوئی کھٹمٹھا بیر حاصل کرنا اتنا ہی مشکل ہو گیا جتنا سمندر کی تہ سے موتی نکالنا۔ چنانچہ اب ہم نے بیر توڑنے کے لئے جنگل میں جانا بند کر دیا۔ اور بستی کی نواحی بیریوں ہی کو کلیجہ تھام تھام کر تکا کرتے۔

ایک دوپہر مجھے بہت تنگی پڑی۔ میں جنگل میں گیا کہ شاید جھڑبیریوں کی گھنی ٹہنیوں میں چھپے ہوئے کچھ بیر مل جائیں۔ لیکن تمام دوپہر کی آوارہ گردی کا نتیجہ صرف پانچ کھٹے بیروں کی صورت میں رونما ہوا۔ شام ہو چکی تھی اور میں کھیتوں سے ہوتا ہوا گھر واپس آ رہا تھا۔ تکان سے میرا بند بند چور تھا۔ منہ خشک تھا۔ اور ہاتھ خالی۔ اور کپڑے کانٹوں سے الجھنے کی وجہ سے پھٹ گئے تھے۔

"آہا میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں" ——— میرے منہ سے بے ساختہ یہ فقرہ نکل گیا۔ میرے سامنے کھیت کے کنارے بیری کا ایک نہایت ہی نفیس درخت تھا۔ جس کی سرسبز ٹہنیوں پر پکے پکے بیر لعل و زمرد کی طرح جڑے ہوئے تھے۔ میرے خیال میں یہ دنیا کا نفیس ترین درخت تھا

ہر شاخ دیکھنے والے کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے تھی۔ شام کی ہوا کے خنک جھونکے بار بار مجھ سے کہہ رہے تھے کہ "بیٹا چوری کرو، چوری!" ادھر سورج بھی میرے لئے شفق کے زریں سمندر میں غوطے لگانے کو تیار تھا۔ آہ شاید جنت کا سماں بھی اتنا حسین نہیں ہوتا!

میں نے چاروں طرف ایک نگاہ دوڑائی اور خدا کا نام لے کر جھٹ بیری پر چڑھ گیا۔ اس بلند قامت بیری کو چاروں طرف سے شیشم کے گھنے درختوں کے جھنڈ نے گھیر رکھا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اس خیال سے میرے دل دھک دھک کرنے لگا۔ کہ اگر رکھوالا آگیا تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ مجھ پر اتنا خوف طاری ہوا۔ کہ میں نے پورا پورا ارادہ کر لیا کہ درخت سے چھلانگ لگا کر بھاگ جاؤں "اپنی تباہی" کا بھیانک غار مجھے صاف صاف نظر آرہا تھا۔ گھنے پتوں میں سے مجھے اپنے گھر کی چھت نظر آرہی تھی۔ مجھے اپنے چھوٹے بھائیوں پر رشک آتا تھا۔ جو اس وقت گھر میں امن داماں سے بیٹھے تھے۔ مجھ پر رعشہ طاری ہونے لگا۔ لیکن جب دُنیا کے بہترین بیروں پر میری نظر پڑی تو میں نے سوچا۔ خدا کارساز ہے ہمت نہیں ہارنی چاہیئے چنانچہ میں ایک بلند ٹہنے پر چڑھ گیا۔ بیروں کے پہلے خوشے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ آہ! میری جیب صرف ایک تھی۔ باقی جیبیں اماں نے سی دی تھیں۔ تاکہ میں انہیں کیوں۔ گول گول خوبصورت پتھروں، مٹی کے کھلونوں اور ندی کے کنارے سے اکٹھے کئے ہوئے گھونگھوں سے بھرپور نہ رکھا کروں۔ میرے لئے ایک جیب بالکل ناکافی تھی۔ خیر اُسے تو میں نے بیروں سے بھر لیا۔ اس کے بعد جھولی میں ڈالنے شروع کئے۔ اب بھی میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

گہری شام ہو چکی تھی۔ میرا خوف کسی قدر کم ہو گیا تھا۔ کیونکہ دور کی چیز اب نظر نہیں آتی تھی۔ یکایک میں رعشہ بر اندام ہو گیا۔ بیری میرے پاؤں تلے سے نکلتی ہوئی معلوم ہوئی غضب ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔۔۔۔ کوئی اس طرف آرہا تھا۔ میں نے اپنی سانس روک لی۔ دم بخود ہو گیا۔ ہیں! یہ ایک تو نہیں دو آدمی تھے۔ باتیں کرتے اس طرف آرہے تھے۔

وہ نہایت آہستگی سے بول رہے تھے۔ میں نے ان کی آواز پر کان لگائے۔ قدموں کی چاپ پھر سنائی دی اور بس۔ وہ کھڑے ہو گئے تھے خبیث! میں نے انگلی دانتوں میں داب لی۔ اب وہ نالائق عین میرے نیچے بیری کے تنے کے ساتھ آ بیٹھے تھے!

میں نے پتوں میں سے جھانکنے کے لئے اپنی گردن ذرا اکڑا لی۔ ایک آدمی تھا اور ایک لڑکی۔ وہ بازوؤں میں بازو ڈالے ہوئے تھے۔ اور ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہے تھے۔ مجھے ان دونوں سے اتنی دلچسپی ہو گئی۔ اور میں ان کی دید میں اس قدر محو ہو گیا کہ رکھوالے کا خیال میرے دل سے بالکل جاتا رہا۔

اب تو کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ میں کھڑے کھڑے تھک گیا تھا۔ میں نے سہارا لینے کے لئے اپنی پیٹھ ایک موٹے سے عمودی ٹہنے سے لگا دی اور آہستہ سے ٹانگیں پھیلا کر اگلی ٹہنیوں پر رکھ دیں۔ اگرچہ میں نے یہ سب کچھ نہایت احتیاط سے کیا پھر بھی ایک ننھی سی خشک ٹہنی آواز پیدا کرتی ہوئی ٹوٹ گئی۔ اگرچہ یہ آواز کوئی اتنی بلند نہ تھی تاہم نوجوان لڑکی ڈر کر اپنے محبوب سے لپٹ گئی۔ اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی "تم نے یہ آواز سنی؟ کون ہے؟"

اس کا محبوب ادھر اُدھر ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ دوڑا کر بولا "کچھ نہیں تم خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو!" اس نے اپنی محبوبہ کی گردن میں باہیں ڈال دیں۔ اور میں یہ نظارہ دیکھ کر اور بھی پُر لطف اندوز ہوتا رہا۔

یہ نظارہ بھی عجیب تھا۔ میں ایک درخت پر بیٹھا تھا جو میرا نہیں تھا۔ ایک عجیب الجھن میں مبتلا تھا۔ رکھوالے سے پٹ جانے کا اندیشہ بھی تھا۔ اماں کی گالیوں اور ابا کے پیٹ کا خوف بھی۔ کیونکہ گھر سے نکلے مجھے دیر ہو چکی تھی۔ میرے کپڑے پھٹ چکے تھے اور خراش آجانے کی وجہ سے ہاتھ سے خون بھی جاری تھا۔ یہ ایسے قصور تھے جو اماں مجھے کبھی معاف نہیں کر سکتی تھیں۔ لیکن اگر ایک طرف غم انگیز خیالات میرے دل کو افسردہ بنا رہے تھے تو دوسری طرف زندگی دور کرنے کا سامان بھی نیچے میسر تھا۔

میں نے ایک خشک شاخ توڑ کر لڑکی کے سر پر پھینکی۔ وہ تڑپ اٹھی جیسے اس کا جسم بجلی کے تار کو چھو گیا ہے۔ لیکن یہ بات میں نے اب سوچی ہے۔ اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ دنیا میں کوئی ایسی چیز بھی موجود ہے جسے بجلی کا تار کہتے ہیں، نوجوان بھی کسی قدر گھبرا گیا۔

اس نے اوپر نگاہ اٹھاتے ہوئے کہا "کوئی چوہا ہوگا"۔

میں نے اپنا کھیل جاری رکھا۔ نہایت ہی آہستگی سے میں نے منہ سے الو کی آوازیں نکالنی شروع کیں۔ لیکن اس آہستگی سے کہ انہیں معلوم نہ ہو سکے کہ کدھر سے آرہی ہے۔ اس کے بعد میں کبھی ایک درخت کی ٹہنیوں میں زور سے ایک بیر پھینک دیتا کبھی دوسرے درخت کی ٹہنیوں میں۔ جس سے "ٹک" کی آواز پیدا ہوتی۔

نوجوان ڈرتے ڈرتے بولا۔ "تم ڈرتی کیوں ہو کوئی جانور وغیرہ ہے گھبرانے کی بات نہیں۔ ممکن ہے بارش کا کوئی قطرہ گرتا ہو اور اسی کی وجہ سے پتوں میں آواز پیدا ہوتی ہو"۔

میں نے دل میں کہا "ہاں میاں بڑے عقلمند ہو۔ آسمان پر بادلوں کا نام ونشان بھی نہیں۔ تارے جھلمل جھلمل کر رہے ہیں اور تم کہہ رہے ہو بارش کے قطرے گر رہے ہیں"۔

لڑکی گھبرا کر بولی "اب میں جاتی ہوں۔ میں ایک سیکنڈ یہاں نہیں ٹھہر سکتی"۔

دونوں چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ میں نے اپنے منہ سے ایک مہیب آواز نکالی۔ جو بہاری کے دنوں میں رات کو روتے ہوئے کتوں کی آواز سے بھی کہیں زیادہ مہیب اور ڈراؤنی تھی۔

لڑکی نے ایک چیخ ماری اور نوجوان سے چمٹ گئی۔ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آگے نکل گئے۔

میں نے فاتحانہ انداز میں درخت سے نیچے چھلانگ لگائی۔ اور کھیتوں میں دوڑتا ہوا گھر آگیا۔

(فرانسسکو چاٹیا) مہدی علی خاں

رباعی

اے مطربِ شیریں دہن نغمہ تیرا

ہاں سرِ عالم پہ ہے زمزمہ تیرا

آغوشِ فلک میں کہکشاں کیا یہ ہے

نبض آ گئی مری سن سا نالہ تیرا

سعید احمد اعجاز

غزل

میری فضائے زیست پہ ناز سے چھا گیا کوئی

آنکھ میں آنکھ ڈال کے بندہ بنا گیا کوئی

مرگ وحیات کے مزے آہ دکھا گیا کوئی

آ کے ہنسا گیا کوئی جا کے رلا گیا کوئی

سجدۂ عشق کے لئے پائے صنم ضرور ہے

میری جبینِ شوق کو راز بتا گیا کوئی

مرے تصورات کا سحر عجیب سحر ہے

دیکھ کے دلِ حزیں دیکھ وہ آ گیا کوئی

سب کی طرف نگاہِ لطف بزم میں تھی رواں دواں

ایک نظر میں بے کہے سب کو مٹا گیا کوئی

فطرتِ عشق کے نثار اس کو مرا خیال تھا

صدقے غرورِ حسن کے مجھ سے چھپا گیا کوئی

بہزاد لکھنوی

شاعر کا خواب

خموشی کی روپہلی اوس میں بھیگی ہوئی فطرت
چراغِ صبحگاہی رات کے جاگے ہوئے تارے
سکوں کی گود میں سوئے ہوئے خوابوں کے نظارے
دلِ ذرات میں انگڑائیاں لیتی ہوئی نکہت
شعاعوں کے سفینے، چاندنی کا بحرِ بے پایاں
دیارِ کہکشاں کے نور میں ڈوبے ہوئے جلوے
سنہری بربطِ ناہید کے جادو اثر نغمے
شباب و شعر کے منظر، بہار و حسن کے طوفاں
تبسم پھول کا پاکیزگی حوروں کے سینوں کی
کلی کے دل کی دھڑکن دلکشی رنگین جمالوں کی
فرشتوں کا تقدس سادگی فردوس والوں کی
جوانی ماہ پاروں کی، ادا زہرہ جبینوں کی
یہ ملتے ہیں تو اک خوب جواں بنتا ہے شاعر کا
یہی ذرے ہیں وہ جن سے جہاں بنتا ہے شاعر کا

تابش صدیقی

تاراچند جی سے ہندی کی چندی

ٹھیٹ اردو میں

بابو جی۔ میں نے آپ سے جو باتیں کیں وہ تو آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں۔ اچھا مہاتما جی سے جو بات چیت ہوئی۔ کیا اسے بھی آپ نہ سمجھ سکے اس میں تو کوئی بات اٹھا نہیں رکھی تھی اور سب باتوں کو ایسے ڈھنگ سے ایک جگہہ اکٹھا کر دیا تھا جسے ہندی کی چندی کرنا کہتے ہیں۔

مہاتما گاندھی سے باتیں کرکے اٹھا ہی تھا جو آپ کی لکھوت ملی اس پر بھی کچھ لکھ لکھا کے بھیج دینا چاہتا تھا۔ پر یہ دھیان آیا پہلے جو لکھا جا چکا اس کا کیا ہوا جواب پھر کہی ہوئی باتوں کو دہرایا جائے اور کہی ہوئی باتوں کا دہرانا ایسا ہی ہے جیسے چبائے ہوئے نوالوں کا پھر سے چبانا۔

پھر، گاندھی جی سے بات چیت والی لکھوت کی ایک کاپی آپ کے "ہندوستانی" کے لئے بھیجی ہی جائے گی جسے جی لگا کے دیکھنے پر نہ سمجھی ہوئی باتیں آپ چاہیں گے تو سمجھ سکیں گے اور جو اس پر بھی کوئی گتھی نہ سلجھ سکی تو اُسے پوچھا گچھ سے سلجھا دیا جائے۔ برابر سب کچھ ہونے پر بھی آپ تو ایسے ہو گئے جیسے کوئی انجان بن جاتا ہے۔

اپنے تماہی ہندوستانی" میں اسے آپ نے چھاپا تو۔ پر اس کا چھاپا نہ چھاپنا ایک سا ہو کے رہ گیا۔ اچھا، بُرا، بڑا، چھوٹا کوئی فٹ نوٹ لکھا گیا آپ اس پر دو ڈھائی بول بھی نہ لکھ سکے۔ اُسے پڑھ کے آپ نے کیا کہا اس کی کتنی باتیں اچھی لگیں، اپنے جی میں آپ نے کیا سمجھونا کیا، یہ سب باتیں جاننا چاہتا تھا پر آپ کے چپ سادھنے سے کچھ بھی نہ جان سکا۔

جب تک اپریل کا ہندوستانی نہیں چھپا تھا یہ سمجھے ہوئے تھا مہاتما سے بات چیت والی لکھت کے چھپنے کی جب گھڑی آئے گی تو آپ اس پر کچھ نہ کچھ لکھیں گے۔ پر جب وہ چھپ چھپا کے سامنے آئی تو یہ دیکھ کر اچنبا ہوا۔ آپ نے تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا اور چھوا تک نہیں۔ ساتھ ہی یہ دھیان بھی آیا کہیں ایسا تو نہیں آپ کسی ایسے جھمیلے میں پھنس گئے ہوں جس سے دو بول بھی نہ لکھے جا سکے اور اس سے چھٹکارا ملنے پر لکھنا لکھانا اُٹھا رکھا ہو۔ پر اپریل کے "ہندوستانی" کو چھپ کے پانچ چھ مہینے ہو چکے۔ اس پر کچھ لکھنا ہوتا تو لکھ لکھا کے آپ کب کا بھیج چکے ہوتے۔

جب دیکھا آپ کی چپ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے تو نہ رہا گیا اور یہ چٹھی لکھنا پڑی۔ میں یہ نہیں کہتا جو میں کہہ رہا ہوں بے سوچے سمجھے اُسے آپ مان ہی لیں۔ نہیں پہلے اسے سمجھ کی کسوٹی پر کسئے۔ ٹھیک اترے تو مانئے ٹھیک نہ دکھائی دے تو مجھے جھٹلائیے۔ کیسے؟ کیوں اور کس لئے کو ساتھ لے کر۔

ربڑ کو جتنا کھینچئے کھنچے گا اور چھوڑیئے تو سکڑ سکڑا کے رہ جائے گا۔ ایسا کھنچنا، سُکڑنا، سمٹنا بڑی سی بڑی اور چھوٹی سی چھوٹی بات میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ کسی بات کو جتنا بڑھائیے بڑھے گی اور جتنا گھٹایئے گھٹ گھٹا کے رہ جائے گی۔ اکڑ تکڑ اور کھینچ تان کرنے سے بات بڑھتی ہے اور بھلمنسات برتنے سے بڑھتی ہوئی بات دب دبا جاتی ہے۔

اسے دیکھ کے آپ کہہ سکتے ہیں۔ میرا کہنا بھی تو یہی ہے۔ پر میرے اور آپ کے کہنے میں بہت بل ہے۔ میں جو کہتا ہوں "کیوں" اور "کس لئے" کا پورا دھیان رکھ کر اور آپ اسے چھوڑ کر۔

کہیں کہیں سے اب اپنی لکھت کے ٹکڑے بھی دیکھ لیجئے۔ ایک جگہہ آپ یہ لکھتے ہیں۔

"کیا ہندی بھاشا مری ہوئی ہے اور کیا اس کے شبدوں کے سمونے سے اردو ادھ موئی ہو جائے گی۔"

دیکھئے ہندی اتنی ہی جیتی جاگتی کہی جا سکتی ہے جتنی یہ اردو میں

گھل مل کے اس کی ہوگئی ہندی کے جتنے بول اردو میں پورے سما چکے اور اپنی اپنی جگہہ نکال کے جم چکے وہ سب جیتے جاگتے ہیں۔ انہیں کوئی مرا ہوا نہیں کہہ سکتا۔ ان کو چھوڑ کر ہندی کے اور جتنے بول ہیں اپنی جگہہ وہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں اردو میں تو انہیں کڈھب اور رچھو لابسرا ہی کہا جائے گا۔ گھلے ملے بول چٹکتی ہوئی کلیاں اور رہکتے ہوئے پھول ہیں۔ ان کا سا روپ نئے بولوں میں کہاں آ سکتا ہے۔ پرانے چانول جتنا گھی اٹھاتے ہیں نئے چاول اس کا آدھا بھی نہیں اٹھا سکتے تو جو ہندی کے بول اردو میں پورے سما چکے وہ سب اردو ہی کے ہو چکے اور کسی جتن سے بھی وہ اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ اب رہا ہندی کے نئے نئے بولوں کا اردو میں ٹھونسنا تو یہ وہی جھگڑا ہے جس پر میرے آپ کے لکھا پڑھی ہوئی اور ہو رہی ہے۔

میں نئے ٹھونسے ہوئے بولوں کو مرا ہوا کہہ رہا ہوں اور آپ جیتا جاگتا۔ کیوں اور کس لئے سے میں ان کا مرا ہوا ہونا دکھا رہا ہوں اور آپ کیوں اور کس لئے کو چھوڑ کر انہیں جیتا جاگتا کہنے پر اڑے ہوئے ہیں۔

عربی، فارسی، ہندی ان سب کے وہ ملواں بول جن سے اردو کا نکھار اور ابھار ہے۔ ان بولوں سے ہٹ کر اردو کے ملے جلے بولوں کو اُن کی جگہہ سے ہٹا کر کسی بھاشا کے نئے بول اس میں بڑھانا اردو کو ادھ موا بنانا نہیں تو پھر اور کیا ہے۔

اپنی لکھت کا یہ ٹکڑا بھی دیکھئے:۔

"انیکتا، کولاہل، رکشا، سمبندھ اور دشا ایسے جن لفظوں کا میں نے استعمال کیا ہے انہیں کون مرا ہوا کہہ سکتا ہے۔ ہماری طرف تو آپ کسی شہر یا گاؤں میں چلے جائیں ہر پڑھا لکھا اور ان پڑھ چاہے ہندو ہو یا مسلمان انہیں سمجھ لے گا۔"

کیا اچھا ہوتا جو اسی کے ساتھ ساتھ اُن پڑھے لکھے مسلمانوں اور ہندوؤں کی لکھتوں کے دو ایک ٹکڑے ہی اپنی بات منوانے کے لئے آپ لکھ دیتے جو ان بولوں کو لکھتے اور بولتے ہیں۔

"ہماری طرف تو آپ کسی شہر یا گاؤں میں چلے جائیں" لکھنے کا یہ ڈھب بتا رہا ہے:۔ اپنے جی میں آپ نے مجھے یہیں کا سمجھ لیا اور آپ کے دھیان میں جب میں یہیں کا ٹھیرا تو پھر وہاں کی باتیں کیسے جان سکتا ہوں۔ سنئیے:۔ دِلّی کب کی لٹ لٹا چکی۔ ایسے ہی لکھنو بھی کب کا اجڑ چکا۔ اب دکھن ہی ایک ایسی جگہہ رہ گئی ہے جہاں ہند سے باہر اور پورے دیس کے چوٹی کے لوگ ایک جگہہ اکٹھے ہو گئے ہیں۔ بڑی سی بڑی راج دھانی میں جو جو باتیں ہونا چاہئیں وہ سب آپ یہاں دیکھ سکتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں کا آپس میں مل جُل کے رہنا، اُن کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا بول چال، بات چیت، پہناوا ایسا ایک سا ہے جو کوئی دوسرا انہیں دیکھے تو نہ پہچان سکے اور سب کو ایک ہی سمجھے۔ پھر جہاں بھی جائے کہیں کپل کا کھٹکا تک نہیں۔ سات آٹھ برس کا لڑکا سڑکوں پر سونا اُچھالتا چلا جاتا ہے اور کوئی آنکھ اٹھا کر بھی ادھر نہیں دیکھتا۔ بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا سب کو راج ایک آنکھ دیکھتا ہے۔ یہاں کی چہل پہل، گہما گہمی، پرماتما کی دیا سے دن دونی رات چوگنی ہے۔ جدھر منہ کیجئے راج کی دیا کی بہتی ہوئی گنگا دیکھ لیجے اور جدھر آنکھ اٹھا کے دیکھئے من بر ستا دکھائی دے گا۔ ایشور اسے سنسار کی ہونس اور اس کی اونچ نیچ سے بچائے اور دکھن کے راج میں اور چار چاند لگائے۔

سنئے، اٹھارا برس سے میں بھی اسی سُکھ چین کی گھنی چھاؤں میں بیٹھا ہنس بول رہا ہوں۔ چوتھے، پانچویں برس اُدھر کا بھی پھیرا ہو جاتا ہے۔ بڑے بوڑھوں کا چھوڑا ہوا کچھ کھیتی باڑی کا دھندا بھی ہے جس کی دیکھ بھال کے لئے کبھی کبھی گاؤں میں بھی آنا جانا ہوتا ہے اور وہاں کی کوئی چھوٹی سی چھوٹی بات بھی ایسی نہیں جو ان آنکھوں سے چھپی ہوئی ہو تو پھر آپ کا یہ "ہماری طرف" کہنا کیسا اور آپ کے اس کہنے کو میں کیسے مان لوں۔ میں نے آج تک مسلمان تو مسلمان اُدھر کے کسی ہندو کو بھی ایسے بول بولتے نہیں سنا۔

یہاں کے رجسٹرار آفس میں اپنی جان پہچان کے کچھ لوگ الہ آباد کے بھی ہیں۔ یہ آپ کی لکھت انہیں بھی دکھائی۔ سب نے بڑے اچنبے سے اسے دیکھا اور یہی کہا:۔ برس کے برس اُدھر جانا آنا رہتا ہی ہے ہم نے تو اب تک ایسے بول کسی ہندو سے بھی نہیں سنے۔ اب کچھ دنوں سے یہ سُن رہے ہیں۔ اُدھر ایک بڑا جتھا ایسا اٹھا ہے جو اردو میں بھوے بسرے بولوں کی ٹھونس ٹھانس اور ان کے پرچار کے جتن کر رہا ہے۔ یہ اور بات ہے جو ڈھائی دن میں بھاشا کی ایسی کایا پلٹ ہو گئی ہو۔

آپ نے سن لیا۔ الہ آباد والوں نے کیا کہا تو اب بھی اپنی لکھت کے اس ٹکڑے کو:۔

"ہماری طرف تو آپ کسی شہر یا گاؤں میں چلے جائیں۔ ہر پڑھا
لکھا اور اَن پڑھ ہندو ہو یا مسلمان انہیں سمجھے گا۔"

کیا آپ دہرائیں گے۔ انیکتا، کولاہل، شنکشا، سمبندھ،
ہتو، آشا، دشا، ابھیاس، نیشچے اور ایسے بہت سے اور بھولے
بسرے بول یو۔ پی اودھ اور ان جگہوں کے آس پاس رہنے والے
آپ کے دھیان میں سب کے سب بولتے اور سمجھتے ہیں اور دوسروں
سے بھی آپ یہی منوانا چاہتے ہیں۔ پر جن کے سامنے وہاں کا پورا سماں
ہو وہ اسے کیسے ٹھیک مان لیں اور آپ کے دھیان کا ساتھ دینے کی
کیسے حامی بھریں۔

آج کل کے ہندی پرچار والوں کو چھوڑ کر نئے پرانے اردو
لکھنے والے ہندوؤں ہی کی لکھتوں میں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے تھوڑے
بہت بول تو آپ کو دکھانا چاہیئے تھے۔ پر آپ ایسا نہ کر سکے۔

یہ بھی ایک نئی بات دیکھی۔ آپ ایک جگہہ جو لکھتے ہیں آگے بڑھ
کر وہ بات بھول میں پڑ جاتی ہے اور اس کا دھیان نہ رہنے سے آپ
ایسی دوسری بات چھیڑ دیتے ہیں جس سے پہلی کہی ہوئی بات کچھ
سے کچھ ہو کے رہ جاتی ہے۔ دیکھئے پہلے تو آپ نے یہ لکھا۔

"میں نے یہ نہیں کہا ہے کہ فارسی، عربی کے وہ بول جو اب ہماری
بولی میں گھل مل گئے ہیں نکال ڈالے جائیں۔ انہیں رکھئے
اور ضرور رکھئے۔"

اس لکھت کو پورا کرتے کرتے دھیان بھٹک کے نہ جانے کدھر
چلا گیا جو آپ یہ لکھنے لگے :۔

"اس آپس کی بول چال کی جو بولی ہے اس کا آپ کیا نام رکھیں گے
میں تو اسے اردو، ہندی یا ہندوستانی کسی بھی نام سے پکارنے کو تیار
ہوں۔ یہی وہ بولی ہے جس کا چو کھا رنگ مولوی سید ابوالقاسم نے اپنی چٹھی میں دکھایا ہے۔"

اپنی لکھت کے ان دونوں ٹکڑوں کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھئے اور
بتایئے کیا ان میں کوئی گھٹ بڑھ اور ال پل نہیں۔ کہیں آپ عربی، فارسی
کے ملے جلے بول اردو میں سے نکالنا نہیں چاہتے اور ان کے نکالنے کی
حامی نہیں بھرتے اور کہیں آپ لکھنے کے ایسے ڈھب کو جس میں عربی
فارسی کے بول تو بول اگر، مگر، کہ، چونکہ، بلکہ، چنانچہ، حالانکہ، یا، وگرنہ، لیکن
کا بھی کہیں پتا نہیں، "چوکھا رنگ" کہہ کے سراہتے ہیں۔ سوجھ بوجھ والوں
کو تو ایسا نہ چاہیئے۔ اردو میں سے عربی، فارسی کے گھلے ملے بول نکالنا
نہ چاہئیں۔ کہنے کو تو یہ کہہ دیا۔ پر کیا وہی جو جی میں تھا تو پھر اسے دکھاوا نہ
کہیں تو اور کیا کہیں۔

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبا جوڑا اس کہاوت کو
سچ کرنے کے لئے کہاں کہاں سے ڈھونڈ کے کڈھب بول کے بول اردو
میں ٹھونسے جا رہے ہیں۔ دھیان اور رات دن کی بول چال سے جو بول
کالے کوسوں پر پڑے ہوئے ہوں چن چنا کے انہیں
ایک جگہہ اکٹھا کرنے کے جتن کئے جا رہے ہیں۔

اوروں کو آپ کیوں دیکھیں اپنے ہی کو دیکھ لیجے۔ کیا پہلے سے آپ
اسی ڈگر پر چل رہے تھے۔ کیا آپ کے لکھنے کا پہلے یہی ڈھنگ تھا۔
"ہندوستانی" کا پورا فائل سامنے نہیں نہیں تو آپ کی ایک ایک لکھت
کا پورا پورا پتا دیتا۔ اب اس کے جو دو تین نمبر سامنے ہیں انہی کو دیکھ لیجے
ان میں آپ کی تین لکھتیں ہیں جن میں سے کسی میں بھی آشا، دشا، شنکتا،
ویاکرن، ابھیاس، کلپور، جیون، ہردے اور ایسے اور دوسرے بولوں
کو آپ نے منہ نہیں لگایا۔

"مسلمانوں کا ہندوستان میں آنا۔ (ہندوستانی، جولائی ۳۱ء)
"تبصرے" (ہندوستانی، جولائی ۳۴ء)
"گرہ زمین" (ہندوستانی، جولائی ۳۵ء)

یہ تینوں لکھتیں آپ ہی کی ہیں اور جن بولوں کو جیتا جاگتا آپ
کہہ رہے ہیں اُن کا ان میں کہیں پتا بھی نہیں تو اب آپ ہی کہئے ان
بولوں کو مرا ہوا نہیں تو جیتا جاگتا کون کہہ سکتا ہے۔ انہیں جیتا جاگتا
کہنے میں آپ سے یوں ہی سی کچھ چوک ہو گئی۔ آپ کو یہ کہنا چاہیئے تھا
یہ بول ہیں تو مرے ہوئے پر اب یہ جِلائے جا رہے ہیں۔

آپ کی جن لکھتوں کا ابھی اتا پتا دیا۔ اب کہیں کہیں سے ان کے لکھنے
کا ڈھنگ بھی دیکھ لیجے اور ہو سکے تو اسے اپنی آج کی لکھت سے بھڑا کے جانچئے
جولائی ۳۱ء کے ہندوستانی میں آپ کے لکھنے کا یہ ڈھنگ ہے :۔

"ان بیانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مغربی کنارے
پر مسلمان اپنے مذہب کے قایم ہونے کے کچھ ہی دن بعد آ کر
بسے اور ان کی تعداد، دولت اور طاقت بڑی تیزی سے بڑھی
ہندوستان کے مشرقی کناروں پر بھی عربوں کی پرانے زمانے
میں بہت قدر و عزت ہوئی۔ جب دارانے پانچویں صدی قبل مسیح
میں دجلہ اور فرات کے دہانوں کو رکوا دیا اور مصر کی تجارت کو فنا کر دیا

تو یہ تجارت یمن کے عربوں کے ہاتھ لگی۔ عربوں اور یہودیوں کی نوآبادیاں
لنکا اور جنوبی ہند میں قایم ہوئیں۔"

جولائی ۱۹۳۴ء کے ہندوستانی میں بھی اپنے لکھنے کا ڈھچر دیکھ لیجیے۔
"غرض کہ مثنوی چونکہ ادب و حکمت اور حقائق و معارف کا ایک گنجینہ ہے۔ اس لئے ہر زمانے میں لوگوں کو اس سے استفادہ کا شوق رہا ہے اور مختلف طریقوں سے اس کے افادے کو عام بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ طرح طرح کے ایڈیشنوں کے علاوہ اگر صرف اس کی شرحوں کا نام گنایا جائے تو ایک طویل فہرست تیار ہو سکتی ہے۔ عام مواعظ میں مثنوی کے قصص و حکایات اور اس کے نکات و لطائف کا مختلف عنوانوں اور تقریبوں سے ذکر ہوتا رہا ہے، بہر صورت اس سے فیض یاب و متمتع ہونے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ بایں ہمہ عام حلقوں میں، اکتساب و مطالعہ کا جو صحیح حق ہے وہ خاطر خواہ ادا نہ ہو سکا۔"

جولائی ۱۹۳۵ء کے ہندوستانی میں آپ کی لکھت کا یہ ڈھب ہے:۔
"ایک زمانہ تھا جب انسان کے تصور میں آسمان ایک لامحدود کرہ تھا جو ایک لایزال قوت کا مسکن تھا۔ جہاں نور ازلی ضوفگن تھا، عقل کل جلوہ افروز تھی، عشق و محبت، سرمستی و مسرت کا دور دورہ تھا۔ یہ وہ آسمان تھا جو اس عالم کے نو افلاک پر محیط تھا، ان سب سے الگ اور اوپر تھا، دائمی سکون اور امن کا مقام تھا، تبدیلی اور حرکت سے ماورا تھا۔ عالم کون و فساد نو کرّوں پر مشتمل تھا۔ کرہ ارض عین مرکز میں واقع تھا اور اس کے فلک پر چاند حکومت کرتا تھا"

اچھا ہوتا ہے جو ایسا لکھ سکتا ہو اور جس کی اڑان اتنی اونچی ہو۔ وہ اتنا نیچے اتر آئے اور یہ لکھنے لگے:۔
"اردو کے کلیور کو لپاریں گے"۔ "میرا بھی یہی نویدن ہے" "اس کا ہیو سا لیجئے"۔ "جو کچھ آپس میں تھوڑا سا بھید ہے"۔ "انتر دو باتوں میں ہے"۔ "مولوی صاحب کو ہندی کے لفظ کڈھبے جان پڑتے ہیں"۔

اچھا یہ تو بتائیے یہ کیا بات ہے: میرے لکھنے کے ڈھنگ کو آپ نے "چوکھا رنگ" کہا تھا تو اسے برتا بھی ہوتا اور اسی ڈگر پر آپ بھی چلے ہوتے یہ تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ منہ سے تو "چوکھا رنگ" کہہ دیا پر اپنی لکھت میں اُسے نہ برت سکے۔

عربی فارسی بولوں سے آج کل کے ہندوؤں کی چڑ اور ان کی جگہہ اردو میں کڈھب بول ٹھونستے دیکھ کر میں نے اس ڈھب کے کواڑ کھول دئیے تھے اور سمجھا تھا، عربی، فارسی بولوں کے نہ ہونے سے آپ لوگ ادھر ہی آ جائیں گے اور ادھر آنے سے ہو گا کیا۔ آتے دن کی توتو میں میں اور نئی بھاشا بنانے کی دوڑ دھوپ سے چھٹکارا بھی مل جائے گا اور نئے بولوں کی ڈھونڈ ڈھانڈ کے لئے گھڑی گھڑی سنسکرت کی ڈکشنری بھی نہیں اٹھانا پڑے گی بنی بنائی بھاشا بیٹھے بٹھائے مل جائے گی اور نئی بھاشا بنانے کی اُدھیڑبن میں جو گھڑیاں کٹ رہی ہیں وہ دیس کے کٹھن دھندوں میں کٹنے لگیں گی۔

ہمارے سامنے ہندوؤں کے دو جتھے ہیں۔ ایک وہ جو عربی، فارسی نہیں جانتا اس کو نیرا ابیرا کرنا نہیں آتا۔ اردو میں جو نسے اور جتنے بول بھی ہیں سب کو یہ اپنے ہی یہاں کا سمجھتا ہے۔ رہا دوسرا جتھا جو کچھ نہ کچھ عربی، فارسی جانتا ہے وہ بات بات میں نیرا ابیرا کرنے کا راگ الاپتا رہتا ہے اور جب کچھ لکھنے لکھانے کے لئے بیٹھتا ہے تو ڈھونڈ ڈھونڈ کے عربی، فارسی کے گھلے ملے بول اُردو میں سے نکالتا اور کاٹ چھانٹ کے ان کی جگہہ نئے کڈھب بولوں کو دے دیتا ہے۔ دھیان نہ رہنے سے بدیسی بولیوں کے بول لکھت کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ لکھ چکنے پر اس کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے اور جانچنے میں جو بدیسی بول ملتے جاتے ہیں انہیں نکال ڈالا جاتا ہے۔ جیسے کسی نے لکھنے کی دُھن میں یہ لکھ دیا۔ "ان کا حال کیا ہے" "آپ سے امید ہے" جانچ کی کسوٹی پر کسنے میں "حال" لکھا ہوا دیکھ کر دھیان آیا "حال" "احوال" "حالت" یہ بول تو عربی ہیں۔ یہ دھیان آتے ہی اسے کاٹ کر "دُشا" کا کڈھب بول اس کی جگہہ جڑ دیا۔ "امید" کو پرکھا تو فارسی بول دکھائی دیا۔ اس پر بھی ناک بھوں چڑھائی اور جھٹ سے اس جیتے بول کو بھی کاٹ کوٹ کے اس کی جگہہ مرا ہوا بول "آشا" رکھ دیا۔ آج کل یہی ڈھنگ چل پڑا ہے اور بہت سے ہندو اسی میں لگے ہوئے ہیں۔

آپ لکھتے ہیں:۔ "میرا نویدن بھی یہی ہے"۔ نویدن کی جگہہ "مقصد" "مدعا" لکھا جا سکتا تھا اور کون سے اچنبے کی بات ہے جو پہلے ہی لکھا ہو اور پھر کاٹ کے نویدن بنایا ہو۔ "مقصد" "مدعا" یہ وہ بول ہیں جنھیں ان پڑھ بھی سمجھتا ہے اور جو ان بولوں کو عربی ہونے سے آپ نہیں لکھنا چاہتے تھے تو ٹھیٹ اردو کا بول "کہنا" نویدن کی جگہہ لکھا جا سکتا تھا۔ "اور میرا بھی یہی کہنا ہے"۔ آپ کی لکھت کا یہ ٹکڑا یوں ٹھیک ہو سکتا تھا۔ پر آپ کو تو "نویدن" کے لئے جگہہ نکالنا تھی اور جیسے بھی بنا وہ آپ نے نکال ہی لی۔ ایسے ہی عربی فارسی کے گھلے ملے بولوں کو اردو میں سے نکال کر شبد، کلیور،

جیون، پورا، ویاکرن جیسے نئے نئے بولوں کو جگہ دی گئی ہے بھارا ج
ٹو کا تھا جس کو پھر وہی بات اد بدا کے کی۔
دیکھئے۔ اردو لکھنے کے دو ہی ڈھب ہو سکتے ہیں:۔ پہلا یہ ہے
عربی، فارسی، ہندی کے وہ بول جو اردو میں گھل مل گئے ہیں۔ ان سب کو
ملا جلا کے جو لکھنا لکھانا ہو وہ لکھا جائے۔ دوسرا ڈھنگ وہ ہے جسے
"ٹھیٹ اردو" کہتے ہیں اور اسی ٹھیٹ اردو میں پہلے آپ کو پھر مہاتما جی
اور پنڈت جواہر لال نہرو کو لکھا جا چکا اور اسی ڈھچر پر پھر آپ کو لکھا جا
رہا ہے۔ آپ نے ان دونوں کو چھوڑ کے لکھنے کا ایک نیا ڈھب یہ نکالنا
چاہا ہے جس میں جگہ جگہ بھولے بسرے بولوں کی بھرمار ہو اور گھلے ملے
بولوں کی جان بوجھ کے کاٹ کوٹ کی گئی ہو۔

کیا آپ نہیں جانتے کسی بھاشا میں نئے نئے بول کب اور کس
لئے بنائے جاتے ہیں۔ دیکھئے جب رات دن کی بول چال، بات چیت
سامنے کے بول کسی بات کو جوں کا توں نہ دکھا سکیں۔ جیسے کسی دوسری
بھاشا کی کوئی لکھت آپ اپنی اردو میں لانا چاہیں اور اس دوسری بھاشا
کی وہ لکھت جسے اردو کے کپڑے پہنائے جا رہے ہوں اس میں کچھ ایسی گتھیں آ جائیں جو اردو کے
ستے سجاؤ میلیاں بول اور اس کی بول چال کے گنے چنے بول اس لکھت کے بھید کو نکال
سکیں تو جب اس بھید کو کھولتے اور چھپی ہوئی باتوں کو لیا دکھانے کے لئے میں بہتوں کی کہریں
دکھائی دیتی ہیں۔ سوچ ساوچ کے نئے نئے بول بنانا اور بڑھانا پڑیں
گے۔ اس سے ہٹ کر نئے بولوں کے گھڑنے کی کوئی جگہ ہی نہیں۔
جو نسے اور جتنے ملاں بول چلے آ رہے ہیں انہیں یوں ہی رکھا جاتا ہے
اور ان میں کچھ بھی گھٹ بڑھ نہیں کی جاتی۔ نہ جانے بیٹھے بٹھائے یہ کیا
سوجھی ہے جو صاف ستھرے بولوں کو چھانٹ چھانٹ کے کڈھب بولوں پر لاگ
رنجھے ہوئے ہیں۔

اردو ہی ایک ایسی بھاشا ہے جو پورے دیس میں تھوڑی بہت
سب جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ نہ آپ کی یہ نرالی اور انوکھی بولی۔ میری
پہلی چٹھی کے اس ٹکڑے کو لکھ کر آپ یہ لکھتے ہیں:۔

"اردو کی جگہ ہندی کا شبد رکھ دیجئے تو ہندی والوں کا بھی
یہی کہنا ہے۔"

رکھنے کو کیا ہے جو جی چاہے اردو کی جگہ رکھ دیجئے۔ پر سوچ
بچار کی آنکھوں سے دیکھئے تو اردو کا بول اٹل دکھائی دے گا جو اپنی
جگہ سے ہٹ نہیں سکتا اور کوئی دوسرا بول اس کی جگہ لے نہیں سکتا۔
دیس کی چھوٹی بڑی بولیاں جتنی بھی ہیں ان سب کو الگ تھلگ دیکھ چکنے
پر جب آپ اردو کو پرتالیں گے تو یہ بل کھلا ڈلا دکھائی دے گا۔

کسی بھاشا کے پھیلاؤ کو کیسے جانچتے ہیں۔ ان پڑھ گاؤں والوں
اور گنواروں کی بات چیت کا کیا ڈھنگ ہے۔ عربی، فارسی کے بگڑے
بگڑائے بولوں کو یہ کس فراٹے سے بولتے چلتے ہیں۔ دیس کی بولیوں میں
سے مرہٹی میں عربی، فارسی کے بگڑے ہوئے بولوں کی کیسی ریل پیل ہے
۔ گاندھی جی کی چٹھی میں یہ سب باتیں لکھی جا چکی ہیں۔ اس چٹھی کو نہ دیکھا ہو تو
دیکھئے اور جو دیکھ لیا ہو تو پھر دیکھئے۔

اپنی اس لکھت میں ایک جگہ آپ نے یہ بھی لکھا ہے:۔

"جس طرح مولوی صاحب ہندی کے لفظوں کو سن کر کان میں
انگلی ڈالتے ہیں، اسی طرح پنڈت جی اردو کے چٹ پٹے شبد
سن کر آپ کا منہ تکتے ہیں۔"

آپ سے یہ کس نے کہہ دیا۔ بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ
دونوں باتیں بھی ٹھیک نہیں۔ نہ "مولوی صاحب" ہندی بولوں کو سن کر
کانوں میں انگلیاں دیتے ہیں اور نہ پنڈت جی اردو کے چٹ پٹے بول
سن کر کسی کا منہ تکتے ہیں۔ ہندی کے وہ بول جنہیں نہ کبھی اردو نے
سنا اور نہ کبھی دیکھا ایسے ہی بھولے بسرے بولوں کو سن کر "مولوی
صاحب" کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں اور وہ بول جو اردو میں گھل مل چکے
انہیں سن کر کون ناک بھوں چڑھا سکتا ہے۔

رہا پنڈت جی کا منہ تکنا اس کے لئے میری پہلی چٹھیوں کو دیکھئے
جن میں بہت سے پنڈتوں کی لکھتوں کا اتا پتا دیا جا چکا ہے۔ ان پنڈتوں
کی لکھتوں کا وہی ڈھنگ ہے جو مسلمانوں کے لکھنے کا۔ پنڈت جی کتر
کے کہیں سے الگ نہیں ہوتے اور اسی ڈھرے پر چلے جا رہے ہیں
جس پر مسلمان۔ تو پنڈت جی کا منہ تکنا تب آپ کہہ سکتے تھے جب
پنڈت جی اپنی لکھت کا ڈھچر مسلمانوں سے بچ بچا کے الگ رکھتے
اور لکھت کی پگڈنڈی پر مسلمانوں کے ساتھ ساتھ کبھی نہ چلتے۔

دیس کی کسی بات کا ٹھیک ٹھور ہو نہ ہو جو بھی ہو آپ بھاشا کی دیکھ
بھال، جانچ پرتال کیجئے۔ اس کا آگا تاگا لیجے آپ کو کوئی روکتا نہیں ہے۔
یہ تو بتا دیجئے یہ سب کھڑاگ کس لئے ہندی پرچار کو بدھ بدھ آٹھ
دن بھی تو ابھی نہیں ہوئے۔ اس سے پہلے کیا ہو رہا تھا۔ دیس کونسی
بولی بول رہا تھا۔ لکھت پڑھت کیسے کی جا رہی تھی۔ دیس والے کیسے

برت رہے تھے تو جو ہو رہا تھا۔ ابھی اُسے ہی رہنے دینے میں کونسا گھاٹا اور ٹوٹا تھا۔ پرانی ڈگر چھوڑنا کیوں اور نئی بنانا کس لئے۔ کیا پرانا ہونا کوئی بری بات ہے اور جو کسی بات سے بچنا اس کے پرانے پن ہی سے مان لیا جائے تو سینکڑوں ایسی باتیں ہیں جنہیں ان کے پرانے پن سے چھوڑ دینا چاہئے، پر کیا وہ چھوڑی جا سکتی ہیں۔

مہاراج۔ دیس کے دو ہاتھ ہیں ایک ہندو اور ایک مسلمان۔ انہیں دونوں ہاتھوں نے مل کر اردو کی ایسی موہنی مورت بنائی جسے آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ یہ بھاشا کسی ایک کی بنائی ہوئی نہیں تو ہندو، مسلمان کے میل ملاپ سے اردو بنی، پنپی، بڑھی اور پھیلی۔ یہ آگے بڑھ ہی رہی تھی جو اس کا ساتھ دینے کے لئے دکھن کی عثمانیہ یونیورسٹی اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کا ساتھ دینا اردو کے لئے ایسا ہوا جیسے سونے پر سہاگہ یہاں کے راج نے کروروں کی لاگت سے اردو یونیورسٹی اور لاکھوں کی بچھاور سے اس یونیورسٹی کے لئے ایک بڑی "اکیڈیمی" بنوائی جس میں یورپ کی کٹھن سے کٹھن لکھتوں پہ لکھتیں اردو کے اچھے سے اچھے کپڑے پہنتی چلی جا رہی ہیں اور یہاں کی راج دھانی نے سہارا دے کر اردو کو ایسی اونچی جگہ پہنچا دیا جہاں بڑی بڑی بھاشاؤں کی سبھا جمی ہوتی ہے تو ایسی اردو جو سارے دیس پر چھا جانا چاہتی ہے۔ اسے چھوڑ چھاڑ کے آپ ایک نئی بھاشا بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔

اچھا اب اردو کو ایک اور ڈھب سے جانچ کے دیکھئے۔ بنگال، گجرات، مدراس ان تینوں جگہوں کی بولیاں دیس کی بڑی بولیوں میں گنی جاتی ہیں۔ کوئی بنگال کا رہنے والا مدراس پہنچ کر اپنی بنگلہ بھاشا میں وہاں والوں سے بات چیت کرنے لگے تو کیا اس کا ایک بول بھی مدراس والے سمجھ سکیں گے؟ ایسے ہی مدراس اور گجرات والوں کی بولیاں کیا بنگال کے رہنے والوں کی سمجھ میں آسکیں گی؟ ہند کی چھوٹی بڑی بولیوں میں سے جونسی بولی بھی لیجے وہ پہلے سے جس جگہہ بولی جا رہی ہے وہیں سمجھی جائے گی۔ اس ٹکڑے سے آگے بڑھنے پر اس کا بولنا تو بڑی بات ہے کوئی اس بولی کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ یہاں کی پوری بولیوں میں سے اکیلی اردو ہی ایسی ہے جو پورے دیس میں تھوڑی بہت بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اردو بولنے والا دیس کے کسی ایسے ٹکڑے میں بھی چلا جائے جہاں یہ بھاشا نہ بولی جاتی ہو۔ اس پر بھی وہاں والے کچھ نہ کچھ اردو بات چیت سمجھ ہی لیں گے۔

جونسی بھاشا بھی ہو پہلے اس کا پھیلاؤ بھی دیکھا جاتا ہے اور اسی پھیلاؤ سے اس کے بڑے پن کا پتہ چلتا ہے۔ آپ نے دیکھا جو پھیلاؤ اردو کا ہے وہ یہاں کی اور کسی بولی کا نہیں تو پھر اردو ہی دیس کی بھاشا ٹھیر سکتی ہے۔ اس پر کہہ سکتے ہیں۔ ہندی بھاشا بھی تو ایسی ہی ہے۔ پر۔ آپ کا یہ کہنا تب ٹھیک سمجھا جائے گا جب آپ کسی ایسی جگہہ کا پتہ دے سکیں۔ جہاں ٹھیٹ ہندی بولی جاتی ہو اور جس میں عربی فارسی کے بولوں میں سے ایک بول بھی نہ ہو اور وہاں کے لوگ فراٹے سے ٹھیٹ ہندی ہی بولتے ہوں۔ گاؤں والے اپنی بات چیت میں عربی، فارسی کے جو سیکڑوں بگڑے ہوئے بول اٹھتے بیٹھتے بولتے ہیں۔ ان کی یہ بول چال ہندی نہیں کہی جا سکتی اسے بگڑی ہوئی اردو کہا جائے گا۔

آپ سے یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں جو پنڈت جواہر لال نہرو کی چھپی ہوئی لکھت پہنچی۔ اسے ادھر اُدھر سے اور الٹ پلٹ کے دیکھا۔ یوں تو یہ لکھت اچھی اور بہت اچھی ہے۔ پر کہیں کہیں اس میں کچھ باتیں ادھوری رہ گئیں اور کہیں کچھ لکھنے سے چھوٹ گئیں۔ پھر، پنڈت جی جو کھیوری بنانا چاہتے ہیں وہ کٹھن ہے۔ اردو، ہندی جھگڑا چکانے کے لئے میرے دھیان میں دو باتیں ہیں جو کچھ کٹھن نہیں۔ سب کا ایکا ہو جائے تو پھر اس جھگڑے مٹنے کا کہیں پتہ بھی نہ لگے۔ عربی، فارسی کے من بھر کے بول ہندوؤں کو اچھے نہیں لگتے اور اسی پر وہ اینٹھے ہوئے ہیں ایسے ہی ہندی کے کڈھب بولوں کو مسلمان ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے اور اسی پر ان کی تیوری چڑھی ہوئی ہے تو جھگڑا اتنا ہی ہے۔ آپس کی اس تن بھن اور اکر تکر کو الگ کر کے آپس میں میل ملاپ کے پینگ یوں بڑھا سکتے ہیں:۔

پہلی بات

(۱) ہندوؤں اور مسلمانوں میں سے ایسے لوگوں کو چن لیا جائے جو بت بنے اور جھگڑالو نہ ہوں، بات کی پیچ کرنے کو برا جانتے ہوں، دیس کا پریم ان کی گھٹی میں پڑا ہو میل ملاپ کے رسیا ہوں اور سب سے بڑھ کر وہ لٹریچر اور بھاشا کا اتار چڑھاؤ اور اس کی اونچ نیچ دیکھنے کی پوری سمجھ رکھتے ہوں اور ایسی باتوں کو پورا پورا جانچ پڑتال سکتے ہوں سب کے سب دُھن کے پکے اور بات کے پورے ہوں۔ دونوں جتھوں میں سے ایسے سوجھ بوجھ والوں کو الگ کر کے اور انہیں ملا کے ان کی ایک پوری کمیٹی بنالی جائے۔ جس میں یہ بھاشا کی نیا پار لگانے والے

ایک جگہ مل کے بیٹھیں جو ایک کہے دوسرے اُسے کان دھر کے سنیں جو سچی بات ہوتی ہے وہ آپ دل میں گھر لیتی ہے۔ ٹھیک بات کے ملنے میں کبھی ہٹ دھرمی نہ چاہیے اس کا کہنے والا چاہے کوئی کیوں نہ ہو اور جو ٹھیک نہ ہو تو جب بھی جو کچھ کہنا ہو وہ ایسے ڈھب سے کہا جائے جس کا سننا دوسروں کے لئے دوبھر نہ ہو جائے۔ سب سے پہلے اردو کی جو جو لکھتیں اچھی سے اچھی مانی جا رہی ہیں (جیسے سرسید، آزاد، حالیؔ، شبلی، نذیر احمد کی لکھتیں) انہیں دے کر ہندوؤں سے کہا جائے:۔ ان لکھتوں میں سے عربی، فارسی کے جو نسے اور جتنے بول آپ لوگوں کو بھوے بسرے دکھائی دیں۔ ان سب کی ایک لسٹ بنالی جائے اور ساتھ ہی عربی، فارسی کے کڈھب بولوں کی جگہ بھرنے کے لئے اپنی ہندی میں سے ایسے گھلے ملے بول چھانٹ کے کمیٹی کو بتائے جائیں جنہیں مانا جا سکے۔ ایسے ہی ہندی کے جن کڈھب بولوں پر مسلمان ناک بھوں چڑھاتے ہیں اُن سب کو ایک جگہ لکھ کے ان کی پوری لسٹ بنالیں اور اسی کے ساتھ بھوے بسرے ہندی بولوں کی جگہ بھرنے کے لئے عربی، فارسی کے گھلے ملے بول لکھ کر کمیٹی کو دکھائیں۔

تو ہندو اپنی جگہ عربی، فارسی کے بھوے بسرے بولوں کی پوری لسٹ بنانے کے ساتھ ان بولوں کی جگہ رکھنے کے لئے ہندی کے ملے جلے بول لکھ لیں گے اور مسلمان اپنی جگہ ہندی کے کڈھب بولوں کی لسٹ بنا چکنے پر ان بولوں کی جگہ برتنے کے لئے عربی فارسی کے گھلے ملے بول لکھ لکھا کے کمیٹی کے سامنے رکھ دیں گے۔ اس ڈھنگ سے پھیلا ہوا جھگڑا اسمٹ سمٹا کے تھوڑی سی جگہ میں آجائے گا اور اب اتنی ہی بات رہ جائے گی جو کمیٹی پورے سوچ بچار سے ایک ایک بات کی پوری چھان بین کر کے یہ جھگڑا ایسا چکا دے جس کو ٹھنڈے جی سے دونوں جتھے والے مان لیں اور اس مانی ہوئی بات میں پھر کوئی کتر بیونت اور گھٹ بڑھ نہ ہو سکے۔ ہندو، مسلمان اپنی اپنی جگہ سچائی کے ساتھ پورا پورا سوچ بچار کر چکنے پر آمنے سامنے جب کمیٹی میں بیٹھیں گے تو پھر آپس میں ایک کو دوسرے کی کہی ہوئی سچی اور اچھی بات مان لینے میں کوئی جھجک اور کچھ ڈر نہ رہے گا۔

یہ جھگڑا دو تین کمیٹیوں میں نہیں نبٹ سکتا، اس کے لئے کمیٹیوں کا جال بچھانا پڑے گا۔ جب تک ہندو اور مسلمان دونوں مل کے کسی بات کے ماننے کی حامی نہ بھریں تب تک بیچ میں کچھ کچھ دن چھوڑ کے یہ کمیٹیاں یوں ہی ہوتی رہیں۔ ایک کمیٹی سے دوسری کمیٹی تک پورے سوچ بچار کے لئے بیچ میں پندرہ دن، مہینہ، سوا مہینہ جو بھی کمیٹی کہے وہی رکھا جائے۔ اس ڈھب سے اردو، ہندی جھگڑا مٹ مٹا کے رہ جائے گا اور اس ڈھنگ سے اس کی بڑھتی ہوئی لے دب دبا جائے گی۔

دوسری بات

اب تک جو بھی ہو رہا تھا یہ دھیان کر کے اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے:۔ "ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا" آج کی باتیں پہ سنسار کا جب سادھنا آج ہی کے لئے ہے۔ یہی اس کی چپ کل کوئی نہ کوئی سمجھوتا سامنے لے ہی آئے گی۔ یہ باتیں بہت پھیلاؤ چاہتی ہیں جن کے لئے یہاں جگہ نہیں نکل سکتی۔ جی چاہا تو اس پر بھی کبھی لکھوں گا۔

اب تک ٹھیٹ اردو لکھتا رہا اور اس ڈھب کے کواڑ میں نے ہی کھولے تھے اور اب میں ہی انہیں بھیڑے دیتا ہوں۔ انہیں کیوں کھولا تھا اور کس لئے بھیڑا جا رہا ہے یہ کوئی بھید نہیں جو آپ سے چھپا ہوا ہو تو اب جو لکھنا لکھانا ہو گا عربی، فارسی، ہندی ان سب کو ملا جلا کے لکھوں گا جیسے اس سے پہلے لکھا کرتا تھا۔

سید ابوالقاسم

شعر

اگر جینا ہے دنیا میں تو یہ توقیر پیدا کر۔

کہ تیرا ہر نفس اک مستقل افسانہ ہو جائے

غزل

رازِ چشمِ میگوں ہے کیفِ مُدّعا میرا
غیر کی نظر سے ہے دُور میکدہ میرا

واسطہ کی خوبی نے سہل منزلیں کر دیں
حُسن عشق کا رہبر عشق رہنما میرا

کر دیا مجھے بے خود اُن کی بے نیازی نے
کہہ رہا ہوں خود اُن سے۔ "دل سنبھالنا میرا"

ہائے خوفِ بدنامی۔ وائے فکرِ ناکامی
بے وفا کے ہاتھوں ہیں "حاصلِ وفا" میرا

لُطفِ خلوت و جلوت ہم نہ پا سکے لیکن
دُھوم ہر طرف اُن کی ذکر جا بجا میرا

طرزِ والہانہ کی داد کب ملی مجھ کو
نازِ دوست کب نکلا صورت آشنا میرا

سوچنے لگے گی کچھ تیری خوش نگاہی بھی
رائگاں نہ جائے گا "یونہی" دیکھنا میرا

مَیں نے جب کبھی دیکھا سر جُھکا لیا تُو نے
تُو نے جب کبھی دیکھا۔ دل تڑپ گیا میرا

"عشرتِ حجاب" از خود چارہ سازِ دل کیا ہو
ساز ہو جب اے ظالم! سوز آشنا میرا

میری خستہ حالی نے سعیٔ خود شناسی کی
اُن کی خود نمائی نے جب کیا گلہ میرا

ہے جو حضرتِ منظورؔ اعتبارِ این و آں
"اِذن بے خودی لے کر پُوچھئے پتا میرا"

علی منظور حیدر آبادی

سنیاسی

"شاما! آج تم اتنے چپ کیوں ہو۔ کچھ باتیں نہیں کرتے تو باجا ہی بجاؤ" اس کے ایک ساتھی نے کہا۔

"جب دیکھو باجے کی فرمائش" شاما نے ترشی سے کہا۔ "آج میرا جی نہیں چاہتا۔"

شاما نے بیس سال ہوئے سنیاسی کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ اس سے قبل وہ اچھا تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ اور دنیا کے جھگڑوں میں دوسروں کی طرح پھنسا ہوا تھا۔ لیکن جوانی میں ہی اس کے عادات و خصائل اپنے ساتھیوں سے بالکل مختلف تھے۔ اس نے بہت کوشش کی کہ ایمانداری اور سچائی کی زندگی بسر کرے۔ مگر تجربہ کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ دنیا میں رہ کر ایسا کرنا ناممکن ہے۔ جب کبھی وہ ایمانداری سے کسی کے ساتھ پیش آتا تو لوگ اسے ضرور دھوکا دیتے۔ آخر وہ شہر کی زندگی سے تنگ آ گیا۔

ایک دن وہ اپنا ستار لے کر جنگل کی طرف چل کھڑا ہوا اور شہر سے دور ایک جھونپڑی بنا کر رہنے لگا۔ وہ جنگلی پھلوں پر اپنا گزارا کرتا اور رات کو وحشی جانور اس کے ہمسایہ ہوتے۔ ابھی وہ ایک مہینہ بھی آرام سے نہ رہنے پایا تھا کہ اس کے ساتھی اور دوست بھی اس کے ساتھ آ کر شامل ہو گئے۔ دن بھر وہ لوگ قدرتی مناظر سے لطف اٹھانے اور جنگلی پھل چننے میں گزارتے۔ اور شام کو وہ جھونپڑی میں جمع ہو کر شاما کے گرد بیٹھ جاتے اور وہ ان کو ستار سنایا کرتا۔ اس طرح بیس سال گذر گئے۔ مگر شاما کو کبھی اپنا وطن یا رشتہ دار یاد نہ آئے۔ بلکہ بستی میں جانے کے نام سے اسے وحشت ہوتی تھی۔ اس کے خلاف اس کے ساتھیوں کی یہ حالت تھی کہ اب تک شہر کو نہ بھولے تھے۔ وہ اپنی بیس سال پہلے کی زندگی کو یاد کر کے مزہ لینے لگتے۔ مگر شاما کو ان کی ان باتوں سے سخت کوفت ہوتی تھی۔ وہ گھبرا کر اپنا ستار بجانے لگتا۔ اور وہ لوگ اپنی سب گپیں بھول کر باجا سننے میں مشغول ہو جاتے۔ اس طرح بیس سال گذر گئے۔ ان کے خیالات اور طرز معاشرت میں کوئی نمایاں فرق ظاہر نہیں ہوا۔

آج شام وہ حسب دستور آگ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر ایک اپنے اپنے خیالات کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ جھونپڑی کے باہر بھی اسی قسم کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سب پرندے رات کی تاریکی سے ڈر کر اپنے اپنے گھونسلوں میں جا چھپے تھے۔ اب ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ تک کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

اس خاموشی کو گھوڑے کی ٹاپ کی آواز نے توڑا۔ پھر کسی نے جھونپڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ سب ایک دوسرے کو پر معنی نظروں سے دیکھنے لگے۔

"اتنی سنسان رات میں یہ کون نازل ہوا"۔ ایک نے اپنے ساتھ والے سے آہستہ سے کہا۔

"تم دروازہ تو کھولو خود ہی معلوم ہو جائے گا"۔ شاما نے کہا۔

آخر ان میں سے ایک نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سڑے ہوئے پتوں اور جنگلی پھلوں کی ہلکی سی بو جھونپڑی میں داخل ہوئی۔ ایک شکاری اندر آیا۔ خوب طول طویل جس نے ایک بھاری بندوق اٹھائی ہوئی تھی۔ اس کی ظاہری حالت سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے ایک گہری نظر ان سب پر ڈالی اور شاما سے کچھ دور ایک سادھو کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ بہت دیر تک اس طرح خاموش بیٹھا رہا۔ مگر ان میں سے کسی کو اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اس سے کچھ سوال کریں۔ "خوب آدمی ہے"۔ ان سب نے ایک دوسرے کے کان میں کہا۔

"تم کہاں سے آئے ہو بیٹا اور اس خوفناک جنگل میں اتنی رات گئے کیا کرتے رہے"۔ شاما نے پوچھا۔

"یہاں میں شکار کے لئے آیا تھا بابا" شکاری نے شاما کو گھورتے ہوئے کہا۔ "اسی دھن میں رات ہو گئی۔ دور سے تمہاری جھونپڑی کا چراغ ٹمٹماتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے سوچا کہ تمہارے پاس کچھ کھانے کو مل جائے گا اور کچھ آرام بھی کر لوں گا"۔

"ہاں بیٹا کیوں نہیں"۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ اور کچھ جنگلی پھل اور ایک پیالے میں پانی لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

کھانے کے بعد شکاری جھونپڑی کی بوسیدہ دیوار سے ٹیک لگا کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔

"کچھ تو بتاؤ کہ آج کل شہر میں کیا ہو رہا ہے؟ وہاں کے لوگوں کا اب کیا حال ہے؟" شاما نے آخر خاموشی کو توڑا۔

"کیا کہا بابا؟ کچھ شہر کا حال سناؤں! شہر کا تو کچھ مت پوچھو۔ روز بروز انسان کی حالت بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ لوگوں میں شرافت تو نام کو نہیں رہی۔ دھوکے دے کر لوگوں سے روپیہ لے لینا، جھوٹ بولنا تو ایک معمولی بات ہے۔ جو لوگ کہ اپنے آپ کو شریف سمجھتے ہیں اور کہلاتے ہیں وہ اسی بلا میں مبتلا ہیں۔ جھوٹے وعدے کرنا۔ جھوٹی تعریفیں کرنا تو ان کی نظروں میں کوئی گناہ ہی نہیں۔ اصل یہ ہے کہ شہر رہنے کے قابل جگہ نہیں رہی" شکاری نے ایک آہ سرد بھر کر کہا۔

اتنا کہنے کے بعد شکاری کی حالت میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ خیالات کے طوفان اور ان کو ظاہر کرنے کے جوش میں اس کا منہ سرخ ہو گیا۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا "یہ ضرور ہے کہ شہر کی حالت آج کل بہت خراب ہے" شکاری نے اپنا مضبوط پاؤں زمین پر زور سے مارتے ہوئے کہا "مگر ہم میں سے کسی کو اسے سدھارنے کا خیال بھی ہونا چاہیئے۔ بابا تم لوگ سمجھتے ہو کہ اس جنگل میں دنیاداروں سے دور رہ کر بڑے نیک بن گئے ہو۔ مگر تمہیں اپنی ذمہ داریوں کا بھی کچھ خیال ہے یا نہیں۔ ذرا بڑے بڑے اوتاروں کی زندگی پر نظر ڈالو۔ انہوں نے اپنے اہل زمانہ کے لئے کیا کیا مصیبتیں اٹھائیں۔ ان کے خیالات بدلنے کے لئے ان کو کس طرح خدا سے ڈرایا۔ دنیا کو اس لئے چھوڑ بیٹھنا کہ وہ پاپوں بھری ہے۔ محض حماقت ہے۔ تم جیسے نیک سادھوؤں کو تو دنیا میں عام لوگوں سے زیادہ دلچسپی لینی چاہیئے"۔ شکاری نے شاما سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "کیونکہ تم ہی میں اتنی طاقت ہے کہ ان کے برے خیالات کو بدل سکو"۔ شکاری نے ایک گہری نظر ان لوگوں پر ڈالی۔ اور اپنی بندوق کندھے پر رکھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کے دروازہ کھولنے سے ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا جھونپڑی میں داخل ہوا۔

"اتنی رات گئے کہاں جا رہا ہے بیٹا۔ رات کی رات ٹھہر جا صبح جانا"۔ شاما نے کمبل سے کندھے ڈھکتے ہوئے کہا۔

"نہیں بابا میرا گھر یہاں سے دور نہیں ہے۔ اور گھر والے میرا انتظار کر رہے ہوں گے"۔

شکاری کے جانے کے بعد جھونپڑی میں بالکل خاموشی چھا گئی سب اپنے اپنے خیالات میں گم ہو گئے۔ گھنے درختوں میں سے ہوا کے گذرنے اور [illegible] پتوں کے زمین پر گرنے کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وہ لوگ شکاری کے خیال میں ایسے گم ہو گئے کہ اپنی جھونپڑی کی چھوٹی سی دنیا کو بھی بھول گئے۔ سردی کی شدت سے ان کے بدن کانپنے لگے۔ "بھئیا آخر تم کو کیا ہو گیا ہے دروازہ بند کر دیکھو آگ بجھ گئی ہے"۔ آخر شاما نے ان کے خیالات کے طوفان کو روکا "کتنا صاف گو ہے ...... مگر سچ کہتا ہے"۔ اس کے ساتھیوں نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ بلکہ چپ چاپ اپنی اپنی جگہ جا لیٹے۔

صبح کو جب وہ لوگ اٹھے تو شاما کو باہر جانے کے لئے تیار ہوتے دیکھا۔

"اتنے سویرے کدھر چلے" ایک نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

"پہلے ہمیں کچھ باجا تو سنا دو۔ پھر ہم سب مل کر باہر جائیں گے" دوسرے نے کھانستے ہوئے کہا۔

"شہر جا رہا ہوں بھیا" اب اس سنسان جنگل میں میرا کچھ کام نہیں" شاما نے جواب دیا۔

"تمہارا جی چاہتا ہے تو جاؤ" مگر اب شہر کی گندی آبادی ہمارے قابل نہیں رہی"۔ پہلے نے کہا۔

"میں تم سے چلنے کے لئے کہہ بھی نہیں رہا"۔ شاما نے ترشی سے جواب دیا۔ اور کچھ کہے بغیر چل کھڑا ہوا۔

شاما کے جانے کے بعد وہ لوگ اپنا وقت حسب معمول سیر تفریح اور جنگلی پھل جمع کرنے میں گذارنے لگے۔ دن تو اس طرح گذار دیتے مگر شام کو وہ اکثر شاما کا ذکر ضرور کرتے۔ کیونکہ اس وقت جب وہ سب تفریح سے فارغ ہو کر آگ کے گرد بیٹھتے تو شاما ان کو سریلے راگ سنایا کرتا۔ جن سے ان کے دماغ میں ایک طوفان برپا ہو جاتا تھا ان کے خیالات دنیا سے دور جنت کے باغوں کا گشت لگانے لگے۔ جہاں ان کو ہر طرح کی راحت ملنے کی امید تھی۔

اسی طرح اٹھوارہ گذر گیا۔ مگر شاما نہ آیا۔ آج صبح باہر جانے سے پہلے وہ لوگ ایک ایک تھال کے گرد بیٹھے کچھ جنگلی پھل کھا رہے تھے۔

وہ سب آج غیر معمولی طور پر بہت خاموش تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے کان دروازے پر لگے ہوئے ہیں۔ ذرا سی آہٹ ہوتی تو وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے۔ آخر دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ وہ حسب معمول ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ "شاما آگیا!" ان میں سے ایک نے چلا کر کہا۔ اور بھاگ کر دروازہ کھولا۔ باہر شاما کھڑا تھا۔ پریشان حال تھکا ہوا۔ "شاما" کہہ کر اس کے دوست نے اس کا کندھا ہلایا۔ مگر اس نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔ سیدھا اپنے بستر پر جا لیٹا۔

"آخر اس کو ہو کیا گیا!" ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

"بہت تھک گیا ہے"۔ دوسرے نے جواب دیا۔

"شاید پیاسا ہو" تیسرے نے کہا۔ اور پانی لے کر اس کی طرف لپکا۔

غرض یہ کہ ہر ایک نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی۔ مگر شاما نے کسی کی بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ اس طرح پورا دن گذر گیا۔ کسی کو اس سے پھر سوال کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ "اس سے کچھ فائدہ نہیں"۔ ان میں سے ایک نے آخر تنگ آکر شام کو اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "ہمیں کسی طرح اس کی پریشانی کی وجہ معلوم کرنی چاہیئے"۔ وہ سب شاما کے سرھانے جا بیٹھے۔

"شاما کچھ تو بتاؤ آخر تم کو کیا ہو گیا ہے"۔ ایک نے اس کا سر ہلا کر پوچھا۔

شاما نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھولیں۔ "تم لوگ میرا پیچھا نہیں چھوڑو گے...... مگر تم سن کر کرو گے کیا۔ سوائے افسوس کے کچھ چارہ نہیں"۔

"کچھ کہو تو سہی"۔ ان لوگوں نے تنگ آکر کہا۔

"اچھا سنو"۔ شاما نے ان کو گھورتے ہوئے کہا۔ "شکاری تمہیں اتنا تو بتا ہی چکا ہے کہ شہر کے لوگوں میں شرافت باقی نہیں رہی۔ جھوٹ بولنا اور دھوکے دینا تو ان کے لئے ایک معمولی بات ہے...... اس کے علاوہ بہت سی اور باتیں ہیں جو شکاری ہم کو بتانا بھول گیا۔ وہ سب آرام طلب عیش پسند ہوتے ہیں۔ خدا کا خوف تو ان کے دل سے بالکل ہٹ گیا ہے۔ اگر ان سے کہو کہ جیسی زندگی تم بسر کر رہے ہو اس کے بدلے میں مرنے کے بعد تم کو جہنم ملے گی جس میں ہمیشہ جلنا ہوگا۔ تو ان کو یہ ایک مذاق معلوم ہوتا ہے بے فکری سے کہتے ہیں۔ "سادھو جی اگر دوزخ کی آگ سے ڈرتے رہے تو زندگی کا لطف کب اٹھائیں گے"......" شاما نے اپنا ماتھا پونچھا اور گردن جھکا کر کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

"بھیا وہ لوگ خدا کی بجائے خوبصورتی کی پوجا کرتے ہیں...... قدرتی خوبصورتی نہیں بلکہ وہ لوگ صنوعی خوبصورتی کے پجاری ہیں وہاں کے شراب خانے اور ہوٹل ایسے لوگوں سے بھرے رہتے ہیں۔ ان کے کھیل تماشے بھی ایسے ہی گندے ہیں۔ شہر کی آدھی سے زیادہ آبادی ہر روز شام کو ان کھیل تماشوں میں لگ جاتی ہے اور گناہ کرنے کے نئے نئے ڈھنگ سیکھتی ہے!!" یہ کہتے ہوئے شاما کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔

شراب پینے کے لحاظ سے وہاں کے امیروں اور غریبوں کا ایک سا ہی حال ہے۔ جہاں انہوں نے شراب خانے میں قدم رکھا سمجھو کہ ان کے ہوش و حواس غائب ہوئے.......... وہ لوگ بغیر سوچے اتنی پی جاتے ہیں کہ آپے سے باہر ہو کر طرح طرح کی بیہودہ حرکتیں کرنے لگتے ہیں........" اتنا کہنے کے بعد شاما نے ایک گہری نظر ان لوگوں پر ڈالی ان سب کی آنکھیں ایک نامعلوم جوش سے چمک رہی تھیں۔ "گھبراتے کیوں ہو بھیا دعا کرو کہ خدا ان کے برے عقیدے اور بیہودہ حرکتیں بدل دے"۔ اتنا کہنے کے بعد شاما سو گیا۔

صبح کو جب وہ اٹھا تو جھونپڑی بالکل خالی تھی۔ اس کے ساتھیوں میں سے ایک بھی موجود نہ تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ وہ شہر گئے ہیں........ لوگوں کو سیدھا راستہ بتانے کے لئے نہیں...... بلکہ وہاں کی زندگی کا لطف اٹھانے کے لئے!!

"ذلیل کتے"!! شاما نے دانت پیس کر کہا۔

معتصم

حقائق و معارف

ادراک ہمیں ملا ہے الا محدود　　محدود ہے عقل و فہم دنیا محدود
عقلوں سے احاطۂ خدا ناممکن　　عقلیں محدود ہیں خدا محدود

اور باعث جنگ ہے تو صرف اتنا ہے　　مدت سے بہم دگر جدل برپا ہے
مذہب اسے خالق اور کہتا ہے　　حکمت جسے علت العلل کہتی ہے

اللہ کے انکار کا جو خوگر ہے　　حیران ہوں کیا سوچ کے ہے کیونکر ہے
اللہ کا اقرار بھی مشکل ہے مگر　　اللہ کا انکار تو مشکل تر ہے

قول حکما تھا کہ یہ عالم کا نظام　　مجموعۂ سالمات برقی ہے تمام
پوچھا کہ یہ سالمات کیا ہیں تو کہا　　خاموش! کہ معیوب ہے تطویل کلام

انسان کو تحقیق کی دھن جب سے ہے　　اک بحث ہے جو ہزار ہا ڈھب سے ہے
راز دو جہاں کبھی کھلا ہے نہ کھلے　　لڑتے رہو کیا ہے، کیوں ہے اور کب سے ہے

عالم کی بنا کیا ہے، یہ مجھ سے پوچھو　　اصل دوسرا کیا ہے، یہ مجھ سے پوچھو
مذہب کا خدا کون ہے، یہ تم جانو　　حکمت کا خدا کیا ہے، یہ مجھ سے پوچھو

یہ جھوٹ کہ اصل دوسرا کچھ بھی نہیں　　عالم میں حقیقت کا پتا کچھ بھی نہیں
عالم کی حقیقت نہ سمجھنے والو!　　عالم تو حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں

مذہب کی نگاہ میں خدا خالق ہے　　حکمت کی نظر میں مادّا خالق ہے
لیکن کسے معلوم یہی خالق ہیں　　یا اور کوئی ان کے سوا خالق ہے

معنی اللہ ہے ورنہ صورت اللہ　　صورت اللہ ہے ورنہ صورت اللہ
اللہ کیا ہے، یہ راز مجھ سے پوچھو　　اللہ قوت ہے اور قوت اللہ

حکیم آزاد انصاری

وزارت

حضور سرورِ کائنات کی وفات کے بعد خلفاء کا دور شروع ہوا۔ ان میں سے پہلے چار خلفاء نہایت عالی دماغ، معاملہ فہم اور صاحب فراست تھے۔ دوست اور دشمن سب اس پر متفق ہیں کہ جس کام کے لئے مسلمانوں نے انہیں منتخب کیا تھا وہ انہوں نے بطریق احسن انجام دیا۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے وہ مسلمانوں کے حکمران، ان کی فوج کے سپہ سالار اور مذہب کے مقتداء تھے۔ یہ خلیفہ ہر معاملے کی نگرانی بذات خود کرتے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی بات خواہ سیاسی ہو یا مذہبی انکی نظر سے پوشیدہ نہیں رہتی تھی۔ جب مسلمانوں نے بارہ برس کے قلیل عرصہ میں وسیع فتوحات حاصل کیں، اور ایشیا کے اکثر متمدن ممالک کو فتح کرنے کے بعد مصر سے گذر کر افریقہ تک اور دوسری طرف سمندر پار کر کے ہندوستان تک پہنچے۔ تب بھی خلفاء بدستور تمام باتوں کی نگرانی بذات خود کرتے رہے۔ فتوحات کی وسعت اور نئے نئے مسائل کے بروئے کار آنے سے خلفاء کو اپنے طرز عمل میں تبدیلی کرنی پڑی اور پہلی سی ذاتی نگرانی بھی قائم نہ رہ سکی۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ اکثر فتوحات حضرت عمر کے زمانے میں ہوئیں۔ انہوں نے ایک طرف تو مفتوحین کی تالیف قلوب کی اور دوسری طرف فاتحین کو حد سے گذرنے نہ دیا۔ اس کے علاوہ مفتوحین میں جو خوبیاں قابل تسلیم تھیں انہیں بلا رد و قدح تسلیم کر کے اسلامی سیاست کا جزو بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بجا طور پر اسلامی سیاسی قوانین کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔

ابتدائی زمانے میں جو ممالک مسلمانوں کے زیرنگیں آئے ان میں ایران و شام بھی تھے۔ ایران قدیم زمانے سے ایک زبردست اور متمدن سلطنت کا درجہ رکھتا تھا، اور مدتوں سے وہاں سیاسی اداروں کی نشوونما ہورہی تھی۔ یہی حال شام کا تھا۔ گو یہ ملک خودمختار نہ تھا، لیکن روما اور اس کے بعد قسطنطنیہ کے زیر سیادت رہنے کی وجہ سے یہاں کے سیاسی ادارے بھی ترقی یافتہ تھے۔ ان ممالک کی فتح کے بعد حضرت عمر کے زیر ہدایت مسلمانوں نے بہت کچھ سیکھا، اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کے سیاسی اداروں پر ان ممالک کا بڑا گہرا اثر پڑا۔

خلفاء کی سلطنت جب وسیع ہوگئی تو وہ تمام کام بذات خود انجام نہ دے سکے، اور انہیں ایک مددگار کی ضرورت ہوئی۔ نائب حکمران کا ظاہر ہے کہ صرف یہی فرض نہ تھا کہ وہ حکومت کے کاموں میں آقا کا ہاتھ بٹائے اور اسے مشورہ دے۔ بلکہ اس کا فرض یہ بھی تھا کہ بوقت ضرورت حکمران کا قائممقام بھی بن سکے، اور اس کے اقوال و افعال خود حکمران کے ہی سمجھے جائیں۔ اس قسم کے نائب یا وزیر کا عہدہ ایران میں بہت قدیم تھا، اور جب ضرورت پڑی تو مسلمانوں نے ایرانیوں کی نقل کی۔ کتاب ادب الوزراء میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ ایرانی بادشاہ اپنے وزیر کی ایسی قدر کرتے تھے کہ جس کی مثال دوسرے ملکوں میں نہیں ملتی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ "وزیر ہمارے نظم و نسق کا منتظم ہے۔ وہ ہمارے ملک کا جمال ہے وہ ہماری زبان ہے وہ ہمارا ہتھیار ہے۔ اسی سے ہم فتوحات حاصل کرتے ہیں، اور ان فتوحات کو قابو میں رکھتے ہیں"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وزارت ایرانیوں کی سیاسی زندگی کا ایک مستقل جزو تھی، اور وزیر کے اختیارات بے انتہا وسیع اور اس کا عہدہ معزز تھا۔ ایران سے نکل کر یہ عہدہ عربوں کی ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں پہنچا جو عرب کے مشرق میں ایران کے زیر سیادت قائم تھیں۔ ان میں یہ عہدہ رِدف کہلاتا تھا۔ رِدف دربار میں بادشاہ کے دائیں طرف بیٹھتا تھا، اور جب شراب نوشی کی مجلس منعقد ہوتی تو بادشاہ کے بعد ردف ہی سب سے پہلے شراب پیتا تھا۔ زمانۂ جنگ میں بادشاہ کی عدم موجودگی میں ردف ہی اس کا نائب ہوتا تھا، اور مال غنیمت میں چوتھائی کا حقدار تھا۔ سلطنت حیرہ میں ردف کا عہدہ بنی یربوع میں موروثی تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قبیلے کے رؤساء جو بادشاہت کے حقیقی دعویدار تھے، اپنے حق سے دست بردار ہوگئے تھے۔ اور اس کے بدلے میں انہیں موروثی طور پر ردف مقرر کر دیا گیا تھا۔ قدیم ایران میں بھی اکثر سیاسی عہدے موروثی ہوتے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ردف درحقیقت ایران ہی کی نقل تھی، اس کے علاوہ حیرہ کی ریاست ایران کی سرحد پر واقع تھی۔ اس لئے باوجود خالص عرب ہونے کے اس میں بیرونی اثرات برابر کام کر رہے تھے۔ جب مسلمانوں کو ضرورت پڑی تو انہوں نے ردف کا عہدہ جوں کا توں قائم رکھا، مگر اسے وزیر کہنے لگے۔ اس لفظ کے متعلق بہت کچھ بحث ہے۔ بہر حال زیادہ قرین قیاس بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ وزیر سے مراد ایسا شخص تھا۔ جو

حکمران کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے میں اس کی مدد کرے اور اس کا نائب ہو۔ قرآن شریف میں بھی وزیر کا ذکر آیا ہے۔ اس سے فقہاء نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وزیر کا عہدہ نہ صرف خلاف شرع نہیں بلکہ اس کے جواز میں نص قرآنی موجود ہے۔ خلفاء چونکہ اپنی تمام ذمہ داریاں بذات خود پوری نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے وہ اپنے چند اختیارات کسی دوسرے شخص کو تفویض کر دیتے تھے تاکہ انتظام مملکت بہتر طریقے پر ہو سکے اور غلطی کا احتمال کم ہو جائے۔

فقہاء نے وزارت کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ وزیر جسے تمام اختیارات کلی طور پر حاصل ہوں، اور دوسرا وہ وزیر ہے جس کے اختیارات محدود ہوں اور جو محض خلیفہ کے احکام کی تعمیل کرے۔ پہلے وزیر کو وزیر تفویض اور دوسرے کو تنفیذ کہتے ہیں۔ ان دونوں عہدوں کے اختیارات اور فرائض جس طرح مختلف تھے اسی طرح ان میں جو خوبیاں تلاش کی جاتی تھیں وہ بھی مختلف تھیں۔

وزیر تفویض کو بعد میں وزیر اعظم کہنے لگے تھے۔ اس کا درجہ بہت بلند تھا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ خلیفہ کے تمام فوجی اور شہری ملازموں میں وہی سب سے بڑا عہدہ دار سمجھا جاتا تھا۔ وہ گویا خلیفہ کا نفس ناطقہ تھا اور اختیارات کے لحاظ سے اس میں اور خلیفہ میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہ خلیفہ کے فرائض بذات خود انجام دے سکتا تھا اور قانوناً اس پر صرف اتنا لازم تھا کہ جو احکام وہ صادر کرے ان سے خلیفہ کو باخبر رکھے، تاکہ عوام کو اور خود اسے یہ محسوس ہوتا رہے کہ اس کی حیثیت خلیفہ کے محض ایک ملازم کی ہے۔ خلیفہ کی طرح وہ سلطنت کے ہر ادارے کی جانچ پڑتال کر سکتا تھا خواہ وہ محکمہ فوجی ہو یا عدالتی یا شہری اور ہر محکمہ کے متعلق جو حکم مناسب سمجھے صادر کر سکتا تھا۔ ان احکام کا بجا لانا ایسا ہی ضروری تھا جیسا کہ خلیفہ کے احکام کا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ احکام کی تعمیل باحقہ ہو رہی ہے یا نہیں اس کے خاص ملازم مقرر رہتے تھے۔ مختصر یہ ہے کہ اس وزیر کے اختیارات وہی تھے جو خلیفہ کے تھے۔ مگر تین باتیں اس کے اختیار سے باہر تھیں۔ اول تو خلیفہ کا ملازم ہونے کی حیثیت سے وہ اپنا جانشین مقرر نہیں کر سکتا تھا، دوسرے خلیفہ اس کا تقرر کرتا تھا، اس لئے عوام اس کے مجاز نہیں تھے کہ اسے معزول کر دیں؛ حالانکہ خلیفہ کا عزل و نصب دونوں عوام کے ہاتھ میں تھے۔ تیسرے اگر خلیفہ کسی شخص کا تقرر بذات خود کرے تو وزیر خلیفہ کے حکم کے بغیر اسے معزول نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ماسوا وزیر کے اختیارات کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ خلیفہ بھی اس کے فیصلوں کو رد نہیں کر سکتا تھا، اور اس کے حکم سے جو رقم ایک دفعہ خزانہ میں داخل کر دی گئی خلیفہ بھی اسے واپس نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن خلیفہ وزیر کے مقرر کئے ہوئے اشخاص کو معزول کر سکتا تھا۔ مگر باوجود ان تمام اختیارات کے انتظام سلطنت کی پوری ذمہ داری خود خلیفہ پر ہی عائد ہوتی تھی نہ کہ وزیر پر۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ ایک معاملے کے متعلق ایک دوسرے کی اطلاع کے بغیر خلیفہ اور وزیر متضاد احکام صادر کر دیتے تھے۔ ایسی صورت میں تحقیق کی جاتی تھی کہ احکام پہلے کس کی طرف سے صادر ہوئے۔ پہلے احکام کی تعمیل ہوتی تھی خواہ وہ خلیفہ کے ہوں یا وزیر کے۔ لیکن اگر مجلس مشاورت میں خود خلیفہ موجود ہو اور اس کے اور وزیر کے خیالات میں اختلاف ہو تو بہر صورت خلیفہ کا حکم مقدم سمجھا جاتا تھا۔

وزیر کے اختیار و اقتدار کا جو خاکہ اوپر پیش کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خلیفہ اور وزیر میں بہت کم فرق تھا۔ اس لئے دونوں کی تعظیم بھی ایک سی کی جاتی تھی۔ صرف فرق یہ تھا کہ خلیفہ کے ملازم ہونے کی حیثیت سے یہ ضروری نہیں تھا کہ وزیر کے خاندان کے متعلق تفتیش کی جائے۔ اس کے برعکس خلیفہ کا قبیلۂ قریش میں سے ہونا لابدی تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلام میں بہت جلد ایک زمانہ ایسا آ گیا تھا کہ جب خلیفہ کے لئے انتخاب کی شرط باقی نہ رہی تھی اور یہ عہدہ بنی امیہ اور بنی عباس میں محدود ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں خلیفہ بناتے وقت کم سے کم خوبیاں تلاش کی جاتی تھیں، اور جس شخص میں یہ مل جائیں اسے خلیفہ تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ صرف اس کا بہت خیال رکھا جاتا تھا کہ وہ خاندان خلافت سے ہو۔ خلفاء راشدین کا انتخاب عوام کی طرف سے ہوا تھا۔ ان کے زمانے میں وزارت کا نشان نہیں ملتا۔ کیونکہ اس وقت حکومت کا کام بہت سادہ طریقہ پر انجام پاتا تھا اور دوسرے ان میں خود اتنی صلاحیت تھی کہ وہ تمام باتوں کی نگرانی کریں سب سے پہلے بنی امیہ کے دور میں وزیر کا نام سننے میں آتا ہے، اور بنی عباس کے عہد میں وزارت اپنے کمال کو پہنچی۔ ان کے زمانے میں وزیر حقیقی حکمران تھے، اور خلیفہ محض عضو معطل ہو کر رہ گئے تھے۔ خصوصاً اس زمانے میں جبکہ خلفاء دُنیا و مافیہا سے بے تعلق ہو کر اپنی زندگی کا زیادہ حصہ حرم میں گذارتے تھے، اور کنیزوں سے دل بہلانے کو امور سلطنت پر ترجیح دیتے تھے۔

تقرر کے وقت وزیر میں جو خوبیاں تلاش کی جاتی تھیں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام میں ایسے اشخاص بلکہ خاندان ملتے ہیں جنہوں نے اپنے کارناموں سے نہ صرف خلفاء کے دلوں میں جگہ کر لی تھی بلکہ عوام بھی ان کے ایسے گرویدہ تھے کہ ان کا نام اب تک عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال بنی عباس میں برامکہ اور عثمانی ترکوں میں کوپریلی

کی ہے - ان خاندانوں نے وزارت نے شہری اور فوجی دونوں انتظامات میں وہ نام پیدا کیا کہ عوام ان کا دم بھرنے لگے' اور ان کے آقاؤں نے اپنی عنایات اور مراعات سے انہیں مالا مال کر دیا۔

لیکن وزارت کی سیاسی اہمیت سے قطع نظر' وزیر کی ایک بڑی اہمیت یہ تھی کہ تقرر کے وقت اس کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ نظم و نسق کی نگرانی کے علاوہ وہ خلیفہ کا بہترین مصاحب بھی بن سکے۔ اگر خلیفہ کو علمی گفتگو کی ضرورت ہو تو وزیر اس میں حصہ لے اور اگر وہ تفریح کا خواہاں ہو تو وزیر اس کا دل بہلائے۔ مختصر یہ کہ وزیر ہر اس چیز میں پورا ماہر ہونا چاہیئے جسے عربی میں عموعی طور پر "ادب" کہتے ہیں۔ یعنی " وہ ماہر شاطر ہو' موسیقی کے قواعد و قوانین جانتا ہو' پولو کھیل سکتا ہو' علوم ریاضی' طب اور نجوم میں دست رس رکھتا ہو' اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شعر و شاعری' صرف و نحو' اور تاریخ کا عالم ہو' بوقت ضرورت شعر پڑھ سکے' اور حکایتوں اور افسانوں سے سامعین کا دل بہلا سکے"۔ چونکہ وزیر میں یہ تمام خوبیاں ہونی ضروری تھیں اس لئے اس ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے بہت سی کتابیں لکھی گئیں' اور ان میں انہیں بتایا گیا کہ یہ خوبیاں وہ کس طرح پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ کتابیں نہ صرف اس وجہ سے دلچسپ ہیں کہ ان میں طرح طرح کے تاریخی اور نیم تاریخی قصے ملتے ہیں' بلکہ ان سے اس زمانے کے حالات معلوم ہوتے ہیں' اور سماجی کوائف کے لئے یہ کتابیں رہنما کا کام دیتی ہیں۔ اسی قسم کی ایک کتاب قوانین الوزارۃ ہے۔ نام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بہت کچھ تاریخی اسناد ملیں گے۔ لیکن کتاب پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ماوردی کا مقصد صرف ایسی کتاب مرتب کرنا تھا جسے پڑھ کر وزیر مصاحبت کے فرائض انجام دے سکے۔

خلیفہ مامون نے ایک مرتبہ مختصراً بیان کیا تھا کہ وہ وزیر میں کیا کیا خصائل ضروری سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "میں چاہتا ہوں کہ میرے وزیر میں تمام انسانی خوبیاں موجود ہوں۔ وہ دل کا سچا اور معاملے کا صاف ہو' عالم ہو' تجربہ کار ہو' راز کو پوشیدہ رکھ سکے' بروقت احکام کی پیروی کرنے میں مستعد ہو' اور موقع کے لحاظ سے خاموش رہے یا بات کرے' میرے اشاروں تک کو سمجھ جائے' سپہ سالار کی طرح مستعد اور قاضی کی طرح عقیل و فہیم ہو' علماء کا انکسار اور فقہا کی باریک بینی رکھتا ہو' بذل و نوال کی قدر کرے' مگر ایسے موقعوں پر بیجا انکسار سے سبک سار نہ ہو' اور اپنی باتوں سے دلوں کو مسخر کر سکے"۔

وزیر تفویض سے کم درجے کا وزیر تنفیذ ہوتا تھا۔ اس کا فرض اتنا تھا کہ خلیفہ یا وزیر تفویض کے احکام کی تعمیل کرے۔ یہ عہدہ درحقیقت اسلامی سیاسیات میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ وزیر تنفیذ خلافت کے ادنیٰ اور اعلیٰ طبقوں کے درمیان محض ایک واسطہ تھا۔ اس لئے اس کا فرض یہ تھا کہ احکام کی تعمیل کرائے' تمام تقررات کا اعلان کرے' جنگ کے موقعوں پر جنگی تیاریوں کی لوگوں کو ترغیب دلائے' اور سیاسی واقعات کو عوام تک پہنچانے کا وسیلہ ہو۔ بعض مرتبہ اسے مجلس مشاورت میں بھی بلا لیا جاتا تھا' اس لئے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس کے اختیارات صرف انہیں باتوں تک محدود ہوں۔ وہ خلیفہ اور عوام کے درمیان ایک واسطہ تو ضرور تھا' مگر یہ نہیں تھا کہ اس کی حیثیت محض ایک ادنیٰ ملازم کی ہو' بلکہ وہ بعض موقعوں پر اپنے عہدے سے کام بھی لے سکتا تھا۔ اس کے اقتدار کا اندازہ اس سے ہوگا کہ خلیفہ کے تمام احکام' حکومت کی تمام روئداد اور تقررات کے تمام کاغذات جب تک اس کے ہاتھوں میں سے نہ گذرلیں اور اس کے دفتر میں ان کی توثیق نہ ہو جائے' اس وقت تک انہیں کوئی قانونی اہمیت حاصل نہ ہوتی تھی۔ ہر سرکاری کاغذ پر اس کے دستخط ہونا ضروری تھے۔

ان دونوں وزیروں کے درجے اور کام میں جو فرق تھا اس سے انکے دفتری تعلقات بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان دونوں عہدہ داروں کا حکومت سے جو گہرا تعلق تھا' اور جس طرح وہ سارے کاروبار پر حاوی ہو گئے تھے اس کا اندازہ معمولی کتابیں پڑھنے سے مشکل ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس قابلیت کی ان میں ضرورت سمجھی جاتی تھی اس کے استعمال کا موقع انہیں کب اور کیسے ملتا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں وزراء تقریباً ہر روز دربار خلافت میں باریاب ہوتے تھے' اور ان ملاقاتوں میں ہمیشہ ان کی قابلیت کا امتحان ہوتا رہتا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اسی وجہ سے انہیں اخلاق و آداب کا بہترین نمونہ بننا پڑتا تھا۔ ماوردی نے لکھا ہے کہ دیانتداری' ضبط اوقات' اور ہمہ دانی ان کی صلاحیت اور قابلیت کا جزو تصور ہوتی تھی۔ یہ بھی کافی نہ تھا کہ وزراء صرف ایک علم پر حاوی ہوں' خواہ وہ فقہ ہو یا علم دین' یا حکومت کے مختلف شعبہ جات۔ ممکن تھا کہ خلیفہ کی خواہش کے مطابق کسی وقت ہر قسم کے علوم میں ان کی دست رس کا امتحان ہو جائے۔ کیونکہ دربار خلافت میں ہر طرح کے علماء جمع رہتے تھے' اور ہر نوع کے مباحث میں وزیر کو حصہ لینا پڑتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ بہت ہی کم وزراء اس معیار پر پورے اترتے تھے۔ جسمانی اور دماغی خوبیاں بھی وزیر میں تلاش کی جاتی تھیں۔ کوشش یہ تھی کہ وہ صاحب الرائے ہو' معاملہ کو جلدی

سکے: حلیم الطبع ہو، سبک حرکات سے پرہیز کرے اور کسی صورت میں دنیوی درجے اور منصب کا اس پر اثر نہ ہو۔

جب وزیر کی قابلیت کا یہ معیار ہو تو ناممکن تھا کہ وزراء کا انتخاب محض ایک طبقہ اور ایک ہی مذہب سے کیا جائے۔ چنانچہ فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ ایک غیر مسلم بھی وزیر مقرر کیا جا سکتا ہے۔ ماوردی گیارھویں صدی عیسوی میں گذرا ہے، اور غالباً پہلا مسلمان سیاست دان ہے جس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے۔ اس کا مقابلہ تاریخ یورپ سے کرو، جہاں انیسویں صدی کے وسط میں بعض ممالک نے غیر مذاہب کے لوگوں کو چند مراعات دے کر سرخروئی حاصل کی تھی مگر یورپ کے اکثر ممالک اب بھی ایسے ہیں جہاں غیر مذہب کے لوگوں کو انسانیت کے زمرے سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ ماوردی کے بعد بعض فقہاء نے اس نظریے کو قبول نہیں کیا، بلکہ اُسے گناہ کبیرہ بتلاتے رہے، لیکن اس میں ذرا شبہ نہیں کہ مسلمان حکمرانوں نے وزراء کے تقرر میں مسلم اور غیر مسلم کے فرق کو کبھی روا نہیں رکھا۔

بہرحال یہ ظاہر ہے کہ وزیر تفویض اور وزیر تنفیذ دونوں مل کر تمام کام انجام دیتے تھے، اور ان کے تعاون کے بغیر حکومت کا کام چلنا ناممکن تھا۔ لیکن سلطنت جوں جوں وسیع ہوتی گئی اور کام کی پیچیدگی بڑھتی گئی یہ محسوس ہونے لگا کہ صرف دو وزیر کام پر حاوی نہیں ہو سکتے۔ اس لئے دو کے علاوہ اور بھی وزیر مقرر ہونے لگے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ کیا ان سب وزیروں کا درجہ برابر ہے، اور کیا ان میں سے ہر ایک خلیفہ کی نمائندگی کر سکتا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو اندیشہ تھا کہ ان مساویانہ درجہ رکھنے والے عہدہ داروں میں ہمیشہ کشیدگی رہے، وہ ایک دوسرے کی مخالفت پر تلے رہیں، اور ایک دوسرے کی تخریب میں کوشاں رہیں۔ اس لئے اول تو ان وزراء کو کسی بڑی ضرورت کے لئے مقرر کیا جاتا تھا، اور وہ سب مل کر اپنے فرائض انجام دیتے تھے یا خاص خاص خدمات ان کے سپرد کی جاتی تھیں، تاکہ کسی قسم کا تصادم نہ ہونے پائے۔ لیکن باوجود ان سب احتیاطوں کے پھر بھی تصادم کا خطرہ تھا۔ اس لئے سیاسیات کے ماہروں کی متفقہ رائے ہے کہ ایک سے زیادہ ایسے وزیر مقرر نہ کئے جائیں جن کے اختیارات لامحدود ہوں اور اس کی اجازت انہوں نے صرف دو صورتوں میں دی ہے۔ اول تو یہ وہ سب کسی فرض کو متحدہ طور پر انجام دیں، تاکہ مسابقت کا سوال ہی پیدا نہ ہو اور سب مل کر ایک آدمی سمجھے جائیں۔ یا یہ کہ ان کے فرائض کی حدبندی اس طریقے پر کی جائے کہ ان میں تصادم کا شائبہ پیدا نہ ہو۔ دوسری صورت میں وہ حکومت کے محض وکیل ہونگے، اور اپنے مخصوص فرائض کے سوا کسی اور کام میں دخل دینے سے رُکے رہیں گے۔ پہلی صورت میں تمام امور سلطنت ان کی متحدہ مجلس مشاورت میں پیش ہوں گے۔ مگر ان کا فیصلہ متفقہ ہونا چاہئیے۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو خلیفہ کا فیصلہ آخری اور قطعی سمجھا جائے گا۔ دوسری صورت میں ہر وزیر اپنے خاص محکمے کا افسر اعلیٰ ہوگا اور اس کے اختیارات معدودے چند مستثنیات کے ساتھ لامحدود ہوں گے۔ اس حالت میں خاص خاص صوبے، مثلاً عراق یا مصر، یا خراسان وغیرہ الگ ہر وزیر کے سپرد کر دیئے جائیں۔ یا حکومت کے خاص خاص شعبوں کے وہ ذمہ دار قرار دیئے جائیں مثلاً ایک وزیر فوجی امور کے لئے، دوسرا شہری امور کے لئے، اور تیسرا محاصل کے انتظام کے لئے مقرر کیا جائے۔ پہلی صورت میں وزیروں کی حیثیت قدیم ایران کے والیان صوبہ کی ہوگی، اور دوسری حالت میں ان کے فرائض وہی ہوں گے جو آج کل متمدن ممالک کے وزراء انجام دیتے ہیں۔

وزراء کا تقرر براہِ راست خلیفہ کی طرف سے ہوتا تھا، مگر تقرر کے وقت کسی قسم کے مراسم ادا نہیں کئے جاتے تھے۔ خلیفہ کا نہ صرف تحریری حکم بلکہ زبان سے حکم دے دینا، یا صرف اشارہ کر دینا تقرر کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ خلیفہ نے یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا کہ جہاں تک ہو سکے وہ عوام سے الگ رہتے تھے۔ ایسی حالت میں ان کے حاشیہ نشینوں کی تعداد بھی محدود تھی۔ آخری عہد میں وزراء کا تقرر انہیں حاشیہ نشینوں میں سے ہونے لگا۔ جب یہ حالت ہوئی تو وزیر کی نہ پرانی قابلیت رہ گئی اور نہ اس کا پرانا اقتدار باقی رہا۔ چنانچہ قاضی تنوخی نے بغداد کے ایک بندر نچانے والے کا قصہ لکھا ہے کہ وہ اپنے بندر سے پوچھتا تھا کہ حجام بنے گا، نان بائی بنے گا، اور ہر سوال پر بندر سر سے ہاں کا اشارہ کرتا تھا لیکن جب پوچھتا کہ وزیر بنے گا تو بندر نہیں کا اشارہ کرتا، اور تماشا دیکھنے والے کھل کھلا کر ہنس پڑتے۔ آخری عہد عباسیہ میں وزارت کا عہدہ بالکل حذف کر دیا گیا تھا۔ اور وزیر کی جگہ امیر الامراء نے لی تھی، جو خلیفہ کا ملازم ہونے کے بجائے درحقیقت اس کا مالک ہوتا تھا۔

وزیر کو برخاست کرنے کا حکم بھی خلیفہ کے سوا اور کوئی نہیں دے سکتا تھا۔ خلیفہ مطلق العنان حکمران تھا۔ وہ اپنے ملازمین کو اپنی مرضی سے نوکر بھی رکھ سکتا تھا اور برخاست بھی کر سکتا تھا۔ بالعموم اسلامی سیاست میں حکومت کا کوئی ملازم خواہ وہ عدلیہ سے تعلق رکھتا ہو یا نظم ونسق سے یا مذہبی امور سے مستقل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تاریخ اسلام میں کسی ملازم کو مستقل کرنے کی غالباً پہلی مثال اس وقت پیش آئی جب سلاطین عثمانی نے محمد علی پاشا کو مصر کا مستقل والی مقرر کیا؛ اور تاریخ دان حضرات پر واضح ہے کہ سلاطین نے بجبر و اکراہ اس کی منظوری دی تھی۔

محمد جمیل الرحمن

کل رات

کیسی شبیریں تھی اے نظر کل رات — کس قدر دل کشا تھے نظارے

رقص کرتے تھے فرش پر نغمے — جھلملاتے تھے عرش پر تارے

کہکشاں کی ردائے سیمیں سے — نور کے چھوٹتے تھے فوارے

نور کے رنگ نور کے جلوے — نور کی موج نور کے دھارے

بامِ افلاک سے عروسِ قمر — دیکھتی تھی زمیں کے مہ پارے

وہ جنہیں سادگی کی صورت میں — یاد تھے بانکپن کے فن سارے

وہ جنہیں نکتہ دانِ ناز کہے — عالمِ دلبری کے سیّارے

وہ جنہیں کاتبِ حیات لکھے — حُسن کے نوبہار گہوارے

وہ جنہیں دیکھئے تو نرم و گداز — اور چھو لیجئے تو انگارے

وہ کہ جن کے خمار میں لرزاں — مستیوں کے ہزار چٹخارے

وہ کہ جن کی اداؤں کے آگے — زُہد بیٹھا ہو حوصلہ ہارے

کیسی شبیریں تھی اے نظر کل رات
ایسے میں تم کہاں رہے پیارے

قیوم نظر

نکاتِ غالب و رقعاتِ غالب

آج کل غالب کے حالات۔ اس کی غیر مطبوعہ نظم و نثر اور اس کی جملہ تالیفات و تصنیفات کی طرف سب کی توجہ مبذول ہے۔ عنوان بالا میں جس کتاب کا نام درج کیا گیا ہے۔ وہ غالب کی ایک درسی تصنیف ہے جس کو اپنی وفات سے صرف دو سال پہلے مرزا صاحب نے مرتب کیا تھا۔ یعنی فروری ۱۸۶۷ء میں۔

اس کتاب کا حجم ۱۸×۲۲/۸ کی تقطیع کے ۱۶ صفحات ہیں۔ اور یہ غالب کے چند انتخاب کردہ فارسی رقعات اور اردو میں زبان فارسی کے قواعدِ زبان کا ایک مجموعہ ہے۔ اس رسالے کے ٹائیٹل پیج پر یہ عبارت درج ہے۔ حسب الحکم میجر فلر صاحب بہادر ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن ممالک پنجاب۔ یہ دو رسالے نامزد بہ نکات غالب و رقعات غالب تصنیف جناب نواب اسد اللہ خاں غالب محمد سعادت علی خاں کے مطبع سراجی میں شائع ہوئے"۔ اس عبارت سے صاف واضح ہے کہ یہ دونوں کتابیں پنجاب یونیورسٹی کے طلبا کے لئے غالب نے بہ فرمائش قلمبند کی تھیں۔ اور اس امر کے اصلی محرک ماسٹر پیارے لال تھے جن کا تخلص آشوب تھا۔ اور وہ لالہ سری رام مولف تذکرہ خمخانہ جاوید کے حقیقی چچا تھے۔ ماسٹر صاحب موصوف پرانے دہلی عربک کالج کے تعلیمیافتہ ایک نامور اہل قلم تھے۔ جو مرزا صاحب کے دلی دوست اور بہت مداح تھے۔ چنانچہ اردوئے معلّٰی میں ان کے نام کے بھی چند رقعات موجود ہیں۔ ان درسی رسالوں کا دیباچہ خود پیارے لال صاحب کا لکھا ہوا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں۔ کہ "ان دنوں نواب اسد اللہ خاں بہادر غالب نے قواعد صرف فارسی میں کئی اوراق بہ زبان اردو لکھے ہیں۔ اور چند خطوطِ فارسی اپنے مجموعہ نثر میں سے کہ جس کا پنج آہنگ نام ہے ضمیمہ ان اوراق کا کئے ہیں۔ یہ دونوں رسالے جناب فیض مآب میجر فلر صاحب بہادر کی خدمت میں بھیجے گئے۔ جو ان کے مقبول نظر ہوئے۔ اور انجمن علمی لاہور میں بھی سزاوار درس و تدریس اور شائقہ آفرین و تحسین قرار پائے۔ چنانچہ میجر صاحب ممدوح نے اس احقر العباد کے پاس بھجوائے۔ اور حکم دیا کہ پانسو نسخے چھاپے جائیں۔ تاکہ مدارس میں پڑھائے جائیں" وغیرہ وغیرہ۔

جس زمانے میں یہ کتاب مرتب ہوئی تھی۔ اس وقت پنجاب یونیورسٹی کے کرتا دھرتا ورنیکولر لٹریچر کی اشاعت اور اس کی روز افزوں ترقی کے دل سے خواہاں تھے۔ چنانچہ مولوی محمد حسین آزاد۔ خواجہ الطاف حسین حالی اور ماسٹر پیارے لعل ایسے قابل اہل تصنیف دلّی سے بلوا کر اس کی علمی انجمن کو سجایا گیا تھا جس نے قصص ہند۔ نیرنگ خیال۔ تذکرہ آب حیات۔ حالی کی نیچرل نظمیں اور کتاب رسوم ہند وغیرہ شائع کی تھیں جن کی نظیر اردو کی تمام درسی کتابوں میں آج تک نہیں مل سکتی۔ بھلا ایسی انجمن غالب کو کب فراموش کرنے والی تھی۔ مگر مرزا صاحب اب ہو چکے تھے۔ کچھ لکھنا پڑھنا تو کجا۔ رات دن صاحب فراش رہتے تھے۔ اسی لئے کوئی اچھی کتاب نہ لکھ سکنے کا عذر کر کے اس مجموعے کو ان الفاظ سے شروع کیا۔ "بسم اللہ الرحمن الرحیم آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے کو سجود۔ اور خدا کی راہ بتانے والے محمد کو درود پھر اکہتر برس کا ناتمام آدمی دُنیا میں عزت اور عقبیٰ میں نجات کا طالب۔ ترک سلجوقی اسد اللہ خاں غالب۔ کہتا ہے کہ میں کہہ سکتا ہوں۔ کہ یہ درویش دل ریش فقیر باکرامت ہے۔ کرامت یہ کہ روح تحلیل ہو گئی اور جسم سلامت ہے۔ اپنا ایک شعر فارسی معہ ترجمہ لکھتا ہوں ؎

درکشاکش ضعفم نگسلد روان از تن
اینکہ من نمے میرم ہم ز ناتوانیہاست

یعنی کثرت ضعف سے روح میں اتنی طاقت ہی نہیں کہ جسم سے ٹوٹ کر نکل جائے۔ واقعی ناتوان آدمی کچھ کام نہیں کر سکتا۔ لیکن اتنا ناتوان ہو گیا ہوں کہ مر نہیں سکتا۔ اس تمہید کے بعد اصل مضمون کی طرف رجوع کیا ہے۔ اور فرمایا ہے۔

نمبر۱۔ (یعنی نمبر۱) اس زمانے سے تیس برس پہلے میں نے اپنی نثریں جمع کیں (یعنی رقعات وتنقیدات کتب بہ زبان فارسی) اور اس کا پنج آہنگ نام رکھا۔ آہنگ لغت فارسی ہے۔ اور اس کے دو معنی ہیں۔ قصد اور آواز۔ چونکہ وہ ایک مجموعہ پارسی ہے۔ میں نے باب کو آہنگ قرار دیا ہے۔ یہ لغت دونوں معنوں کے رو سے بجائے باب سزاوار اور بجا ہے۔ (مراد یہ کہ پنج آہنگ پانچ باب کی کتاب ہے۔ جیسے گلستاں کے پانچ باب ہیں یہ عبارتیں جو خطوط وحدانی میں درج ہیں۔ مرزا کی نہیں ہیں) پھر لکھتے ہیں۔ چالیس برس میں وہ رسالہ لکھا ہے (شیخ سعدی کی گلستاں بھی کہتے ہیں۔ چالیس ہی سال میں تصنیف ہوئی تھی) اور اب اکتیس برس کے بعد ارادہ کیا ہے کہ کتاب پنج آہنگ کی چوتھی آہنگ جس میں فارسی کی صرف کا بیان ہے۔ اس کا اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ تاکہ وہ اوراق حضور پر نور قبلہ حاجات خلق اور کعبہ امال انام۔ نائب مسیح علیہ السلام۔ جامع دانش وداد۔ امرا کے مربی اور علما کے استاد۔ جناب معلی القاب میکلوڈ صاحب بہادر زمانہ کے مالک وسیعہ پنجاب۔ بظاہر نواب لفٹنٹ گورنر بہادر ان کا خطاب اور فی الحقیقت سلطان فلک نخش ہلال رکاب۔ کی نظر کئے جائیں۔

خدا کرے مجھ ترک جاہل کا بیان حضرت کے پسند آئے۔ اور یہ رسالہ ان کی زبان مبارک سے نکات غالب نام پائے۔ (اس طرز عبارت سے بخوبی واضح ہے۔ کہ مرزا صاحب اس زمانہ کے دستور کے مطابق حتی الامکان مقفیٰ عبارت ہی لکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے)

نمبر۲۔ (اس نمبر یا نمبر میں جناب مرزا صاحب اردو زبان کے متعلق کچھ ارشاد فرماتے ہیں) اردو آگے مرکب تھا۔ عربی اور فارسی اور ہندی اور ترکی ان چار زبانوں سے۔ اب پانچویں زبان یعنی انگریزی بھی اس میں شامل ہوگئی۔ دیکھو گنجائش اردو کی۔ کہ یہ پانچوں زبانوں پر کس لطف سے حاوی ہوتی ہے۔ اور یہ زبانیں اس میں کس طرح سما گئی ہیں۔ کہ کوئی زبان اوپری نہیں معلوم ہوتی۔ (اب یہاں سے قواعد صرف کو لکھنا شروع کیا ہے) یہ بھی جاننا چاہیئے۔ کہ بے اور جیم اور زے اور کاف عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں آتے ہیں۔ مگر یہ چاروں حرف فارسی میں بہ تغیر لہجہ ایک صوت خاص پاتے ہیں۔ بے اور جیم کے نیچے اور زے کے اوپر تین تین نقطے دیئے جاتے ہیں۔ اور کاف کے دو مرکز لگاتے ہیں۔ (گویا عربی میں کی بے جیم۔ زے اور کاف فارسی میں پ۔ چ۔ ژ اور گ بن جاتے ہیں) اور شناسات فوقانی (یعنی تے اور دال اور رے) یہ تین حرف انگریزی زبان میں ایک شدت کے ساتھ لائے جاتے ہیں۔ وہاں تے پر دو نقطے اور بڑھاتے ہیں (یعنی ٹ۔ انگریزی میں T) اور دال اور رے پر طوئے چھوٹی سی بناتے ہیں (یعنی ڈ = D اور ڑ = R)

نکتہ۔ فقیر کو اس تحریر سے ان صاحبان انگریزی کی خدمتگزاری مراد ہے جو ولایت سے تشریف لائیں۔ اور فارسی اور اردو کو اچھی طرح نہ جانتے ہوں پس اب ضرور آپڑا ہے کہ لغات مشکل کمتر درج کروں بلکہ الفاظ زبان زد عوام سے کام لوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ پھر مرزا صاحب فرماتے ہیں اب نمبر بہ نمبر لکھونگا مطابق اصل کتاب کے ہر مطلب کو نکتہ تعبیر کرونگا۔ (وھو ہذا) نکتہ۔ فارسی میں مبتدی کی سہولت فہم کے لئے تعلیم کے دو دستور مقرر کئے ہیں۔ مصدر اور مضارع۔ مصدر سے ماضی اور مفعول کا صیغہ پیدا ہوتا ہے۔ اور مضارع سے فاعل اور امر نکلتا ہے۔ مصدر فارسی کے آخر نون کے سوا دوسرا حرف نہیں ہوتا۔ اور مصدری نون سے پہلے دال اور تے کے سوا تیسرا حرف نہیں آتا۔ جیسے کردن اور گفتن۔

نکتہ۔ مضارع مانند مصدر کے کسی سے نہیں بنتا۔ اور اپنی ہستی کے واجب ہونے میں مصدر سے کم نہیں۔ ہاں مصدر اول ہے اور مضارع ثانی۔ پس اس کو مصدر سے اتنا علاقہ ہے جتنا موجود ہونے میں ثانی کو اول سے اور گننے جانے میں دو کو ایک سے۔

اور مصدر کی طرح مضارع کی ذات میں سے بھی افعال پیدا ہوتے ہیں۔ آخر ہر مضارع کے دال ہے۔ اور مضارع کی دال سے پہلے حرف کی قید نہیں۔ اکثر حرف تہجی آتے ہیں۔

غرض اس تشریح قواعد زبان میں بھی مرزا کا طرز استدلال اور صرفیوں یا نحویوں سے قدرے مختلف ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا مصدر اور مضارع کی بحث سے منتج ہوتا ہے۔

اسی رسالہ کے ضمن میں ایک جگہ مثنوی معنوی کا شعر لکھ کر بتایا ہے کہ اس میں شصت (یہ معنی گھات) کو شست کے ہم قافیہ نظم کیا گیا ہے اور یہ صحیح نہیں ہے۔ اصل شعر ان کو یوں لکھا ہوا دکھائی دیا تھا۔

بخطا مے جست تیر از شست او
شست او شاگرد چشم مست او

گر مجھے تعجب آتا ہے۔ کہ شعر مذکور میں شصت یعنی ساٹھ کا کا تو کہیں ذکر بھی نہیں ہے۔ پھر یہ ساٹھ کی بحث کیا۔ البتہ یہاں ہر دو جگہ شصت کا لفظ غلطی سے شست لکھا گیا ہے۔

اس نادر مجموعے کے خاتمے کی عبارت مرزا صاحب نے یہ لکھی ہے۔ نکتہ اب میں اس تحریر کو ختم کرکے مسودہ اٹھا رکھتا ہوں۔ اور ایک کاتب خوشنویس سے اس کی نقل کو لکھوا کر نورچشم اقبال نشاں بابو پیارے لعل ستودہ خصال کو دیتا ہوں۔ اللہ اللہ گورنمنٹ بہادر کا کیا اقبال ہے کہ غالب ناتواں نیم جان باآنکہ چھ طرح کے ضعفوں میں مبتلا ہے ضعف پیری۔ ضعف بصارت۔ ضعف اعضا۔ ضعف دل۔ ضعف دماغ۔ ضعف طالع قلم اٹھا سکا۔ اور مطلب کو دل سے زبان تک اور زبان سے قلم تک لاسکا۔ واللہ علیٰ کُلِّ شیءٍ قدیر۔

نوٹ :۔ اساتذہ ادب میں سرسید احمد خاں۔ اور مرزا غالب دونوں نے قواعد زبان کے رسالے لکھے۔ لیکن آزاد مرحوم کی جامع القواعد ہی زیادہ مقبول عام ہوئی۔ جو شاید اب بھی کہیں کہیں بطور کورس مدارس میں رائج ہے۔ مولانا حالی نے بھی ایک رسالہ تذکیر و تانیث کی بحث میں لکھا تھا لیکن غیر مکمل ہی رہ گیا +

سرخوش

رباعی

جب وقت سنائے مغنیہ گاتی ہے

اس لہرِ نشی کی دل کو گرماتی ہے

اس کشتیِ مسحور کی صورت مری روح

خوابوں کے جزیرے کی طرف جاتی ہے

سعید احمد اعجاز

حسّیات

عشق بھی آخر عدوئے جان و تن ثابت ہوا
رہنما سمجھے تھے جس کو راہزن ثابت ہوا

آندھیاں چلتی تھیں جس صحرا میں اور اڑتی تھی خاک
تیرے آجانے سے جنت کا چمن ثابت ہوا

پھر اُسی کے عہد و پیماں پر ہمیں جینا پڑا
دہر میں جو بارہا پیماں شکن ثابت ہوا

حُسن جس ارتباطِ آب و گل کا نام تھا
جلوۂ یزداں فریبِ اہرمن ثابت ہوا

بے حقیقت جانتے تھے جس دلِ محزوں کو ہم
رونقِ ہنگامۂ دار و رسن ثابت ہوا

وہ دلِ سوزاں لئے پھرتا ہوں پہلو میں کہ جو
انجمن سے اٹھ کے شمعِ انجمن ثابت ہوا

اہلِ محفل ہو گئے سرشار سن کر اے نظیرؔ
میرا شعر تازہ، صہبائے کہن ثابت ہوا

اصغر حسین خاں نظیرؔ

کیوپڈ اور میری شاہدہ

گل گشت کر رہی تھی اک صبح میری پیاری — عکس جمال سے تھی ساری فضا درخشاں

اس وقت اتفاقاً کیوپڈ اُدھر سے گزرا — تقدیر کھینچ لائی اس کو سوئے گلستاں

کھیلا لگا کے بازی وہ میری شاہدہ سے — ہارا تمام اُس نے جو کچھ تھا پاس ساماں

اک پل میں ہار ڈالے تیر و کمان و ترکش — ہونٹوں کے لعل خنداں رُخ کے گلِ فروزاں

پھینکا اتار کر پھر آئینۂ جبیں بھی — گیسو کا پیچ برقِ دنداں، چہ زنخداں

جب جیت لیں یہ چیزیں سب میری شاہدہ نے — جھنجلا کے پھر لگائیں کیوپڈ نے چشمِ فتّاں

کنگال ہوگیا وہ نورِ نظر بھی کھو کر

بیچارہ آخر اٹھا اندھا وہاں سے ہو کر

مسعود شاہد

پہلی پوجا

(رابندرناتھ ٹیگور کی ایک افسانوی نظم)

براہِ راست بنگالی سے

'تریکیشور مندر'۔
لوگ کہتے تھے' وشوکرما* نے اپنے ہاتھوں اسے تعمیر کیا تھا۔
زمانہ قدیم کے کسی سورج بنسی راجہ کے عہدِ حکومت میں ہنومان خود
اس کے لئے پتھر لایا تھا۔
اتہاس کے پنڈت (تاریخ داں) فرماتے تھے "یہ مندر کرات جاتی
کا تعمیر کردہ ہے"۔
"یہ دیوتا کراتوں کا ہے"۔
ایک دفعہ جب کشتری راجا نے ملک پر فتح پائی ———
مندر کا صحن پوجاریوں کے لہو سے لالہ گوں ہو گیا۔
دیوتا نے نئے نام اور پوجا کے نئے آئین کی آڑ میں سلامتی پائی ——
ہزار سالہ قدیم بھگتی کی دھارا کا بہاؤ ——— طریقِ پرستش
یک لخت تبدیل ہو گیا۔
کرات آج اچھوت قرار دیئے گئے۔ اس مندر میں ان کا داخلہ بند
ہو گیا۔
کرات سماج سے الگ کر دیئے گئے۔ ندی کے اس پار مشرق
میں ان کا گاؤں تھا۔
وہ بھگت تھے مگر آج ان کا مندر نہیں۔ ان کے گیت تھے بھجن
تھے۔
اُن کے ہاتھ پُر فن۔ ان کی نگاہیں حق شناس۔
وہ جانتے تھے کس طرح پتھر کے اوپر پتھر چنا جاتا ہے۔

کس طرح پیتل پر دوہلی میناکاری کی جاتی ہے ———
کرشن شیلا (نیلگوں پتھر کا ٹکڑا) پر مورتی ستھاپت کرنے کا طریقہ کیا ہے۔
مگر عنانِ حکومت ان کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ ان سے ہتھیار چھن گئے
تھے۔
رہنے سہنے' پوشش وطرزِ معاشرت میں وقار قائم کرنا ان کے لئے
منع تھا۔ کتبِ مقدسہ کے مطالعہ اور تعلیم حاصل کرنے کا انہیں حق حاصل نہیں تھا۔
'تریکیشور' مندر کا سنہری کلس مغربی سمت سے دکھائی دیتا تھا۔ اس کے
درشن وہ کر سکتے تھے بہت دور سے کھڑے ہو کر دل ہی دل میں اسے
پرنام کرنے کی انہیں اجازت تھی۔
کتک کی چودھویں۔ چاندنی رات کی تقریب ——— جشنِ پرستش۔
مندر میں بنسی، مردنگ، کرتال اور جھینے بج رہے تھے۔
قناتوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ بیچ بیچ میں پھریرے لہرا
رہے تھے۔
راہگذار کے دونوں طرف دلکش قرینے کے ساتھ دوکانیں سجی ہوئی
تھیں ———
پیتل کے برتن، چاندی کے زیورات، دیوموتی کے قیمتی پارچات'
ریشمی کپڑے، لکڑی اور مٹی کے رنگ برنگ کھلونے، کاغذی بنسریاں،
چلغوزے، بھینٹ پوجا کا سامان پھل پھول مالا' دھوپ' اگربتی،
تیرتھوں کے جل بھرے چھوٹے چھوٹے برتن وغیرہ سب چیزیں بک
رہی تھیں۔
بازیگر اپنے مخصوص انداز میں گا بجا کر اپنے کرتبوں سے لوگوں کو
محوِ حیرت کر رہے تھے۔

---

* ہندو علم الاصنام میں تعمیر کا دیوتا۔

کتھا سنانے والے رامائن کی کہانی سنا رہے تھے۔

سفید وردیوں میں ملبوس مسلح سنتری گھوڑوں پر سوار ہو کر گشت لگا رہے تھے۔

شاہی وزرا ہاتھیوں پر ہودج میں بیٹھے جا رہے تھے۔ ان کے آگے آگے شنکھ[1] بجتا چلا جاتا تھا۔

پردہ دار پالکیوں میں امیر گھرانوں کی مستورات تھیں اور ان کے آگے پیچھے نوکروں کی ایک پلٹن۔

ایک تناور پیپل کے زیر سایہ سنیاسی، ناگے، جٹا دھاری اور بھسم رمئے سادھوؤں کا بھاری جمگھٹا تھا۔ عورتیں آتیں۔ ان کے چرنوں میں بڑی عقیدت کے ساتھ بھوگ ـــــ پھل، دودھ، مٹھائی، چاول وغیرہ رکھ کر چلی جاتیں۔

گاہے بگاہے فلک بوس نعروں سے فضا گونج اٹھتی تھی ـــــ

"جے ترلوکیشور، جے"

کل راجہ کی پہلی پوجا کا شبھ لگن ہوگا۔ مہاراج بنفس نفیس ہاتھی پر سوار ہو کر تشریف لائیں گے۔ ان کی گذرگاہ کے دورویہ کیلے کے درختوں کی قطاریں ـــــ پھول مالاؤں سے آراستہ۔ اور منگل گھٹ (رنگین شگونی گھڑے) آم کے پتوں سے پیراستہ۔

لمحہ بہ لمحہ گذرگاہ پر معطر پانی کا چھڑکاؤ جاری تھا۔

چاند کی تیرہویں رات

مندر میں پہلے پہر کی آرتی کا گھنٹہ۔ بھیری، دمامہ بجا۔

آج چاند کے چہرہ پر ایک دھندلکا چھا رہا تھا۔

چاندنی پھیکی پھیکی ـــــ بجھی سی

ہوا بند ـــــ

آسمان پر دھواں سا پھیلا تھا۔

دور ـــــ حد نظر تک درخت ہراساں، ٹہنیاں سہمی ہوئی سی معلوم دیتی تھیں ـــــ

کتے بلاوجہ لمبی لمبی دردانگیز آوازیں بھوں بھوں کر اٹھتے تھے ـــــ

گھوڑے اچانک کان کھڑے کر کے ہنہنانے لگتے تھے۔ کسی نامعلوم سمت کی طرف دیکھ کر۔

ناگہاں زمین کے نیچے سے خوفناک آواز سنائی دی ـــــ

جیسے پاتال کے دیوجنگی نقاروں پر زبردست چوٹیں لگا رہے ہوں ـــــ گڑ گڑ گڑ گڑ ....

مندر کے گھنٹے زور زور سے بجنے لگے۔

ہاتھی بندھا ہوا تھا۔ وہ زنجیریں توڑ کر چنگھاڑیں مارتا ہوا بے تحاشا بھاگ نکلا۔

زمین لگاتار زلزلہ سے ہلنے لگی۔

ہزارہا لوگ حواس باختہ ہو کر چیختے چلاتے ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے۔

ان کی آنکھوں سے خوف و ہراس ٹپک رہا تھا۔

آپا دھاپی میں اپنے بیگانے کی تمیز نہ رہی۔

زمین شق ہوئی جاتی تھی۔ جابجا دھوئیں کے بادل اٹھنے لگے۔ کہیں گرم پانی کے چشمے بہ نکلے ـــــ

کہیں بڑے بڑے وسیع تالابوں کا لبالب پایاب پانی بالو کے نیچے سما گیا۔

مندر کی چھت سے آویزاں بڑا گھنٹہ زور سے کھا کر بجنے لگا ـــــ

ٹن ٹن ....

یکدم یہ صدا خاموش ہو گئی اور دھڑام دھڑام کی ہیبت ناک آواز سے سینے دہل گئے۔

زمین جب ساکت ہوئی۔

چاند مغرب کی جانب مائل ہو رہا تھا۔

جلتی ہوئی قناتوں سے آسمان میں اٹھتے ہوئے دھوئیں کے حلقے اس طرح معلوم ہوتے تھے جیسے چاندنی کے ساتھ لپٹے ہوئے ہوں۔

دوسرے دن جب عزیزوں کے غم میں آہ و بکا سے چاروں طرف فضا میں الم چھا رہا تھا۔

شاہی لشکر جرار نے مندر کا محاصرہ کر لیا۔

اس کے پیچھے سنتان پوتر کرنے کے لئے منگل جل کے گھڑے۔

راج منتری آئے، دھرم شاستروں کے بڑے بڑے پنڈت آئے۔

کیا دیکھا ـــــ مندر کی بیرونی دیوار بالکل مسمار ہو چکی ہے۔

دیوتا کی ویدی کے اوپر کی چھت گر گئی ہے۔

پنڈتوں نے کہا، اگلی پورنما سے پہلے پہلے سنسکار (دوبارہ تعمیر)

---

[1] ایک قدیم قسم کا بگل

ہو جانا چاہیئے۔ نہیں تو دیوتا مورتی کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔

راجہ نے حکم دیا۔ "فوراً سنسکار کرایا جائے۔"

وزیر نے عرض کیا۔ "ان کِراتوں کے سوا پتھر کا کام کون کرے گا۔ ان کی ناپاک نگاہوں سے دیوتا کی رکشا کا کیا انتظام ہو گا؟

"مندر کے سنسکار سے کیا فائدہ جب دیوتا کی آنگ مہما (عضوی عظمت) کی تقدیس نہ ہو۔"

کِراتوں کے سرغنہ مادھو کو راجہ نے بلوا بھیجا۔

بوڑھا مادھو اپنے سر کے خشک و سپید بالوں پر سفید چادر اوڑھ کر حاضر ہوا ——

زرد رنگ کی دھوتی پہنے، تانبے کے رنگ کا جسم کمر تک ننگا۔ دو لو آنکھیں قابلِ رحم عاجزی سے سرشار،

نہایت مؤدبانہ انداز میں مہاراج کے قدموں کے پاس چھوت کی احتیاط رکھتے ہوئے مٹھی بھر جل پھول رکھ کر اس نے مجرا عرض کیا۔

راجہ نے کہا "تمہارے بغیر دیو مندر کا سنسکار نہیں ہو سکتا۔"

"ہم پر یہ دیوتا کی کرپا ہے مہاراج!" ان الفاظ کے ساتھ مادھو نے دیوتا کے احترام و بھگتی میں پرنام کیا۔

مہاراج نر سنگھ رائے نے دوہرایا۔ "آنکھیں باندھ کر کام کرنا ہوگا۔ دیوتا کی مورتی پر نگاہ نہیں پڑنی چاہیئے۔ کر سکو گے؟"

مادھو نے عرض کیا۔ "باطنی آنکھوں سے کام سرانجام دیں گے اے باطن شناس، جب تک کام چلے گا۔ آنکھ نہیں کھولوں گا۔"

باہر کراتوں کی جماعت کام کر رہی تھی۔

مندر کے اندر مصروفِ کار تھا مادھو۔

اس کی آنکھوں پر نہایت مضبوطی سے کالا کپڑا بندھا تھا۔

دن رات مندر سے باہر نہیں نکلتا۔

(دل سے) دھیان کرتا (زبان سے) بھجن کرتا۔ اور اس کی انگلیاں تھیں سرگرمِ کار۔

وزیر آتا اور کہتا "جلدی کرو، جلدی کرو۔"

دن گذرتے جا رہے ہیں۔ شبھ لگن کے لئے وقت تنگ ہے۔"

مادھو دست بستہ عرض کرتا۔ جس کا (دیوتا) کام ہے وہ خود ہی جلد کروا رہا ہے۔ شرمیاں میں کوئی بہانہ نہ ہو۔"

چاندنی راتیں گذریں۔ پھر اندھیری راتوں کا دور آیا

اندھا مادھو انگلیوں سے چھو کر پتھر کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

اور پتھر ان کا دے رہا تھا جواب۔

پاس ہی کھڑا تھا پہرہ دار۔

اس کے بعد مادھو نے آنکھوں کی پٹی ذرا ڈھیلی کی۔

پنڈت نے آکر کہا۔ "اکادشی کی رات کو پہلی پوجا کا شبھ لگن ہے۔

اس سے پہلے کام ختم ہو جائے گا کیا؟"

مادھو نمسکار کر کے بولا۔ "میں اس کا کیا جواب دوں؟

بھگوان کی جب کرپا ہوگی۔ وقت پر اطلاع بھجوا دوں گا۔"

"اس سے پہلے خواہ دیر ہو، یا رکاوٹ۔"

مندر کے دروازے سے چاندنی کی روشنی مادھو کے سپید بالوں پر آکر کھیل رہی تھی۔ مادھو نے لمبا سانس کھینچ کر کہا ——

"جاؤ پہریدار، مہاراج کو خبر کرو کہ مادھو کا کام آج ختم ہوتا ہے۔ وہ اپنا کام آکر کریں مبادا لگن گذر جائے۔"

پہریدار چلا گیا۔

مادھو نے آنکھوں سے پٹی کھول کر الگ پھینک دی۔

جب کھلے دروازے سے اکادشی کے چاند کی جوان کرنیں دیوتا کی مورتی کی بلائیں لے رہی تھیں۔

مادھو گھٹنے ٹیک کر دست بستہ مورتی کے سامنے بیٹھ گیا۔

دیوتا کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں ساکن نگاہیں۔

آنکھوں کے چشمہ سے بہہ رہی تھی پریم کی گنگا۔

آج برسوں سے دیدار کے بھوکے بھگت کو دیوتا کا قرب اور درشن نصیب ہوئے۔

راجہ نے مندر میں قدم رکھا۔

مادھو سر بسجود تھا۔ دیوتا کی ویدی مول (قربان گاہ) پر۔

جب راجہ کی تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا سر تن سے جدا ہو گیا۔

دیوتا کے قدموں میں ہی تھی پہلی پوجا اور آخری پرنام۔

(ٹیگور)

جگن ناتھ شرما پربھاکر

دنیائے ادب

عورت

تابشِ خورشید۔ نورِ ماہ۔ پانی کی جھلک
خندۂ قلقل۔ صدا کوئل کی۔ غنچوں کی چٹک

لرزشِ سیماب۔ بجلی کی تڑپ۔ شاخوں کا لوچ
عقل کی تیزی۔ طبیعت کی اُپج۔ شاعر کی سوچ

اضطرابِ موج۔ کانٹوں کی خلش۔ ناگن کے بل
تیر کی سرعت۔ کماں کا عجز۔ شمشیروں کے پھل

آب موتی کی۔ چمک کُندن کی۔ ہیرے کی دمک
اشرفی کا روپ۔ ٹکسالی صداقت کی کھنک

دامنِ کہسار کے منظر۔ نوائے آبشار
شورِ دریا۔ کروٹیں لہروں کی۔ ساحل کا قرار

زمزمہ کا عطر۔ کیفِ نغمہ۔ لے کی پختگی
شورشِ مے۔ مستیٔ مے نوش۔ جوشِ بیخودی

آہوئے رم خوردہ کی وحشت۔ طرارے۔ تیزیاں
گائے کی سنجیدگی۔ جگنو کی آتش ریزیاں

وادیٔ کشمیر کی نزہت، گلوں کا رنگ و بُو
سرو کا قد۔ مور کی رفتار۔ قُمری کا گلو

رونقِ شامِ اودھ، صبحِ بنارس کا نکھار
آگرہ کے تاج کی عظمت۔ ہمالہ کا وقار

دلپذیریٔ اذاں دلداریٔ ناقوسِ دَیر
صحنِ مسجد کا تقدس۔ پرتوِ فانوسِ دَیر

ہر بھجن کا فیض۔ حسنِ اعتقادِ برہمن
کُمبھ کے میلے کی شہرت، وقعتِ گنگ و جمن

تلخیٔ انجام جب سب کوششیں ناکام ہوں
خوشنما سیبوں کی ہلکی ترشیاں، جب خام ہوں

بربط و چنگ و سرود و ارغنوں کے زیر و بم لرزشیں پردوں کی آوازوں کے جادو، تال سم

دیکھ کر یہ اتّقا اس کارگاہِ انس و جاں کارپردازانِ قدرت میں ہوئیں سرگوشیاں
ایک بولا امتزاج ان کا قیامت ساز ہے دوسرا کہنے لگا۔ خاموش کوئی راز ہے

صبحدم جب گوشہ گوشہ مطلعِ انوار تھا ذرہ ذرہ عالمِ نیرنگ کا سرشار تھا
اُس مرکّب کو اصولی جنبشیں ہونے لگیں تاکہ ہو غربالِ ندرت سے کثافت تہ نشیں
یہ عناصر ایک مدت تک رہے گرمِ عمل آخرش تحریکِ عصمت سے ہوئے آپس میں حل
جلوۂ حسنِ ازل سے پاکے قلبِ ماہیت آگئی کافور میں بلّور کی سی خاصیت
اب ہیولیٰ ارتقائی منزلیں طے کر گیا شہپرِ پروازِ عفّت سے بلندی پر گیا
اعتدالِ عنصری پر پالیا جب اعتبار عزمِ فطرت کے مطابق شکل کی اک اختیار
آئی اعضا میں گدازی اور نرمی جسم میں آئی رخساروں پہ سُرخی اور گرمی جسم میں
جوں ہی پہنچا پایۂ تکمیل پر یہ شاہکار دستِ قدرت نے ٹٹولی نبض اس کی بار بار
بسترِ نکہت پہ یہ پتلی جو محوِ خواب تھی مست انگڑائی کے ہاتھوں جاگ اُٹھی شرما گئی

دیکھ کر شاعر نے اس کو نکتۂ حکمت کہا
اور بے سوچے زمانے نے اُسے "عورت" کہا

شاد عارفی

"ھمایوں"

اُردُو کے یورپین پرستار

دہلی کی سلطنت مٹنے پر جب ہندوستان کی سلطنت بدلی اور انگریزی حکومت کا دور دورہ ہوا تو بقول نواب نصیر حسین خیال مرحوم کسے معلوم تھا کہ اردو پھر بھی یوں رواج پائے گی۔ سرکاری حکم اور خزانہ سے فورٹ ولیم کلکتہ میں اردو کالج قائم ہوا اور ڈاکٹر جون گلکرائسٹ کی نگرانی میں اس کا سکہ چلنے لگا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اُردو زبان کی وسعت و ہمہ گیری پر نظر کرکے اُسے سلطنت کی زبان بنانے کی فکر ہونے لگی۔ اور ۱۸۳۷ء میں جب فارسی زبان دفاتر سے متروک ہوگئی۔ تو اس کی جگہ اُردو ہی کو منتخب کیا گیا۔ حکومت کی نظروں میں کل دیسی زبانوں میں اردو کے سوا کوئی دوسری زبان اس قابل نہیں سمجھی گئی کہ وہ دفاتر کی زبان بن سکے۔ صدر عدالت دیوانی سے حکم نافذ کیا گیا۔ کہ اس کی ماتحت عدالتوں میں اردو کو رواج دیا جائے۔ اردو تصانیف پر حکومت کی طرف سے انعامات مقرر کئے گئے اور مدارس میں اُردو کی تعلیم لازمی قرار دیدی گئی۔ چنانچہ ہندو، مسلمان اور یورپین سبھوں کی متفقہ مساعی جمیلہ کے باعث اُردو زبان سارے ملک میں رائج ہوگئی۔

یورپ کے جو لوگ سب سے پہلے اس ملک میں آئے وہ پرتگالی تھے۔ انکی حکومت بہت قلیل مدت کے لئے اس ملک میں رہی پھر اس کا خاتمہ ہوگیا۔ لیکن اردو زبان نے پرتگالی اثر قبول کرلیا۔ یہاں تک کہ متعدد پرتگالی الفاظ الماری۔ گملا۔ آلپین۔ تولیا۔ تمباکو۔ نیلام۔ بوتل۔ کمرا وغیرہ اس زبان میں داخل ہوگئے۔ نیز فرانسیسی اور ڈچ زبانوں کا بھی اثر پڑا۔ ان قوموں کے بعد انگریز اس ملک میں آئے۔ دیسی باشندوں سے میل ملاپ کے باعث یورپین حضرات کو بھی اردو زبان سیکھنے کی ضرورت پڑی زبان کی تحصیل کے بعد وہ اس کی شیرینی و لطافت اور ہمہ گیری سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کو اس زبان میں کتابیں لکھنے کا شوق پیدا ہوگیا۔ چنانچہ سب سے پہلا یورپین جس نے اردو زبان کے صرف نحو پر ایک کتاب لکھی وہ جان جاشو کٹلر تھا۔ یہ ڈچ قوم کا تھا۔ اور اپنی حکومت کی طرف سے شاہ عالم اور جہاندار شاہ شاہان دہلی کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اس کی اس کتاب کا سنہ تالیف ۱۷۱۵ عیسوی ہے (جس کو ڈیوڈ مل نے ۱۷۴۳ء میں شایع کیا) اس کے بعد ۱۷۷۲ء میں مسٹر ہیڈلے نے اردو زبان کے صرف نحو کی ایک کتاب شایع کی۔

کٹلر صاحب کی متذکرہ کتاب کی اشاعت کے ایک سال بعد یعنی ۱۷۴۴ء میں نادر شلیزے نامی ایک پادری کی اُردو صرف نحو کی ایک کتاب شایع ہوئی۔

مسٹر فرگوسن نے ۱۷۷۳ء میں اُردو زبان کی ایک لغت لکھی۔ اس کے بعد ۱۷۸۷ء سے اُردو زبان کے بہت بڑے محسن ڈاکٹر جون گلکرائسٹ کی تصانیف کا سلسلہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے اُردو زبان پر مستند و قابلِ قدر کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

(۱) انگریزی ہندوستانی لغت مطبوعہ کلکتہ ۱۷۸۷ء لغایت ۱۷۹۰ء

(۲) مشرقی زبان بشمول انگریزی ہندوستانی اور ہندوستانی انگریزی لغت (جس میں ہندوستانی زبان کے ابتدائی مسائل بیان کئے گئے ہیں) مطبوعہ کلکتہ ۱۷۹۸ء

(۳) قصص مشرقی (قدیم حکایتوں اور قصوں کا ترجمہ انگریزی سے اُردو میں) مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۳ء۔

(۴) مذکورہ بالا کتاب کا خلاصہ بعض اضافوں کے ساتھ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۱۰ء

(۵) رہنمائے زبان اُردو۔ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۴ء۔

(۶) ہندوستانی انگریزی فرہنگ یہ کتاب اڈنبرا میں ۱۸۱۰ء میں شایع ہوئی۔

(۷) مکالمہ انگریزی۔ ہندوستانی مطبوعہ لندن ۱۸۲۰ء

اس کے بعد جان شیکسپیر نے ایک ہندوستانی لغت لکھی جو ۱۸۱۷ء میں چھپی۔ بعدہٗ مسٹر ڈنکن فاربس کی ہندوستانی لغت ۱۸۴۷ء میں بمقام لندن طبع ہوئی۔ جان ولیم بیل (علم طبیعات اور کیمیا کا ماہر) آگرہ کالج میں پروفیسر تھا۔ اس نے (معہ نقشہ جات) آلات طبعی کے استعمال متعلق ۱۸۵۰ء میں اردو زبان میں ایک کتاب لکھی تھی۔ جو آگرہ کے مطبع مصور میں ۱۸۴۵ء میں طبع ہوئی۔ جان پارکس لیڈلے (جو آگرہ میں سرکاری مترجم تھا) اردو زبان سے نہایت دلچسپی رکھتا تھا۔ اور اردو کا ایک مطبع بھی قائم کر رکھا تھا۔ اس نے علم الاقتصاد پر انگریزی سے ترجمہ کرکے اردو زبان میں ایک کتاب موسومہ "دستور المعاش" تالیف کی تھی۔ جس کو اپنے ہی مطبع میں ۱۸۵۳ء میں طبع کرایا تھا۔ مسٹر برٹینڈ نامی ایک فرانسیسی نے بھی اردو زبان کی ایک لغت لکھی تھی جو ۱۸۵۸ء میں پیرس میں چھپی تھی۔

مسٹر براٹس کی لکھی ہوئی ایک اُردو انگریزی لغت ۱۸۶۴ء میں لنڈن میں شایع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر فیلن ایک زبردست محقق اور جیّد فاضل تھا۔ ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ اس سے اچھی طرح واقف ہے۔ اس نے یوں تو کئی لغات لکھے۔ مگر اسکی دو ڈکشنریاں اُردو سے انگریزی اور انگریزی سے اُردو بہت مشہور ہیں۔ ان تصانیف میں اُس نے جس قدر محنت جانفشانی اور تحقیق سے کام لیا ہے وہ اسی کا حصہ تھا۔ یہ دونوں لغتیں نہایت مستند مانی جاتی ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اُن سے بہتر ڈکشنریاں آج تک تصنیف نہیں ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ایک مدت دراز تک دہلی، آگرہ، الہ آباد، متھرا اور دوسرے بڑے بڑے شہروں میں رہا۔ وہ جہاں بھی رہا گلی کوچوں میں پھرا دیہاتوں میں گیا۔ بڑے بڑے علما اور فضلا سے ملا۔ اور ان سے لفظوں کی تحقیق کے متعلق گفت و شنید کرتا رہا۔ ہر ایک لفظ کو تولا، پرکھا، اس کے معنی کے متعلق تحقیق کر لینے کے بعد اپنی لغت میں درج کیا۔ اس نے اپنی اس تصنیف کے دیباچے میں اُردو زبان پر محققانہ بحث کی ہے۔ نیز بعض ہندوستانی شعرا کا ذکر کیا ہے۔ اس کی نظر انتخاب کبیرداس اور نظیر اکبرآبادی پر خصوصیت کے ساتھ پڑی ہے۔ نظیر کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کے کلام کی خوبیوں کو واضح طور پر بیان کیا ہے اور جو اعتراضات نظیر پر کئے گئے ہیں۔ اُن کا نہایت مدلّل جواب دیا ہے۔

گارسن دتاسی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ فرانسیسی تھا۔ اور اگرچہ ہندوستان کی کوئی زبان نہیں جانتا تھا۔ لیکن اردو زبان میں اس قدر کمال حاصل کر لیا تھا کہ اس زبان کا محقق مانا جاتا تھا۔ اور پیرس یونیورسٹی میں اُردو کا پروفیسر مقرر ہوا تھا۔ وہ نہایت محنت کے ساتھ اُردو میں خط و کتابت کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے اُردو خط کے نمونے ابتک پیرس کے کتب خانۂ ملی میں محفوظ ہیں۔ پروفیسر موصوف نے بہت سی اُردو کتابوں کے ترجمے فرانسیسی زبان میں شایع کرکے اپنے ملک اور قوم کو اردو تصانیف سے روشناس کیا ہے۔ غرضیکہ پروفیسر موصوف کو اردو زبان سے سچا عشق تھا۔ اور باوجود اس کے کہ وہ ہندوستان سے ہزاروں میل پر تھا۔ مگر پھر بھی اُردو زبان سے درس و تدریس تک ہی دلچسپی نہ لیتا تھا بلکہ اس زبان میں تصنیف و تالیف بھی کرتا تھا، اس کی تصنیفات و تالیفات کی فہرست بہت طویل ہے۔ جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں۔

(۱) انتخاب کلام میر معہ ترجمہ مطبوعہ پیرس ۱۸۲۶ء (۲) اُردو زبان کا ابتدائی رسالہ مطبوعہ پیرس ۱۸۳۳ء (۳) مسلمانان مشرق کا علم عروض مطبوعہ پیرس ۱۸۳۴ء۔ (۴) انتخاب از گل بکاولی معہ ترجمہ مطبوعہ پیرس ۱۸۳۵ء۔ (۵) انتخاب کلام ولی معہ ترجمہ مطبوعہ پیرس ۱۸۳۶ء۔ (۶) ذکر و تذکرہ حیات شعرا و مصنفین اُردو مطبوعہ پیرس ۱۸۳۹ء۔ (۷) ایک ہندوستانی ڈرامے کا انتخاب مطبوعہ پیرس ۱۸۵۸ء۔ (۸) مؤلفین و مصنفین اُردو کے حالات اور ان کی تصانیف کا ذکر مطبوعہ پیرس ۱۸۶۸ء۔

یہ تو اُردو نثر کا حال تھا۔ لگے ہاتھوں اب ذرا شاعری پر جو اُردو زبان کی مایۂ ناز کائنات ہے۔ نظر ڈالئے تو ایسے وقت میں جبکہ یہ زبان آجکل کی سی ترقی یافتہ اور پاکیزہ اُردو نہ تھی۔ تاہم اپنی شیریں زبانی، دلکشی اور نرم گفتاری کی بدولت نہ صرف دیسی باشندوں بلکہ سات سمندر پار کے بسنے والوں کو بھی اپنا مداح بنا لیا۔ اور دیسی باشندوں کے ساتھ مخلصانہ تعلقات نے اس قدر یکجہتی اور اتحاد پیدا کر دیا کہ اُنیسویں صدی کے آغاز سے ہی اکثر یورپین حضرات نے اردو زبان میں اشعار کہنے شروع کر دیئے تھے۔ جن میں سے بعض شعرا کے مختصر حالات معہ نمونہ کلام درج ذیل کئے جاتے ہیں یقین ہے کہ ناظرین اُردو زبان کے ان مغربی شعرا کے کلام کی پاکیزگی، زبان کی صفائی اور الفاظ کی بندش ملاحظہ فرما کر نہ صرف محظوظ ہوں گے بلکہ اس کو اردو زبان کی عالمگیر مقبولیت جاذبیت اور قدردانی پر محمول کرکے اپنی پوری توجہ اور منفعت کے ساتھ اس زبان کی نگہداشت کریں گے اور بادِ مخالف کے زہریلے جھونکوں سے بچا کر اپنے اسلاف کی یادگار کو قائم و برقرار رکھتے ہوئے اس کی ترویج و ترقی کی سعی بلیغ کریں گے۔ اور اس طرح سچے اخلاف ہونے کا عملی ثبوت پیش کریں گے۔

زمینِ سخن پر پڑے سو رہے ہیں شہیدانِ تیغِ سخن کیسے کیسے (سیفی بلگرامی)

(۱) **شایق** — تخلص، اصل نام جان فائم تھا۔ یہ فرانسیسی تھا۔ اور ہندوستان میں مختلف فوجی عہدوں پر مامور رہا، فارسی اُردو دونوں زبانوں میں بھی قابلیت رکھتا تھا۔ ۱۸۴۶ء میں بمقام بھرت پور انتقال کیا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو

جو رقیب منتِ درباں و طنزِ غیر کیا کیا جفائیں ہم نے سہیں تیرے واسطے

(۲) **مفتون** — تخلص۔ اصل نام آگسٹن ڈی سلوا۔ بنگالی تھا۔ اور آگرے میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ مرزا عنایت علی ماہ کا شاگرد تھا۔ کلام ملاحظہ ہو:-

نکالوں کس طرح پہلو سے ٹکڑا اس کے پیکاں کا
کہ مدت میں گندہ دل میں ہوا ہے آج مہماں کا

(۳) **واکر** — تخلص، پورا نام جان واکر، انگریز تھا، اور کلکتہ میں کسی عالی عہدے پر فائز تھا۔ اردو سے نہایت اُنس رکھتا تھا۔ اور لب و لہجہ نہایت صاف اور درست تھا۔ نمونہ کلام یہ ہے

اے طالبِ دنیا تجھے عبرت نہیں آتی کھائی دہن خاک نے فغفور کی ہڈی

گر راست ہو نسبت ہو گی باعثِ دولت مشہور ہے رکھ پاؤں میں تیمور کی ہڈی

(۴) صبا تخلص، نام جوہانس - اردو ادب سے کافی دلچسپی رکھتا تھا۔ اور شاعری میں اچھا دخل تھا۔ میر وزیر علی صبا کا شاگرد تھا۔ بطور نمونہ ایک شعر درج کیا جاتا ہے ؎

دیکھنا توڑ کے وحشت میں نکل جاؤنگا مجھکو پہنانے ہو زنجیر یہ زنجیر عبث

(۵) افلاطون تخلص - اصل نام بنجمن جونسٹن حیدرآباد دکن میں ملازم تھا، پیشہ ڈاکٹر تھا۔ اردو اور فارسی دونوں میں اشعار کہتا تھا۔ مرزا مہدی حسن حنا کا شاگرد تھا۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے ؎

کیوں خزاں میں سر پٹک کر مر نہ جائے عندلیب ہے نفائے گل سے وابستہ بقائے عندلیب

(۶) آزاد تخلص - اصل نام الگزنڈر ہیڈرلی - اُردو زبان سے خاص شغف تھا۔ اور اگرچہ ریاست الور میں بعہدہ کپتان ملازم تھا - پھر بھی شعر و شاعری کا سلسلہ جاری رکھتا تھا، ۱۸۶۱ء میں انتقال کیا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

ابرو نہ ہو تو تیغ ستم ریز کھینچئے مژگاں نہ ہو تو خنجر براں نکالیے

(۷) اسفان تخلص - پورا نام جارج اسٹفن - قیام زیادہ تر دہلی میں رہا - منشی خوب چند ذکا نے اپنے خاص دوستوں میں لکھا ہے - اُردو شاعری سے نہایت دلچسپی تھی - اور ہمیشہ شعرا کی صحبت میں نشست رہا کرتی تھی - نمونۂ کلام درج ذیل ہے: ؎

خط کا یہ جواب آیا، لکھا جو کبھی پھر خط کر ڈالونگا اک دم میں ٹکڑے اُن کے پرزے

(۸) فراسو[1] تخلص - پورا نام معلوم نہ ہو سکا - اردو ادب سے کافی دلچسپی تھی - اور بسلسلۂ ملازمت مستقل قیام دہلی میں رہا - یہ کیسے ممکن تھا کہ گلستان میں رہ کر گلوں سے دلچسپی نہ ہوتی - چنانچہ دہلی ہی میں شاعری کا شوق پیدا ہوا - اور خیراتی خاں دلسوز کی شاگردی اختیار کی - نمونۃً ایک شعر درج ذیل کیا جاتا ہے - جس میں مسٹر فراسو نے اپنے محبوب کے قد کی تعریف کی ہے: ملاحظہ ہو -

قمری کے مانند وہ پہنے محبت کا طوق
باغ میں گر قد تیرا سرو کو دکھلائیے

(۹) شور تخلص - پورا نام جارج برش شور - اُردو اور فارسی دونوں زبانوں پر اچھی مہارت تھی - علی گڑھ میں قیام تھا - صاحب دیوان تھا - دو دیوان ۱۸۷۰ء میں ممتاز المطابع میرٹھ میں طبع ہوئے تھے - مگر اب نایاب ہیں - منشی کریم الدین پانی پتی اپنے تذکرۂ شعرائے اُردو میں لکھتے ہیں - کہ میرے مکان پر مشاعرے ہوا کرتے تھے - اور ان مشاعروں میں پڑھنے کے لیے اپنی غزلیں اکثر بھیجا کرتے تھے - کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو -

دیر و حرم میں دے نہیں ترجیح زاہدا
سر جس طرف جھکایا وہی سجدہ گاہ تھی

(۱۰) طوماس تخلص - پورا نام جان ٹومس تھا - انگریز تھا - دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی - اور اسی شہر کو اپنا وطن ثانی بنا لیا تھا - نصیر دہلوی جیسے ماہر فن سے شرف تلمذ تھا - بطور نمونہ ایک شعر درج ذیل کیا جاتا ہے: ؎

سودا ہے زلفِ یوسفِ ثانی کا اس قدر
روتے ہیں ہم کھڑے سر بازار زار زار

(۱۱) جمیت تخلص - پورا نام معلوم نہ ہو سکا - میجر آرجیسٹن کی بیوی تھی اور اپنے شوہر کے ساتھ آگرے میں قیام پذیر تھی - اُردو خوب جانتی تھی اور کبھی کبھی اشعار بھی موزوں کر لیتی تھی - نمونۂ کلام یہ ہے -

روٹھا ہے ہمارا جو وہ دلبر کئی دن سے
اس واسطے رہتی ہوں میں مضطر کئی دن سے

(۱۲) لارڈ ہین ماؤتھ اس زبان کی ہمیشہ تعریف کرتا تھا - شاعری کا از حد شوق تھا - مگر مذہبی تعصبات کا جذبہ بہت غالب تھا - جس کا شائبہ کلام میں بھی پایا جاتا ہے - چنانچہ ایک مصرعہ ملاحظہ ہو: ع

دین اسلام گھٹے دین مسیحا بڑھ جائے

جس کا کسی منچلے شاعر نے مصرعہ ثانی میں یوں جواب دیا ہے - ع

گر ہرا نِ ہنوی سے خر عیسیٰ بڑھ جائے

(۱۳) صاحب تخلص - اصل نام الوسس رین ہارڈٹ - فرانسیسی جنرل سومرو کا فرزند تھا - اس کی شاعری کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی - دہلی میں اس کے مکان پر اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے - اور شہر کے اکثر ممتاز و مشہور شعرا ان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے - خیراتی خاں دلسوز کا شاگرد تھا - نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

ہے زلف حلقہ زن خطِ دلبر کے آس پاس
یا اژدہا ہے فوجِ سکندر کے آس پاس

(۱۴) عبری تخلص - پورا نام آئزک عبری تھا - مذہباً یہودی تھا - کلکتہ آکر بس گیا تھا - اردو زبان سے بڑی محبت تھی، ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

اشک سے شیشہ جگر چشم میخانہ بنے
دیکھیے اب ہمہ تن عبرت میخانہ ہوا

[1] فرانسس کوہن ایڈیٹر ادبی دنیا۔

تخلص ۔ اصل نام جارج فانژوم۔ اس کا باپ برنارڈ فانژوم

(۱۵) صاحب نواب نظام الملک آلی دکن کی سرکار میں فوجی کپتان تھا۔ اور خود اس کا تعلق ریاست رام پور سے تھا۔ شعر و سخن میں میر نجف علی شفقت سے مشورہ لیتا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ اور اچھا کہتا تھا۔ صاحب کے علاوہ کبھی جرجیس بھی تخلص کرتا تھا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

یہ رزو ہے کہ آنے کی مجھے اے شوخ
کہ جھوٹے وعدوں پہ بھی انتظار باقی ہے

تخلص ۔ نام مسز آئین شکیر۔ مسٹر شکیر صاحب پولیس کپتان مستنفیر کلکتہ کی بیٹی

(۱۶) ملکہ تھی۔ اردو زبان کی بہت مداح اور اس کی شیرینیت کی دلدادہ تھی۔ کبھی کبھی اشعار بھی کہہ لیا کرتی تھی۔ مؤلف سخن الشعرا منشی عبدالغفور نساخ سے اصلاح لیا کرتی تھی۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

ہو گئی نیند بھی ہمسایہ کی تا صبح حرام ۔۔۔ میں نے نالہ جو کسی رات سر شام کیا

تخلص ۔ اصل نام دانیال گارڈنر تھا۔ ضلع ایٹہ میں مقیم تھا۔ اس کا

(۱۷) شکر باپ وہیں سرکار انگریزی میں کسی معزز عہدے پر مامور تھا۔ پہلے جوزف مینلے متخلص بہ فنا کی شاگردی اختیار کی تھی۔ مگر بعد کو مرزا عباس حسین ہوش لکھنوی سے مشورہ سخن کرنے لگا تھا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو: ؎

پہنچا ہے بعد مرگ فلک پر مرا غبار ۔۔۔ رتبہ بلند خلق میں ہے خاکسار کا

تخلص ۔ پورا نام ایبن جیکوب ۔ گورکھپور میں سکونت پذیر تھا۔

(۱۸) ایبن حضرت ریاض خیر آبادی مرحوم سے شرف تلمذ تھا۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے ؎

یہ کیا چپکے چپکے شکایت ہے اے دل
خبردار کس کا گلا ہو رہا ہے

مسٹر بلیک کی بیٹی تھی۔ اردو سے خاص دلچسپی رکھتی تھی۔ اور

(۱۹) خفی کبھی کبھی اشعار بھی موزوں کر لیا کرتی تھی۔ اس سے زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:۔

اے خفی اپنے اشکِ بے تاثیر
مفت میں جگ ہنسائی کرتے ہیں

تخلص ۔ اصل نام جون بلیغرز۔ اُردو کا اچھا شاعر تھا۔ جنرل سیبر

(۲۰) اسپیر کے بیٹے متخلص بہ صاحب (مندرجہ مضمون ہذا ۱۳) کے خاص دوستوں میں تھا۔ اور شاہ نصیر دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھا۔ بطور نمونہ ایک شعر درج کیا جاتا ہے۔

شمع فانوس میں در پردہ جلی ہے دیکھو
شعلۂ آہ نکالے ہے جگر سے باہر

یہاں تک تو اُن یورپین حضرات کا تذکرہ تھا۔ جنہوں نے اُردو زبان کی خدمت بذریعہ تصنیف و تالیف اور شعر و سخن کی ہے۔ اب چند ایسے یورپین حضرات کا بھی ذکر کر دینا بیجا نہ ہو گا۔ جنہوں نے اس زبان میں شاعری یا تصنیف و تالیف تو نہیں کی، تاہم اردو زبان سے بے حد دلچسپی رکھتے تھے اور اچھی طرح لکھ پڑھ لیا کرتے تھے۔ اور فصیح اُردو میں گفتگو کر سکتے تھے۔

سر ولیم جونس ۱۷۸۳ء میں فورٹ کلکتہ میں جج ہو کر آئے تھے آپ ہی دراصل "ایشیاٹک سوسائٹی" کے بانی تھے۔ اٹھائیس زبانوں کے ماہر تھے، اُردو میں بڑی اچھی استعداد تھی ۱۷۹۴ء میں ہندوستان ہی میں انتقال کیا۔

ڈیوک آف کناٹ ملکۂ وکٹوریہ کے صاحبزادے۔ اُردو نہایت خوب لکھتے۔ اور نہایت روانی کے ساتھ بولتے تھے۔

فریڈرک پین کوٹ اردو محض جانتے ہی نہ تھے۔ بلکہ اس زبان میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔

لیڈی چیمسفورڈ اُردو کی نہایت دلدادہ تھیں۔ چنانچہ ہندوستان آ کر شملے کے ایک زنانہ جلسے میں اُردو ہی میں تقریر کی۔ جو ادبی حلقوں میں بہت پسند کی گئی۔

آنجہانی ملکہ وکٹوریہ کو بھی ساٹھ سال کی عمر میں اردو سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور آگرہ کے مولوی برکت اللہ مرحوم موصوفہ کو پڑھانے کے لئے لندن بھیجے گئے۔ موصوفہ نے تھوڑے ہی عرصے میں اچھی طرح اُردو لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ چنانچہ اپنا ایک روزنامچہ بھی اردو ہی میں لکھا ہے۔ ۱۸۸۹ء میں شاہ ایران کی سیاحت انگلستان کے موقع پر وہ ایک جگہ لکھتی ہیں کہ:۔

آج کا دن بہت اچھا رہا، شاہ پرشیا معہ چند وزیروں کے آئے تھے۔ کھانا ہمراہ کھایا۔ سوا تین بجے لندن گئے۔

"کلیم" **سید قاسم رضا**

نقد و نظر

نغمۂ فردوس

خان بہادر چودھری خوشی محمد ناظر بی اے (علیگ) سابق گورنر ریاست جموں و کشمیر کے مجموعۂ کلام کا حصۂ اول نغمۂ فردوس کے نام سے پروفیسر محمد عبداللہ کامل ایم اے نے مرتب فرما کر شائع کیا ہے۔ کتاب کا سائز ۲۰×۲۶/۸ اور حجم ۲۰۰ صفحات ہے۔ کاغذ نفیس اور کتابت و طباعت نہایت شگفتہ قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور

کتاب کے شروع میں مصنف و مرتب کی تصاویر ہیں۔ اس کے بعد دونوں حضرات کے دیباچے ہیں جن میں نغمۂ فردوس کی ترتیب و تدوین اور ناظر کی شاعری کے تاریخی و ارتقائی پہلوؤں کے متعلق اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ چودھری خوشی محمد ناظر سر عبدالقادر کی آراستہ کی ہوئی بزمِ مخزن کے صدر نشینوں میں تھے۔ ان کی شاعری کا آغاز ۱۸۸۹ء میں ہوتا ہے جب وہ ابھی پنجاب کے دور افتادہ گوشے میں ایک معمولی سے اسکول کے طالب علم تھے۔ اس کے بعد وہ علی گڈھ کالج میں تشریف لے گئے جہاں اس زمانے میں سر سید اور مسٹر آرنلڈ کے زیر اثر ہندوستان کی نئی نسل کے بہترین دل و دماغ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ علی گڈھ میں ناظر کا رجحان قومی اور نیچرل شاعری کی طرف ہو گیا۔ اس کے بعد ان کی شاعری کا تیسرا دور جسے شگفتہ ترین دور کہنا چاہئے شروع ہوا جب وہ کشمیر میں بہ سلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ نغمۂ فردوس کی بہت سی دل آویز نظمیں اس زمانے کی یادگار ہیں۔ ان کی شاعری کے چوتھے دور کی ابتدا ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ہوتی ہے اور یہ دور اب تک قایم ہے۔ اگرچہ ناظر کی اپنی رائے ہے کہ اس آخری دور کے رنگِ سخن کی تشریح کے لئے یہ شعر کافی ہے۔

ناظر اب ذوقِ نظر بے کار ہے
منظرِ ہستی پرانا ہو چکا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ناظر کے قلم سے اب بھی بعض ایسی رنگین و مرصع نظمیں نکلی ہیں کہ ذوقِ سلیم کو سر دھننے کے سوائے چارہ نہیں

نغمۂ فردوس کے مختلف ابواب ہیں جن کے ماتحت اس نوع کی متعدد نظمیں درج ہیں۔ مثلاً سروشِ غیب۔ یادِ رفتگاں۔ تہنیاتِ درباری۔ بہرے مناظرِ قدرت۔ مطائبات۔ غزلیات۔ رباعیات۔ ناظر کی مشہور و معروف نظم جوگی جو طرزِ خیال کی جدت اور اندازِ بیان کی حلاوت سے ہندوستان بھر میں مقبول ہو چکی ہے اس مجموعے میں شامل ہے۔ ہماری رائے ہے کہ اگر ناظر اپنی زندگی میں اس نظم کے علاوہ اور کچھ نہ لکھتے تو بھی ان کا نام ادب اردو میں حیاتِ جاوداں حاصل کر لیتا۔

ناظر کو مختلف اصنافِ سخن پر استادانہ قدرت حاصل ہے۔ وہ موقع و محل کے مطابق نہایت شیریں، پُر زور اور شاندار زبان استعمال کرتے ہیں اور اس کے ساتھ محاورے کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ انہوں نے مسلسل نظم لکھنے کی طرف اس وقت توجہ کی جب اردو میں جذبات نگاری کا تنہا ذریعہ غزل بن چکی تھی۔ جوگی اور ناظر کا مکالمہ بعض بعض مقامات پر اتنا دلکش ہے کہ کچھ نقل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مثلاً جوگی ناظر سے کہتا ہے۔

کیوں بابا ناحق جوگی کو تم کس لئے آ کے ستاتے ہو
ہیں پنکھ پکھیرو بن باسی تم جال میں ان کو پھنساتے ہو
کوئی جھگڑا دال چپاتی کا کوئی دعوے گھوڑے ہاتھی کا
کوئی شکوہ سنگی ساتھی کا تم ہم کو آن سناتے ہو
ہم حرص و ہوا کو چھوڑ چکے اس نگری سے منہ موڑ چکے
ہم جو زنجیریں توڑ چکے تم لا کے وہی پہناتے ہو
سنسار سے یاں مکھ پھیرا ہے من میں ساجن کا ڈیرا ہے
یاں آنکھ لڑی ہے پیتم سے تم کس سے آنکھ ملاتے ہو

ناظر کا جواب سنئے

ہیں ہم پردیسی سیلانی یوں آنکھ نہ ہم سے چرا جوگی
ہم آئے ہیں تیرے درشن کو چتون پر میل نہ لا جوگی
آبادی سے منہ پھیرا کیوں جنگل میں کیا ہے ڈیرا کیوں

ہر محفل میں ہر منزل میں ہر دل میں ہے نور خدا جوگی
جس شہر میں خوب بہلتا ہے واں حسن پہ عشق مچلتا ہے
واں پریم کا ساگر چلتا ہے چل دل کی پیاس بجھا جوگی
واں دل کا غنچہ کھلتا ہے کلیوں میں موہن ملتا ہے
چل شہر میں سنکھ بجا جوگی بازار میں دھونی رما جوگی

سرورِ کائنات

رائٹ آنریبل سید امیر علی مرحوم کی مشہور عالم کتاب "سپرٹ آف اسلام" کے پہلے حصے کا ترجمہ سرور کائنات کے نام سے قومی کتب خانہ لاہور نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ کتاب مجلد ہے اور ۲۲×۱۹ کی تقطیع پر شائع ہوئی ہے۔ کاغذ اچھا لکھائی چھپائی اچھی اور ظاہری صنع قطع نہایت خوبصورت قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ کتاب کے مترجم مولانا منصور احمد مرحوم ایڈیٹر ادبی دنیا ہیں۔

سید امیر علی مرحوم قانون، تاریخ، فلسفہ، مذہب اور سیاست کے بہت بڑے عالم تھے اور اس حیثیت سے ان کی شہرت متمدن دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ چکی ہے۔ تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں ان کا ایک ہمیشہ زندہ رہنے والا کارنامہ "سپرٹ آف اسلام" ہے۔ یہ کتاب اپنے مطالب و معانی حسن انشاپردازی اور اثر و اہمیت کے اعتبار سے دور حاضر کی ان چند کتابوں میں شمار ہوتی ہے جنھوں نے مشرق کی فضیلت و قابلیت کا سکہ مغرب پر بٹھا دیا ہے۔ سید امیر علی کو خدا نے ایسی قدرتِ اظہار بخشی ہے اور وہ معمولی معمولی واقعات کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا مسحور ہو ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص جس کے قلم کی جنبش بے روح چیزوں میں زندگی کی حرارت پیدا کر سکتی ہے جب دنیا کے سب سے بڑے مذہبی، سیاسی اور علمی انقلاب پر خامہ فرسائی کرے اور اس ہستی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مناقب و فضائل بیان کرے جسے دنیا نے خیر البشر تسلیم کر لیا ہے تو پھر اندازہ کیجیے کہ اس کی تحریر میں کس قدر شوکت اور اس کے الفاظ میں کس قدر قوت پیدا ہو جائے گی۔ "سپرٹ آف اسلام" نے یورپ کے سامنے اسلام اور بانی اسلام کی صحیح، پاکیزہ اور دلفریب تصویر پیش کرنے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ آنحضرت کے متعلق مغربی دنیا کے تنگ نظر اور متعصب پادریوں نے محض بغض و عناد کی وجہ سے نہایت ناپاک اور غلط قصے مشہور کر رکھے تھے۔ سپرٹ آف اسلام کی اشاعت سے جھوٹ کا یہ قلعہ آہستہ آہستہ مسمار ہو رہا ہے۔

سپرٹ آف اسلام کا پہلا حصہ سیرت النبی پر مشتمل ہے اور دوسرے حصے میں اسلام کی تعلیم اور اصول و ایمان کے متعلق مضامین ہیں۔ سرور کائنات پہلے حصے کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ جس کاوش، محنت اور خوبی سے کیا گیا ہے اس کی کفالت صرف منصور احمد مرحوم کا نام کرتا ہے۔ اردو زبان کی خوش قسمتی ہے کہ "سپرٹ آف اسلام" ایسی عالمگیر شہرت رکھنے والی بلند پایہ کتاب کے ترجمے کی خدمت منصور احمد نے سر انجام دی جن کا بہار آفریں قلم قوتِ تحریر میں اپنے بہت کم حریف رکھتا تھا۔ منصور احمد کو دوسری زبان کے خیالات کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کا جو لاثانی ملکہ حاصل تھا اس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ سید امیر علی کو منصور احمد سے بہتر مترجم نہیں مل سکتا تھا۔ افسوس ہے کہ یہ کتاب مترجم کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ وہ لوگ جو منصور احمد مرحوم سے دوستانہ مراسم رکھتے تھے اس کتاب کو ایک بچھڑے ہوئے دوست کی پاک یادگار کے طور پر پڑھیں گے اور وہ لوگ جو ان کی تحریر کے مداح تھے اس نسخے میں ان کی جادو نگاری اور ان کے اسلوب بیان کی شگفتگی کو اپنے عروج پر دیکھیں گے۔ کتاب میں جگہ جگہ انشا پردازی اور محاکات نگاری کے لاجواب نمونے نظر آتے ہیں الفاظ کی برجستگی، فقرات کی چستی اور محاورات کی بندش کی خوب صورت مثالیں ہر صفحے پر موجود ہیں۔ اس مختصر سی جگہ میں ان سب چیزوں کے اقتباسات مشکل ہیں۔

"ع"